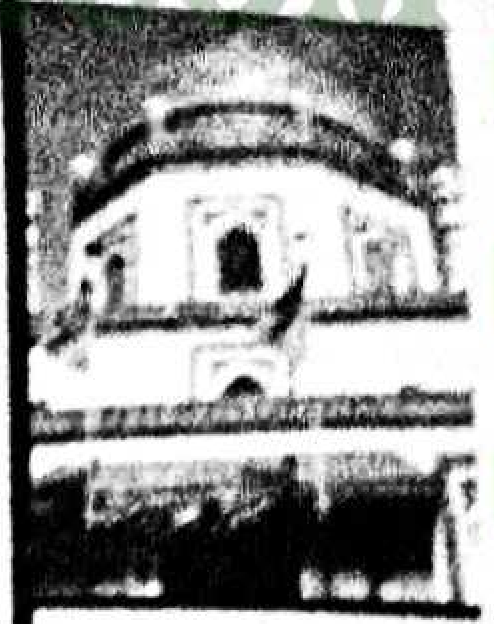
دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

May
2014

روحانی نمبر





07





08

اپنے قارئین سے مخاطب مدیر کی کچھ دلداریاں



10

قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دلچسپ سلسلہ





40

سرکار لال حسین شاہ سوراسی سیداں کے ایک ولی کا قصہ



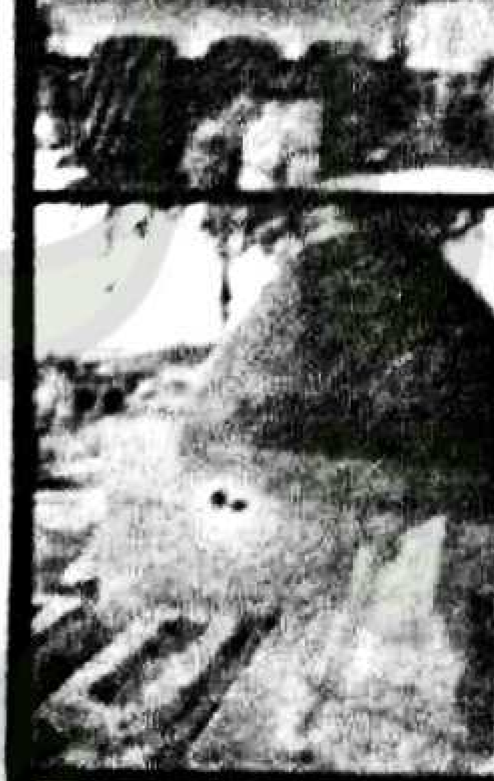
60

سرگودھا سے نوٹاں والی سرکار کی فضیلت



69

ہیڈ بکائنی سے ولی اللہ میاں متقی سائیں کی کرامات





76

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے ایک نوجوان کی سرگزشت



100

اُچ، دعا کے وسیلے سے منزل پانے والے انجینئر کی کہانی



108

پاکستان کی سرزمین سے عاشق گنج شکرؒ کی دعا کا حال





116

قوم جنات کے پڑوس میں بسنے والے گھرانے کی کہانی



122

ملتان، گناہوں سے تائب ہونیوالے ڈاکو کی سرگزشت



126

اپنے لیے خود احتسابی کا عمل چننے والی عورت کی کتھا





130

ایک دوشیزہ کی زندگی سنوارنے والی فقیرنی کی انوکھی کتھا



136

لاہور سے خدا کی قدرت کا رنگ دکھاتی ایک کہانی



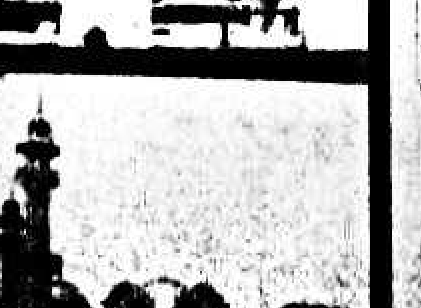
پرنٹر: حسام الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی / 021-34939823












اعجازِ دُعا — 150
مہر پرویز احمد
بی بی پاک دامنؒ پر مقبول ہونیوالی ایک دعا کی تفصیل

سبز پیر — 152
کنول عمران خان
کراچی سے ایک بزرگ ''سبز پیر'' کی نوازشات

یقینِ کامل — 154
تنویر خالد
داتا دربار سے صحت کاملہ پانیوالے گورنمنٹ ملازم کی بپتا

نُور کا ہالہ — 156
ندا ہاشمی
کشمیر سے عقل کو متحیر کرتی ایک معجزاتی حقیقت

بھر دے جھولی — 159
الماس فاطمہ ارمان
بابا تاج الدینؒ کے مزار پر ملنے والی قلندر فقیرنی کی کہانی

کایا پلٹ — 162
مسز نوید ہاشمی
قبولیت دعا پر کامل یقین دلاتی کراچی سے سچ بیانی

مرشد کی دعا — 166
نسیم سکینہ صدف
ڈسکہ، مرشد کی دعا سے فیضیاب ہونیوالے ایک ڈاکٹر کی کہانی

ناگن — 168
اعجاز احمد نواب
ہزاروں برس کی تپسیا پر پھیلا ہوا زندگی کا ایک رنگ

کھٹمل — 188
سرور شاذ
منچن آباد، جاگیردارانہ نظام کا شکار حسینہ کی داستان الم

صنم کدہ ہے جہاں — 204
ریاض حسین شاہد
برنالہ شریف، سخی عبداللہ قلندر قادریؒ کی درگاہ کی بہاریں

مسئلہ یہ ہے — 224
ادارہ
آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کالازوال سلسلہ

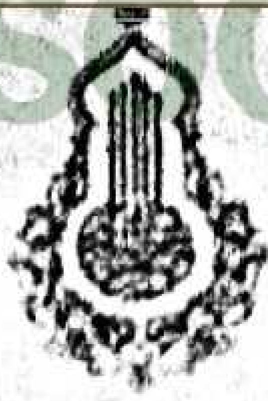
سخن آباد — 234
قارئین
شعراء کے کلام سے آباد ایک سخن فہم سلسلۂ خاص



مکھنی — 238
ارشد علی ارشد
خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان

متفرقات — 000
☆☆☆
چنیدہ، چنیدہ معلوماتی اقتباسات قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر ... 34939823



پختہ عزم

دنیا بھر میں پاکستان کا نام سربلند کرنے والے بچوں کو پاکستان بھر سے تو کم از کم تہنیتی پیغامات ملنے چاہئیں، انعامات ملنے چاہئیں۔ کچھ خاص مواقع ہوتے ہیں جب یہ ثابت کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم سب سچے اور کھرے پاکستانی ہیں۔ ٹکڑوں میں بٹے نہیں، بلکہ متحد پاکستانی...... برازیل میں اسٹریٹ چلڈرن کے تحت ہونے والے مقابلوں میں پاکستانی بچوں نے بھارت اور امریکہ کو ہرا کر تیسری پوزیشن حاصل کی...... ننگے پاؤں کھیلنے والے اِن بچوں نے ثابت کیا کہ کیا ہوا جو وہ تیسری دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ کامیابی کا جذبہ انہیں ہمیشہ آگے بڑھنے کی ہمت دلاتا رہتا ہے اور اسی لیے جیسے ہی انہیں موقع ملا تو وہ جیت کے جھنڈے گاڑتے چلے گئے...... دُنیا حیران ہے کہ وہ ملک جہاں فٹ بال گراؤنڈ ہی نہیں، وہاں سے آنے والے اس قدر بہترین کھلاڑی...... ہمارے ان شیر جوانوں نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ محاذ کوئی بھی ہو جیت صرف ہمارا ہی مقدر ہے...... بس! پختہ عزم اور نیت ہونی چاہیے۔

منزہ سہام

www.paksociety.com

کچھ اپنی باتیں

شاید ایسا صرف میرے ساتھ ہوتا ہے یا شاید سب کے ساتھ ہوتا ہوگا، کچھ دن ہی کے لیے سہی مگر ہوتا کچھ یوں ہے کہ کبھی کبھی راوی چین ہی چین لکھتا ہے، ہر کام صحیح، کہیں کوئی غلطی نہیں، کہیں کوئی گڑبڑ نہیں، کوئی شخص ناراض نہیں، کسی کو شکایت نہیں، کوئی تقاضا نہیں، کوئی مجبوری نہیں، کوئی زنجیر نہیں، کوئی قید نہیں، مکمل سکھ ہی سکھ ہوتا ہے، ایسی حالت میں دل تو کم بخت خوشی سے مر جائے، مگر یہ نامراد جو ہر وقت مسائل اور الجھنوں سے ڈرا تا رہتا ہے، بہکاتا رہتا ہے، ابھر ابھر کے ڈوبتا رہتا ہے۔ بہت خالی خالی سا ہو جاتا ہے، اب کوئی غم کوئی الجھن نہیں، اسے تو شادکام ہونا چاہیے، مگر یہ دل..... ہائے یہ کم بخت دل ایک بے نام سے خلا میں تیرنے لگتا ہے۔ سامنے نظر آنے والی ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے، ہر چہرہ بے تاثر نظر آتا ہے، ہر کام بلا وجہ محسوس ہوتا ہے، میں خوش ہونے کی بے پناہ کوشش کرنے لگتا ہوں، مگر ایک پھیکی سی مسکراہٹ، ایک بے نام سی رمق میرے چہرے پر آ کر گزر جاتی ہے۔ لذیذ ترین اور بے عیب کھانا بھی جی کو ہشاش بشاش نہیں کرتا۔ یہ حالت طاری رہتی ہے اور کئی دنوں تک طاری رہتی ہے پھر اچانک ایک دن خود بخود ختم ہو جاتی ہے، پہلے میں جان نہ پاتا تھا کہ یہ کیفیت کیوں ہوتی ہے اور کیوں ختم ہو جاتی ہے، مگر ایک دن یہ راز حیات میں نے جان ہی لیا۔

ہوا یوں کہ میں اسی کیفیت میں اسکول سے نکلا، سب طالب علموں کا ہوم ورک پورا تھا، کلاس میں کوئی بد نظمی نہیں ہوئی تھی، کسی بچے نے کوئی شکایت کی تھی نہ کسی کی پنسل کاپی چوری ہوئی تھی، سب اچھا ہی اچھا تھا، مجھے خوش ہو کر اسکول سے نکلنا چاہیے تھا، مگر یہ نامرادی تھی یا کچھ اور، میں بہت خالی خالی سا اسکول سے نکلا اور گھر کی راہ لی۔ میرے قدم زمین پر نہیں خلاؤں میں تیر رہے تھے، مجھے ایسے لگا کہ جیسے اسکول میں میری ضرورت ہی نہیں، مجھے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو رہا ہے۔ میں اس سوچ میں غلطاں گھر کی سمت چلے جا رہا تھا۔ وہی لگا بندھا معمول کہ اب گھر جا کے کھانا کھانا، تازہ دم ہونا اور دفتر چلے جانا، وہاں وہی سب سے مسکرا مسکرا کر سلام دعا کرنا، کہانیاں پڑھنا، ان میں غلطیاں تلاش کرنا، اصلاح کرنا اور کمپوزر کے حوالے کر دینا، مدیر اعلیٰ کو کارگزاری پیش کرنا اور گھر کی راہ لینا۔ میں اسی تانے بانے میں گھر پہنچا، تازہ دم ہوا، نصف بہتر نے کھانا پیش کر دیا، بہترین کھانا تھا، مگر مجھے اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی، میں ایسے ہی چھوڑ کر اٹھ گیا، محترمہ نے پوچھا کہ خیریت کھانا کیوں نہیں کھاتے، میں نے کہا بے سواد پکا ہوا ہے، اسے کیا کھاؤں؟ چنانچہ محترمہ کو نادم چھوڑ کر میں دفتر کو نکل آیا۔ راستے میں تھا کہ ایک بہت عزیز دوست کا فون آ گیا، انھیں بطور قرض کچھ رقم کی شدید ضرورت تھی، وہ میرے مشکل وقت میں بھی کام آئے تھے، ان کی مطلوبہ رقم میرے پاس نہیں تھی مگر ان کی ضرورت ایسی جان لیوا تھی کہ انکار کا موقع نہ تھا۔ دوست کہنے لگا کہ کاش اگر دے سکو تو ہامی بھرنا، شام کو رقم ہر حال میں چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے بھروسے رہ جاؤں۔ میں نے اللہ توکل ہامی بھر لی کہ شام کو لے جائیے گا، سوچا کہ انہوں نے پندرہ دن کا وعدہ کیا ہے، جو رقم کم ہے وہ میں ایک دوسرے دوست سے لے کر دے دوں گا۔ میں نے دوسرے دوست کو دفتر پہنچ کر فون کیا، ان کا نمبر بند تھا، سوچا کہ شام تک کھل ہی جائے گا۔ دفتر میں دوشیزہ ڈائجسٹ

چھپ کر آ چکا تھا۔اس میں پروفنگ کی ایک دو غلطیاں نکل آئی تھیں، یہ اطلاع صدمہ خیز تھی،اس خبر نے مجھے شپٹا دیا، ہانپتے کانپتے ڈائجسٹ کھولا، دل میں دعائیں کہ یہ بات اڑائی ہوئی نکلے، مگر بات سچ تھی غلطیاں تھیں۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اب مدیر اعلیٰ منزہ سہام کی میٹھی میٹھی مگر دو ٹوک سرزنش کا سامنا ہوگا۔ میں نے سر اٹھایا تو سینے میں کچھ وزن کا احساس ہوا، یہ دل تھا، ہاں یہ میرا دل تھا جو دھڑک دھڑک کر اپنی موجودگی کا احساس دلوا رہا تھا، کچھ دیر پہلے جو سینہ خالی خالی بے وجود سا تھا۔اب وہی زندگی سے بھرپور تھا۔اسی لمحے ایک سوال اٹھا کہ کیا خوشی موت کی علامت ہے اور غم زندگی کی؟ میں اسی ادھیڑ بن میں شام کو دفتر سے نکلا، مجھے قرض والا معاملہ یاد آ گیا، میں نے اپنے دوست کو فون کیا، ان کا نمبر ہنوز بند تھا۔اب میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں دفتر سے سیدھا اپنے دوست کے گھر پہنچا، معلوم ہوا کہ صاحب ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں دو روز بعد واپس لوٹیں گے، میرا وہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ نکلے۔ کہ وعدہ کر چکا ہوں کہاں سے رقم لاؤں، ضرورت ایسی تھی کہ وہ پریشانی میرے دوست کی نہیں میری تھی۔ خیر میں نے دو چار احباب کو مزید فون کیے، مگر سب کے اکاؤنٹ خالی نکلے۔اسی اثنا میں دوست کا فون آ گیا کہ وہ رقم لینے گھر آ رہا ہے، میں نے کہا کہ آ جاؤ۔ میری پیشانی عرق آلود تھی، دل بے طرح دھڑک رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا میرے پاس موجود رقم سے دوست کا کام چل جائے گا؟ مگر اب میں کر بھی کیا سکتا تھا میں حواس باختہ گھر کی دہلیز پر پہنچا، اچانک میرا موبائل بجا، اسکرین پر ایک لمبا سا نمبر تھا، یقیناً غیر ملکی کال تھی۔ میں نے فون اٹھایا تو میرا وہی دوست تھا جس کے میں گھر گیا تھا، کہنے لگا کہ گھر سے اطلاع ملی کہ تم گھر گئے تھے، خیریت تھی؟ میں نے کہا ہاں خیریت تھی۔ مجھے پندرہ دن کے لیے کچھ رقم چاہیے تھی۔ کہنے لگا کوئی مسئلہ ہی نہیں، میرا چھوٹا بھائی کچھ دیر میں یہ رقم تمہارے گھر دے جائے گا۔اور یوں ہی ہوا۔ میرے حواس اس وقت بحال ہوئے جب میں نے اپنے ضرورت مند دوست کے حوالے رقم کر دی وہ جلدی جلدی آیا اور جلدی چلا گیا۔اس کے جاتے ہی اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے محترمہ سے کھانے کا کہا، محترمہ نے جھٹ پٹ پیش کر دیا۔ میں نے بے ارادہ کھانا شروع کیا اور کھاتا چلا گیا۔ بہت لذیذ کھانا تھا۔ کہا کہ یہ دوپہر کی طرح بے سواد نہیں بہت لذیذ ہے۔ محترمہ نے مسکرا کر فرمایا، "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ امان دی۔ فرمایا کہ یہ کھانے کا وقت نہیں تھا، رات کا کھانا ابھی تیار ہو رہا ہے۔ آپ نے بے وقت کھانا مانگا۔ یہ دوپہر ہی کا سالن موجود تھا میں نے وہی دوبارہ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ یہ وہی سالن ہے جسے آپ دوپہر میں بے سواد کہہ رہے تھے۔ میں تو بس ہکا بکا کبھی سالن تو کبھی بیگم کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا!

سو میں نے جان لیا کہ میں کبھی خالی خالی سا کیوں ہو جاتا ہوں؟ غم اور خوشی سے زندگی کا تعلق نہیں، بلکہ زندگی کا تعلق جمود سے ہے، جمود موت کا دوسرا نام ہے۔ خوشی کا تسلسل بھی موت ہے اور غم کا تسلسل بھی موت ہے، غم کے بعد خوشی احساس جگاتی ہے اور خوشی کے بعد غم احساس جگاتا ہے، سمندر کا پانی اگر ہوا کے ہلکوروں سے اوپر نیچے نہ ہو تو بدبودار ہو جائے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اللہ نے مختلف موسم کیوں بنائے، کھانوں کے ہزار ذائقے کیوں بنائے، سیکڑوں رنگوں سے کیوں دنیا کو سجایا، ہر انسان کی شکل مختلف کیوں رکھی، ہر آواز کو جدا کیوں بنایا، صرف دن ہی کیوں نہیں بنایا، صرف رات ہی کیوں نہ بنائی، رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کیوں رکھی؟ یہ سوچنے کی بات ہے، آپ بھی سوچیے میں بھی سوچ ہی رہا ہوں۔

آپ کا آئینہ

www.paksociety.com

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب



پیارے ساتھیو!

کیسے ہیں آپ؟ امید واثق ہے خدا تمام آلام و مصائب سے محفوظ رکھے ہوئے ہوگا۔ پیارو! دکھ سکھ ایک ساتھی کی طرح ہوتے ہیں اور بھلا دوست ساتھ چھوڑ سکتے ہیں...... تو دکھ سے نہ گھبراؤ کیونکہ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔ اور اس شام کے بعد جو صبح طلوع ہوتی ہے، بڑی نکھری نکھری ہوتی ہے۔ ہر ماہ کس بے چینی سے اپنے پیاروں! اپنے سجنوا پنے متروں سے ملنے کی ہوک میرے دل میں جاگ اٹھتی ہے۔ کیا بتاؤں؟ کس طرح یہ دن انگلیوں پہ گن گن کر کاٹے جاتے ہیں۔ یہ تو سوہنا مولا سائیں ہی جانتا ہے۔ بس خوشی اس بات کی ہے کہ اس آتش عشق میں، میں اکیلا ہی نہیں مجھ سے پیار کرنے والے بھی لمحہ لمحہ سوزش محسوس کرتے ہیں۔ باتیں تو بہت ہوگئیں بھلا محبت کرنے والوں کی باتوں کا انت ہوتا ہے۔ چلیے جی اب آتے ہیں اس محبتوں کے طلسم کدے میں 'اپنے حال احوال' ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔

✉ اس ماہ احوال میں یہ شرکت ہے کراچی سے گل رعنا صاحبہ کی، لکھتی ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان بھیا۔ السلام علیکم۔ اپنی پہلی کاوش اپنے پسندیدہ رسالے "سچی کہانیاں" میں بھیج رہی ہوں۔ گر قبول اُفتد زہے عزوشرف۔ یہ میری سہیلی کی خالہ اماں نے سنائی تھی۔ اگر پسندیدگی کی سند پائی تو ان شاء اللہ اور کہانیاں بھی بھجواؤں گی۔ آپ کی بہن۔

☆ پیاری آپا! سلامت رہیے۔ اگلے ماہ آپ کی اتنی سی حاضری نہیں چلے گی۔ ہمیں تو بھرپور تبصرہ چاہیے آپ سے۔



✉ یہ ہیں ہمارے لکھاری دوست مور شاہد حسین، حب چوکی (بلوچستان) سے، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھیا اللہ پاک آپ کو پُرسکون اور صحت مند زندگی سے نوازے۔ سچی کہانیاں دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ بھیا آپ ورق ورق سے جھلک رہے ہیں۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ "آمین"۔ 30 مارچ کو سچی کہانیاں نے دل پر دستک دی۔ محبت سے تھام کر من میں بٹھا دیا۔ ماڈل سے من پسند کھانے، مزہ آ گیا بھیا۔ باقی اگلے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے پھولوں سے سجی فہرست میں ارے واہ ہم بھی شامل ہیں۔ "ذرا سی بھول" میری کہانی کو سچی کہانیاں کا حصہ بنا کر جس طرح میری حوصلہ افزائی کی، مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اسی محبت واپنائیت سے نوازتے رہیں گے، بے حد شکریہ۔ آنٹی منزہ سہام نے اداریہ "تھرپیاسا ہے" انتہائی حساس اور اہم موضوع پر لکھا۔ بھیا آپ کی "کچھ اپنی باتیں" جیسے انار میں موتی اور بہار میں خوشبو۔ بھیا آپ مخصوص رفتار سے احوال "کوچ" چلا رہے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر اگر مجھے بٹھا دیتے تو بہت مزہ آ جاتا۔ دیکھیں بھیا کتنے نئے لوگ انیل حسین، قربان جاوید علی، ظفر علی، فیض رسول، امجد علی، غلام مرتضیٰ، عمران علی، مبشر حسن، مومنہ بتول، عطیہ ذاہرہ، عماد حسین انصاری، عبدالجبار اچکزئی، عمیر عادل بھی سوار ہوئے، خوش آمدید۔ خوش آمدید، بھائیو اور بہنو! کرایہ تو دیتے جاؤ۔ پاکستان کے تمام شہروں کے علاوہ محمد شہزاد کنول کے توسط سے شارجہ دبئی کی بھی سیر ہوئی۔ واہ، اڈی زرینہ جونیجو، آپ فریدہ فری یوسف زئی خدا آپ دونوں کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) عمیر عادل بھیا ہم تمام احوال سچی کہانیاں فیملی کے ممبر ہیں۔ شبیر منگی بھیا آپ قمبر علی خان سے آئے "بھلی کرے آیا" ہم بھی قمبر کے ہیں۔ پلیز آئندہ ماہ sms نہیں بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہونا۔ اڈی تحسین جونیجو قمبر شہداد کوٹ یا حب چوکی سے ہم ہی لکھتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ قمبر ہمارا ماضی اور حب چوکی حال ہے۔ اچھا آپ بتائیں زرینہ جونیجو آپ کی کیا لگتی ہیں اور ہاں پرانے شماروں میں صنوبر جونیجو کا بڑا نام ہے، وہ کون اور کہاں ہیں؟ صفدر علی بھیا اللہ پاک آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) عبدالعزیز جی آ انکل! آداب، سلام ودعائیں۔ مجید احمد جائی بھیا آپ کو شادی اور ڈاکٹر ایس وفا کو شادی کی پہلی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ سدا خوش رہو (آمین) سچ بیانیوں میں بشیر احمد بھٹی "پنچھی واپس"، سلمٰی غزل "سزا کی جزا"، ایم اشفاق بٹ "ہم نام"، محمد عمیر شہزاد "کفارہ" حقیقت کا عکس تھیں۔ میری کہانی "ذرا سی بھول" قارئین بتائیں گے۔ قمر تابندہ "کس پر اعتبار کریں"، شاہد محمود مغل "بے رنگ حیات"، محمد عزیز مے "سلگتے ارماں"، نور محمد بھٹو "آخری خواہش"، محمد بلال فیاض

"میں مطمئن ہوں" بہترین تحریریں تھیں۔ سرحد پار سے محمد شہزاد کنول "دل اک شہر خموشاں" رئیسہ خالد "بے جڑ کے پودے" پڑھنے کو دیں۔ صائمہ نفیس "کملی"، ممتاز احمد "بابا عمر دین" خوب صورتی سے بیان کی گئیں۔ سنبل "دشمن زندہ ہے"، محمد سرفراز ناز "کون بنے گا کروڑ پتی"، محمد تقی "ستم" شعلہ ساماں تحریریں پسند آئیں۔ مقبول سلسلہ تین مرد تین کہانیاں میں ارشد اجمیری "سچی توبہ"، مجید احمد جائی "تجھ سا ڈھونڈوں کہاں"، شاء کنول اللہ دتہ "تہی داماں" سبق آموز تحریریں تھیں۔ تحن آباد سب کی شاعری پسند آئی۔ اس ماہ کی خاص کہانی سرور شاذ "کھٹل" کے علاوہ تسلیم فاروقی "آتش جنوں"، اعجاز احمد نواب "ناگن" اور ارشد علی ارشد "مٹھنی" مصروفیات کے باعث زیر مطالعہ ہیں۔ اب اجازت، اگر کسی کو کوئی بات بُری لگی ہو تو دلی معذرت۔

☆ ارے مور شاہد...... آپ نے تو لاجواب تبصرہ کر دیا۔ ویلڈن! آپ سب کا تعاون ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے، یقیناً یہ حوصلہ ہمیں ہر قدم پر ملے گا۔



✉ غلام حسین۔ جیکب آباد سے، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی بھائی یقین کریں، گزشتہ دنوں پہلی بار سچی کہانیاں کا مطالعہ کیا اور اس کا دل سے مداح ہو گیا۔ واقعی ایک عمدہ رسالے میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں سچی کہانیاں ان خوبیوں سے مزین ہے۔ شام کو جب میں گھر آیا۔ میز پر سچی کہانیاں کا تازہ پرچہ خوب صورتی سے سجا ہوا جب میری نظر سے گزرا تو میں نے ایک دم اسے ہاتھوں میں لیا۔ بے حد پسند آیا۔ گھر والوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بھائی غلام رسول گل اسے لائے ہیں۔ پرچے کا مطالعہ کیا بہت مزہ آیا۔ معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ احوال ایک بہت اچھا سلسلہ ہے اور آپ کے خلوص بھرے جواب اسے اور بھی اچھا بنا دیتے ہیں۔ جب میں نے احوال پڑھا تو میرا دل چاہا کاش میں بھی اس میں شامل ہوں، سو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ کو میرا خط اشاعت کے قابل لگے تو ضرور شائع کر دیجیے گا۔ اس سے میرے اندر مزید لکھنے کا حوصلہ بڑھے گا۔ میں چاہتا ہوں ہر ماہ احوال میں شریک ہوں، کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر احوال میں تھوڑی سی جگہ ملی تو ان شاء اللہ ہر ماہ باقاعدہ کوشش کروں گا کہ احوال میں ضرور شریک ہوں۔

☆ لیجیے جناب! آپ کا خط احوال کا حصہ بنا۔ اب تو خوش ہیں نا۔ اب اگلے ماہ بھی لازمی آنا ہے آپ نے...... وعدہ!!



✉ یہ آمد ہے جیکب آباد سے ہمارے پیارے غلام رسول گل کی، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ خدا آپ کو سدا خوش رکھے۔ سب سے پہلے بہت بہت نوازش، ہر ماہ خط شائع کرنے پر۔ سچی کہانیاں باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ آپ نے سچی کہانیاں کو خوب اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔ شمارے میں کی جانے والی تبدیلیاں اچھی ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ احوال میں خط کے ساتھ تصویر بہت اچھی بات ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا انعام ہوگا۔ وقت مصروفیات اور حالات نے گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک محدود رکھا ہوا ہے۔ کہیں جانے کی، دوستوں سے ملنے کو بھی دل نہیں کرتا ہے۔ خدا جانے کیوں۔ نفسا نفسی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مطلب کے سوا کوئی کسی کو سلام بھی نہیں کرتا ہے۔ 29 مارچ کو

یکے ڈاکیا سچی کہانیاں کا پرچہ دے گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنے محبوب دوست مور شاہد حسین کی تحریر ''ذرا سی بھول'' پڑھی۔ بے حد پسند آئی۔ مبارک باد، مور شاہد دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت سی کامیابیوں سے نوازے، آمین۔ اس کے بعد ''کفارہ'' پڑھی جس میں عائشہ کے اندھے اعتماد نے اسے اجاڑ دیا۔ ''سچی توبہ''، ''آخری خواہش''، ''سزا کی جزا''، ''دشمن زندہ ہے''، ''کملی'' بھی اچھی تھی۔ ''سلگتے ارماں''، ''بے رنگ حیات'' بھی پسند آئیں۔ کاشی بھائی آپ کی تحریر کی کمی تھی۔ پلیز آپ ہر ماہ کوئی تحریر پڑھنے کو دیں نا؟

☆ پیارے غلام رسول! سلامت رہو۔ پہلے بتاؤ اب بھائی کی طبیعت کیسی ہے؟ ہمارے پاس دعاؤں کا خزانہ ہے، وہ سب کے لیے ہے۔ آپ کے بھائی کو خدا صحت کاملہ عطا کرے۔ (آمین)



✉ عادل حسین، کراچی سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی جی! السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ رخسانہ آنٹی اور منزہ آپی کو بھی سلام! اپریل کا شمارہ بہت انتظار کروا کے بالآخر ہمارے ہاتھ آ ہی گیا۔ منزہ آپی کی باتیں سچ کے سوا کیا تھیں؟ اتنا سب کچھ ہو گیا مگر نا ہی زمین پھٹی اور نہ ہی آسمان سر پر آ گرا۔ کاشی! آپ کی باتوں نے آنکھوں کو نم کر دیا۔ زبردست بھائی! خوش رہو۔ احوال میں داخل ہوئے تو دل خوش ہو گیا۔ کیا شاندار محفل ہے بھائی۔ اللہ پاک یہ محفل، اس کے لوگ اور یہ محبتیں یوں ہی قائم و دائم رکھے۔ جگہ کی بچت کے لیے میں سب کے نام نہیں لکھ رہا، لیکن جس جس نے مجھے سراہا اور تعریف کی میں ان سب کا شکر گزار ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی میری اصلاح کرتے رہیں گے۔ اللہ پاک خواجہ پرویز رشید صاحب کو جنت میں جگہ دے اور مجید احمد جائی کو شادی کی مبارک باد کے ساتھ نئے سفر کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ پہلی سچ بیانی پڑھ کر دل میں بندھی اُمید اور مضبوط ہو گئی کہ اچھے لوگ ابھی موجود ہیں۔ سلمیٰ غزل جی کی سچ بیانی بھی لاجواب تھی۔ ایم اشفاق بٹ کی ''ہم نام'' پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ محمد عمیر شہزاد کی ''کفارہ'' بھی خوب تھی۔ عبرت کے لیے بھی سدھار کے لیے بھی۔ مور شاہد حسین کی ''ذرا سی بھول'' کو بہت بڑی بھول ہونا چاہیے تھا۔ قمر تابندہ جی کی ''کس پہ اعتبار کریں'' پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ شاہد محمود مغل کی کہانی بھی وہی رشتوں کی توڑ پھوڑ کو لیے ہوئے تھی۔ ''سلگتے ارمان'' پڑھ کر دل ایک بار پھر دُکھی ہو گیا۔ منشی محمد عزیز جی نے کمال لکھا ہے۔ نور محمد بھٹو کی ''آخری خواہش'' پر بس اتنا ہی کہ اللہ آخری خواہش پوری کر دے۔ محمد بلال فیاض کی ''اب میں مطمئن ہوں'' پڑھ کر آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ''آتش جنوں''، ''ناگن'' اور ''ٹھگنی'' تو خوب چل رہے ہیں، لیکن کیا اتنے بڑے بڑے خلا سے ضروری ہیں؟ ذرا سوچیے! محمد شہزاد کنول کی ''پریم کہانی'' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ لوگ محبت کے نام پر کس کس طرح لوٹتے ہیں۔ یہ وفاداروں کا خاصہ ہے کہ خوشی خوشی لٹتے رہتے ہیں۔ شہزاد نے بہت محنت سے کہانی کو بنا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیوں؟ اپنے خشک ہوتے ہوئے زخموں کو اپنے ہاتھوں سے کھرچنا آسان بات ہے کیا؟ رئیسہ خالد جی کی ''بے جڑ کے پودے'' بھی خوب صورت لگی۔ کیسے کیسے سچ سننے پڑتے ہیں۔ صائمہ نفیس کی ''کملی'' پڑھ کر دل لرز اٹھا۔ یہ بھیانک رسمیں عورت کی کب تک تذلیل کرتی رہیں گی۔ اللہ پاک ہمارے

حکمرانوں کو ہوش کے ناخن دے دے۔ ممتاز احمد صاحب کی "بابا عمر دین" بہت خوب صورت کہانی تھی۔ انسان کی ہمت، سچائی، ایمان داری اور بھروسا انسان کو ضرور کامیاب کرتا ہے۔ اندازِ بیان بھی اچھا ہے۔ سنبل جی نے کیا خوب تحریر نذر قارئین کی ہے۔ سنبل جی بہت مبارک! محمد سرفراز ناز کی "کون بنے گا کروڑ پتی" بھی لاجواب تھی۔ محمد تقی صاحب کی "سسٹم" بھی زبردست! اندازِ بیان منفرد، بہت اچھی لگی۔ ارشد اجمیری صاحب کی سچی توبہ بھی ایک خوب صورت تحریر تھی۔ بے شک توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ مجید احمد جائی صاحب کی "دوست" پر لکھی گئی ایک خوب صورت تحریر پڑھ کر لطف بھی آیا اور افسوس بھی ہوا۔ ثناء کنول اللہ دتہ کی "تہی داماں" پر کہنے کو لفظ نہیں ملتے۔ یہ کھیل آج بھی جاری ہے۔ بس انداز بدل جاتے ہیں۔ اس ماہ کی خاص کہانی سرور شاذ کی "کھٹل" کا ایک حصہ پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سوچتا ہوں لکھنے کے انداز کی تعریف کروں یا ظلم و بربریت پر بین۔ کاشی بھائی مجھے آپ کی نظم یاد آ گئی۔ مارچ کے دوشیزہ کی "پاکستانی عورت کے نام" مسئلہ یہ ہے۔ نیکی کا کام ہے۔ ہم تعریف کے سوا کیا دے سکتے ہیں۔ اللہ صلہ دے گا۔ اب آتے ہیں آخر میں سخن آباد پر۔ کچھ صفحات میں اضافہ کر لیں بھائی۔ ڈاکٹر صغیر صاحب کی نعت رسول ﷺ خوب تھی۔ نظموں میں ظفر اللہ رند کی منت، محمد آصف ریاض کی یاد کرو، عصمت پروین عظمٰی کی راہوں سے پوچھتی ہوں اور حبیب الوہاب کی کہانی "پوچھو تم" بہت اچھی لگیں۔ غزلوں میں ہمیں نوید سہیل لاکھو، ریحان آفاق، رضوانہ کوثر اور عمران فائق کی مزا دے گئیں۔ ارے واہ! ہم بھی موجود ہیں۔ شکریہ بھائی! دل چاہتا ہے کہ کھل کر اظہارِ خیال کروں، مگر طوالت کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی سی کوشش کی ہے کہ پورے پرچے کا احاطہ کیا جائے۔ کسی کو کوئی بات بُری لگی ہو تو معافی۔ سب دوستوں کو سلام اور دعائیں۔ مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ بشرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔



☆ پیارے عادل! تمہارا بھرپور تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ سلامت رہو۔

✉ کراچی سے عصمت پروین عظمٰی صاحبہ احوال میں مختصر ترین خط کے ساتھ شامل ہیں، لکھتی ہیں۔ بہت اچھے سے کاشی بھیا! السلام علیکم۔ کہانی حاضر خدمت ہے۔ اُمید کرتی ہوں پسند آئے گی آپ کو۔ ستمبر 2013 کا شمارہ ابھی تک نہیں ملا اور بھی کچھ کہانیاں بھیجی ہیں میں نے اُمید ہے آپ کو پسند آئیں گی۔ اجازت چاہتی ہوں۔

☆ پیاری پروین جی! آپ کی آمد سر آنکھوں پر، مگر ہماری آپ سے گِلہ۔ آپ نے تبصرہ کیوں نہیں کیا شمارے پر۔ ہماری محنت کا کچھ تو حق ادا کرتیں آپ۔



✉ ٹنڈو جام سے پیر نوید شاہ احوال میں پہلی بار حاضری دے رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ مکرمی مدیر ماہنامہ "سچی کہانیاں" آداب عرض! اُمید ہے کہ آپ اور دیگر تمام اراکین میگزین بخیریت ہوں گے۔ (آمین) 28 برس قبل جب میری عمر 12 سال تھی تب ادارہ "سچی کہانیاں" کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے بچوں کے پرچہ "ماہنامہ بچوں کا رسالہ" کراچی سے پرورش پا کے ادبی میدان میں اُترا تھا۔ رخسانہ سہام مرزا کی ادارت میں شائع ہونے والے اپنے اس محسن کو ہم آج

دعائے صحت

ہمارے ادارے پرل پبلی کیشنز کے منیجر ایڈمن اور سرکولیشن انچارج محمد اقبال زمان کی والدہ پچھلے دنوں ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہوگئی تھیں۔ قارئین سے ان کی صحت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں جس کی بدولت علم وادب سے شناسائی ہوئی اور آج مادری زبان سندھی ہونے کے باوجود ہم خود کو اُردو ادب میں منوانے کے قابل ہوسکے۔ چند روز قبل اپنے پسماندہ شہر ٹنڈو جام کے بک اسٹال پر ایک عرصہ کے بعد ''سچی کہانیاں'' دیکھا تو ادارہ کی محبت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ تنگ دستی کے باوجود جوں توں خریدا، مطالعہ کیا تو از خود ہاتھوں میں قلم تھامنے پر مجبور ہوا۔ اس پراسرار نمبر شمارہ مارچ 2014ء میں ہمزاد، خونی بدروح، روشنی والے، کالا انڈا، ناگن، مکھنی وغیرہ نے دل موہ لیا۔ شاعری کے گوشہ سخن آباد میں ثمینہ ناز، شہزاد کنول، نوید سہیل لاکھو کی تخلیقات پسند آئیں۔ گوشہ خطوط ''احوال'' میں رانا محمد شاہد، منشی محمد عزیز، ملک صفدر عباس، ایم اشفاق، ممتاز احمد، عظمیٰ شکور، نصرت سرفراز کے خطوط بازی لے گئے۔ تحاریر اور خطوط کے ہمراہ تصویر کی اشاعت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ادارہ ادیبوں کی بھرپور ہمت افزائی پر یقین رکھتا ہے۔

☆ پیارے بھائی نوید شاہ! آپ کو احوال میں پاکر بہت اچھا لگا۔ کہانی کے ساتھ فوراً حاضری لگوائیں۔



✉ عمران علی۔ قمبر شہداد کوٹ سے، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان، سلام مسنون۔ اُمید واثق ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میری پہلی کوشش سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات کی زینت بنی، بے حد شکریہ۔ پرچہ بروقت موصول ہوا۔ اچھی تبدیلیاں سچی کہانیاں کے حسن میں کافی اضافہ کررہی تھیں۔ سچی کہانیاں میں نئی نئی ہونے والی تبدیلیوں نے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ ''روحانی نمبر'' کا شدت سے انتظار ہے۔ ہمیشہ کی طرح پرچے کی شروعات منزہ سہام کے اداریے ''تھرپیاسا ہے'' سے کی۔ بہت خوب، آپ کی ''کچھ اپنی باتیں'' بے مثال انداز ہے آپ کا۔ محفل احوال میں نئے آنے والوں کو ویلکم اور سینئر رائٹرز کو بہت بہت سلام۔ آپ نے میرا خط شائع کرکے مجھے بہت خوشی دی ہے۔ اب اسی اُمید سے خط لکھ رہا ہوں کہ تھوڑی سی جگہ ملے گی۔ وقت کی کمی کے باعث چند کہانیاں پڑھی ہیں جن پر زیر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ بشیر احمد بھٹی کی ''پلٹھی واس''، سنبل کی ''دشمن زندہ ہے''، محمد بلال فیاض کی ''میں مطمئن ہوں''، سلمیٰ غزل کی ''سزا کی جزا''، مورشاہد حسین کی ''ذرا سی بھول''، ایم اشفاق بٹ کی ''ہم نام'' بے حد پسند آئیں۔ سلسلہ خاص ''آتش جنوں'' اور ''مکھنی'' دلچسپ پڑھنے کو ملے ہیں۔ اب اجازت اس شعر کے ساتھ........؟؟؟

☆ ارے بھائی! اتنی جلدی!!! کہ شعر لکھنا بھول گئے۔ بھائی جاؤ آپ کو تبصرے کے لیے دو دن اور دیے۔ آئندہ شعر لکھنا نہ بھولنا۔



✉ یہ ہیں ہمارے ساتھ غلام مرتضیٰ۔ قمبر شہداد کوٹ سے، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان، السلام علیکم! اللہ پاک کے فضل و کرم سے ہماری طرف سب خیر ہے اور آپ کی خیریت کے لیے خدا تعالیٰ سے دعا گو ہوں۔ سچی کہانیاں میں آپ کی محنت اس کے معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ احوال میں جگہ دینے پر عین نوازش۔ پچھلے ماہ جب مور شاہد حسین کے بھرپور اصرار پر پہلی بار خط لکھا تھا۔ مجھے آپ کی محبت اور اپنائیت کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ آپ کس قدر مہربان و محسن ہیں۔ اب تازہ شمارے کی بات ہو جائے۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ محترمہ منزہ سہام کا اداریہ ''تھر پیاسا ہے'' اور آپ کے دل کی ''کچھ اپنی باتیں'' جتنی تعریف کرو، اتنی کم ہے۔ ''ناگن''، ''سزا کی جزا''، ''آتش جنوں''، ''کون بنے گا کروڑ پتی''، ''کھٹل''، ''سچی توبہ'' رائٹرز حضرات نے خوب صورت تحریریں پڑھنے کو دیں۔ سنبل کی ''دشمن زندہ ہے''، محمد شہزاد کنول کی ''دل اک شہر خموشاں''، مور شاہد حسین کی ''ذرا سی بھول''، رئیسہ خالد ''بے جڑ کے پودے''، ممتاز احمد کی ''بابا عمر دین'' بھی بہترین تھیں۔ محمد تقی کی ''سٹم''، صائمہ نفیس کی ''کملی''، ثناء کنول کی ''تہی داماں'' پسند آئیں۔ مصروفیات کے باعث اتنا ہی پڑھا ہے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اُمید ہے باقی کہانیاں بھی اپنی مثال آپ ہوں گی۔

☆ بھائی غلام مرتضیٰ، آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ سلامت رہیے اور ہمارے ساتھ رہیے۔



✉ کاشف عبید کاوش، بٹہ موڑی۔ بٹ گرام سے، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم۔ جناب کاشی چوہان صاحب، اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور آپ کا پورا اسٹاف بھی خیریت سے ہوگا۔ ''سچی کہانیاں'' کا پراسرار نمبر 3 مارچ کو ملا۔ سب سے پہلے شمارے میں اپنا خط تلاش کیا، اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ''سچی کہانیاں'' کا سرورق اس بار بہت زبردست تھا۔ اس بار بہت سے نئے لوگوں نے ''سچی کہانیاں'' بہت خریدا ہوگا۔

☆ پیارے بھائی! خدا آپ کو امتحان میں کامیابی دے۔ اگلے ماہ احوال میں ملاقات کا انتظار رہے گا۔



✉ ملک عاشق حسین ساجد، ہیڈ بکائنی، مظفر گڑھ سے، احوال میں حاضر ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم عزت مآب جناب کاشی چوہان صاحب، السلام علیکم۔ مزاج گرامی بخیر! اس جریدے میں ہلکی پھلکی گفتگو، ادبی تسکین اور اصلاحی، سبق آموز کاوشیں آپ کی محنت، لگن اور فرض شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ویسے بھی آپ نے جس دن سے اس کی باگ ڈور سنبھالی ہے اس کا معیار بلند اور قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ آپ کی ذہنی صلاحیتوں کی داد نہ دینا منافقت والی بات ہوگی۔ میں نے دیکھا ہے بہت سارے بھٹکے ہوئے لوگ ''سچی کہانیاں'' کو پڑھ کر راہ راست پر آ گئے ہیں اور ایک مکمل کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ سماجی شعور سے آگاہی حاصل کرنے والے اپنے اس محبوب پرچے کی

بے حد مقبولیت پر میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ویلڈن سچی کہانیاں، ویلڈن باجی منزہ سہام اور ویلڈن کاشی چوہان۔ یو آر دی گریٹ۔

☆ پیارے بھائی! آپ نے احوال میں حاضر ہو کر ہمارا مان بڑھایا۔ اب یہ سلسلہ ٹوٹنا نہیں چاہیے۔



✉ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاول پور سے رقم طراز ہیں۔ جناب مدیر صاحب آداب! آج 14 مارچ ہے۔ جمعہ کا دن ہے۔ مارچ کے پراسرار نمبر کا ٹائٹل نمبر کے مطابق پراسرار ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ سچی کہانیاں جونہی مارکیٹ کی زینت آرائش وزیبائش بنتا تھا۔ کہانی شائع ہونے پر اعزازی شمارہ بذریعہ ڈاک فوراً موصول ہو جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس جانب توجہ دیں۔

☆ آپ کی تجاویز پر ضرور عمل ہوگا، مگر اس بار کا تبصرہ؟؟؟



✉ نفیسہ فضل، کراچی سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ آپ سب اسٹاف صحت وزندگی کے ساتھ خوش وخرم رہیں (آمین) میں حسب وعدہ کچھ پراسرار اور کچھ روحانی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ یہ کہانی ہے خیر وشر کی جس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے یعنی ''عجیب ہے یہ داستاں'' میں دو ماہ سے مسلسل بیمار تھی۔ اللہ کا شکر ہے آپ سب کی دعاؤں سے بہت بہتر ہوں! بہت خوب کاشی بیٹا، اتنی سی عمر میں اتنی بڑی ذمے داریاں! اللہ پاک آپ کو ہمت وصحت عطا فرمائے۔ (آمین) بھئی کہاں ہیں وہ پرانے لکھاری رابیل عطاری، شمیم فضل خالق، فہیم بھائی ودیگر۔ سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں'' کا جواب نہیں، دل چاہتا ہے پڑھتے جاؤ۔ اس کے بعد ''ناگن'' احمد نواب کہاں سے لائے ہیں یہ کہانی؟ ہاں ''منگھنی'' اپنا اثر کھو چکی ہے۔ بھئی پسند ہے اپنی اپنی...... ویسے میری بھابی شگفتہ کا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا بھئی منزہ بیٹی کا تو جواب نہیں اتنی سی بچی مرزا صاحب مرحوم کی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے سنبھال رہی ہے۔ میری طرف سے بہت سی دعائیں پیار...... تمام اسٹاف کو دعا پیار رخسانہ بھابی کو محبت بھرا سلام۔

☆ نفیسہ آنٹی...... آپ کی احوال میں شرکت ہمارے حوصلے بڑھاتی ہے۔ خدا آپ کو صحت دے۔ اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔



✉ شاہد سلیم، کچھ موڑ حسن ابدال سے، لکھتے ہیں۔ محترم جناب کاشی چوہان بھائی! السلام علیکم۔ ماہنامہ سچی کہانیوں کا تازہ شمارہ مارچ 2014ء کی سرگرمیوں کی جولانیوں کے ساتھ کڑکڑاہٹ، ہولناک، خوفناک، ہیبت ناک، دل ہلا دینے والی کہانیوں کے ساتھ قارئین کی زینت ہے، واہ کینٹ میں انوریہ بک ڈپو سے وصول ہوا۔ سب سے پہلے اپنی اسٹوری ''خونی بدروح'' اور لیٹر دیکھا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ماشاءاللہ! ہر طرف سے تمام قارئین گلدستوں کی شکل میں پھول نچھاور کرنے کے لیے ''احوال'' میں داخل ہو رہے ہیں اور اپنی اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے آپ کی محفل میں شرکت تو نہیں کر سکا مگر اپنے پرانے اور نئے

دوستوں کے خطوط اور کہانیاں ضرور پڑھی ہیں۔ کہانیوں میں خوشبو کہاں گئی آپ کی۔ ''آتشِ جنوں'' سلیم فاروقی کی۔ ''انہونے واقعات'' عصمت پروین عظیمی کی۔ ''وہ خوشبو، وہ پائل'' اشفاق عباسی کی بہت زیادہ پسند آئیں۔ اس کے علاوہ سلسلے وار تینوں کہانیاں ''ناگن، آتشِ جنوں، کلکھنی'' اچھی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام دوستوں نے بھی اپنے اپنے انداز میں اچھی خاصی اور بہترین اسٹوریاں لکھی ہیں۔ اچھا اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ ان شاءاللہ! زندگی رہی تو اگلے ماہ میں ضرور ملاقات ہوگی۔

پیارے شاہد! تمہاری محبت دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے اگلے ماہ سے احوال میں غیر حاضری نہیں ہوگی۔

✉ مسز نوید ہاشمی، نارتھ ناظم آباد، کراچی سے رقم طراز ہیں۔ محترم ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم۔ مارچ کی سچی کہانیاں ہاتھ میں آیا۔ پراسرار نمبر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میرے پندرہ سال کے بیٹے بُرہان سے لے کر چھوٹی بیٹی جو آٹھ سال کی ہے۔ بختاور سب کو بہت پسند آیا۔ آج کل کی جنریشن جو کتابیں پڑھنا بھول گئی ہے اول تو کورس کی کتابوں کو وقت نہیں دیتی اوپر سے T.V نے ان کو دور کر دیا ہے۔ ہر بات sms کر کے کہہ دیتے ہیں۔ لکھنا وہ بھی خط، ان کے لیے مشکل ہے۔ آج sms کر کے کہانیوں پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ میرے اپنے بچے کہہ رہے تھے ماما آپ بھی sms کر دیا کریں۔ میں نے کہا، جو مزا قلم اٹھانے اور انتظار کرنے میں ہے کہ پتا نہیں خط یا کہانی پہنچی یا نہیں، وہ sms میں نہیں۔ ہاں نیو جنریشن کے لیے احوال میں شرکت کو آپ نے آسان بنا دیا ہے۔ مارچ میں اپنی باتوں میں کاشی صاحب نے سچ کا آئینہ دکھایا ہے۔ منزہ سہام نے مارچ احترام میں عورت کا ایک مقام بتایا۔ اگر فتح کرنا چاہتے ہیں عورت کو تو محبت سے فتح کر کے دیکھو، جیت آپ کی ہی ہوگی۔ مارچ کا پراسرار نمبر پڑھ کر سچی بہت اچھا لگا۔ ہر کہانی ہی نگینہ کی طرح فٹ تھی، مگر کچھ بہت زیادہ دل جیت گئی۔ خوشبو کہاں گئی کاشی چوہان، ''ہم زاد'' خلیل احمد، ''محافظ'' بشریٰ سعید، ''شرارتی جنات'' عمران مظہر، ''اپسرا یا ناگن'' محمد سلیم اختر بہت ہی شاندار تھیں۔ ایک بات کا آج میں اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ سچی کہانیاں میں ضرور پڑھتی تھی، مگر کبھی احوال نہیں پڑھا تھا۔ جب کاشی چوہان نے کہا کہ آپ نے احوال میں کبھی شرکت نہیں کی تو میں نے پھر پڑھا تھا۔ اکثر میں سوچتی تھی کہ ایڈیٹر صاحب اتنے صفحے تو یوں ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ ان صفحات پر بھی ایک اور کہانی آ سکتی تھی۔ Sorry کاشی چوہان صاحب اور آج میں خود احوال کا حصہ بن رہی ہوں۔ دوسرے میں سمجھتی تھی کہ سچی کہانیاں میں زیادہ تعداد صرف خواتین کی ہوگی۔ احوال میں شرکت کر کے مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے اس ڈائجسٹ کو مرد اور عورتیں سب ہی پسند کرتے ہیں، شکریہ۔ کاشی چوہان صاحب واقعی یہ ڈائجسٹ نمبر ون پر ہے۔ خط لمبا ہو گیا ہے، Sorry۔ یہ قلم کو ڈانٹیے کیوں کہ اس قلم کی ساری غلطی ہے جو احوال میں آنے کے بعد واپس جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ چلنا شروع ہوتا ہے تو رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آج اس قلم کو خوب ڈانٹیے کہ To The Point بات کرے اور ہاں اپریل کا ڈائجسٹ میرے ہاتھ آیا تو میں سب سے پہلے احوال ہی پڑھنے بیٹھ گئی۔ ہنس لیں ہنس لیں کہ ابھی یہ ایڈیٹر کا سوچ رہی تھیں کہ احوال کی جگہ ایک کہانی آ سکتی ہے۔ آج سب سے پہلے احوال ہی پڑھنے

بیٹھ گئی۔ غلط کر کے ہی ٹھیک کام ہوتا ہے۔ ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھیے۔

☆ پیاری بہن! آپ کی احوال میں شرکت ہمارے لیے سب سے اچھی بات ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ احوال تو محبتوں کے وہ پھول ہیں جو آپ کی جانب سے ہمیں زندگی کی نوید دیتے ہیں۔

✉ عمران قافی، کامل پور موسیٰ، لیہ (اٹک) سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر "سچی کہانیاں و دوشیزہ" السلام علیکم۔ خداوند کریم کے حضور دعا گو ہوں کہ آپ ہمیشہ مع الخیر ہوں اور خوش و خرم رہیں تاکہ آسمان اردو ادب کا درخشندہ تارا "سچی کہانیاں" ہمیشہ جگمگاتا رہے اور واقعی اس جریدے کی مثال دینا ہمارے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ خداوند کریم اس کے معیار کو مزید بلند فرمائے۔

☆ پیارے عمران! تبصرہ کہاں ہے؟ دیکھو اس بات پر ہماری لڑائی ہونے والی ہے۔ کیا تم ہم سے لڑنا چاہو گے؟ نہیں نا۔ تو پھر جلدی سے قلم اٹھاؤ اور اگلے ماہ کے لیے پیارا سا تبصرہ لکھ بھیجو۔

✉ یہ احوال میں پہلی بار شرکت ہے ہمارے بہت قابل احترام دوست لکھاری ریاض حسین شاہد کی قبولہ شریف، پاکپتن سے، لکھتے ہیں۔ برادرم کاشی چوہان صاحب، السلام علیکم۔ خیریت باشد! تعمیل حکم سچی کہانیاں کے روحانی نمبر کے لیے اپنی ایک کاوش ارسال ہے۔ جب تک حرف آخر کو پڑھ نا لیں تب تک مسودے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کر لینا۔ انتہائی ذہنی دباؤ کا شکار ہوں۔ ذہنی یکسوئی نا تھی، لیکن عاشق حسین ساجد مظفر گڑھ کا اصرار تھا کہ ہر حالت میں لکھوں۔ کوشش کی ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ کچھ ملے جو پہلے بہت کم لوگ جانتے ہوں کہ حق آشنائی کیا ہے۔ کرداروں میں ڈھال کر مقصد کی بات کی ہے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ مسودہ قابل موزوں نہیں ٹھہرایا جا سکتا، مگر معنوی لحاظ سے اور قارئین کے اندر ایک نئی روشنی جگمگانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور بھلا کیا کاوش ہوگی۔ جوابی لفافہ ہمراہ ہے۔ اولین فرصت میں پڑھ کر رائے دیجیے گا تاکہ انتظار کی صلیب پر نہ لٹکتا رہوں۔

☆ بھیا جی! آپ کی آمد ہمارے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ اب وعدہ کریں کے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔



✉ جاوید علی۔ چیچل آباد سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں، محترم کاشی بھیا دنیا کی ساری سچی، پکی اور اچھی دعائیں آپ کے نام۔ ماہنامہ سچی کہانیاں میں یہ میرا دوسرا تبصرہ ہے۔ میں چند ماہ سے سچی کہانیاں پڑھ رہا ہوں۔ اس میں تمام کہانیاں میری پسند کی ہیں۔ ویسے تو میں کئی سالوں سے سچی کہانیاں کا نام سنتا آرہا تھا اور کبھی کبھی مور شاہد حسین بھیا سے پرچہ لے کر مطالعہ بھی کرتا تھا، مگر جب سے آپ نے سچی کہانیاں کو سنبھالا ہے، تب سے میں باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں اور اب اس میں شائع ہونے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ اپریل کے شمارے میں آپ نے جگہ دی، بلکہ اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ بہت شکریہ۔ ویسے بھیا یہ شکریہ لفظ چھوٹا ہے نا؟ اب بھی ایک چھوٹے سے خط کے ساتھ حاضر ہوں، اُمید ہے پچھلے ماہ کی طرح جگہ دے کر ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے کا موقع ضرور دیں گے۔ تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں مگر مجھے نور محمد بھٹوکی "آخری خواہش"، شاہد محمود مغل کی "بے رنگ حیات"، صائمہ نفیس کی "کملی" اور مور شاہد حسین بھیا کی

''ذرا سی بھول'' بے حد پسند آئیں۔ اب اجازت اس خوب صورت بات کے ساتھ کہ کسی کی دل آزاری کرنے سے پہلے اپنے دل پر ہاتھ ضرور رکھو اور کسی کے احساسات اور جذبات کو مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کرو۔

☆ پیارے جاوید علی! آپ کی خوب صورت بات ہم نے سب تک پہنچا دی۔ خدا کرے سب اسے سمجھ جائیں، (آمین) اب آپ کا اگلے ماہ ہمیں انتظار رہے گا۔

✉ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور سے انجم فاروق ساحلی احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ محترمہ باجی منزہ سہام صاحبہ، آداب! اُمید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر وعافیت ہوں گے۔ مارچ کے سچی کہانیاں میں کہانی ''قصہ ایک روح کا'' شائع کرنے کا شکریہ۔ حسب معمول کہانی کو اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے پرچے کا انتظار تھا لیکن پرچہ آیا تو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ آپ کے ادارے کے متعلقہ آدمی نے سچی کہانیاں کی جگہ لفافے میں دوشیزہ بھیج دیا ہے جس نے پریشانی سے دوچار کر دیا۔ جن بک اسٹال والوں سے اچھے تعلقات ہیں وہاں سچی کہانیاں جلد ہی فروخت ہو گیا ہے ورنہ وہاں سے تبدیل ہو سکتا تھا۔ گزشتہ دو ماہ امراضِ معدہ کی وجہ سے کافی علالت میں گزرے۔ اس وقت بھی علاج جاری ہے۔ والد اور والدہ کے گزرنے کے بعد بھی حالات بگڑتے رہے۔ کہانی کو اچھے انداز میں شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔

☆ بھائی انجم فاروق! خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آپ کی آمد اچھی لگی، مگر تبصرہ ہنوز غائب۔ یہ احوال کی محفل بھی تو آپ ہی کی ہے۔



✉ فیض رسول، بہاول پور سے شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ جناب مدیر سچی کہانیاں کاشی چوہان کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ مجھے رب کے فضل وکرم سے پوری اُمید ہے کہ آپ اور پورا اسٹاف بخیریت ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ جب سے آپ ماہنامہ سچی کہانیاں کے مدیر کے عہدے پر فائز ہیں۔ آج تک ناغہ نہیں ہوا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ اس بار سچی کہانیاں میرے لیے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لایا۔ دل خوشی سے باغ باغ ہوا۔ آپ نے میری پہلی کوشش کا مان جو رکھا۔ بے حد شکریہ۔ آپ نے آتے ہی سچی کہانیاں کو چار چاند لگا دیے۔ خوش گوار تبدیلیاں بے حد پسند آئیں۔ احوال کی کیا بات ہے۔ محبتوں سے سجی محفل بہت اچھی ہے۔ سب اپنے اپنے انداز سے، اپنے رنگ سے شاملِ اشاعت تحاریر پر رائے دیتے ہیں اور ساتھ میں دوستانہ ماحول تو بے حد پسند آیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہیں، کس کس کی تعریف کریں۔ بس رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ یونہی ہمیشہ آپ کی صدارت میں سچی کہانیاں پھلتا پھولتا رہے۔ گرین ٹاؤن کے علاقے میں سچی کہانیاں بہت لیٹ آتا ہے، یہ ہماری شکایت متعلقہ شعبے تک پہنچنے کے باوجود بھی پرچہ 3 اپریل کو ملا۔ اب آپ ہی بتائیے بھائی تبصرہ کیسے کریں؟

☆ آپ کا گلہ ہم نے متعلقہ شعبے تک پہنچا دیا ہے۔ خدا ہمارے محکمہ ڈاک کو ٹھیک کر دے تو پاکستان کے 75 فیصد مسائل آپ ہی آپ ختم ہو جائیں۔ سلامت رہے۔



✉ امجد علی۔ چیزل آباد سے، لکھتے ہیں۔ مدیرِ اعلیٰ اور مدیر سچی کہانیاں۔ اُمید ہے آپ، قارئین، مصنفین حضرات اور ادارہ بخیریت ہوں گے۔ تازہ اور دلکش شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ 29 مارچ کو بک اسٹال پر میگزینز کا شور وزور تھا۔ ان سب میں سچی کہانیاں سب سے الگ اور ممتاز نظر آیا۔ ہم نے ایک دم سچی کہانیاں طلب کیا اور وقت ضائع کیے بغیر احوال کی جانب چھلانگ لگائی۔ احوال میں خود کو پا کر دل کے باغ میں بہار آ گئی۔ میں ہمیشہ آپ کا ممنون اور مشکور رہوں۔ اپریل کا شمارہ اپنے اندر جان رکھتی ہے وجہ آپ کی انتھک محنت اور خوب صورت مواد کی کہانیاں ہیں جو شمارے میں شامل ہیں۔ رسالے کی بہتری کے لیے آپ خود محنت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں آپ کی صدارت میں روز بروز مقبولیت کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا کامیابی کے ریکارڈ قائم کر رہا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مور شاہد حسین کی تحریر ”ذرا سی بھول“ پڑھی جو اپنے اندر ایک جان رکھتی ہے۔ ویلڈن بھیا۔ محمد عمیر شہزاد کی ”کفارہ“، قمر تابندہ کی ”کس پہ اعتبار کریں“، صائمہ کی ”کملی“، ارشد اجمیری کی ”سچی توبہ“ سبق آموز تحریریں تھیں۔ مستقبل کی ”دشمن زندہ ہے“، نور محمد بھٹو کی ”آخری خواہش“، محمد عزیز مئے کی ”سلگتے ارماں“ اور محمد شہزاد کنول کی ”دل اِک شہر خموشاں“ پسند آئیں۔ اب اجازت، ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر آپ کے ساتھ ہوں گے۔ بشرطِ زندگی۔

☆ پیارے امجد! ہماری کامیابی آپ کی محبت سے مشروط ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔



✉ یہ ہیں ہمارے ساتھ ظفر علی ابڑو۔ ملیر کراچی سے، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھائی بہت سی دعائیں، نیک تمنائیں آپ کے نام۔ 30 مارچ کو اپریل کا سچی کہانیاں چمکتا دمکتا موصول ہوا۔ آپ کی کارکردگی قابلِ ستائش ہے۔ تازہ شمارہ ملتے ہی احوال میں اپنا نام تلاش کیا۔ صفحہ نمبر 15 پر اپنے لکھے خط کے ساتھ تصویر دیکھ کر دل خوشی سے سرشار ہوا۔ بھیا آپ نے بہت خوب صورت جواب دیا۔ اس کا بھی شکریہ۔ مور شاہد حسین کو فون کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا تو وہ صاحب دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔ ”ظفر بھیا، اس بار بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ خط لکھنا سمجھے؟“ میں نے ”ہوں“ میں جواب دیا۔ پرچے کی ابتداء منزہ سہام کے اداریے ”ٹھہر پیا سا ہے“ سے کی، لاجواب تحریر تھی۔ ”کچھ اپنی باتیں“ بھیا ہم بھی ڈاکوؤں سے 3 بار لٹ چکے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں کو سمجھ دے۔ کہانیوں کی شروعات مور شاہد حسین کی کہانی ”ذرا سی بھول“، سلمیٰ غزل کی ”سزا کی جزا“، بشیر احمد بھٹی کی ”پکھی واس“ سے لے کر سرور شاذ کی ”ٹھٹل“ جتنی بھی کہانیاں پڑھیں، بے حد پسند آئیں۔ سب نے اپنے اپنے قلم کا حق ادا کیا، مبارک باد ہو۔ دیکھو بھیا آپ کے حکم کے مطابق ہم اس بار بھی احوال میں شامل ہیں، اب تو آپ خوش ہیں نا؟

☆ بھائی ظفر! تم نے تبصرہ بھیج کر ہمارا مان بڑھایا۔ خدا خوش رکھے۔ سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ اس کی ترقی آپ کی ترقی ہے۔



✉ ہمارے نئے قاری دوست شفقت حسین۔ حب چوکی سے رقم طراز ہیں۔ پیارے بھائی کاشی چوہان خدا آپ کو سدا سکھی رکھے ''آمین''۔ ماہنامہ سچی کہانیاں 29 مارچ کو ملا۔ شاندار ٹائٹل کے ساتھ شمارہ بھی نہایت ہی شاندار تھا۔ احوال میں نئے لوگوں کی آمد آمد تھی۔ سب کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ احوال میں سب کی آپس میں نوک جھوک بڑی اچھی لگی۔ تمام تر خطوط اتنے دلچسپ تھے کہ بیٹھے بیٹھے سارا احوال پڑھ ڈالا اور ہاں آپ کے جواب دینے کا انداز بھی خوب رہا۔ ڈاکٹر صغیر احمد، منشی محمد عزیز، مور شاہد حسین، سدرہ انور علی، عامر زمان عامر، مبشر حسن، تحسین جونیجو کے بھرپور تبصرے کے ساتھ خط پسند آئے۔ کہانیاں بھی سبھی شاندار تھیں، مگر مجھے ''پنچھی واس، سزا کی جزا، ہم نام، کفارہ، ذرا سی بھول، ناگن، سچی توبہ، بے رنگ حیات، سلگتے ارماں، آخری خواہش'' زیادہ پسند آئیں۔ ''کسی پر اعتبار کریں، میں مطمئن ہوں، ستم، تہی داماں، دل اِک شہر خموشاں، کھٹل'' اچھی تھیں۔ تینوں سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں۔ ''سچی توبہ، دشمن زندہ ہے، کملی، بابا عمر دین، بے جڑ کے پودے، کون بنے گا کروڑ پتی، تجھ سا ڈھونڈوں کہاں'' کے رائٹرز نے خوب محنت کی۔ آپ سمیت تمام اسٹاف کو مبارک باد کہ اتنی محنت کے ساتھ اتنا شاندار معیاری پرچہ نکالتے ہیں۔

☆ شفقت بھائی! آپ کو پرچہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی۔ اگلے ماہ احوال میں آپ کا انتظار رہے گا۔



✉ ہماری بہت پیاری قاری اور لکھاری ساتھی سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے رقم طراز ہیں۔ محترم بھیا کاشی چوہان، ڈیئر، سسٹر، برادرز، انکلز، آنٹیز اینڈ آل اسٹاف۔ السلام علیکم! اسی اُمید کے ساتھ حاضر محفل ہوں کہ تمام پڑھنے والے ان شاء اللہ خیریت سے ہوں گے اور ہونا بھی چاہیے، کیوں کہ جب سچی کہانیاں آتا ہے تو سب ہی میری طرح ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ دوستو! ہمارے شہر میں ہر سال مارچ میں میلہ لگتا ہے۔ میلہ سنگ جھنگ، میں میلہ دیکھنے گئی، میرے ساتھ میری سسٹر، بھائی فرینڈز اور کزنز بھی تھیں۔ بہت بڑا بیڑا ہوتا ہے میلے میں، ہم سب بھی بیڑے میں بیٹھے جب بیڑا چلا تو ابھی بمشکل 2 منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میرا ہاتھ پتا نہیں کیسے چھوٹ گئے اور میں دھڑام سے نیچے زمین پر آ گری۔ بیڑے کی اونچائی عموماً 50 فٹ ہوتی ہے لیکن چلتے ہوئے اور بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ بس مجھے پتا نہیں چلا تھا اور میں 55 فٹ کی بلندی سے نیچے آن گری۔ نیچے جہاں میں گری وہاں اینٹیں اور پتھر تھے۔ میرے سر پر بہت شدید چوٹ آئی، خون تو اس قدر بہا کہ میرے سارے کپڑے اور چہرہ خون سے لال ہو گیا۔ ہمارے ملک کی تیز رفتار سروس ریسکیو 1122 کو فوری طور پر بلوایا گیا۔ اتنی دیر میں ماں باپ نہیں پہنچتے جتنی دیر میں یہ پہنچ جاتے ہیں۔ 27 گھنٹے کومے کی حالت میں رہنے کے بعد اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ سب کو یہی پتا تھا کہ میں اب نہیں بچوں گی۔ میری امی جان کی حالت تو بہت بُری تھی، لیکن شکر ہے اُس ربِ رحیم کا جس نے میری ماں اور میرے باقی چاہنے والوں کی دعاؤں سے مجھے نئی زندگی دی، میں بزدل نہیں ہوں۔ بڑے بڑے طوفانوں سے نہیں ڈرتی لیکن مجھے کالی گھور قبر سے

بہت ڈر لگتا ہے۔ مٹی ہی مٹی، اندھیرا ہی اندھیرا، کیڑے مکوڑوں کا گھر۔ میں اکثر اپنے گھر والوں سے کہتی ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو میری نعش کسی دریا میں بہا دینا، لیکن مجھے مٹی میں مت دبانا۔ خیر اب میں ڈسچارج ہو کر 5 دن پہلے گھر آئی ہوں۔ اپنے سچی کہانیاں، کو اپنے پیارے پیارے احوالی بہن بھائیوں کو دیکھا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ کئی دن ابھی میں کالج بھی نہیں جا سکوں گی۔ عمیر عادل بھائی بے شک حقیقتیں بہت زہریلی ہوتی ہیں، لیکن میں انہیں نگل جاتی ہوں، آپ کا بہت شکریہ۔ انیل حسین، جاوید، ظفر علی، کیفی رسول، امجد علی، غلام مرتضیٰ اور عمران علی کو خوش آمدید مرحبا۔ بھیا صفدر علی اتنا سوچنا اچھا نہیں ہوتا۔ ارے ارے یہ ہماری آپی زرینہ تشریف فرما ہیں۔ یہ مقدر سے آتی ہیں۔ ارے سب کہہ دیجیے ناں، خوش آمدید، آپی جان آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ آپ کو صحت بھری لمبی عمر دے۔ میں ٹھیک ہوں اب۔ ارے تحسین جی اب سوچنا کیسا آپ بھیج دیں، پکچر اپنی۔ میری مصروفیات فی الحال ترک ہیں بالکل۔ عمیر نے جو بھی کہا آپ کے بارے میں غلط کہا ہے۔ مور شاہد حسین بھیا بہت شکریہ کیا حال ہے؟ ممتاز بھیا آپ پھر غائب، مجھے دیکھیے میرے ہاتھ درد سے کانپ رہے ہیں پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ رانا شاہد بھیا، عامر بھیا، عزیز بھیا، عماد انصاری کے خطوط پسند آئے۔ مبشر حسن موسٹ ویلکم۔ منزہ آنٹی کا اداریہ ''تھر پیاسا ہے'' نے رُلا دیا۔ بشیر احمد بھٹی کی ''پنچھی واس''، سلمیٰ غزل کی ''سزا کی جزا'' اشفاق بٹ کی ''ہم نام'' عمیر شہزاد کی ''کفارہ'' اور مور شاہد حسین بھیا کی ''ذرا سی بھول'' سبق آموز تحریریں ہیں۔ ''کس پہ اعتبار کریں'' قمر تابندہ کی، ''بے رنگ حیات'' شاہد مغل کی، ''سلگتے ارماں'' منشی محمد عزیز بھیا کی، نور محمد کی ''آخری خواہش، اب میں مطمئن ہوں'' بلال فیاض کی تحریریں بہت اچھی اور لاجواب تھیں۔ شہزاد کنول کی ''دل اِک شہر خموشاں'' بے شک محبت دُکھوں کی سرزمین اور آنسوؤں کا سمندر ہے۔ ممتاز احمد بھیا کی ''بابا عمر دین'' سرفراز ناز کی ''کون بنے گا کروڑ پتی'' اور مجید احمد بھیا کی ''تجھ سا کہاں ڈھونڈوں'' پسند آئیں۔ کنول ثنا اللہ دتہ کی ''تہی داماں'' اور سرور شاذ کی کھٹل بہت پسند آئیں۔ آخری حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ رخسانہ آنٹی، منزہ آنٹی، انکل اقبال زمان کو سلام۔ جانے انجانے میں کسی کا دل دُکھایا ہو تو بہت معذرت۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ زندگی نے کی وفا تو پھر ہو گی ملاقات۔ سب لوگ اپنا خیال رکھیے گا، تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ! صرف ہم اتنا کہیں گے کہ خدا آپ پر اپنا رحم و کرم کرے۔ سارے دوستوں سے آپ کی صحت سلامتی کی دعا کی اپیل ہے۔

☒ یہ احوال میں آمد ہے ہماری بہت پیاری لکھاری دوست لاہور سے۔ عطیہ زاہرہ کی، لکھتی ہیں۔ بہت ہی پیارے بھائی کاشی چوہان! آداب عرض ہے۔ کیسے ہیں آپ؟ اُمید کرتی ہوں، کہ آپ اور منزہ صاحبہ کے ساتھ ساتھ باقی ''سچی کہانیاں'' کا اسٹاف بھی خیریت سے ہوگا۔ اب سب سے پہلے تو میں آپ سے اور باقی سب ساتھیوں سے اپنی اِک خوشی Share کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایم۔ ایڈ میں فرسٹ گریڈ سے پاس ہو گئی ہوں۔ (اللہ کا لاکھ شکر ہے) بھائی 29 مارچ کو اپنی جاب سے واپس آتے ہوئے ''سچی کہانیاں'' کا شمارہ لے آئے تو میں خوش ہو گئی۔ سرورق خوب صورت ہے اور اس کی خوب صورتی کے بعد کہانیوں پر بات کروں تو

سب سے پہلے میں نے احوال میں شرکت کی۔ سب ساتھیوں کا تبصرہ پڑھا اور اپنی پیاری "فریدہ جاوید فری" کی بیماری کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ ان کو صحت دے (آمین) اس کے بعد پہلی کہانی صائمہ نفیس کی پڑھی۔ موضوع پرانا تھا، لیکن بہت ہی خوب صورتی سے لکھا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ دوسرے نمبر پر رئیسہ خالد کی کہانی پڑھی۔ مجھے اس کہانی میں بہت جھول نظر آیا۔ آخر پر بہت کچھ اُلجھا دیا۔ (ان کی بیگم جو چار سال بعد مر گئی، بمعہ بچے کے ساتھ یہ دو بچے کہاں تھے......؟ کہانی میں وضاحت نہیں......سوری) پھر شاہد مغل کی کہانی وہی عورت اور اس پر ہونے والے مظالم کی وضاحت تھی۔ قمر تابندہ کی کہانی پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ نعمان کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی۔ پھر کفارہ پڑھی، اچھی لکھی گئی اور آج کے ماحول کے مطابق تھی۔ سبق آموز تھی۔ بشیر احمد بھٹی کی کہانی بھی بہت اچھے سبق کے ساتھ سامنے آئی۔ پھر ممتاز احمد کی کہانی پڑھی، مجموعی طور پر کہانی دوستی، احسان مندی کی اعلیٰ مثال تھی اور جناب باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہے۔ منزہ صاحبہ اور آپ کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ باقی اب انتظار ہے، اپنی کہانی کا......!

☆ اچھی بہن عطیہ زاہرہ سلامت رہو! تبصرہ اچھا کیا، مگر تھوڑا ہاتھ ہولا رکھو...... اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉ کنول عمران خان۔ کراچی سے احوال میں شامل ہیں، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! کاشی بھائی، کیسے ہیں۔ اپریل کا شمارہ ملا، بہت اچھا لگا۔ سچی کہانیاں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے آپ کا اور تمام رائٹرز کا ہاتھ ہے جو کہ اسے خوب سے خوب تر بنانے میں جتے رہتے ہیں۔ کاشی بھائی آپ تو بالکل دوستوں کی طرح احوال میں تمام لکھاریوں کے خطوط کے جوابات دیتے ہیں اور آپ کی یہی خوبی آپ کو ہر دل عزیز بناتی ہے۔ آپ نے جو میرے لیے یہ لکھا کہ ہمیشہ کی طرح تاخیر سے آئی ہیں کنول عمران! آپ نے تو مجھے تاخیر والی کا خطاب ہی دے دیا۔ ہا ہا......ہاہا...... ہا...... چلیں کوئی بات نہیں۔ اب کوشش کروں گی کہ ٹائم سے احوال بھجوا دوں اور آپ کی مہربانی کہ تاخیر ہونے پر بھی میرا خط شائع کر کے عزت افزائی کی۔ اس مرتبہ کی کہانیوں میں "ذرا سی بھول، کس پہ اعتبار کریں، سچی توبہ، آخری خواہش" اچھی تحریریں تھیں۔ "پنچھی واس" بھی بہترین تحریر تھی۔ اس کے علاوہ "تجھ سا ڈھونڈوں کہاں، تہی داماں" بھی زبردست ہیں۔ "کھٹل" بھی بہترین تحریر ہے جو کہ پہلا حصہ ہے، مگر اگلے ہی شمارے میں آخری قسط آ جائے گی۔ اس کے علاوہ تمام باقی کی سچ بیانیاں بھی قابلِ تعریف ہیں۔ یہ دیکھ کر دل خوش ہوا کہ ہر شہر اور ہر علاقے سے تحریر موصول ہوئی اور ناگن تو اس بار بہت ہی خوں ریزی دکھا رہی ہے۔ چلیں یہ بھی ٹھیک ہے۔ "ناگن" جو ٹھہری۔ ویسے اس بار عمیر عادل زادہ کے احوال کو پڑھ کر مزا آ گیا۔ کیا خوب تجزیہ کیا ہے انہوں نے سب کا۔ زندگی رہی تو اگلے احوال میں ضرور شرکت کروں گی۔

☆ ارے...... کنول جی!! اتنی جلدی...... مگر دیکھ لیجیے، معجزہ ہو ہی گیا۔ آپ نے واقعی بہت محبت سے تبصرہ کیا۔ آپ کی سچی کہانیاں سے محبت آپ کے تبصرے کی صورت ہمارے سامنے موجود ہے۔ سلامت رہیے۔

✉ یہ آمد ہے احوال میں چھا جانے والی عظمیٰ شکور کی سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! آداب۔ انتظار کی طویل گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں اور سچی کہانیاں ہاتھوں میں دمکنے

لگا۔ خوب سے خوب تر بننے کی کوششیں کرتا یہ رسالہ کامیابیوں کے آخری پائیدان تک پہنچ چکا ہے۔ سرورق ٹھیک تھا، وہ بس لپ اسٹک کا کلر مجھے پسند نہیں آیا۔ چند اشتہارات کے بعد ''منزہ سہام'' کے احساسات تھر والوں کے بارے میں پڑھنے کو ملے۔ تھر کے لوگوں کی بھوک و پیاس پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا گئیں۔ اب آتے ہیں کاشی چوہان صاحب کی باتوں کی طرف، کراچی کے لوگوں کی خدا ترسی، ان کے اخلاق کے بارے میں بہت خوب چرچا کیا ہے۔ کہانیوں میں بشیر احمد بھٹی کی لکھی گئی ''پلھی واس'' اچھی تھی۔ محترمہ سلمٰی غزل صاحبہ کی اسٹوری ''سزا کی جزا'' بھی اپنے الگ رنگ میں تھی۔ ممتاز احمد کی بیان کی گئی سرگزشت جس اطمینان سے شروع ہوئی اُسی اطمینان کے ساتھ اختتام پذیر ہوگئی، میں اسٹوری میں کلائمکس تلاش کرتی رہ گئی۔ بس کہانی پڑھتے چائے کی طلب نے پریشان کیے رکھا۔ ''دشمن زندہ ہے'' محترمہ سنبل صاحبہ کی تحریر متاثر کن کیفیات سے بہت آگے نکلتی نظر آئی۔ محترمہ نے شروع سے آخر تک اسٹوری کو گرفت میں رکھا، زبردست! بہت خوب۔ سرور شاذ کے قلم سے تحریر ہونے والا ''قتل'' پڑھتے پڑھتے جب اس میں غرق ہوگئے تو پتا چلا کہ باقی حصہ مئی میں آئے گا، انتظار کی کوفت سامنے کھڑی نظر آئی۔ بہرحال اسٹوری زبردست ہے۔ محمد تقی صاحب کا تحریر کیا ''سٹم'' اُف بارش میں بھیگا بھیگا پڑھنے کو ملا جس طرح انہوں نے بارش کے ہونے کے منظر کو بیان کیا ہے قابلِ تعریف ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ٹھنڈی بارش ہمیں بھی بھگوئے دے رہی ہے۔ خیر ہم نے سچی کہانیوں کو بھیگنے سے بچایا اور کہانی سے نکل آئے۔ ایم اشفاق بٹ کی کہانی ''ہم نام'' بھی اچھی تحریر تھی۔ تخن آباد میں حبیب الوہاب کہانی ''پوچھو تم'' ٹھیک لگی۔ احوال میں سب خطوط مزے کے تھے۔ مور شاہد بھائی کے خط میں ہمارا ذکر تھا۔ بہت شکریہ، مور بھائی۔ میری ڈھیر ساری دعائیں اور پیار سچی کہانیاں کے لیے۔

☆ عظمٰی جی! لیجیے۔ خط شاملِ احوال ہوا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉ یہ ایک نامعلوم روحانی مسافر کا چورہ شریف سے محبت نامہ ہمیں موصول ہوا ہے جو من و عن آپ کے سامنے احوال میں شامل ہے۔ جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ آپ کی خدمت میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں رسالہ اَٹک شہر سے خریدا۔ میں کبھی اس کا خاموش قاری تھا۔ جب ناصر رضا اور پرویز بلگرامی ہوتے تھے۔ اب نہ وہ وقت رہا نہ وہ بندے۔ سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا خوف ناک وقت بھی ہم دیکھیں گے کہ مسلمان بھائی کا بھائی دشمن ہے۔ معاشرہ عدم برداشت کا شکار ہے۔ نا عزت ہے نا کسی کی قدر۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں اپنے پیر و مرشد کے پاس کچھ عرصہ سے قیام پذیر ہوں۔ کل کا کوئی پتا نہیں کہاں چلا جاؤں۔ پیر فقیری کی بیٹھک ان کی خدمت کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔ راہِ سلوک کا مسافر ہوں، مجھے کسی عظیم اور مقدس ہستی نے روحانی مسافر کے رتبے پر فائز کیا۔ سچی کہانیاں کبھی میرے سرہانے کے نیچے ہوا کرتا تھا۔ اب لکھنے والے سب نئے ہیں۔ سید مستقیم نوشاہی، محفوظ عطاری، عبدالعزیز جی، آ، نسیم اختر اور اس زمانے کی مشہور لکھاری نام لکھنا مناسب نہیں، عورت ذات پردہ دار ہیں۔ سب اچھے لوگ تھے۔ کاشی بھائی بہت جی چاہتا ہے ایک اپنی بھی کہانی شائع ہو، کیا ہو سکتا ہے؟

دعا میں یاد رکھنا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے، اللہ بیلی!

☆ پیارے بھائی! آپ کی آمد سر آنکھوں پر۔ آپ کی عقیدت مندی کی قدر کرتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ اگر گھر کا کوئی فرد کچھ عرصہ گھر سے غائب ہو جائے تو اس کا گھر سے رشتہ نہیں ٹوٹ جاتا۔ آپ کی کہانی کے لیے میں نے ابھی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ سچی کہانیاں آپ کا پرچہ ہے۔ اس میں آپ کو کچھ بھیجنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔

✉ شائستہ جمال۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی سے پہلی بار احوال میں دستک دے رہی ہیں، لکھتی ہیں۔

ناگوار نہ گزرے گر طبیعت پہ آپ کی!
محفل میں بن بلائے ہی یوں آگئے ہیں ہم

قارئین اور خوب صورت تحریریں لکھنے والوں کو میرا خلوص بھرا سلام! عرصہ دراز سے سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہی ہوں، مگر خط لکھنے کی ہمت اس لیے نہیں ہوئی کہ کہیں وہ خاموش ناگن (ردی کی ٹوکری) ہمارا خط نہ ہڑپ کر لے اور ہمارا نازک دل ٹوٹ جائے۔ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چاہے وہ خوب صورت سرورق ہو جس کو دیکھتے ہی دل شاد ہو جاتا ہے یا پھر کہانیوں کے سلسلے، جو کہ ہمارے معاشرے سے جڑی ہوتی ہیں۔ منزہ آنٹی کی تحریر ''تھر پیاسا ہے'' پڑھ کر آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کاشی صاحب کی تحریر ہمیشہ کی طرح ایک نئے انداز میں پیش کی تھی اور ایک سبق بھی کہ ''اچھے لوگوں کی اچھی باتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں''۔ بات ہو احوال کی تو ایسا لگتا ہے جیسے اپنے ہی گھر میں اپنی Family کے ساتھ بیٹھے ہوں۔ خاص کر ملکۂ احوال تحسین جونیجو اور شہزاد کنول کا تبصرہ قابل تعریف ہے۔ زرینہ جونیجو کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ ان کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ (آمین) سلسلے وار کہانیاں بہت ہی لاجواب ہیں۔ خاص کر راشد علی ارشد کی مکھنی، محمد عمیر کی کفارہ، قمر تابندہ کی کس پہ اعتبار کریں، محمد بلال کی اب میں مطمئن ہوں، بہت ہی عمدہ تھیں ہاں سلمٰی غزل کی کہانی ''سزا کی جزا'' عام سی کہانی تھی۔ تین مرد تین کہانیاں کا سلسلہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ زنانہ جیل سے نکلی کہانی ''کملی'' صائمہ نفیس کی منفرد تحریر تھی۔ بات آتی ہے شعلہ ساماں تحریروں کی تو سنبل جی کی ''دشمن زندہ ہے'' بہترین تخلیق تھی اور آخر میں خاص کہانی واقعی بہت خاص لگی۔ دوسرے اور آخری حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ سخن آباد میں تمام شاعروں نے بہترین رنگ دیے۔ میری ایک غزل ہے اگر قابلِ اشاعت ہے تو ضرور شائع کیجیے گا۔ اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین) اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

☆ بہت پیاری بہن شائستہ! کہاں غائب تھیں اب تک۔ اگر ہم سے محبت ہے تو پھر اگلے ماہ پر ہی کیا موقوف! ہمیں ہر ماہ آپ کی آمد، اسی طرح مزیدار سے تبصرے کے ساتھ چاہیے۔



✉ ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست ممتاز احمد، سرگودھا سے احوال میں شامل ہیں، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم۔ اللہ کریم پوری اُمت مسلمہ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین) اپریل کا شمارہ حسب معمول تھوڑی تاخیر سے ملا۔ جاذب نظر اور دلکش ٹائٹل تھا۔ اداریہ ''تھر پیاسا ہے'' میں منزہ سہام نے تھر کی بھوک اور پیاس کی بہت تلخ تصویر پیش کی۔ جی کاشی بھیا آپ کی کچھ

اپنی باتیں واقعی ہماری اپنی باتیں ہیں۔ احوال میں آپ نے عذاب کا ذکر کیا تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حکمران ایک عذاب کی شکل میں پوری قوم پر مسلط ہیں۔ مور شاہد حسین آپ کے لیے بہت ساری پرخلوص دعائیں۔ پیاری چھوٹی بہن سیدرہ انور علی آپ میری بیٹی جیسی تو ہو، دعائیں آپ کا حق ہے۔ عامر زمان عامر کا تبصرہ پسند آیا۔ قمر شہداد کوٹ کے بھائی غلام مرتضیٰ اور حب چوکی کے عمران علی ویلکم۔ بھائی فیصل ندیم بھٹی آپ بہت پیارے اور مخلص انسان ہیں۔ آپ میرے گرائیں (ایک ہی شہر میں رہنے والے) بھی ہو اور جاب کے سلسلے میں ہمارا محکمہ بھی ایک ہی ہے۔ احوال میں بہت اچھا لکھتے ہو۔ عظمیٰ شکور جی یہ کیا......؟ آپ اتنی ڈرپوک ہیں سرورق دیکھ کر ڈر گئیں۔ شاہینوں کے شہر سرگودھا کی باسی ہیں، دل تھوڑا مضبوط کریں۔ اُچ شریف بہاول پور کے بھائی صفدر علی حیدری آپ کا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ آپ کے والد محترم کی مغفرت کے لیے رَب کے حضور دعا گو ہوں۔ زرینہ جونیجو آپ کی پُرخلوص دعاؤں کا بہت شکریہ۔ کھاریاں کے عمیر عادل زادہ کی بھڑک دار انٹری پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ آپ نے لگی لپٹی رکھے بغیر خوب ڈانٹنے کے انداز میں تجاویز دیں۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ ''بے جڑ کے پودے، کملی، پکھی واس، سزا کی جزا'' اچھی کہانیاں تھیں۔ ایم اشفاق بٹ کی ''ہم نام'' ایک عبرت انگیز کہانی تھی۔ نام نہاد سکندر نے ایک شہید کے بیٹے اور پوتے کی تحقیر کر کے ذلت، عذاب اور پچھتاوا کمایا۔ مور شاہد حسین کی ''ذرا سی بھول'' گناہِ کبیرہ کے دردناک انجام کی عکاسی کرتی کہانی تھی۔ ''کفارہ اور سچی توبہ'' بہت عمدہ کہانیاں تھیں۔ ''سزا کی جزا'' میں سلمیٰ غزل نے محاوروں کا استعمال خوب کیا ہے، ویلڈن! اور کہانی کا اختتام چونکا دینے والا تھا۔ ''کس پہ اعتبار کریں'' ایک ظلم و بربریت کی دُکھی کر دینے والی داستان تھی۔ ''سلگتے ارماں، آخری خواہش اور اب میں مطمئن ہوں'' بہت خوب صورت کہانیاں تھیں۔ ''دل اِک شہر خموشاں'' میں شہزاد کنول نے جوہر آباد میں جس یونیورسٹی کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہاں ہے؟؟ کیوں کہ میں اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہوں، مگر وہاں ایسی کسی یونیورسٹی کا وجود بھی نہیں ہے۔ ''کملی'' میں صائمہ نفیس نے دُکھی کر دیا اور ''بابا عمر دین'' کے بارے میں تو میرے پیارے لکھاری اور قاری دوست ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔ سنبل کی کہانی ''دشمن زندہ ہے'' واقعی ایک شعلہ ساماں تحریر تھی جس میں انہوں نے دوست، دشمن کی بالکل صحیح پہچان کرائی ہے۔ یہ تحریر واقعی ایک لمحۂ فکریہ تحریر ہے۔ بہن اُم عادل، بھائی عبدالعزیز، محمد فہیم بھٹی آپ سب لوگ کدھر ہیں۔ پلیز احوال کی رونق کو بڑھائیں۔ اب اجازت چاہوں گا، اس پیغام کے ساتھ کہ اچھے لوگوں کی ہمیشہ قدر کریں، کیوں کہ اچھے لوگ سڑک کے کنارے لگی روشنیوں کی مانند ہوتے ہیں جو فاصلے کو تو کم نہیں کرتیں، البتہ راستے کو چلنے والوں کے لیے آسان اور محفوظ ضرور بنا دیتی ہیں۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی، تب تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ پیارے ممتاز بھائی! خدا آپ کو صحت اور سلامتی کی دولت سے سرفراز کرے۔ بھرپور تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ آپ کا تعاون ہی ہماری کامیابی ہے۔

⊠ احوال میں یہ شرکت ہے ہماری بہت پیاری تحسین جونیجو کی، خیر پور ناتھن شاہ سے۔ لکھتی ہیں۔ محترم کاشی چوہان بھیا اور تمام قارئین کی خدمت میں نہایت عقیدت بھرا اسلامِ محبت۔ ''تھر

پیاسا ہے" منزہ آپی نے غمگین کر دیا، مالک کرم فرمائے (آمین) کئی سالوں سے یہی سنتی آئی ہوں، "فلاں ماہ میرا موبائل چھین گیا تھا۔ سارے نمبر اسی میں تھے، آپ کون؟" غصے کے ساتھ ہنسی بھی آتی مجھے جب "کون" کا جواب نازل ہوتا کہ کیا مصیبت ہے۔ اول تو میں میسج کرتی نہیں، مگر جب ضروری کام آجائے تو "کون؟" جواب پا کر موڈ بگڑ جاتا، لیکن اب حقیقت جان کر (کچھ اپنی باتیں) آنکھیں نم کر دیں۔ ڈاکوؤں کی روداد جان کر کہ کیسے لوگ بستے ہیں اپنے وطن میں۔ دل کی آنکھ سے پوری فلم دیکھ کر اور کام کی زیادتی کی وجہ سمجھتے ہوئے اب اپنے پیارے بھیا کاشی سے شکایت دور ہوئی۔ اللہ سائیں آپ کو سلامت رکھے خوش رہیے۔ (آمین) محفل احوال میں جہاں نظر دوڑائی بس مرد حضرات ہی کثرت سے جلوہ گر رہے۔ بھئی کچھ خواتین اور بچیوں کے لیے بھی سیٹیں چھوڑ دیا کریں...... دھماکے دھار انٹری مارتے ہوئے عمیر عادل صاحب، شکوہ اپنوں سے ہی ہوتا ہے، تو سچی کہانیاں پہلی درس گاہ جس سے محبت ابھی تک برقرار ہے۔ خیال رہے یہاں اول شرط احترام و خلوص ہے، بھلے تعریف نہ سہی مگر تنقید سے اجتناب برتیں۔ ہاں تنقید برائے اصلاح اولین شرائط میں شامل ہے۔ وہ تو کاشی بھائی نے حساب برابر کر دیا، نہیں تو ہم کہاں رعایت بخشنے والے تھے۔ ہر انسان کو ظرف اعلیٰ کے گر سیکھ لینے چاہیے عمیر صاحب...... نہ کہ صرف اپنی سنا کے یہ جا وہ جا۔ ادا مور شاہد حسین ابھی تک حیرت میں مبتلا ہوں کہ میری سالگرہ یاد کیسے رہی؟ وڈی وڈی مہربانی، خوش رہیے۔ ملکۂ احوال کا لقب عنایت کرنے والی سوئٹ سدرہ انور ؟؟؟ آپ بھی خاموشی کی زبان سے واقف ہیں، بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں "ذرا سی بھول" مور شاہد حسین۔ "سلگتے ارماں" محمد عزیز مئے۔ "آخری خواہش" نور محمد بھٹو۔ "میں مطمئن ہوں" محمد بلال فیاض۔ "دل اِک شہر خموشاں" محمد شہزاد کنول۔ "دشمن زندہ ہے" سنبل اور "کملی" صائمہ نفیس۔ یہ تمام بہترین شاہکار تحریریں ٹھہریں۔ خاص کہانی "کھٹل" بھی شمارے کی جان رہی، ویلڈن سرور شاذ بھیا بہت عرصہ بعد آپ کی تحریر نظر سے گزری...... ارشد علی علی بھیا کی "دلھنی" پر گرفت کافی مضبوط ہے۔ "سخن آباد" میں نعت نبی ﷺ، سبحان اللہ۔ تیری خاطر، فریب، غزل رضوانہ کوثر آپی کی ان تمام نے بہترین لکھا۔ بھائی ذرا آپی کے کلام پر بھی نظر ثانی کیجیے گا۔ اجازت، اللہ حافظ۔

☆ پیاری تحسین! سلامت رہو۔ ہمارے لیے تم اور سب ایک گھر کے فرد کی طرح ہو۔ بس کبھی کبھی کسی کے لاڈ زیادہ اٹھا لینے سے کسی کی بھی حیثیت یا مرتبے میں کمی نہیں ہو جاتی۔ آپ کا بھائی کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا۔ سچی کہانیاں ہمارا اور آپ کا اپنا گھر ہے۔



✉ **فیصل ندیم بھٹی، چک نمبر 58، شمالی سرگودھا** سے ہمیں یاد کر رہے ہیں۔ اپریل 2014 کا شمارہ 31 مارچ کو ہی مل گیا تھا۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ "گھر پیاسا ہے" پڑھ کر دل بہت رنجیدہ ہوا۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر دو نوجوان طالب علموں کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مور شاہد حسین جی اپنا ایڈریس بتا دیں۔ کیک آپ تک پہنچ جائے گا جناب۔ ظفر اللہ جمالی صاحب آپ کیسے ہیں۔ سالگرہ کی مبارک دینے کا شکریہ۔ سدرہ انور علی صاحبہ سالگرہ کی مبارک کے ساتھ دعا دینے کا تہ دل سے ممنون ہوں، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ یونیورسٹی کے

www.paksociety.com

امتحان کی وجہ سے کہانیاں نہ پڑھ سکا، لہٰذا تبصرہ اگلی دفعہ سہی۔ کاشی بھیا یہ پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی کہ میری کہانی بھی جلد سچی کہانیاں میں شامل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملک پاکستان میں امن کی آشا قائم ہو (آمین)۔ ان ہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

☆ فیصل! تمہاری محبت کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

✉ احوال میں ایم اشفاق بٹ۔ لالہ موسیٰ سے رقم طراز ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان بھائی۔ محبتوں بھرا اسلام قبول کریں۔ کاشی بھائی 27 مارچ کو میری سسٹر کی بیٹی ریلوے ٹرین عوام ایکسپریس کے ساتھ حادثے کا شکار ہوگئی اور ہم اس کو شدید زخمی حالت میں عزیز بھٹی شہید اسپتال لے گئے۔ اس وقت ہم پر قیامت کی گھڑی تھی جب انہوں نے کہا کہ اس کو جنرل اسپتال لاہور لے جائیں۔ سر میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے بچی کا خون بہہ کر ہمارے جگر چھلنی کر رہا تھا۔ آخر ہم ایمبولینس میں بچی کو لے کر لاہور چل پڑے۔ بچی کائنات کی ایک سانس آ رہی تھی اور ایک جا رہی تھی اور ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ لاہور تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے لاہور کوسوں دور چلا گیا ہو۔ آخر خدا خدا کر کے لاہور کا جنرل اسپتال آیا جلدی سے انہوں نے بچی کو ایڈمٹ کر لیا، کیوں کہ بچی کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ساری رات ہم اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ کبھی ڈاکٹر کے پاس جاتے تھے تو کبھی نرس، تو کبھی میڈیسن لینے۔ اسی طرح پریشانی میں رات جاگتے کٹ گئی۔ اگلا دن، اگلی رات اور پھر اگلا دن جاگتے گزر گئے، نیند آنی ہی نہیں تھی۔ پھر انہوں نے ہمیں آئی سی یو وارڈ میں بھیج دیا کہ آپ اپنے پیشنٹ کو اُدھر لے جائیں، پھر ہم بچی کو اُدھر لے گئے اور ابھی 28 مارچ سے بچی آئی سی یو وارڈ، ایمرجنسی میں ہے۔ سب بہن بھائیوں اور سچی کہانیاں پڑھنے والے میری بھانجی کائنات کے لیے دل سے دعا کریں، کیا پتا اللہ کے کسی محبوب بندے کی دعا قبول ہو جائے...... کاشی بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو اور سچی کہانیاں کے سب اسٹاف کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، (آمین) پرچے پر تبصرہ نہیں کیا، اس کی معذرت بہت بہت۔

☆ پیارے اشفاق! درد کی اِن گھڑیوں میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا جلدی سے کائنات کو شفائے کلی عطا فرمائے (آمین)۔ دوستو! کائنات کی صحت یابی کے لیے آپ سے بھی دعا کی اپیل ہے۔



✉ شاہد فراز۔ حیدر آباد سے ایک لمبے عرصے کے بعد احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھائی السلام علیکم! آپ کے مدیر بننے کے بعد یہ میرا پہلا خط ہے۔ دیر سے ہی سہی مبارک قبول کیجیے۔ جب سے آپ نے چارج سنبھال ہے کافی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں جو کہ اچھی بات ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف بشیر احمد بھٹی کی ''پنچھی واس'' اچھی تحریر تھی۔ ''ذرا سی بھول'' مور شاہد سبق آموز کہانی لے کر آئے۔ ''کون بنے گا کروڑ پتی'' محمد سرفراز نازکی بہترین کہانی تھی۔ ''دشمن زندہ ہے'' سنبل لے کر آئیں جو کہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ ''دستم'' محمد تقی کی کہانی بہترین لفظوں کی شاہکار تھی۔ ''بخن آباد'' میں عمران فائق، رضوانہ کوثر، آصف ریاض، ظفر اللہ رند، وفا صدام حسین، ڈاکٹر صغیر احمد عاجز نے متاثر کیا۔ کچھ کام کی مصروفیات اور واپڈا کی مہربانی سے ابھی اتنا ہی پڑھ پایا

ہوں۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور پرانوں کو سلام۔ مور شاہد آپ نے یاد کیا اور ہم آگئے۔ کاشی بھائی فروری کے مہینے میں میری نظم شائع ہوئی تھی جس میں میرے نام کے ساتھ سے بھکر لکھ دیا گیا تھا، کیوں؟ جبکہ میں ہمیشہ پہلے حب چوکی اور اب کافی عرصے سے حیدرآباد سے آپ کی محفل میں آتا ہوں اور سچی کہانیاں کے لیے بس اتنا ہی کہوں گا۔

ہر چیز ایک حد تک اچھی لگتی ہے
اور تم ہو کہ بے حد اچھے لگتے ہو

☆ پیارے شاہد! Wellcome Back۔ اتنے اتنے عرصے غیر حاضر رہو گے تو ابوظہبی اور کینیڈا بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اس بہانے تم آئے تو سہی۔ اب غیر حاضر ہوئے تو......... پتا ہے نا۔



✉ طارق جاوید بہاول نگر سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان بھیا السلام علیکم۔ خدا آپ کو سدا سلامت رکھے۔ (آمین) احوال میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری پذیرائی کریں گے۔ بھیا آپ کے رسالے سچی کہانیاں کا تعارف اپنے پیارے دوست مور شاہد حسین کے ذریعے ہوا جو کہ باقاعدگی سے احوال میں شرکت کرتے ہیں اور ماشاء اللہ کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کہانی ''ذرا سی بھول'' مجھے بے حد پسند آئی۔ مور شاہد حسین بھیا اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ وقفہ وقفہ سے کچھ مطالعہ کیا۔ تمام تحریریں بہترین تھیں۔ جتنی تعریف کریں کم ہے۔ کاشی بھیا پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اور ڈر بھی رہا ہوں کہ کہیں آپ کو تا خیر سے نہ ملے یا کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ اگر حوصلہ افزائی کی گئی تو ان شاء اللہ آئندہ بھی شرکت کروں گا۔ محترمہ منزہ سہام ''تھر پیاسا ہے'' اور آپ کی تحریر ''کچھ اپنی باتیں'' لاجواب سلسلے ہیں۔ اس کے علاوہ سلیم فاروقی ''آتش جنوں''۔ اعجاز احمد نواب ''ناگن''۔ ارشد علی ارشد ''ملکھنی'' اچھے اور بے حد پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اب اجازت، تمام اہل وطن کے لیے پُرخلوص دعائیں۔

☆ پیارے طارق! آپ نے ہمیں اتنی محبت سے تبصرہ لکھا تو بھلا ہم آپ کو کیوں شامل احوال نہ کرتے۔ اگلے ماہ آپ سے احوال میں ملاقات ہو رہی ہے نا......

✉ احوال میں یہ پہلی آمد ہے، ہمارے ساتھی مبشر حسن کی ہیڈ بکائنی سے، لکھتے ہیں۔ محترم پیارے سویٹ اور ہمارے دل کی دھڑکن مدیر جناب کاشی بھائی! السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ اللہ کی رحمت سے ٹھیک ہوں گے۔ اپریل کا شمارہ جلد مل گیا۔ اس ماہ کے شمارے کا بطورِ خاص انتظار اس لیے بھی تھا کہ میں نے گزشتہ شمارے پر تبصرہ بھیجا تھا جسے آپ کی محبت اور شفقت سے شمارے میں جگہ مل گئی۔ سرورق میں اس دفعہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ حسینہ زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ ٹائٹل سادہ سا تھا ہم جلدی سے اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے اپنی محفل احوال میں آ ہی رہے تھے کہ منزہ سہام کا ''تھر پیاسا ہے'' جیسی پیاری تحریر نے ہمارے قدم روک لیے، میں خود کالم نگار ہوں۔ مجھے تھر کے حالات کا پتا بھی ہے، مگر منزہ سہام کے کیا کہنے، واہ...... خوب لکھا تھا۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی صاحب نے جو منظر پیش کیا وہ تو مجھے اپنا ہی لگا۔ کاشی صاحب کا قلم ہو اور تحریر دل پر نہ لگے یہ تو بہار میں پھول نہ کھلنے والی بات ہوئی، احوال میں کرسی صدارت پر انیل حسین قربان پٹھان کو تشریف فرما دیکھا۔ اس سے

آگے پھر جناب ڈاکٹر صغیر احمد عاجز، جہلم سے عاجز ی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب آپ کس چیز کے ڈاکٹر ہیں۔ دوست عادل، فیصل ندیم، عارف شہزاد، کنول نے بھی اچھا تبصرہ کیا تھا۔ ویلڈن، صفدر علی حیدری اُچ شریف سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان کی کہانی ہو یا ہو عام سا تبصرہ، دل کرتا ہے بار بار بندہ پڑھے، خدا سلامت رکھے ان کو۔ کہانیاں اس بار تو خوب تھیں۔ بشیر احمد بھٹی کی ''پنچھی واس'' اچھی تھی۔ سلمٰی غزل کی ''سزا کی جزا'' سچ بیانی خوب تھی۔ پڑھ کر آنکھ سے آنسو آرہے تھے۔ ویری گڈ غزل۔ ایم اشفاق بٹ ''ہم نام'' کے ساتھ آئے تھے، گڈ۔ عمیر شہزاد کی ''کفارہ'' واقعی ایک سچ بیانی تھی۔ قمر تابندہ نے بھی خوب رنگ جما رکھا تھا۔ شاہد محمود مغل، رئیسہ خالد اور ثناء کنول کی کہانیاں اچھی لگیں۔ قسط وار کہانیاں ابھی پڑھ رہا ہوں، مگر ٹائم کی شدید قلت ہے۔ تخن آباد سے نسیم سکینہ، ثمینہ ناز، ظفر رند اور ابراہیم شہزاد کی شاعری اچھی لگی۔ اس مشینی دور میں سچی کہانیاں جو رابطہ کا سلسلہ احوال کے ساتھ جاری کیے ہوئے ہے، یہ بہت بڑی بات ہے۔ کاشی بھائی کی محنت نے اس کو مزید چار چاند لگا دیے۔ خدا اس کو مزید ترقی دے، (آمین)۔ آپ سب کی دعاؤں کا طلب رہوں گا۔

☆ پیارے مبشر! ہمیں تو تمہارا تبصرہ بہت پسند آیا، مگر اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ اور ہاں! کہانی اور شاعری کیا ہوئی؟؟؟



✉ اُچ شریف، بہاول پور سے یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست صفدر علی حیدری کی، عرض کرتے ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان! السلام علیکم! اس بار بھی ''سچی کہانیاں'' حسب معمول دیر سے ملا۔ یعنی بجائے 25 مارچ کے 2 اپریل کو۔ مزید وقت ضائع کیے بنا آپی منزہ کا اداریہ ''ٹھہر پیاسا ہے'' پڑھا۔ انہوں نے ایک المیے کو چند سطروں میں بیان کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ کاش عوام کو بے زبان سمجھنے والے عوام کے خیر خواہ ہوتے۔ پھر آپ کا ''کچھ اپنی باتیں'' پڑھا جو ہمیشہ کی طرح ایک شاندار آرٹیکل تھا۔ تاریکی میں امید کی شمع جلانے اور روشنی پھیلانے پر آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ پھر احوال کی محفل میں جا گھسا جہاں نئے اور پرانے ساتھی اپنے اپنے راگ الاپتے دکھائی دیے۔ خوش کن بات یہ تھی کہ سارے ہی پیار کا گیت گاتے پائے گئے۔ اپنائیت کا رنگ سب میں نمایاں بلکہ غالب دکھائی دیا۔ اپنے پیارے دوست اور بھائی مبشر حسن کو خوش آمدید کہتا ہوں جن کی آمد نے دل کی کلی ہی کھلا دی۔ امید ہے آپ جلد ہی اپنی شوخ تحریروں سے قارئین کا دل جیت لیں گے کہ یہ فن انہیں خوب آتا ہے۔ منشی محمد عزیز کا بھرپور تبصرہ پسند آیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی اپنا اپنا رنگ خوب جمایا۔ اب کی بار محفل خاصی شاندار بلکہ جاندار لگی۔ سلیم اختر صاحب کی کمی البتہ بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ نہ کہانی نہ خط...... یہ کیا بات ہوئی بھلا؟۔ اور جانی بھائی بھی شادی کی مصروفیت کے سبب صرف موبائل پیغام تک ہی محدود رہے۔ جناب آپ کا تبصرہ خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ ایک کونے میں اپنا خط پا کر طمانیت کا احساس ہوا۔ احوال سے باہر آئے تو سب سے پہلے جانی بھائی کی دکھی کہانی ''تجھ سا ڈھونڈوں کہاں'' پڑھی۔ دوستی ہو تو ایسی...... بشیر احمد بھٹی کی ''پنچھی واس'' کا ابتدائی حصہ کہانی کی بجائے آرٹیکل لگا۔ سلمٰی غزل کی ''سزا کی جزا'' نام کی حد تک نئی لگی۔ عمیر شہزاد کی ''کفارہ'' میں ربط کی

شدید کمی دکھائی دی۔ تاہم اختتام ایک مثبت نوٹ پر ہوا اور یہی اس کہانی میں اچھی بات لگی۔ مور شاہد حسین کی ''ذراسی بھول'' میں کہانی کی ہیروئن کی بے باکی ہضم نہیں ہو پائی۔ قمر تابندہ کی کس پر اعتبار کریں، ''بے رنگ حیات'' شاہد مغل، منشی محمد عزیز کی ''سلگتے ارماں'' نور بھٹو کی آخری خواہش، بلال فیاض کی ''اب میں مطمئن ہوں'' یہ سب کی سب سچ بیانیاں اچھی لگیں۔

شہزاد کنول کا ذاتی المیہ پڑھتے ہوئے ہمہ وقت ایک ہی جملہ ذہن میں گونجتا رہا ''محبت سے اگر خوش فہمی نکال دی جائے تو غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں بچتا''۔ دوسری پردیس کہانی ''بے جڑ کے پودے'' ایک اچھی کاوش تھی۔ صائمہ نفیس کی کاوش ''کملی'' کو سچی کہانیاں کا حسن کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ''بابا عمر دین'' ایک اچھی کہانی تھی۔ شعلہ کہانیاں واقعی شعلہ ہی لگیں۔

کاشی بھائی تین دن میں سارا رسالہ پڑھ کر ہم نے خود اپنا ریکارڈ توڑ ڈالا۔ اب جلدی جلدی تبصرہ کمپوز کر رہا ہوں کہ کہیں دیر ہی نہ ہو جائے۔ آخر میں ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہیں میری کاوش ''آسیب'' پسند آئی۔ کنول عمران خان سے عرض ہے کہ جن کو ''کراڑ'' نہیں کہتے۔ ہماری سرائیکی میں ہندو کو کراڑ کہتے ہیں اور مڑیچا ان جھگی نشینوں کو کہتے ہیں جو ہر شہر میں پائے جاتے ہیں ان کی عورتوں کی خاص بات ہاتھی دانت سے بنی وہ چوڑیاں ہوتی ہیں جن کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ کاشی چوہان کے ایک شعر سے اپنے خط کا اختتام کرتا ہوں۔

تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

☆ بھائی صفدر! کیا کمال تبصرہ کیا! آپ نے تو جناب ہمارا دل ہی جیت لیا۔ اب ہم کہاں جائیں؟ اگلے ماہ بھی ریکارڈ ٹوٹ سکتا ہے نا!!؟؟



✉ یہ احوال میں شرکت ہے، دبئی سے محمد شہزاد کنول کی، لکھتے ہیں۔

محترم جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ جنابِ من! سب سے پہلے تو یہ بتادوں کہ ''دل اک شہر خموشاں'' شائع کر کے آپ نے ہمیں خرید ہی لیا ہے۔ میری کہانی کو اتنے خوب صورت انداز میں شائع کرنے کا شکریہ۔ اب آتا ہوں تبصرے کی طرف۔ سب سے پہلے باجی منزہ کا اداریہ پڑھا اور دل دُکھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد آپ کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر کراچی والوں کو سلام کرنے کو دل چاہا۔ اس کے بعد سچ بیانیوں میں بشیر احمد بھٹی، قمر تابندہ، ایم اشفاق بٹ، نور بھٹو، بلال فیاض، عظمیٰ غزل، مور شاہد حسین، عمیر عادل نے کمال کیا۔ جبکہ شعلہ ساماں تحریروں میں سنبل، سرفراز ناز کی کہانیاں زبردست رہیں۔ تین مرد تین کہانیوں میں ارشد اجمیری، مجید احمد جائی اور ثناء کنول اللہ دتہ تینوں کی کہانیاں نمبر ون رہیں۔ سرحد پار سے ''بے جڑ کے پودے'' بھی اچھی تھی۔ صائمہ نفیس کی ''کملی''، اسٹیشن کہانی میں ممتاز احمد کی ''بابا عمر دین'' یادگار رہی۔ خصوصی کہانی میں اس ماہ سرور شاذ کی ''کھٹل'' ایک بھرپور کہانی رہی۔ پہلا حصہ زبردست رہا۔ دوسرے کا انتظار ہے۔ ''آتشِ جنوں اور مکھنی'' بہت خوبی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ باقی ''ناگن'' ریپٹیشن کا شکار ہو رہی ہے۔ باقی سخن آباد میں سب کا کلام محظوظ کرتا ہے۔ اب اجازت دیں۔

☆ بہت عزیز شہزاد! سلامت رہو! بھائی تم خوش ہو گئے اور ہمیں کیا چاہیے۔ ایک بات بتاؤں!

کان اِدھر لاؤ۔ تم نے اتنا شاندار تبصرہ کر کے ہمیں خرید لیا۔ اب دیکھو، ہم نے حساب برابر کر دیا۔



✉ پہلی بار احوال میں کراچی سے ظفر ظہور رقم طراز ہیں۔ بہت پیارے کاشی بھیا! السلام علیکم! بھیاجی، پہلی بار احوال میں شرکت کر رہا ہوں، وجہ ہے اس ماہ کا پرچہ۔ سرورق شاندار تھا جبکہ اندر محفل احوال میں آپ کا احوالیوں کو مخاطب کرنا، ان کے جواب دینے کا انداز ہمیں کسی اور ڈائجسٹ میں نظر نہیں آتا۔ بس بھیاجی! آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اس بار مجھے سنبل صاحبہ کی ''دشمن زندہ ہے'' اور شہزاد کنول کی ''دل اِک شہر خموشاں'' بہت پسند آئیں۔ باقی سچ بیانیوں میں تمام ہی دل موہ لینے والی تھیں۔ تین مرد تین کہانیاں آپ کے رسالے کا ایک نہایت دل چسپ سلسلہ ہے۔ جیل کہانی میں ''کملی'' خوب رہی، جبکہ سرگودھا کے ممتاز احمد صاحب کی ''بابا عمر دین'' نے رُلا دیا۔ محمد تقی صاحب کے ''سسٹم'' میں ہر لفظ انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا تھا، زبردست۔ خصوصی کہانی کے طور پر ''کھٹل'' کمال تحریر تھی۔ باقی تینوں ناول اپنی اپنی جگہ زبردست جا رہے ہیں۔ ان شاء اللہ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے ظفر! بھئی یہ لکا چھپی کا کھیل اب چھوڑو۔ سچی کہانیاں ہم سب کا اپنا پرچہ ہے۔ اپنے گھر میں صرف دستک دے کر دھڑلے سے آجاتے ہیں۔ اُمید ہے میرے تمام خاموش قاری میری بات کا مقصد سمجھ گئے ہوں گے۔ سلامت رہو اور اب اگر غیر حاضر ہوئے تو سمجھو سزا ملے گی۔



✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری مستقل قاری اور لکھاری بہن ثمینہ ناز کی کراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں سے وابستہ ہر فرد کو السلام علیکم۔ کاشی بھائی آپ نے اچھے منتظم نگراں مدیر ہونے کو حقیقت کا روپ دے دیا، کیوں کہ ایک اچھے مدیر کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری اور لکھاری پر باریک بینی سے نظر رکھے۔ سرورق دل کو بے حد بھایا۔ خوب صورتی معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اداریہ ''تھر پیاسا ہے'' پڑھ کر فرطِ جذبات سے آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ''کچھ اپنی باتیں'' کاشی بھائی یہ ڈاکو تو لگتا ہے کہیں اور سے آبسے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگ تو بہت رحم دل اور سخی ہیں، احوال کی محفل اپنے عروج پر ہے۔ نئے ساتھیوں کو خوش آمدید۔ مور شاہد حسین بھائی مشرقی انداز پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ لڈن صاحب المعراج، ممتاز احمد، سدرہ انور علی، عامر زمان میں ان تمام احوالیوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے تبصرے کو سراہا۔ تحسین جونیجو! آپ بھی شاد رہیں، آباد رہیں۔ سب سے پہلے اپنی من پسند ''منگنی'' پڑھی۔ اعجاز احمد کی ''ناگن'' اپنا پھن پھیلائے پورے پرچے پر راج کر رہی ہے، بہت شاہکار تحریر ہے اب آتے ہیں بقیہ کہانیوں کی طرف ثناء اللہ دیتہ کی ''تہی داماں'' بہت عبرت ناک کہانی تھی۔ ''پلٹی واپس، سچی توبہ، ہم نام، ذرا سی بھول، بے رنگ حیات، سلگتے ارماں، کفارہ، صائمہ نفیس کی کملی، ممتاز احمد کی ''بابا عمر دین، محمد تقی کی سسٹم، مجید احمد جائی کی ''تجھ سا ڈھونڈوں کہاں، سنبل کی دشمن زندہ ہے، آخری خواہش، وغیرہ بہت سبق آموز کہانیاں تھیں۔ آخری کہانی ''کھٹل'' پڑھی۔ ظلم و بربریت کی لرزہ خیز داستان پانچ انسان نما بھیڑیے رضیہ کو ماس (گوشت) کی طرح نوچتے رہے، پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ قیامت سے پہلے قیامت کی نشانیاں ہیں۔ عمیر عادل صاحب! ندامت ملے گی

ہمیں تو آپ خود باتیں الجھی معلوم ہوتے ہیں، جب ہی تو دوسروں پر تنقید پر ہی خط مکمل کر دیا۔ کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے۔ رہی نقاب والی بات تو جناب اپنے اندر چھپے ایک اچھے مسلمان پر بھی نظر ثانی کر لیجیے کہ وہ نقاب اور دوسرے احکامات کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ منزہ آنٹی کو اُجلے حروف کی اشاعت اور کاشی بھائی آپ کو مجموعہ کلام ''اور تم'' کے شائع ہونے پر دل سے ڈھیروں مبارک باد۔ ''حق آباد'' میں نعت رسول ﷺ، ڈاکٹر صغیر احمد، غزل نوید سہیل، رضوانہ کوثر، عمران فائق اور ''کہانی پوچھو تم'' صوبیہ الوہاب ان کی تخلیقات نے دل کو چھو لیا۔ زرینہ جو نیجو! پروردگار آپ کو تندرست، شاد و آباد اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ مجید احمد جائی صاحب! آپ کو زندگی کے خوش گوار اور تابناک سفر کی خوشیوں کی ڈھیروں مبارک باد۔ روحانی نمبر کا شدت سے انتظار رہے گا۔ پروردگار سے دعا ہے کہ سچی کہانیاں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے اور ہمارے دلوں پر راج کرے (آمین)۔

٭٭پیاری ثمینہ! آپ ہمیں عزیز ہیں اور ہمارا خلوص، ہمارے سب اپنوں کے لیے ہے۔

✉ تقریباً آٹھ دس برس بعد انہیں ہمارے ایک بہت پیارے لکھاری اور مستقل قاری دوست عبدالغفار عابد نے چیچہ وطنی سے یاد کیا ہے، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم محترمہ منزہ سہام صاحب، محترم جناب کاشی بھیا اور تمام اسٹاف و قارئین سچی کہانیاں۔ کافی عرصے بعد اس محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ سب کو خوشی ہوگی اپنے درمیان پا کر۔ عزیز ساتھیوں کراچی میں ملازمت کے دوران تقریباً ہر ماہ سچی کہانیاں کے دفتر جاتا تھا۔ پہلی دفعہ انکل دانش دیروی مرحوم نے مجھے سچی کہانیاں کے دفتر خوش آمدید کہا۔ چائے کے بعد انکل نے سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے اسٹاف سے میرا تعارف کرایا۔ انکل دانش مرحوم سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اگلے ماہ جب میں سچی کہانیاں کے دفتر آیا تو انکل نہیں تھے، مگر ان کی یادیں باقی تھیں۔ انکل کی مہمان نوازی میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ انکل کو آخرت کی آسانیاں نصیب فرمائے (آمین) عزیز دوستو! اس وقت پرسمکر ز دیریز لاہور میں ملازمت کرتا ہوں۔ لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا، مگر کاشی بھیا نے چھوٹے بھائی عامر زمان عامر سے میرا موبائل نمبر لیا۔ کال کی اور مجھے سچی کہانیاں میں دوبارہ لکھنے کی تاکید کی۔ میں نے کاشی بھیا سے وعدہ کر لیا اور آج آپ دوستوں کے درمیان ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی طرف پھر آتا ہوں۔ پہلے ماہ اپریل کے شمارے پر کچھ تبصرہ کر لوں۔ آغاز کرتا ہوں باجی منزہ کے اداریے ''تھر پیاسا ہے'' سے۔ ٹی وی اور اخبارات سے تھر کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا مگر باجی کے اداریے نے بہت غمگین کیا۔ باجی کے اداریے کے بعد کاشی بھیا کی ''کچھ اپنی باتیں'' پڑھ کر دل اور بھی دکھی ہو گیا، کہاں گئی ہماری انسانیت، مگر اس نفسانفسی کے دور میں کچھ لوگ ابھی باقی ہیں جن کے دم سے یہ دنیا قائم ہے، جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ کاشی بھیا نے بھی ''کچھ اپنی باتیں'' کے آخر میں ایسے لوگوں کی نشاندہی کی ہے، جن کے دلوں میں دوسروں کا درد ہے۔ سچی تو بہ ارشد اجمیری کی یہ تحریر پڑھ کر ایمان اور پختہ ہو گیا۔ بشیر احمد بھٹی کی تحریر ''پکھی واس'' اور قمر تابندہ کی تحریر ''کس پہ اعتبار کریں'' بہت جان دار تحریریں تھیں۔ ایک بار پھر احوال کی طرف آتا ہوں۔ احوالیوں سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، مگر کاشی بھیا عجب نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی تقریر کو ختم کروں۔ کاشی بھائی پلیز بہت عرصے بعد اپنوں سے بات کر رہا ہوں۔ صرف

تھوڑا سا وقت اور دے دیں، شکریہ۔ احوال میں بہت سی پرانی اور نئی شخصیات سے میری ملاقات ہوئی۔ عظمیٰ شکور، زرینہ جوتجو، رضوانہ کوثر، تسلیم کوثر، رانا شاہد اور عزیز ملے وغیرہ وغیرہ احوال میں کل 75 قارئین شامل تھے، ان میں 38 کی حاضری خطوط کے ذریعے اور 21 لیٹ لسٹ میں شامل تھے اور 16، sms کے ذریعے شامل ہوئے۔ احوال میں اتنی زیادہ حاضری دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس میں کاشی بھیا کی محنت کا بھی اثر ہے۔ چھوٹے بھائی عامر زمان عامر لوجی میں اس محفل میں شامل ہوں، اب تو خوش ہیں نا آپ۔ آپ سب کی خوشیوں کا طلب گار۔

☆ پیارے بھیا، آپ کو احوال میں حاضر دیکھ کر لفظ جامد ہو گئے ہیں۔ میری خاموشی کو میری محبت مانیے اور ہاں اب آپ سے دوری ہم احوال میں قطعاً قبول نہیں کریں گے۔



✉ احوال میں یہ آمد ہے ہمارے انیل حسین پٹھان کی سندھ یونیورسٹی، جامشورو سے، لکھتے ہیں۔ محترم جناب کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم۔ اُمید ہے رب العزت سے آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ ماہ اپریل کا شمارہ ہاتھوں میں سب سے پہلے ''تھر پیاسا ہے'' پر نظر پڑی۔ منزہ آپی نے بہت اچھا لکھا ہے۔ ''ننھے منے فرشتے روٹی اور پانی کو ترستے ہیں۔''

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

منزہ آپی ہمیشہ شاد و آباد رہیں، بہت اچھا لکھا ہے۔ جیسے کہ میرے شہر کے لوگ، میرے وطن کے لوگ، میرے دل کے لوگ...... سلامت رہیں! اور اب نظر پڑی ہے احوال پر۔ احوال میں سب سے پہلی آمد اپنی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اتنی خوشی ہوئی کہ لفظوں میں، میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ آپ نے میری حوصلہ افزائی کی، بہت بہت شکریہ! اور اب آتا ہوں تبصرے پر۔ مور شاہد حسین کی ''ذرا سی بھول'' بہت اچھی لگی۔ بڑی حیرت انگیز کہانی ہے۔ محمد عمیر شہزاد کی ''کفارہ''، سلمیٰ غزل کی کہانی ''سزا کی جزا''، بشیر احمد بھٹی کی ''پکھی واس'' اور تمام کی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ کاشی بھائی مئی میں میرے پیپرز ہیں اس وجہ سے میں اس ماہ بڑی کوشش کے بعد بھی کہانی نہیں لکھ سکا۔ مزدور ڈے کے حوالے سے ایک غزل ارسال کر رہا ہوں، اُمید ہے ضرور پسند آئے گی اور فرسٹ مئی کو میرا جنم دن بھی ہے اور اب اجازت چاہتا ہوں۔ قارئین اور لکھاریوں کو میرا سلام اور دعا، آپ کی دعاؤں کا طالب۔

☆ پیارے انیل! خدا تمہیں امتحانات میں شاندار کامیابی سے ہمکنار کرے۔ تبصرہ بہت مختصر مگر اچھا لگا۔ ارے ہاں، سالگرہ مبارک!

✉ اعجاز احمد آرائیں، کراچی سے ایک عرصے بعد احوال میں شامل ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم جناب کاشی چوہان صاحب السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ، محترمہ رخسانہ سہام مرزا، محترمہ منزہ سہام مرزا اور ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ''سچی کہانیاں'' کی اس محفل میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ غیر حاضری کی سب سے بڑی وجہ کچھ پیشہ ورانہ مصروفیات تھیں۔ بہرحال دیر آید درست آید۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' سے میرا تعلق نیا نہیں ہے، مجھے وہ وقت بھی یاد ہے کہ جب جناب دانش دیروی (مرحوم) اور جناب سہام مرزا (مرحوم) جیسی شخصیات اس گلشن کی شان ہوا کرتی تھیں۔ ان ہی

لوگوں کے دم قدم سے اس گلشن میں رونق ہوا کرتی تھی۔ پھر......نجانے کیا ہوا کہ اک طوفان سا آ کر گزر گیا اور کچھ بھی باقی نہ بچا اور صرف کچھ یادیں باقی رہ گئیں۔ اس کے بعد اگرچہ قلمی واسطہ باقاعدگی سے نہیں رہا لیکن مطالعہ کی حد تک سچی کہانیاں سے میرا تعلق 20 سال پرانا ہے۔ آج کل بھی سخت مصروفیت ہے۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ آرائیں برادری کی سماجی و فلاحی تنظیم "انجمن آرائیاں سندھ" کے صوبائی آفس سیکریٹری اور ماہنامہ "بزم آرائیاں" کے ایڈیٹر کی ذمے داریاں بھی نبھا رہا ہوں۔ اس کے باوجود ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے ساتھ ایک خاموش قاری کا رشتہ آج تک باقاعدگی سے جاری ہے اور الحمد للہ! 20 برس سے جاری ہے۔ اپریل کا شمارہ سامنے موجود ہے، حسب معمول ہر کہانی اور ہر تحریر لاجواب ہے۔ تمام لکھاری اپنی اپنی تحریروں کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔ اب انشاء اللہ باقاعدگی سے حاضری کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام نیک دعا کے ساتھ۔

☆ پیارے بھائی اعجاز! خوش آمدید۔ آپ نے ہمیں بھی رفتگاں کی یاد دلا دی۔ وقت بھلا کب رک پاتا ہے۔ اچھا وقت، اچھی یادوں کے ساتھ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ اب ہمیں آپ کی احوال میں آمد مستقل چاہیے۔

✉ احوال میں ڈی آئی خان سے یہ آمد ہے ہماری نئی احوالی دوست ارم خان کی، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم۔ بھائی کاشی چوہان، اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ لمبی عمر ڈھیروں ڈھیر خوشیاں اور کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ ایک بار پھر محفل احوال میں حاضر ہیں۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ اپریل کا سچی کہانیاں سامنے ہے۔ اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہو گیا، شکریہ کاشی بھائی۔ جس طرح خط کے لیے مایوس نہیں ہونا پڑا، دل کہتا ہے اسی طرح اپنی شاعری اور کہانی کے لیے بھی مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔ کیوں کاشی بھائی سچ کہا نا۔ سچی کہانیاں کا ایک اور سلسلہ چلا ہے، sms کا۔ ویری گڈ۔ اپریل کا شمارہ کیم کو ملا۔ زیادہ ابھی پڑھا نہیں، سو خط میں اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی اور میرے خیال میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں، کیوں کہ سچی کہانیاں ہر ماہ لاجواب ہوتا ہے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے، خدا حافظ۔

☆ پیاری ارم! اتنی دور سے خط بھیجا تھا تو دو چار کہانیوں پر بھی رائے دے دیتیں۔ خیر جیو! کہ ہماری یہی دعا ہے۔ اس ماہ تمہاری شاعری بھی سخن آباد کا حصہ ہے۔ خوش!



✉ ہماری بہت پیاری شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ کاشی بھائی، السلام علیکم۔ اپریل کا سچی کہانیاں ملا۔ ٹائٹل کیا شاندار تھا، کتنی دیر تو ہم ٹائٹل کو ہی دیکھتے رہے۔ ویسے سچی کہانیاں کے ٹائٹل بے حد دل فریب ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ سب کہانیاں اے ون رہیں، پڑھ کر بے حد مزا آیا۔ "کچھ اپنی باتیں" پڑھ کر دل دُکھی بھی ہوا، مگر بے حد اچھا لگا اتنا اچھا کہ ایک چھوٹی سی سچی کہانی لگی۔ کاشی بھائی بُرا مت منائیے گا۔ آپ کے لکھنے کا انداز ہی اتنا اچھا لگا۔ کیا بات ہے، واقعی یہ آپ کا ہی کمال ہے۔ واقعی اس دنیا میں اچھے اور بُرے انسان دونوں ہی ہوتے ہیں۔ ایک میگزین میں آپ کی کہانی "راکھی" پڑھی تھی، اب تک ان پھلکوں کا مزا جو دیسی گھی کے ساتھ کھائیں، ابھی تک ہونٹوں پر ہے۔ یہ احوال میں رات کو لکھ رہی ہوں۔ "بے جڑ کے پودے، کملی، بابا عمر دین" تو بے حد پسند آئی۔ کمال احمد نے واقعی کمال کر دیا۔ "کون بنے گا کروڑ پتی، تجھ سا ڈھونڈوں کہاں" مجید احمد جائی کئی اور رسائل میں بھی لکھتے ہیں اور بہت عمدہ تحریریں ہوتی ہیں ان کی۔ "تہی داماں، ذرا سی بھول، ہم

نام" پڑھ کر دل دُکھ سے بھر گیا۔ کیا اس دنیا میں اتنے سنگدل لوگ بھی ہوتے ہیں۔ "پلھی واس" بھی بے حد اچھی تحریر تھی۔ کاشی بھائی آپ نے میرا تبصرہ تو لگا دیا، شکریہ، مگر میری غزل کا کیا ہوا۔ سب دوستوں کو سلام، میری نظم کی پسندیدگی پر بے حد شکریہ، اگلے ماہ پھر حاضر ہوں۔ اللہ حافظ۔

☆ پیاری فریدہ فری یوسف زئی صاحبہ! آپ کے تبصرے کو دیکھ کر صرف ایک لفظ لکھنا ہے۔ گلستاں میں کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جن کے بغیر گلستاں ویران سا لگتا ہے۔ آپ کی محبت کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ خدا آپ کو طویل عمر، صحت کے ساتھ عطا کرے۔ آپ کی غزل اس ماہ سخن آباد کا حصہ ہے۔

میرے پیارو! مترو! سجنو! مٹھوں...... یہ تو تھے اس ماہ ہمیں موصول ہونے والے خطوط اور جو احوال میں شریک نہ ہو سکے ان میں ☆ ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ ☆ رانا محمد شاہد، بُورے والا ☆ سہیل خان، کورنگی کراچی ☆ محمد عمیر شہزاد، ہری پور ☆ ملک صفدر عباس، جہانیاں۔ تو پیاروں اب ہم دیکھتے ہیں کہ SMS کے ذریعے ہمیں کس کس نے یاد کیا۔

SMS کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

☆ سعدیہ ایمن۔ دیہہ سوبھو (سندھ) ☆ فضہ شہزاد۔ پشین (بلوچستان) ☆ مسز شایان کنول۔ حیدرآباد (سندھ) ☆ شبانہ، حیدرآباد۔ ☆ افشاں، کراچی۔ ☆ کوثر سعید، لاہور۔ ☆ سارا الیاس، ہری پور۔ ☆ ایم سعید انور۔ لاہور ☆ ملک اسحق حسین ساجد، ہیڈ کانٹی ☆ صباء، کراچی۔ ☆ مسی ایم عزیز، لڈن، وہاڑی۔ ☆ صائمہ شاہین، سرگودھا۔ ☆ شکیلہ انجم طارق، لاہور۔ ☆ ثناء کنول اللہ دتہ، لودھراں۔ ☆ مسز طارق خان، کراچی۔ ☆ زاہدہ کنول، کراچی۔ ☆ وجیہہ، راول پنڈی۔ ☆ افضل، ٹاؤن شپ، لاہور۔ ☆ حنا، راولپنڈی۔ ☆ ثمیر شاہد۔ کراچی

پیارے ساتھیو! ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

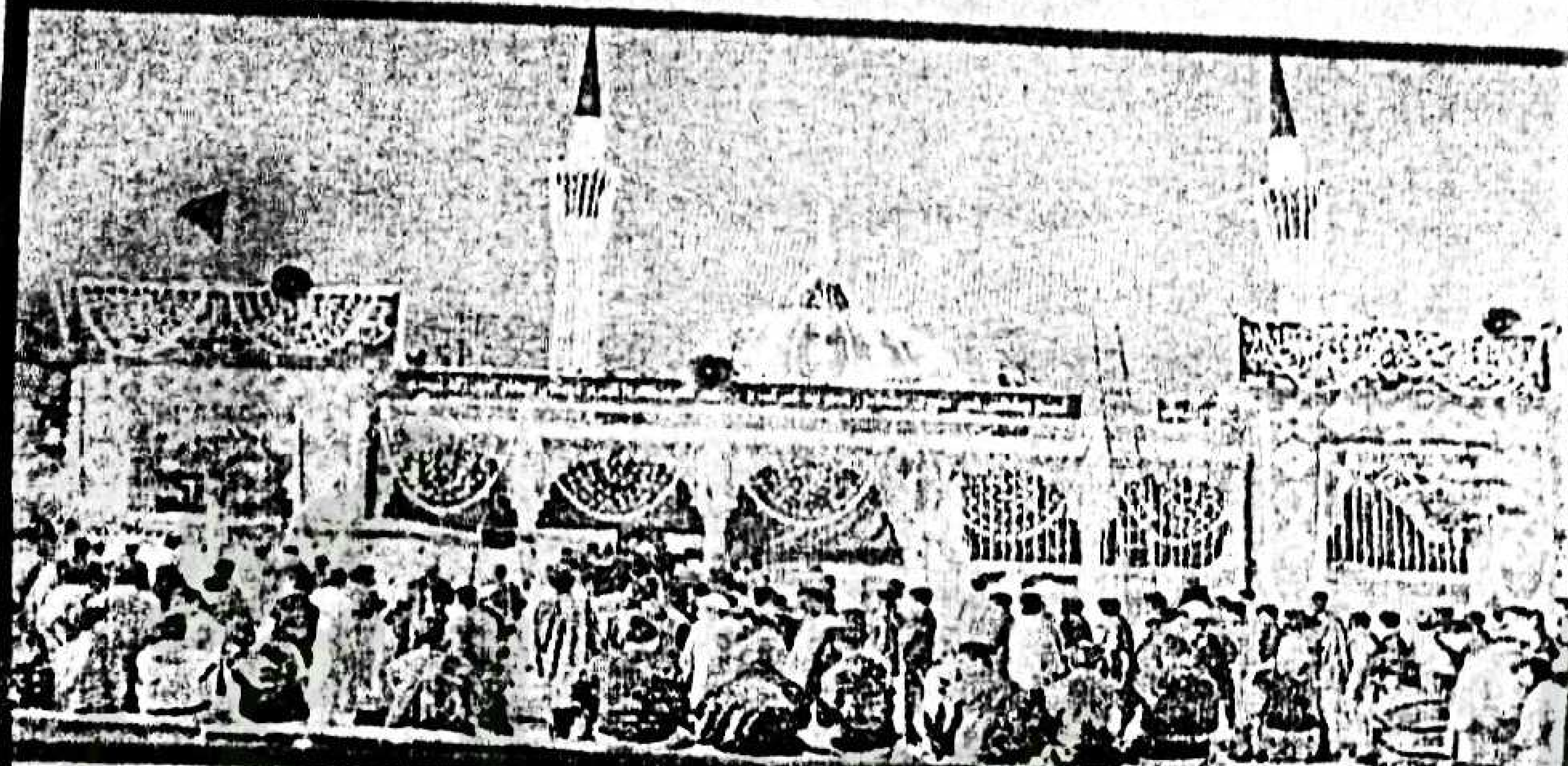
ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ ر بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

کشف و کرامات کے سرچشمے، اللہ کے ولی

جن کے فیض کی بہاریں آج بھی گل و گلزار ہیں



☆ جلوۂ جنوں۔ جاوید راہی

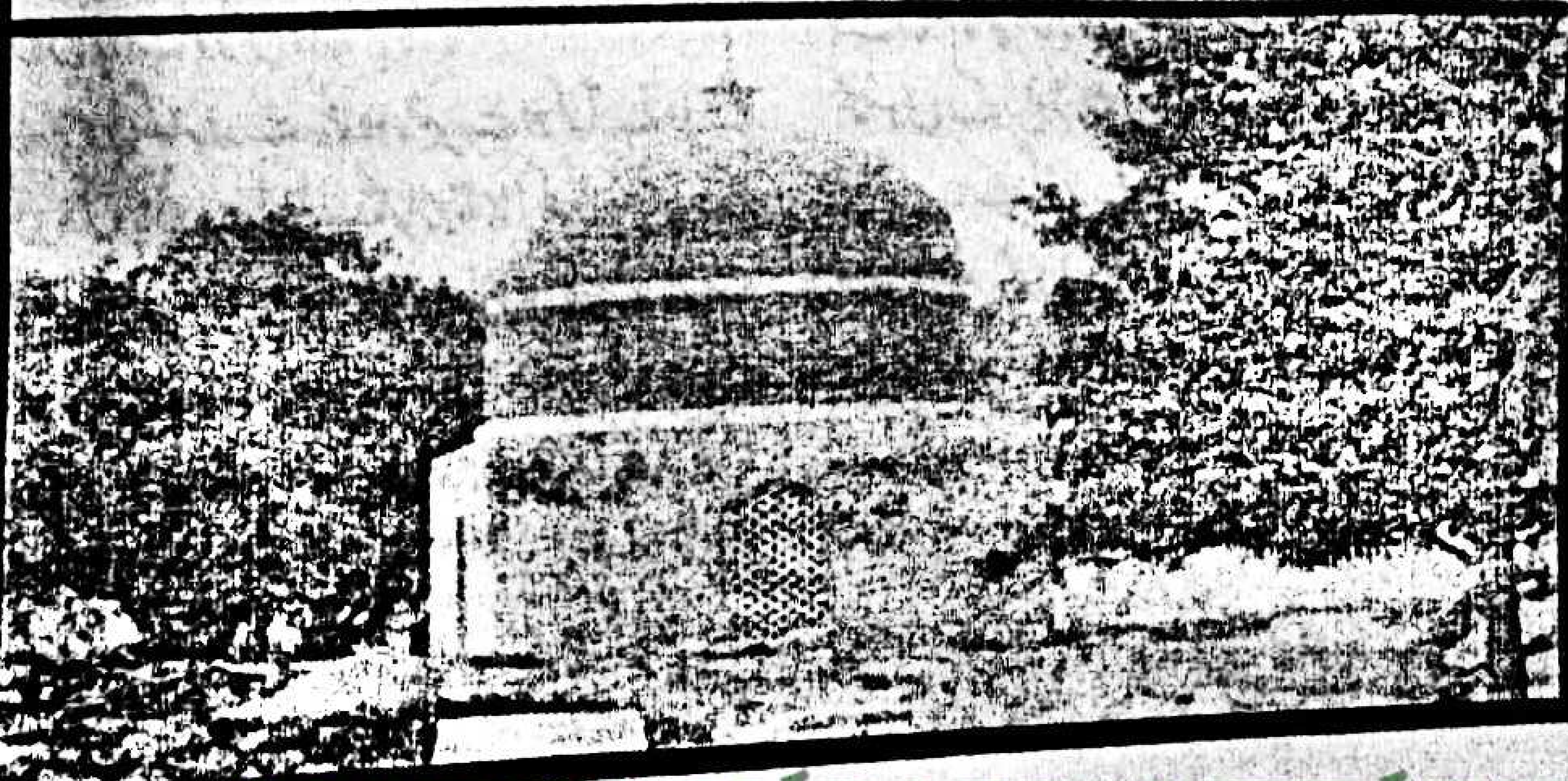
سرکار لال حسین شاہ صاحب سوراسی سیداں والے کے دَر سے سرچشمۂ کشف وکرامات پانے والے ایک زندہ ولی کا زندگی نامہ، اوکاڑہ سے۔

☆ نوٹاں والی سرکار۔ ممتاز احمد

سرگودھا سے ایک برگزیدہ ہستی، میاں عبدالرشید المعروف نوٹاں والی سرکار کی فیضیات

☆ چشمۂ فیض۔ ملک عاشق حسین ساجد

ہیڈ بکائنی، مظفر گڑھ سے ولی اللہ، میاں متقی سائیں کی کشف وکرامات کے نظارے



جلوۂ جنوں



جاوید راہی

ایک سرچشمۂ کشف و کرامات، زندہ ولی کا زندگی نامہ





جانے مجھے اپنی زندگی میں صرف اکیلا پن ہی کیوں محسوس ہوتا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود کوئی فیصلہ اگر روح کے زخم کریدنے کے لیے سر اُٹھاتا، تو جانے وہ کون تھا جو کسی کونے سے سرگوشی کرتا اور میں یونہی نہر کی طرف ویران راستوں پر گھنٹوں گھومتا رہتا۔ کوئی ادھورا پن تھا میرے اندر جو مکمل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ شہر کی گہما گہمی کو چھوڑ کر کئی کئی ایکڑ پر پھیلے پُرسکون باغوں کو پیچھے چھوڑتا آخر میں بنے دھوبی گھاٹ پر شہر کے لانڈری والے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے اپنے کام میں جُتے دیکھ کر مجھ پر ایک انجانی سی کیفیت طاری ہو جاتی، جیسے زندگی متحرک ہو کر چاروں جانب محو رقص ہو۔

دھوبی گھاٹ سے کچھ دور نہر سے ہو کر آنے والے سرخی مائل پانی سے لبالب بھرا بہتا بڑا کھالا، جس کے کنارے کنارے چلنا دونوں جانب ہرے بھرے درختوں کی مدبھری چھاؤں میں پرندوں کی سُریلی آوازیں روح کے زخموں پر شبنم جیسی تازگی بھر دیتی۔ کھالے اور نہر کے درمیانی راستے میں پرانا قبرستان، جس میں ستر اسّی قبریں اپنی بوسیدگی کا نوحہ اتنی خاموشی سے دہراتی نظر آتیں کہ کسی تنہا شخص کا وہاں سے گزرنا بڑے حوصلے کی بات ہوتا، مگر مجھے یہاں سے گزرنا کسی بھی طرح کے جذبے سے بے نیاز محسوس ہوتا۔ میں نہر کے کنارے گھاس پر بیٹھتے ہی اپنی ٹانگیں پُرسکون لہروں کے جسم میں اُتار دیتا اور آنکھیں نیم وا کر کے پانی کے ساتھ ساتھ بھاگتے منظر کی دل کشی میں ڈوب جاتا، جیسے روح کی بے چینی سمٹ کر آنکھوں کی چوکھٹ پر ہولے ہولے دستک دیتے کہہ رہی ہو کہ مجھے تلاش کرو، میں تمہاری دسترس میں ہوں، مگر تم مجھ سے گریزاں ہو۔ تم مجھ سے کیوں دور بھاگتے ہو، دیکھو میں نے تمہیں تنہا نہیں چھوڑا، تمہیں اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتی ہوں۔ کئی کئی گھنٹے گزر جاتے مجھے بیٹھے بیٹھے۔ جب شام کو نہر کنارے واپس جاتے بھیڑ بکریوں، گائے بھینسوں کے ریوڑ دھول اُڑاتے، ہائے ہُو کی آوازوں میں قریب سے گزرتے، تو میرے طلسم کا حصار چکنا چور ہو جاتا اور میں اپنی ٹانگیں ٹھنڈے پانی کی سوندھی سوندھی مہک سے الگ کرتے واپس شہر کی جانب جانے والے کھالے کے کنارے کنارے پرانے قبرستان کی خاموشی کو پیچھے چھوڑتا میاں محمدؒ کا کلام الاپتا بے خودی میں آگے بڑھتا جاتا۔

دھوبی گھاٹ پر سب لوگ اپنے اپنے دھوئے

ہوئے کپڑوں کو سمیٹ رہے ہوتے۔ شہر سے اُٹھتا روشنیوں کا مدھم سلسلہ دکھائی دینے لگتا تو یک دم روح کی بے چینی پھر سے جاگ اُٹھتی۔ اکثر واپس پلٹتے ہوئے مرکزی قبرستان کا دراز قد سائیں عاشق "رب ای رب اے" کی صدا لگاتے قریب سے گزرتا تو میں بھی بلند آواز میں کہتا۔ "رب ای رب اے" تو میرا پورا وجود کیف و مستی میں ڈوب کر سائیں عاشق کی تائید کرتا۔ اپنے گھر کی سیڑھی چڑھتے بابا فیروز کی طرف دیکھتا، جس کی دونوں ٹانگوں کو اپنے ہاتھوں سے دباتے حاجت مند خواتین اور مرد دعاؤں کی التجا

مانگنے والوں کی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تو اُلجھتا ہی چلا جاتا، مگر روح کی بے چینی تھی کہ کسی پل بھی چین نصیب نہ ہوتا۔ "سائیں، رب ای رب اے" کی صدا سن کر میرے جسم کی بے چینی لمحہ بھر کو جیسے چین میں ڈھل جاتی، ادھر میں مرکزی قبرستان گھوڑے شاہ کے گورکن سائیں عاشق علی کے ڈیرے کا حصہ بن گیا تھا۔ یہاں مجھے ایک راہ مل گئی تھی اور میری تلاش کو جیسے تپتی ریت کے صحرا میں کہیں نخلستان نظر آ گیا تھا۔ آواز اچھی تھی۔ ہیر وارث شاہ، میاں محمد بخش اور بابا بلھے شاہ کے عارفانہ کلام میں ڈوب جاتا۔ عمر کا وہ حصہ جس میں



سرکار لال حسین شاہ صاحب سوراسی سیداں

کرتے مٹی کے بے جان بت لگتے۔ کبھی کبھار میں خود بھی اُن بے جان بتوں میں شامل ہو کر گھنٹوں بابا فیروز گیسو والے کے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتا رہتا جو حقے کا کش لگاتے دعا کے ساتھ منہ سے دھواں اگلتا جو دعاؤں کے ضرورت مندوں کے چہروں پر پھیل جاتا۔ مخصوص مرد، عورتیں بابا جی کی چوکھٹ پر لنگر حاضری میں باقاعدگی سے نظر آتے۔ گیارہویں کا ختم شریف بابا جی بڑے اہتمام سے کرتے، کھیر اور بتاشے شرکاء اور آنے جانے والوں میں تقسیم کیے جاتے۔ میں اکثر بابا جی فیروز صاحب کی کرشمہ سازی اور ان کو

جسم اور روح کے کئی اَن جانے تقاضے بندے کو بے بس کر دیتے ہیں، مگر میں ان تقاضوں سے بے نیاز غمِ دنیا کو غمِ یار کی بجائے کسی ایسے جذبے کا متلاشی تھا، جو مجھے حقیقی روشنی کو کھوجنے کا سلیقہ بتا دے، مگر میں ہوش میں بے ہوشی کا مفہوم ڈھونڈتے خود میں اُلجھ جاتا۔

والد محترم چوہدری محمد دین درویش صفت شخص تھے۔ بڑے بھائیوں کی ڈانٹ ڈپٹ پر میرے سامنے دیوار بن جاتے تھے۔ اماں جی کسی بڑی بیماری کی بناء پر چلنے پھرنے سے کمزور تھیں، اس لیے ان کی خدمت کرنے اور ان کی زبان سے نکلتی دعاؤں کی پھوار میں،

میں ڈوب ڈوب جاتا۔ وہ بڑی محبت سے درسِ قرآن دیتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم میں صوم وصلوٰۃ کی طرف دھیان ہونے کی بناء پر اسکول میں نعت وقرأت کی ذمے داری ہم دو تین لڑکوں کے سپرد تھی۔ اسکول میں مولوی کا لقب اساتذہ کی طرف سے مجھے ملا ہوا تھا۔ ماں باپ کی نصیحت میں جھوٹ کی نفی، سچائی سے محبت اور ایمان داری کو ایثار کا درجہ دینا شامل تھا۔

جوں جوں درویشوں کے قریب ہوتا گیا، روح کی بے چینی راحت میں بدلنے لگی۔ پہلے ویرانوں کی خاک چھاننے میں صرف تنہائی کا ساتھ ہوتا تھا، لیکن جب سے ذکر کا سلسلہ شروع ہوا تھا، بے چینی بڑھ گئی تھی، مگر لطف و کرم کا احساس بھی میری طبیعت پر رہنے لگا تھا۔ قبرستان سائیں گھوڑے شاہ کے آخری حصے میں ایک پرانی طرز کی اینٹوں سے بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ انتہائی درمیان میں تھا۔ اندر چھوٹی اینٹوں کا بنا سپاٹ فرش کسی بھی پرانی قبر کی نشان دہی نہیں کرتا تھا، مگر یہ کمرہ قبرستان میں کس نے تعمیر کروایا ہوگا اور اسے کون استعمال کرتا ہوگا۔ قبرستان میں مکین گورکن بس اتنا ہی جانتے تھے کہ ان کے خاندان کی کئی پشتیں اس کمرے کو اسی طرح دیکھتی آ رہی تھیں، گو کہ اس کی تعمیر پرانی تھی، مگر اب بھی وہ قبروں کے درمیان اپنی حیثیت نمایاں رکھتا تھا۔ کئی دنوں سے ایک پُرنور چہرہ بزرگ اس کمرے کے اندر چٹائی پر بیٹھے اونچی آواز میں کوئی ورد کرتے سنائی دیتے تھے۔ میری اندرونی کیفیت مجھے اُکساتی کہ میں اگر اندر نہیں تو کم از کم دروازے کے باہر بیٹھ کر ہی اس عمل کو سنوں۔ ڈیرے پر آنے والے بہت سے لوگوں میں اسلم کرپلانی بھی تھے، جو خاصے پڑھے لکھے تھے اور اسلامی علوم سے انہیں خاصی واقفیت بھی تھی۔ میں اکثر ان سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔

"سائیں رب ای رب اے" عاشق علی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ بزرگ پیر اصغر علی گیلانی المعروف بودیاں والے سرکار تھے، جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ان کے پاس جنات کی حاضری ہوتی ہے اور ان کے جنات مرید بھی تھے۔ اس انکشاف پر میرے اندر اس بات کا اور بھی اشتیاق بڑھ گیا تھا۔

سائیں عاشق علی صبح وشام ان کی خدمت میں دودھ اور پینے کا پانی لے کر جاتے تھے اور وہاں رُک کر وہ پیر اصغر علی گیلانی سرکار کی خدمت میں کچھ دیر بیٹھتے بھی تھے۔ کئی دن رات کی بے چینی کے ہاتھوں تنگ آ کر میں نے سائیں سے ان کے پاس جا کر بیٹھنے کا اظہار کر دیا۔ جواب میں کچھ دیر توقف رہا، پھر مجھے ساتھ لے کر جانے کی انہوں نے حامی بھرلی۔

یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اسلم کرپلانی صاحب علم الاعداد اور آسٹرولوجی پر عرصہ دراز سے کام کرتے آ رہے تھے۔ اکثر وہ اپنے حلقۂ یاراں میں بڑے مقبول تھے۔ میرے بارے میں ان کی رائے کچھ ایسی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب تم اسرار روحانیت کی کچھ منزلیں عبور کر کے ایسے منصب پر فائز ہو جاؤ گے کہ تمہیں اپنے خود کی بھی سمجھ نہیں آئے گی اور عشق حقیقی کی پُراسرار جہتوں کی تلاش وکھوج عروج پر پہنچ جائے گی۔ علم نجوم سے بھی ان کی تھوڑی بہت واقفیت تھی، مگر جتنی بھی تھی، خوب تھی۔ میری تشنگی اور بے چینی کی تلاش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گھر اور باہر ایک ہی بے خودی چھائی رہتی، جیسے کوئی ادھورا کام اُلجھتا ہی چلا جا رہا ہو، کچھ نا سمجھ میں آنے والا کام، جس کی کوئی تحریک تو تھی، مگر وہ تھا کیا، یہ میری ناقص سمجھ سے بالاتر چلا آ رہا تھا۔ کوئی عمل کرنا چاہتا تھا میں، مگر کیا؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

صبح سے طبیعت میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ باغوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں نہر کی جانب چل پڑا۔ پرانے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے گدھوں کے جھنڈ پر نظر ٹھہر گئی، جو مرے ہوئے گدھے کو نوچ نوچ کر کھانے کے دوران چیخ پکار میں بھی مصروف تھے۔ ان کی ازلی بھوک، مگر فطرت کی کاری گری نے ماحول کی کثافت کا سامان پیدا کر دیا گیا تھا۔ کھڑے کھڑے جب کافی دیر ہوگئی تو میں نے نہر کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس چل پڑا اور دوپہر تک یونہی بھٹکتا پھرا، آخر کار قبرستان گھوڑے شاہ آ کر ڈیرے پر "سائیں رب ای رب اے" کے پاس آ بیٹھا۔



سرکار لال حسین شاہ صاحب سوراسی سیداں محو دعا ہیں

جنگ کا دور چل رہا تھا۔ اسم ریڈیائی اخبار کی خبروں پر تبصرہ کر رہا تھا۔ میں ایک طرف کونے میں بیٹھا دور سے نظر آتا پرانی اینٹوں کا کمرہ دیکھ رہا تھا، جس کے اندر پیر اصغر علی شاہ گیلانی صاحب کوئی وظیفہ کرنے میں مصروف تھے۔ کافی دیر بعد سائیں عاشق علی نے مجھے مخاطب کرتے کہا۔

''آؤ چلیں'' ان کے ہاتھ میں دودھ اور پانی کے برتن تھے۔ میں اٹھ کر ان کے ہمراہ قبروں میں بنی پگڈنڈیوں پر کمرے کی طرف چل پڑا۔ جوں جوں کمرہ قریب آ رہا تھا، بابا جان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دروازے پر پہنچتے ہی سائیں عاشق نے ''رب ای رب اے'' کی صدا لگائی، تو بابا جان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر آ جاؤ۔ مجھے پیچھے آنے اشارہ کرتے وہ آگے بڑھ گئے۔

کمرے کے آخری کونے میں بابا جان چٹائی پر چوکڑی بھرے بیٹھے ہوئے تھے۔ سائیں جی نے دونوں برتن ان کے قریب رکھے اور پہلے والے خالی برتن اُٹھاتے ہوئے میرے بارے میں بابا جان کو بتایا۔ بابا جان نے اپنی آنکھیں اُٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ چند پل بیٹھنے کے بعد میں سائیں جی کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آیا تو بابا جان کی آواز پھر سے گونجنے لگی تھی۔

''سائیں جی کب تک سرکار کا وظیفہ جاری رہے گا؟'' میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اکیس یوم کا بتایا تھا انہوں نے، آج پانچواں دن ہو رہا ہے۔ مجھے انہوں نے آتے ہی پیسے دے دیے تھے

www.paksociety.com

دودھ کے۔ سرکار ایک عرصے سے اس کمرے میں چلّہ کشی کرتے آرہے ہیں“۔ ”سائیں رب ای رب اے“ نے آگے آگے چلتے ہوئے جواب دیا۔

شام کے ڈھلتے منظر مجھے انتہائی عزیز تھے۔ چاروں جانب اترتے ہلکے اندھیرے کی پھوار ماحول کو اس قدر غم ناک بنا دیتی تھی کہ جب کبھی میری اس دیوانگی اور بے چینی کو گھر کے لوگ محسوس کرتے تو کسی بابا پالے کا نام لیتے، جو مجھے دو ماہ کی عمر میں جھولے سے اُٹھا کر لے گیا تھا۔ گھر میں کہرام بپا ہو گیا تھا، چاروں جانب تلاش سے تھک کر گھر والوں نے تھانے میں اطلاع کر دی تھی کہ ہمارا بچہ کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے۔ رات گئے دروازے پر دستک ہوئی تو والد صاحب نے دروازہ کھولا۔ دیکھا تو بابا پالا مجھے گود میں اُٹھائے کھڑا تھا۔ ”اپنا کاکا (بچہ) لے لو، یہ روتا بہت ہے۔“ والدہ نے مجھے لے کر غصے سے کہا۔

”سارا دن میرا بچہ بھوکا پیاسا مار دیا۔“

”نہیں اماں جی، جب یہ روتا تھا تو میں اپنی زبان اس کے منہ میں ڈال دیتا تھا اور یہ چوستے چوستے سو جاتا تھا“ یہ کہہ کر وہ بابا پالا بھاگ گیا، پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

پالا اُسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ سردی ہو یا گرمی، اپنے آپ کو ڈھانپنے کے لیے وہ صرف چھوٹا سا ایک جانگیہ پہنے پھرتا رہتا تھا۔ والدہ صاحبہ، جن کا نام رحیم بی بی تھا، اگر وہ کبھی آتا تو اس کو کھانا کھلاتیں اور پیسے بھی دیتیں۔ وہ بھی کبھار ہی آیا کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ آیا اور والدہ صاحبہ اس کے لیے روٹی بنانے لگ گئیں اور وہ مجھے جھولے سے اُٹھا کر رفو چکر ہو گیا۔ پتا نہیں کہاں کہاں لیے پھرتا رہا، یہ تو وہ ہی جانتا تھا، مگر دن ڈھلے، جب سب لوگ مایوس ہو گئے تھے اور تھانے میں بھی اطلاع کر دی گئی تھی، تو وہ مجھے واپس سونپ گیا۔ اسی مناسبت سے گھر کے لوگ میری بددعا سے ڈرتے تھے۔

رات بھر میں باباجان کی آنکھوں کے سحر میں ڈوبا رہا۔ صبح اُٹھا تو اسکول جانے کی بجائے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ ڈیرے پر جھاڑو دیتے سائیں عاشق علی کے بڑے بیٹے پیراں دتہ نے نظر پڑتے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ سرکار باباجان کو دودھ اور پانی پکڑا آؤ اور آتے ہوئے خالی برتن لیتے آنا۔ اگر ابا کا پوچھیں تو کہنا کہ قبر تیار کر رہا ہے، کسی مرنے والے کی۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے قریب پڑے دودھ اور پانی کے برتن اُٹھاتے ہوئے جواباً کہا اور قبرستان کے آخری حصے کی طرف چل پڑا، جہاں سرکار اصغر علی گیلانی بودیاں والا سرکار چلّہ کشی میں مصروف تھے۔ کمرے کے اندر اُن کے وظیفے کی آواز کا ورد جاری تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کو کنٹرول کرتے ان کے لیے دودھ پانی لانے کا بتایا، چند پل انتظار کیا اور دروازے کے پٹ کھولتے اندر داخل ہو گیا۔ بابا جی اُسی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے کہ میں ایک روز قبل سائیں جی کے ہمراہ آ کر دیکھ گیا تھا۔ ساتھ لائے برتن ان کے قریب رکھتے ہوئے میں نے پہلے والے اُٹھا لیے اور سر جھکاتے ہوئے سلام کیا اور باہر آتے ہی دروازہ اسی طرح بند کر دیا۔ اس دوران کوئی نا کوئی وسیلہ بن جاتا، جب میں باباجان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ ان کی شخصیت اور عبادت میرے اندر گھر کر چکی تھی۔ آخری دن جب سرکار بودیاں والا حجرہ شاہ مقیم اس کمرے سے باہر آئے تو باباجان نے پہلے سائیں عاشق علی کی پُشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، پھر میرے سر پر دستِ شفقت کے بعد ہمارا شکریہ ادا کیا تو میں نے ہمت کر کے ان کو مخاطب کیا۔

”سرکار پورے وجود میں بے چینی پھیلی رہتی ہے، کسی پل چین نہیں ملتا۔ کوئی کمی چلی آ رہی ہے، جو مکمل ہونے کا نام نہیں لے رہی۔“ باباجان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور فرمایا۔

”اسے مکمل کرنا تو ضروری ہے، آؤ میرے پاس“۔ انہوں نے کمرے کے باہر کھڑے کھڑے مجھے اپنے سینے سے لگاتے کہا۔

”یا قادر واللہ ہو صمد“ کا ورد کیا کرو، وہ بڑا کارساز ہے، کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دے گا تمہارا۔“ یہ کہتے وہ ہم دونوں سے جدا ہو کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر آگے بڑھ گئے۔ میں ان سے کوئی اور سوال نہ کر پایا کہ کیسے اور کب ورد کرنا ہوگا۔ سائیں عاشق علی نے کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، جب وقت ملے، کوئی

موقع ملے، پڑھتے رہا کرو۔ جوں جوں میں ورد کرتا گیا، میری بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اسکول سے کالج کا دور شروع ہو گیا، مگر اسرار روحانیت کے رموز بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے، میں اس کو بھی ازبر کرتا رہتا۔

سب بڑے بھائی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور میں ان کے رحم و کرم پر تھا۔ پہلے باپ اور بعد میں والدہ صاحبہ ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کی جدائی میں اور پریشانی بڑھ گئی۔ تعلیم کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور روحانیت کی طرف توجہ زیادہ مائل ہونے لگی۔ کئی کئی دن بابا فرید گنج شکر سرکارؒ اور داتا دربارؒ پڑا رہتا، صرف ''یا قادر و اللہ ہو صمد'' کا ورد ہی جاری رہتا۔ میری دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑے بھائی چوہدری اللہ دتہ، جو طبیعت کا حاکم اور سخت مزاج شخص تھا، مگر میری زیادہ توجہ اور محبت کا مرکز میری ماں کے بعد ماں جیسی بھابی اور بھائی ہی رہ گئے تھے۔ مرنے سے پہلے والدہ صاحبہ اور والد صاحب سیالکوٹ میں اپنے رشتے داروں میں میری سگائی کر گئے تھے۔ بھائی اللہ دتہ مرحوم کے سمجھانے پر میں شادی پر راضی ہو گیا، مگر شادی کے بعد بھی مزاج نہ بدل سکا۔ پہلے پہل تو بیوی برداشت کرتی رہی، آخرکار جھگڑا کر کے واپس سیالکوٹ چلی گئی اور اس بات پر بضد ہو گئی کہ مجھے بھی اس کے پاس رہنا ہو گا، مگر میں نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ جب بیٹی پیدا ہوئی تو میں بھائی بہنوں کو خیرباد کہہ کر سیالکوٹ شفٹ ہو گیا۔

کچھ عرصے کام دھندا کرتا رہا۔ بیگم کے بڑے بھائی ریاض احمد نے، جو ٹیکسی اسٹینڈ پر اپنی گاڑی چلاتا تھا، ساتھ میں ٹائروں کا کام بھی کرتا تھا، مجھے گاڑی چلانا اور ٹائر ٹیوب کا کام بھی انہوں نے سکھا دیا، مگر میرا زیادہ وقت یہاں بھی درباروں اور خانقاہوں پر گزرتا۔ اسی دوران ایک درویش سے میری ملاقات ہوئی، جنہوں نے مجھے یاحی یاقیوم یارحیم یاکریم کا ورد سرکار کے بتائے ورد میں شامل کروا دیا۔ اب میں نے (یا قادر و اللہ ہو صمد یاحی یاقیوم یارحیم یاکریم) کا اکٹھا ورد شروع کر دیا اور درویش کے بتانے پر باقاعدہ تسبیح پر پڑھنے لگا۔ اب میں دن میں کم از کم آٹھ سے نو ہزار بار ورد کرنے لگا تھا۔ نماز کے بعد جب تک طبیعت سیر نہ ہو جاتی، پڑھائی جاری رہتی۔ بچپن پیچھے چھوڑنے تک ہوتے ہوتے روح کی تسکین میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ بے چینی جو پورے وجود میں رہتی تھی، ورد جاری رکھنے پر چین میں بدلنے لگی تھی، مگر اب اس چین میں مزید آگے بڑھنے کی خواہش بے دار ہو چکی تھی۔

☆......☆

قریبی گاؤں میں اسپتال سے ایک مریض کو لے کر جانا تھا۔ ریاض بھائی کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے انہوں نے سواری چھوڑنے کی ذمے داری میرے سپرد کرتے ہوئے احتیاط سے جانے کی تاکید کی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ اسپتال سے مریض کو لیا اور خدا کا نام لے کر اس گاؤں کی جانب چل پڑا۔ تمام راستے ورد جاری تھا۔ میرے قریب آگے بیٹھے بزرگ نے میری روحانی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے مجھ سے اپنے مریض کی صحت کے بارے میں دعا کی عرض کی۔ اس سے قبل بھی متعدد بار لوگوں نے اس بارے میں کہا تھا، مگر میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ کسی کے لیے دعا یا بددعا کروں۔ غیر یقینی سی کیفیت تھی مجھ پر، میرے منہ سے بس برجستہ ایک ہی فقرہ نکلتا تھا کہ اللہ خیر کرے گا۔

جب میں سواری چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑا تو اس بزرگ نے رات اس کے پاس ہی رکنے کے لیے کہا، مگر میں نے انکار کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ واپسی کے لیے گاڑی کا انجن بھی فٹ ہے، اس لیے اللہ کا نام لے کر واپس چل پڑا۔

☆......☆

ابھی میں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ گاڑی کا اگلا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میں نے گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کرتے ہوئے انجن بند کیا اور ڈگی سے جیک وغیرہ نکال کر ٹائر کھولنے لگا۔ جب ٹائر تبدیل کر کے سامان واپس رکھ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ جیسے کوئی میرے آس پاس موجود ہے۔ ڈر نام کی کوئی بھی چیز میرے اعصاب پر حاوی نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ شروع ہوش سے ہی میں اس کیفیت سے بے نیاز تھا۔ اس لیے میں نے اس بات

کا کوئی بھی نوٹس نہ لیا اور اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر ڈگی بند کرتے ہوئے اسٹیئرنگ پر آن بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہوئے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ جاری ورد میں ایک بار پھر میں نے وہی احساس محسوس کیا اور غیر ارادی طور پر میں نے گھوم کر پچھلی سیٹ پر دیکھا تو ایک سات آٹھ سالہ بچہ وہاں موجود تھا۔ پہلی بار میرے پورے وجود میں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی اور میں نے ورد کرنے کی رفتار کو اور تیز کر دیا اور اس صورت حال کے بارے میں اپنے اندر کی قوت کو کنٹرول کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اُس کی طرف اشارہ کیا۔

''میں وضوک ہوں، اُدھر سرحد پار رہتا ہوں۔ گھومنے پھرنے کے لیے آیا تھا۔'' یہ بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ میرے اندر لحہ بھر کو چھائی ہوئی خوف وڈر کی چادر آہستہ آہستہ سمٹنے لگی تھی اور پھر ایک دم میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بے دار ہو گئیں۔ تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس اگلی سیٹ پر آ جاؤ۔ چند پل کے توقف بعد وہ پیچھے سے ہوتا ہوا میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو وضوک دوستی کرو گے مجھ سے۔'' میں نے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بس میں نے آگے اُتر جانا ہے، پیچھے گھر والے پریشان ہوں گے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ انسان ہے یا کوئی دوسری دنیا کا ہے، بہر حال میں نے پھر ہمت کرتے اسے مخاطب کیا کہ سرحد پار رہتے ہو، یعنی بھارت میں۔''

''ہاں'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار جان بوجھ کر کم کر دی تھی، تا کہ کچھ دیر اُس سے باتیں کر سکوں۔

''تم اس وقت، یعنی میرا مطلب تمہیں اِدھر اُدھر آنے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ میرا مطلب سرحد پار کر کے آنے جانے کا خطرہ''

''یہ تو آپ انسانوں کو ہوتا ہوگا، میں تو جن ہوں'' اس بار اس نے ہنستے ہوئے میری پریشانی دور کر دی اور میں جیسے مطمئن سا ہو گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اس گاؤں کے ایک عیسائی نے اپنے بس میں کر رکھا ہے۔ وہ مجھ سے کام تو کوئی نہیں لیتا، بس مجھے حاضر کر کے وہ آنے والے لوگوں کے سامنے مختلف کام، مثلاً چیزیں اِدھر اُدھر پھینکنا، پہلے سے لا کر رکھی ہوئی چیزیں کھانے پینے والی، پرفیوم، سگریٹ اور ایسی ویسی ہی دوسری اشیاء ان کے سامنے رکھ دینا، جس کا کوئی کام وغیرہ کرنا ہو تو اسے دوسرے کمرے میں یا کہیں باہر جا کر کاغذ پر لکھنے کا کہتے مجھے اشارہ کر دینا۔ میں اس کی حاجت اور وہ تمام نام، جو وہ لکھ رہا ہوتا ہے، اسے پڑھ کر اس سے پہلے جا کر اسے بتا دیتا۔ جب وہ کاغذ پر لکھ کر اندر اس کے سامنے آتا، تو وہ اسے بغیر چھوئے کہے گا۔ 'اسے جلا دو' اب جو لکھنے والے کو وہ سب لکھا بتائے گا، تو آگے آپ خود اندازہ لگا لو، پھر وہ کام کے عوض کئی کئی ہزار کی رقم جنات کی کڑاہی اور حاضری کے نام کی کسی پلیٹ وغیرہ پر رکھوا دے گا، جو میں ان سب کی آنکھوں کے سامنے اُٹھا کر اس کی جیب میں ڈال دیتا ہوں اور دینے والا یہی سمجھتا ہے کہ اس کی رکھی ہوئی رقم جنات لے گئے ہیں۔ بھلا ہمیں کسی چیز کی کمی یا ضرورت ہے؟ بس جب سے میں اس کے قابو آیا ہوں، وہ یہی کچھ کرتا آ رہا ہے۔ اب بھی میں اس کے بلانے پر وہ سب کچھ کر کے واپس جا رہا تھا کہ آپ کو مصیبت میں دیکھ کر رُک گیا، مگر جو وظیفہ آپ کر رہے ہیں، اس کی فضیلت کے طفیل آپ کو چھیڑنے یا تنگ کرنے کی بجائے اس اُمید پر آپ کے سامنے آ گیا ہوں کہ آپ مجھے اس شخص کی قید سے نجات دِلا سکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وضوک نے میری طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''وضوک بیٹا میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت میں مصروف رہتا ہوں۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں صحیح کرتا ہوں یا کوئی کمی ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''میرے بڑے یہ بتاتے ہیں کہ اسم اعظم ہی اس خبیث کا توڑ ہے۔ جب وہ مجھے حاضر کرنے کے لیے شیطانی عمل کر رہا ہو تو اس کے قریب یا آس پاس اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا جائے، تو میں اس کی قید سے

آزاد ہو جاؤں گا۔'' وضوک نے بتایا۔
''مگر مجھے تو اسم اعظم کا کوئی ادراک ہی نہیں۔ چلو اگر میں تمہاری آزادی کے لیے اسم اعظم پر عبور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تمہاری حاضری کا جو وہ کرتا ہے اور کب کرتا ہے۔''
''وہ اس وقت مجھے حاضر کرتا ہے، جب کوئی آسامی اس کے پاس آتی ہے۔ آس پاس کے گاؤں میں اس کا خاصا چرچا ہے۔ کوئی نہ کوئی دن رات میں آیا ہی رہتا ہے اس کے پاس۔ وہ کم بخت گالی گلوچ بہت کرتا ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنے دھونس جمانے کے لیے گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ مار پیٹ بھی کرتا ہے۔''
مار پیٹ سے کیا مراد ہے۔''تم اس سے اس قدر ڈرتے ہو۔''
''ہاں وہ اپنے علم کے ذریعے مجھے بہت تکلیف پہنچاتا ہے'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
''وضوک میں کوشش کروں گا کہ تمہیں آزادی مل جائے، مگر بیٹا ایک بات دھیان سے سن لو۔ میں تمہاری طرف سے کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں، کیوں کہ میری منزل ابھی نہ ہونے کے برابر ہے۔''
''نہیں ایسی کوئی بھی حرکت میری طرف سے نہیں ہوگی اور پھر ہماری نسل میں یہ بات سرے سے نہیں کہ ہم بلاوجہ کسی کو تنگ کریں۔ بس میں اس کی زد میں آ گیا، میرے بڑے گزر گئے اور میں پھنس گیا۔ میں اپنے لوگوں میں جا کر آپ کا تذکرہ کروں گا اور اپنے ماں باپ سے اجازت بھی لوں گا آپ کے پاس آتے جاتے رہنے کی۔''
''تمہیں کیسے پتا چلے گا میرا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔''
''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دو۔ بس لمحہ بھر کے لیے مجھے خود پر آنے کی اجازت دے دو، کوئی تکلیف نہیں ہوگی آپ کو۔'' میں نے بغیر سوچے سمجھے وضوک کو اجازت دے دی۔ وہ پل بھر میں میرے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے پورے جسم میں ہلکا سا بھاری پن محسوس ہوا، جیسے کسی نے میرے کندھوں پر دونوں جانب ادھر اُدھر کپڑا لٹکا دیا ہو۔ یہ کیفیت کچھ منٹ رہی، پھر یوں لگا، جیسے وہ کپڑا ہٹا دیا گیا ہو۔ وضوک دوبارہ میرے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔
''کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہوا میرے آنے سے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نامکمل ہیں، مگر میرا کہنا یہ ہے کہ آپ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر کوئی کمی ہے تو صرف راہبر کی، مرشد کی، جو باقاعدہ آپ کی انگلی تھام کر آپ کو منزل کی طرف لے جائے۔''
شہر کے آثار دور سے نظر آنے لگے تھے۔ وضوک نے جانے کا کہتے ہوئے پھر آنے کا وعدہ کیا اور مجھے پھر اسم اعظم کے بارے یاد دلایا اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا وظیفہ جاری تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پہلا انعام ملا تھا کہ کوئی جن، چاہے وہ بچہ ہی تھا، بغیر کسی چلہ کشی کے، اس کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا اعزاز مجھے ملا تھا۔

☆......☆

وضوک سے ملنے کے بعد میرا وجود اس مخلوق کے ڈر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے وضوک جن کی شکل پر غور کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی اصلی شکل میں مجھے ملا تھا۔ اس کی آنکھیں انسانوں سے ذرا مختلف تھیں۔ ہماری پتلیاں گول اور وضوک کی الف کی مانند سیدھی، جب کہ اس کے کان عام انسانوں سے تھوڑے اوپر کی جانب لمبے اور دونوں کانوں کی سائیڈ پر دو چھوٹے چھوٹے نوکیلے اُبھار سے تھے، جیسے کسی نوخیز ہرن کے سر پر ابتدائی دور میں نظر آتے ہیں۔ اس کے جسم پر بچوں کی طرح کا لباس تھا، جو اس پر خاصا جچ رہا تھا۔ اس کے جانے سے بعد مجھے کئی سوال یاد آئے، جو مجھے اس سے پوچھ لینے چاہیے تھے، مگر خوف اور تذبذب کے عالم میں بس واجبی سی ہی گفتگو کر سکا تھا میں اس سے۔
واپس آ کر میں رات گئے تک اپنا ورد کرتا رہا، پھر صبح نماز پڑھ کر سو گیا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ جتنی مرضی نیند غالب آ جائے، اگر آدھا گھنٹہ، پندرہ منٹ آنکھ لگ جائے تو میری نیند پوری ہو جاتی ہے۔ دکان چوں کہ میں کھولتا تھا اور ریاض بھائی بعد میں آتے تھے۔ ان کے آنے پر میں حسب معمول اوپر قلعے پر پیر مراد علی شاہ شہید المعروف (پیر مرادیہ) حضرت امام سرخرو شہید اور

پانچ پیر کے درباروں پر آ جاتا اور اپنی روح کی تسکین کا سامان کرتا رہتا۔

وضوک نے مجھے اسم اعظم کی جانب موڑ دیا تھا اور مجھے تو اتنا شعور نہیں تھا، مگر اسم اعظم تک رسائی بھی ضروری تھی۔ پیر مرادیہ سرکار کا متولی سید گل بہار شاہ، جن سے اکثر میری یاد اللہ رہتی تھی، جو میری منزل دیکھ کر مجھ سے متاثر بھی تھا، ویسے بھی اللہ کا نیک اور پرہیزگار بندہ ہونے کے ناتے مجھ پر شفقت کرتا رہتا تھا، وہ اپنے حجرہ میں موجود تھا۔ میں سیدھا دربار سے ان کے پاس آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ زیر لب مسکرائے اور بولے۔

"جی چھٹہ جی خیر خیریت تو ہے؟"

"شاہ جی ایک عرض لے کر آیا ہوں، گر قبول ہو تو۔"

"ہاں بولو بیٹا۔"

"شاہ جی اسم اعظم کے بارے میں پوچھنا ہے۔ اگر آپ میری مدد فرمائیں تو۔"

"بیٹا میرے بزرگوں نے تو مجھے "یا حی یا قیوم یا ذوالجلال والاکرام" کا ورد بتاتے کہا تھا کہ دھیان اور مراقبے کی اشد ضرورت ہے۔ اس میں پرہیز اور ہر طرح کا گوشت ترک کرنا ہوگا۔ دودھ اور پانی ہی اکتالیس دن تک ہوگا۔ خوراک میں، بغیر کسی کامل اور مرشد راہبر کے بہت مشکل ہوگا۔"

میرے ذہن میں فوراً سرکار سید اصغر علی گیلانی پیر بودیاں والا کا چلہ یاد آ گیا، جو وہ 21 دن تک قبرستان میں دن رات بیٹھے کرتے رہے تھے۔ ان کی خوراک بھی صرف دودھ پانی تھا۔ میں نے اپنے مشاہدے کے مطابق شاہ جی کی خدمت میں وہ ساری بات دہرائی تو انہوں نے فرمایا۔

"بیٹا وہ بہت بڑی ہستی ہیں۔ میرا کہا مانو تو ان کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ وہ ضرور تمہاری مدد فرمائیں گے۔"

میں یقین پختہ کرتے ہوئے واپس آیا اور بھائی ریاض احمد اور اپنی شریک حیات سے اجازت لی۔ ویسے بھی مجھے کئی دنوں سے والد اور والدہ خواب میں ملتے آ رہے تھے اور میں نے ان کی قبروں پر فاتحہ خوانی کا ارادہ کیا ہوا تھا۔

☆.....☆

مجھے اپنے آبائی شہر میں آ کر ایک عجیب طرح کا سکون نصیب ہوا۔ میرا وطیرہ بن چکا تھا کہ ہر لمحہ ورد میں مصروف رہتا۔ لاکھوں بار کے ورد نے میرے اندر انتہائی نرمی پیدا کر دی تھی۔ بڑے سے بڑا دکھ ہنس کر سہ جاتا تھا۔ صبح اُٹھ کر قبرستان آ گیا۔ سائیں جی اور دیگر رفقائے کار بڑی محبت سے پیش آئے۔

ان سے فارغ ہو کر والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی قبروں پر آن بیٹھا۔ تلاوت کے دوران آنکھوں سے آنسو بھی جاری رہے۔ جب خوب دل کی تسلی ہو گئی تو آخری بار فاتحہ پڑھ کر شہر خموشاں کے باسیوں کی نذر کیا اور سائیں عاشق علی کے ڈیرے پر آ گیا۔

سائیں جی بھنگ کو رگڑا لگا رہے تھے۔ میرے بیٹھنے پر خیر خیریت کے بعد لمبی جدائی کا گلہ کیا۔ میں نے انہیں اپنے حالات سے آگاہ کیا اور ساتھ میں سرکار سید اصغر علی گیلانی صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے حجرہ شاہ مقیم جا کر پتا کرنے کا کہا۔

میں زیادہ دیر نہ رکا اور وہاں سے اُٹھ کر پوسٹ آفس کی طرف چل پڑا۔ میں اسلم کرپلانی کو ملنا چاہتا تھا، جو پوسٹ آفس کے باہر عرضی نویسی اور اسٹامپ پیپر کا کام کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑی محبت سے ملا۔ کچھ دیر میں اس کے پاس رہا، پھر اجازت لیتے ہوئے بس اسٹینڈ پر آ گیا۔

حجرہ شاہ مقیم کا سفر تقریباً چالیس پچاس منٹ کا تھا۔ سرکار شاہ مقیم کے دربار شریف پر حاضری دی، پھر وہاں سے پیر بودیاں والا سرکار کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کافی عرصے سے نامعلوم کہاں چلے گئے تھے۔ ان کے صاحب زادے پیر اختر علی شاہ گیلانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے بارے میں پوچھا تو وہی جواب ملا، جو دربار شریف پر موجود گدی نشین حضرات نے بتایا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر واپسی کے لیے بس میں سوار ہو گیا۔ گھر آ کر بڑے بھائی صاحب سے اجازت مانگی واپس جانے کی، مگر بھابی ماں، جنھیں میں بی بی جی کہا کرتا تھا، انہوں نے روک لیا۔ آخر کو وہ میری ماں تھیں، جن کا کہا میرے لیے ماں

کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

صبح اُٹھ کر ناشتا کیا اور بڑی آپا فیروزہ کو ملنے پاک پتن چل دیا۔ ویسے بھی دربار شریف جانے کو دل مضطرب تھا۔ بہن بڑے پیار سے ملی، بہنوئی صاحب، جن کا نام محمد شریف تھا، مگر وہ تھے بھی شریف انسان۔ ان کا بھی زیادہ تر وقت سرکار بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے سجادہ نشین دیوان صاحب کے ڈیرے پر گزرتا تھا۔ ان کے ہمراہ دربار شریف پر حاضری دی۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے وضو کیا اور دربار شریف کی مسجد میں نماز مغرب ادا کر کے ان کے ہمراہ دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سیکڑوں نیاز مندوں میں ایک کونہ مجھے بھی میسر ہو گیا۔

عجیب نظارہ تھا۔ قوال سرکار کا کلام پیش کر رہے تھے اور محفل پر وجد طاری تھا۔ عشاء پڑھنے سے بعد بھائی محمد شریف گھر چلے گئے تھے۔ میں دربار عالیہ کے ایک کونے میں جا بیٹھا۔ دل میں تو ورد جاری رہتا ہی تھا، پھر زبان بھی ساتھ دینے لگی تھی۔ کوئی رہبر ہوتا تو کم از کم سیدھی راہ دکھا دیتا۔ یہاں تو بس ایک ہی ذات پر انحصار چلا آ رہا تھا بس، اسی کی لو پورے وجود میں عشق بن کر دوڑ رہی تھی۔ میں نے پیر مرادیہ کے متولی شاہ جی کا بتایا ہوا راستہ اختیار کر لیا اور بابا فرید گنج شکرؒ کی چوکھٹ پر سوہنے کی یاد میں مشغول ہو گیا۔ بے خودی، بے نیازی، نہ اپنا ہوش، نہ دنیا سے واسطہ۔ ایک دو بار بہنوئی صاحب آئے اور مجھے اسم اعظم کے وجد میں ڈوبے دیکھ کر بغیر بات کیے چلے گئے۔ اسی طرح یاد الٰہی میں آٹھ روز بیت گئے۔ ورد کی تعداد اکیس لاکھ تک پہنچ گئی، مگر دلی کیفیت میں کوئی بھی بدلاؤ نہ آیا تھا۔

☆......☆

نماز عشاء میں نے ادا کرتے ہوئے سلام کے بعد نظریں اوپر کیں، تو میرے دائیں جانب وضوک ایک خوب رُو، دراز قد شخص کے ہمراہ بیٹھا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور احترام صاف طور پر دکھائی دیا۔

"باباجی یہ میرے والد صاحب ہیں، میں آپ کے آس پاس ہی پھرتا رہتا ہوں۔ مجھے سب خبر ہے۔ آپ میرے لیے جو کچھ بھی کر رہے ہیں۔" وضوک کے والد نے مجھے سلام کرتے ہوئے اپنا نام یولیس بتایا اور اپنے بیٹے کی آزادی کے لیے استدعا کی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میں یہ سب کچھ کر پاؤں گا، مگر میرے دل میں وضوک کے لیے باپ جیسی ہی محبت اور شفقت موجود ہے۔ ہم ایمان والے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے والے ہیں۔ میرے قبیلے کے کسی شخص نے بھی، میرے سمیت نے انسان کو تو تنگ کیا ہے اور نہ ہی کبھی سوچا ہے اس بارے میں۔ ہمارا پورا قبیلہ نقل مکانی کر کے سرحد پار جا رہا تھا اور وضوک اس عیسائی کی پکڑ میں آ گیا۔ اللہ پاک نے ہماری دعائیں سن لیں، جو آپ کو اس کے لیے نجات دہندہ بنا کر بھیج دیا۔"

"ٹھیک ہے یولیس بھائی، سوہنا اللہ پاک دلوں کے بھید خوب جانتا ہے، اب آپ جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔" یہ کہتے میں نے اپنا سر جھکاتے ہوئے ورد پھر سے شروع کر دیا۔ میں آپ کو بتا تا چلوں کہ دونوں باپ بیٹے کی آمد نے مجھ پر کوئی تاثر نہ چھوڑا تھا۔ میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ جیسے عام زندگی میں لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے، اسی کیفیت میں دونوں سے محو گفتگو تھا۔ دونوں سلام کرتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"باوا صاحب کے دربار کا کونا سنبھالے اور ورد کرتے مجھے 25 روز ہو چکے تھے۔ اس دوران بہن فیروزہ بھی دربار آ کر مل گئی تھی۔ میں نے ہر طرح کا گوشت اور اناج، پھل، فروٹ، چائے وائے ترک کر دیا تھا۔ بھائی محمد شریف جو دودھ پانی رکھ جاتے، اگر حاجت ہوتی تو تھوڑا بہت پی لیتا، ورنہ یاد الٰہی ہی سے پیٹ بھرا رہتا۔

تہجد پڑھنے کے بعد ہلکا ہلکا خمار ذہن پر چھانے لگا اور ورد کرتے کرتے آنکھ لگ گئی تو خواب میں مجھے بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا دیدار ہوا، جو سرکار بری امامؒ کی چوکھٹ پر جانے کا کہتے ہوئے دربار شریف کے باہر بہشتی دروازے کے اندر چلے گئے۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میرا پورا وجود لطف و کیف میں سرشار تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ولایت کی امید نے

مدہوش کر ڈالا تھا۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہو گیا تھا اور مجھے باوا جی سرکار کا خواب میں دیدار ہو گیا تھا، جو مجھے سرکار بری امامؒ کی چوکھٹ تھامنے کی نوید سنا گئے تھے۔ میری دن رات کی عبادت عشق خداوندی رنگ لائی اور میری بھٹکی ہوئی روح کو جیسے قرار مل گیا تھا۔ خوشی میرے جسم کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہی تھی۔ شکرانے کے نفل ادا کرتا آخری بار باوا سرکار کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے ہوئے دربار شریف پر الوداعی نظر ڈالتے بہن کے گھر کی جانب چل پڑا۔ بہن میرا بدلا حلیہ اور بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں کی لالی دیکھتے ہی تڑپ اُٹھی، مگر اسے کیا معلوم یہ 35 سالہ مسافت کا تھکا ہوا مسافر بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے دیدار سے سرفراز ان کے حکم کی بجا آوری کے لیے اپنے اگلے سفر پر کمر بستہ ہونے جا رہا ہے۔ بہن کے اصرار پر چند لقمے لیے اور نہا کر اس سے ملتے ہی اجازت لی اور پاک پتن کی سرزمین کو آنکھوں سے چومتا ہوا داتا صاحب حاضری کے لیے بس میں سوار ہو گیا۔

☆......☆

لاہور پہنچ کر رات دربار شریف پر قیام کیا۔ اسم اعظم تو جانے کب سے دل میں محفوظ کرنے کا عمل تو کسی بھی لمحے خود سے جدا نہیں ہوا تھا۔ اب تعداد لاتعداد ہو گئی تھی۔ روح میں ان دیکھی روشنی کی کرنیں منور ہو چکی تھیں۔ دنیاوی آرام و آسائش، کھانا پینا اور سونا قربان ہونے کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جو دل و دماغ حکم دیتا اس پر چل پڑتا۔ دل میں آیا کہ اسلام آباد جانے سے پہلے ایک چکر گھر کا لگا آؤں تو سیالکوٹ کی طرف چل پڑا۔

رات گئے بس اسٹینڈ سے پیدل گھر کی جانب چل چلا۔ دستک پر بیوی نے دروازہ کھولا۔ جی بسم اللہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو ہٹ گئی۔ بچے جاگ اُٹھے تھے اور مجھے دیکھتے ہی باری باری لپٹ گئے تھے۔ ممتاز، جسے گھر میں تاج بھی کہتے تھے، نے کھانے کا پوچھا، مگر میں نے صرف دودھ کا کپ ہی لیا۔ دونوں بیٹیاں اور بیٹا میرے بستر پر میرے دائیں بائیں لیٹے ہوئے تھے اور میں تاج سے خیر خیریت کی باتوں میں آہستہ آہستہ دودھ بھی پی رہا تھا کہ اچانک اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"محمد حسین تمہارے بھجوائے ہوئے روپے مل گئے تھے، جو آپ نے پاک پتن سے بھیجے تھے۔"

"روپے، کون دے کر گیا تھا" میں نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

"باپ بیٹا تھے۔ بڑا کہا کہ کھانا، چائے وغیرہ پی کر چلے جانا، مگر وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ پھر کسی روز آئیں گے، جب چٹھہ جی گھر پر ہوں گے۔"

"کتنے روپے تھے؟"

"سات ہزار" ممتاز نے خالی گلاس اُٹھاتے جواب دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا یولیس اور وضوک پاک پتن سے میرے گھر بھی آ پہنچے تھے۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے تاج پر کوئی بھی ایسا فقرہ نہ منہ سے نکالا، جس سے وہ خوف زدہ ہو جائے۔ میرے پاس کوئی بھی عمل یا رابطہ نہیں تھا، جو میں دونوں کو حاضر کر کے ان سے اس نوازش کے بارے میں پوچھ گچھ کر سکتا۔ بہر کیف دل میں ان کے لیے دعا اور دیے گئے روپے واپس کرنے کا سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ تاج نے بچوں کو ان کے بستر پر لٹاتے ہوئے میرے پیچھے ہونے والے حالات سے مجھے آگاہ کیا کہ فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ، پھر وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں بچوں کے پاس چلی گئی۔ میں وضو کر کے یاد الٰہی اور ورد وظیفہ میں گم ہو گیا۔

☆......☆

صبح اُٹھ کر دکان پر گیا۔ میرے سسر مستری محمد حیات دونوں بیٹوں کے ہمراہ موجود تھے، وہ بڑی محبت سے ملے۔ فرداً فرداً سب کا پوچھا۔ بھائی سجاد، جن کو عرف عام میں کاکا بھائی کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ یہ سب سے چھوٹے تھے کہ میاں جی نے چائے لانے کا کہا اور باتوں میں لگ گئے۔ اسی دوران بس کا ٹائر آ گیا۔ بڑے دنوں کے بعد مشقت کو ہاتھ لگایا تھا۔ جلدی ہانپنے لگا تو بھائی ریاض نے فقرہ کسا۔

"چٹھہ صاحب ہاتھ ڈھیلا چل رہا ہے۔" میں جواباً ہنس کر رہ گیا۔ اسلام آباد جانے کے لیے میں مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ یہاں آ کر زندگی پھر اسی ڈگر پر رواں ہو گئی تھی۔

☆......☆

شاہ جی کی خدمت میں پہنچ کر میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ سرکار بودیاں تو نہیں ملے، مگر میں نے آپ کا بتایا ہوا وظیفہ اسم اعظم کی مد میں شروع کر دیا تھا اور خواب میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ آئے اور مجھے سرکار بری امامؒ کی چوکھٹ پر جانے کا اشارہ کر گئے، تو انہوں نے مشورہ دیا کہ جب تک گھر والوں کی رضامندی نہ میسر آئے تو مت جانا، یونہی پھر میں نے ان کے گوش عرض گزاری کی کہ میری غیر موجودگی میں وضوک اور اس کا والد مجھے سے مل کر کچھ روپے میری بیوی کو دے گئے کہ میں نے پاک پتن سے ان کو خرچہ بھجوایا ہے۔“

”چٹھہ جی، یہ مخلوق بھی ہماری طرح محنت مزدوری کر کے اپنی گزر بسر کرتی ہے۔ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہ بھی رزق حلال کماتے ہیں۔ بے شمار مشاہدات و واقعات بھرے پڑے ہیں ان کے کاموں سے، خیر اگر وہ کچھ دے گئے ہیں تو اس میں ان کی محبت شامل ہو گی۔ اگر موقع ملے تو آپ بھی تبادل کر لینا کچھ۔“

میری منزل دن بہ دن آگے بڑھتی جا رہی تھی اور طبیعت کسی اور طرف مائل تھی، جیسے کچھ کھو گیا ہے اور اس کی تلاش جاری و ساری ہے، پھر ہمت کر کے میں نے اپنی بیوی سے سارے معاملات ڈسکس کرتے اسلام آباد شفٹ ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کرماں والی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی، ”جیسی مرضی آپ کی۔“ اس کا جواب سن کر جیسے میرے کندھوں پر سے بوجھ ہٹ گیا۔

کچھ دن بعد میں اجازت لے کر اسلام آباد آ گیا۔

☆......☆

سب سے پہلے میں نے سرکار بری امامؒ کی چوکھٹ پر حاضری دی اور پھر اپنے کام پر لگ گیا۔ یہاں دربار کے آس پاس رہتے بڑا سکھ چین نصیب ہوتا۔ تمام کھانے کی چیزوں کو ترک کر دینے سے جسم کا دبلا پن اور نمایاں ہو گیا تھا۔ میری عبادت کو دیکھ کر دربار میں مستقل رہائش پذیر درویشوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی اور ایک اللہ لوک نے مشورہ دیا کہ اوپر بری سرکار کے چلہ والے مقام پر چلا جاؤں، تا کہ میری عبادت میں خلل نہ پڑے۔

میرے لیے یہ مشورہ اچھا تھا۔ میں نے دربار شریف سے اُٹھ کر اوپر پہاڑ کی طرف چل پڑا، ادھر بھی بری سرکار کے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ زائرین کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں کئی گھنٹے کی مسافت کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں بری امام سرکارؒ نے غار کے اندر کئی سال بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی اور آپ پر ولایت کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ میں اس جگہ پہنچ کر واقعی بہت راحت محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف بیٹھ کر میں نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ سرکار کے دربار کا گنبد آنکھوں کے روبرو تھا۔ یہاں ذکر کرنے میں واقعی بڑا سرور ملا۔ کئی دن کی ریاضت میں مصروف رہنے سے جسم میں نقاہت کی بجائے توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں بری امام سرکار کا لنگر دن رات جاری رہتا۔ لنگر تقسیم کرنے والے جو کچھ ہوتا میرے قریب عبادت میں مگن ہوتے دیکھ کر رکھ جاتے، وہ انہیں دوپہر، شام، رات حتیٰ کہ دوسرے روز بھی جب وہ رکھنے آتے تو اسی حالت میں ملتا، کیوں کہ کچھ کھانے کی حاجت ہی ختم ہو چکی تھی۔ زیادہ ہوتا تو میں تھوڑا دودھ یا چائے کا کہہ دیتا۔ مجھے یہاں مسلسل عبادت کرتے اَن گنت دن ہو گئے تھے۔ اس دوران دو بار وضوک یہاں میرے پاس آیا اور تشکر آمیز انداز میں بیٹھ کر چلا گیا، کیوں کہ میں نے نہ کوئی بات کی اور نہ سنی۔ اسی دوران ایک بزرگ یہاں آئے اور لنگر تقسیم کرنے والوں کے بتانے پر کہ کوئی اللہ کا بندہ دن رات عبادت میں مصروف ہے، نہ کسی سے بات کرتے ہیں اور نہ کچھ کھاتے ہیں، بس کوئی وظیفہ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ بزرگ میرے پاس آئے، سلام دعا کے بعد براہ راست مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا اور کہا کہ اگر مرشد نہیں ملا تو کیا ہوا، تمہاری تلاش تو جاری ہے، کسی وقت بھی اس کی نظر کرم ہو سکتی ہے۔ آپ کو اگر حصار کا وظیفہ آتا ہے تو گیارہ دن اکتالیس بار کر لیں، پھر جو بھی وظیفہ آپ کریں گے نہ تو اس کا کوئی الٹا اثر ہو گا اور نہ ہی آپ کو تشنگی کا احساس رہے گا۔

مجھے فوراً ادراک ہو گیا کہ یہ بزرگ جو بھی کوئی ہیں، مگر ہیں باطن پر نظر رکھنے والے۔ میں نے بڑی لجاجت و منت سے ان کا ہاتھ تھامتے بے اختیار جاری ہونے والے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ کبھی تو سرکار مدینے والے کا کرم ہوگا، مجھ گنہگار اور نکمے پر۔ حصار کا وظیفہ تو دور کی بات ہے، مرشد کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں، مگر ابھی تک کسی طرف سے کوئی ٹھنڈی ہوا نصیب نہیں ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں، اللہ پاک سے بڑا کوئی رہنما نہیں۔ میں حصار کے کچھ اعمال آپ کو ہدیہ کرتا ہوں اور اجازت بھی دیتا ہوں۔ ان میں جو دل کو لگے کرلینا۔ اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا۔"

"اپنے بارے میں صرف انہوں نے یہ بتایا کہ میں ڈیرہ پھل شاہ گجرات کے قریب رہتا ہوں۔ میرا نام سید نور شاہ ہے۔ اگر کبھی دل کرے تو ملنے آجانا۔" یہ بتا کر انہوں نے عمل حصار کے کچھ وظیفہ جات ہدیہ کیے۔ مجھے ایک رہبر نصیب ہوگیا تھا۔ ان کے بتائے ہوئے عمل میں سے میرے دل کو "الحفیظ الرقیب" حفاظت کرنے والا بڑا نگہبان لگا اور میں نے دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کی کہ اے میرے پروردگار دلوں کے حال آپ پر آشکارا ہیں۔ مجھے تو ٹھیک سے تیری عبادت بھی نہیں کرنا آتی، مگر میں جو بھی کرتا ہوں دل سے اور تیری خوشنودی کے لیے کرتا ہوں اور تجھے ہی اپنا مرشد سچے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ اگر تیری رضا ہوئی، کوئی وسیلہ تیری طرف سے ملا تو مرشد کا حصول بھی آسان ہوجائے گا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس وظیفے کو مجھ پر آسان فرما۔"

دعا مانگ کر نماز عشاء ادا کر کے اول و آخر سات بار درود شریف پڑھ کر اکتالیس سو بار "الحفیظ الرقیب" کا وظیفہ شروع کردیا، جو وقت میں نے اس وظیفے کے لیے مقرر کیا، وہ بعد از نماز عشاء تھا۔ وظیفہ ختم کر کے میں دوبارہ اپنے اسم اعظم کی طرف متوجہ ہوجاتا۔ اسم اعظم کی مسلسل تگ و دو سے یہ ہوا کہ میرا دل وہم، وسوسے اور ڈر سے بے نیاز ہوگیا۔ جوں جوں میں عمل حصار کے دن پیچھے چھوڑ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں وسعت آتی جارہی تھی۔

آخر کار میرا وظیفہ عمل حصار بغیر کسی خاص واقعے کے مکمل ہوگیا۔ اس پہلے اور کامیاب عمل کے لیے شکرانہ کے نوافل ادا کیے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہزار بار شکر ادا کیا، جس نے میری عرض کو شرف کامیابی سے نوازا۔ میرے اندر مضبوطی اور وسعت نے گھر کرلیا تھا۔ میرا ورد اب با بلند آواز جاری ہونے لگا تھا۔ مجھ پر وجد طاری ہو جاتا۔ میری آواز سے پہاڑوں کا سکوت ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ دن اور رات تیزی سے گزرتے جارہے تھے۔ بھوک اور پیاس سے بے نیاز صرف ایک ہی رو میں بھاگا جارہا تھا اور وہ تھی خود کو فنا کرنے کی جستجو۔

☆......☆

پہلی بار اسم اعظم کی قبولیت کا آغاز ہوا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے ورد میں گم تھا کہ پہاڑ کی کھوہ سے ایک ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے بغیر کسی خوف کے آنکھیں کھولیں تو چند قدم کے فاصلے پر ایک بڑے سے ببر شیر کو کھڑے پایا، جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنا ورد تیز تیز آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ببر شیر کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا، پھر بڑی سی چٹان پر یوں بیٹھ گیا، جیسے اُسے میری کوئی پروا نہیں تھی۔ پہاڑوں کی اونچائی پر سے سرکار بری امامؒ کے روضہ مبارک پر روشنیوں کا جگمگ کرتا منظر جو نظارہ پیش کررہا تھا، اسے صرف وہی محسوس کرسکتا ہے، جس کی روحانیت کی طرف جستجو ہو۔ میں اپنے وظیفے کے نشے میں یہ بھول گیا تھا کہ ایک خونخوار ببر شیر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر چٹان پر بیٹھا ہوا میری طرف گھور رہا تھا۔ میں اس سے بے نیاز، اس خالق کائنات کی توجہ کا موجب بننے کی سعی میں پیہم ہر خوف سے عاری تھا۔ پتا نہیں وہ کب نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جب فجر کی اذان میرے کانوں میں پہاڑوں کا سینہ چیرتے پڑی تو میں نے اپنی بند آنکھیں کھولتے ہوئے اس چٹان کی طرف دیکھا، جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پہاڑوں میں سے گزرتا قدرتی نالہ جو اوپر سے نیچے کی جانب گرتا تھا، صرف چند قدم پر تھا، جہاں سے میں پانی بھی پیتا اور وضو بھی کرتا تھا۔ میں نے فجر کی نماز کے لیے وضو کیا اور واپس آکر اپنی مخصوص جگہ پر نماز فجر ادا کی اور تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کا معمول دہرالیا۔ میں تمام رات عبادت میں مشغول رہتا اور صبح فجر پڑھ کر تھوڑی دیر آرام کرلیتا تھا۔ تمام رات جاگنے میں عمل دخل

میری بھوک کا بھی تھا۔ جس پر میں نے فتح حاصل کر لی تھی۔ دن کا اُجالا پھیلتے میں اُٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر مسواک کرتا، منہ ہاتھ دھو کر وضو کرتا اور دوبارہ اپنے ورد میں لگ جاتا۔ اس ببر شیر والے واقعے کے بعد کوئی بھی خاص بات ظہور پذیر نہ ہوئی تھی اور میں اپنے مرشد کی خوشنودی کے لیے ڈٹا رہا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا کہ اچانک وضوک میرے سامنے نمودار ہوا اور بڑی محبت سے میرے قریب آ کر دو زانو بیٹھ گیا۔

''ہاں وضوک کیا چل رہا ہے'' میں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں باباجی، بس اُس پاکھنڈی کے رحم و کرم پر ہوتا ہوں، جو ہر وقت لوگوں کو لوٹتا رہتا ہے۔''

''بس بیٹا سوہنے رب کے حضور دعا گو رہو، وہ بڑا رحیم و کریم ہے، ضرور تمہیں اس کے ظلم سے نجات دلائے گا۔''

''والد صاحب آپ کی خدمت میں سلام کہہ رہے تھے۔ بہت جلد سب قبیلے والے اور میری ماں، بہن، بھائی سب آپ کی دعائیں لینے کے لیے حاضر ہوں گے۔''

''اللہ پاک ان سب پر اپنا کرم فرمائے۔''

وضوک نے بتایا کہ والد صاحب قرآن حفظ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آج کل اُشو میں قاری خولا دشاہ کی مسجد میں آتے جاتے ہیں۔''

''اللہ پاک ان کی مدد فرمائے بیٹا۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک عرض کروں۔''

''ہاں وضوک بولو'' میں نے اس کی طرف دیکھتے کہا۔

''میں آپ کے لیے دودھ اور پھل رکھ جایا کروں؟''

''بیٹا مجھے ضرورت نہیں اور پھر تم اگر کسی کی دکان سے اُٹھا کر لاؤ گے، تو میری اس دن رات کی عبادت پر کیا اثر پڑے گا۔'' میں نے اس کی بات سن کر اپنے دل کا خدشہ زبان سے ظاہر کر دیا۔

''باباجی، آج میں آپ پر یہ واضح کر دوں کہ ہم بھی آپ انسانوں کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنا گھر بار چلاتے ہیں۔ ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔ خود میں ایک دو جگہ محنت مزدوری کر کے ضروریات زندگی چلاتا ہوں۔

ہماری عمریں آپ انسانوں کی عمروں سے سیکڑوں سال زیادہ ہوتی ہیں۔ ہماری بھی شادیاں، غم اور خوشی آپ لوگوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ کچھ روپے جو میرے والد صاحب نے آپ کے گھر پہنچائے تھے، ان کی ضرورت تھی آپ کے گھر اس وقت، کیوں کہ آپ پاک پتن میں تھے اور آپ میرے لیے سب کچھ سہ رہے تھے۔ میں آپ کی خیر خیریت پر نگاہ رکھتا ہوں۔ میں ہر پل آپ کے قریب رہنا چاہتا ہوں، مگر ہم پر بھی کچھ اصول اور قانونِ قدرت کی پابندیاں لاگو ہیں۔ جس طرح انسان ہم سے خوف زدہ ہوتا ہے، ہم انسانوں سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ ہمارا اپنا معاشرہ ہے۔ ہمارے مذہب بھی آپ انسانوں کی طرح ہیں، بس اُس کی مرضی پر سب کچھ چلتا ہے۔'' یہ بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔

''میں چند پل اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس وعدے پر ہاں کر دی کہ میرے پاس پیسے ہیں، جو میں نے تھوڑے بہت اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ گھر سے چلتے وقت جن کی ضرورت نہیں پڑی ابھی تک۔ اگر لانا ہی ہے تو یہ لو کچھ روپے اور تھوڑا سا دودھ اور شہد لا کر کسی وقت دے جانا۔

میں نے اپنی چادر کے نیچے رکھے پیسوں میں سے دو سو روپے اس کی طرف بڑھا دیے اور پھر اسے جانے کا کہا، کیوں کہ میری روح کی پیاس بڑھ رہی تھی۔ وہ سلام کر کے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے اپنا وظیفہ جاری کر دیا۔

وہ کب دودھ اور پھل رکھ گیا، مجھے اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ طبیعت کی بے خودی میں جو ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی، اس کے برعکس بری امام سرکار کے قدموں میں بیٹھ کر ایک لطف بھی ملا تھا۔ میری آنکھوں کے روبرو پھل اور دودھ موجود تھا، مگر میں نے ثابت قدمی سے اپنی بھوک پر کنٹرول رکھا ہوا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے، طبیعت کا بھاری پن پورے وجود پر پھیلا ہوا تھا، جیسے میرا احساس مجھے خبردار کر رہا ہو کہ کچھ ہونے والا ہے۔ بار بار میرا دھیان چوک رہا تھا، کبھی بچے یاد آ جاتے، کبھی گھر کی فکر جاگ پڑتی۔ اس طرح کے دنیاوی خیالات میری عبادت میں خلل ڈال رہے تھے۔ دوپہر کے قریب مجھے

کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ایک خوبرو دوشیزہ کو اپنے سامنے پایا، جس کا انداز مجھے گم راہ کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا، مگر میں نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، تو میرے کانوں میں اس کی دل کش آواز آئی۔

"کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو، چھوڑو یہ سب کچھ، آؤ میں تمہیں زندگی کی تمام رعنائیاں اور خوشیاں دینے کے لیے خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو، کیوں حقیقت سے دور بھاگ رہے ہو۔"

میری آزمائش، میرا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ بار بار میرے وظیفے میں خلل پڑ رہا تھا۔ یک دم میرے اندر جیسے دیوار اُٹھ گئی اور میرے عمل میں تیزی آ گئی۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ میرے اندر جو بے چینی پیدا ہو چکی تھی، اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، مگر میں اپنی دھن میں لگا ہوا تھا اور میرا ورد تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

وہ رات میرے لیے بڑے کڑے امتحان کی تھی۔ کبھی اپنے چاروں جانب ایسی آوازیں سننے لگتا جیسے ہزاروں گھوڑے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہوں، کبھی پرندوں کے پروں کی تیز شائیں شائیں گونجنے لگتی، کبھی اپنے آس پاس بین کرتی عورتوں، بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتیں اور کبھی سیکڑوں گیدڑوں کے چیخنے کی صدائیں۔ غرض یہ کہ صبح فجر تک میں اسی کش مکش میں اُلجھا رہا۔ سامنے سرکار بری امامؒ کا روضہ جگمگا رہا تھا اور میں اپنے حصار کے اندر محو ہو کر اپنے عمل کی تکمیل میں مصروف تھا، پھر میں اللہ تعالیٰ کی مدد مانگتا ہوا اُٹھا، وضو کیا اور نمازِ فجر ادا کر کے تھوڑا بہت دودھ اور پھل لیا اور حسبِ عادت لیٹ کر آرام کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ دورانِ آرام بھی میرا قلب جاگتا رہتا۔ آنکھ لگ گئی، خواب میں سرکار بری امامؒ اسی چٹان پر، جہاں کچھ روز پہلے میں نے ببر شیر بیٹھا دیکھا تھا، آپ براجمان تھے۔ بڑی محبت سے بولے۔

"میرے پاس بھیجنے والے نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تجھے مرشد کی ضرورت ہے، جو تیرا ہاتھ تھام کر تجھے تیری منزل کا راستہ دکھائے۔ جاؤ سوراسی سیدیاں کی طرف جاؤ، تیری سفارش کر دی ہے۔"

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ خوشی اور یقین کی ٹھنڈی پھوار میرے پورے وجود پر برس رہی تھی۔ سجدۂ شکر ادا کیا۔ آنسوؤں نے میرے پورے جسم کا پانی آنکھوں کے راستے بہا دیا تھا۔ میں اُٹھا اور اپنا مختصر سا زادِ راہ سنبھالا، نوگندی کے پُر اثر مقامات پر آخری نظر ڈالی اور سرکار کی چوکھٹ پر حاضری کے لیے نیچے جانے کے لیے چل پڑا۔ جب لنگر تقسیم کرنے والوں اور زائرین کے قریب سے گزرا، تو وہاں موجود سب لوگ میرے گرد عقیدت سے اکٹھے ہو گئے اور اپنے اپنے بارے دعا کی استدعا کی۔ پہلی بار میں نے سچے دل اور سچے جذبے سے اپنے مرشد، اپنے پروردگار اور سرکار بری امامؒ کی خدمت میں سب کے دکھ، درد، سُکھ، چین میں بدلنے کی دعا کی اور سب سے فرداً فرداً مل کر نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ سرکار کے دربار پر حاضری دی اور آنکھوں سے لاکھوں بار تشکر آمیزی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کے خواب میں بتائے مقام کی جانب چل پڑا۔

دنیاوی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا کوئی سلیقہ نہیں تھا، بس ایک حب اور جذبہ تھا شروع دن سے، پھر مرشد کے بتائے ہوئے اذکار اور آشیرباد کی روشنی میں صراطِ مستقیم کی راہ میں آسانیاں تو ملتی ہی ہیں۔ سوراسی کوہ مری پہنچ کر پوچھتا پوچھتا مرشد کے علاقے سوراسی سیداں میں پہنچ گیا۔

بابا لال حسین شاہ صاحب اپنے آستانہ مبارک میں موجود تھے، مجھ پر نگاہ پڑتے ہی زیرِ لب مسکرائے اور فرمایا۔

"آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی بیٹا۔"

"نہیں بابا جان" میں نے بڑے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ "آپ کے آستانہ مبارک پر بہت سے چاہنے والوں کا ہجوم تھا۔ ایک خدمت گار نے مٹی کے پیالے میں چائے میرے سامنے رکھتے ہوئے پرچ میں گڑ کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں بھی رکھ دیں۔ بابا جان نے ایک ڈلی گڑ کی اٹھا کر اپنے دانتوں سے آدھی کرتے ہوئے فرمایا۔

"لو بھئی، بڑی سفارش لائے ہو اپنے ساتھ۔"

میں نے عقیدت سے ان کا جھوٹا گڑ منہ میں ڈال لیا۔

آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ورد دہرا ابھی پڑھا اور الحمد شریف پڑھنے کے بعد مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے آہستہ سے فرمایا۔

"وہی مرشد سب سے بڑا مرشد ہے۔ تقویٰ اور پرہیز کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا۔ اپنے وظیفے میں "اللہ ہو" کا اضافہ کرلو۔ سچے دل اور یقین کے ساتھ آگے بڑھتے رہو۔"

انہوں نے اپنے گلے میں سے تسبیح اُتار کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے میرے گلے میں پہنا دی اور مجھے اپنی نگاہ التفات کا اسیر کرلیا۔ میرے گلے میں اپنی ذمے داری کی سند پہنا دی۔ میں بھی سرکار بری امامؒ کے خادمین میں شامل ہوگیا۔

بابا جان لال حسین شاہ صاحب نے اپنے علاقے میں آزادانہ اجازت فرمادی کہ جہاں دل چاہے بیٹھ کر اپنا چلّہ کرتے رہو۔ میں نے ان کے قدموں میں ہی پناہ کی درخواست عرض کردی۔ انہوں نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے فرمایا۔

"ادھر بیٹھے رہا کرو۔"

میں ان سے اجازت لے کر آستانہ مبارک کے انتہائی بائیں جانب جہاں آمد ورفت قدرے کم تھی، جا بیٹھا اور دھیان لگالیا۔ دن بہ دن ریاضت کا لطف بڑھنے لگا۔ بابا جان کی رفاقت اور وہاں موجود مریدان کی توجہ مجھ گنہ گار پر ہمہ وقت رہتی۔ ایک نیا اسلوب محسوس ہورہا تھا دھیان میں۔ لطف کا اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔

مجھے بابا جان کے آستانے پر پورے ساٹھ روز ہوچلے تھے اور ورد کی تعداد چالیس لاکھ سے بھی تجاوز کرچکی تھی۔ بابا جان کی عنایت کی ہوئی تسبیح ہر پل میرے ہاتھوں میں رہتی اور لبوں پر اب "الحفیظ الرقیب اللہ ہو" کا ورد جاری تھا۔ یہاں میرے ساتھ ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا، جو میں دل میں تصور کرتا، خواب میں مجھے اس کا جواب مل جاتا۔ جو میرے سامنے اُسی حالت میں آجاتا، جو میرے تصور میں ہوتا۔

☆......☆

بابا جان سرکار لال حسین شاہ صاحب سوراسی سیداں والا اپنے علاقے کی جانی مانی ہستی تھے۔ ان کے مریدان میں وزراء، جنرل، بریگیڈیئر، کرنل، میجر، کیپٹن، صنعت کار غرض کہ ہر مکتبۂ فکر کے افراد موجود تھے۔ آپ کی کرامات کا چرچا پورے پاکستان میں زبان زد عام تھا۔ آپ عاشقِ رسولؐ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کی سرفرازی میں آئے مجھے قریباً ساڑھے سات ماہ کا عرصہ ہوچلا تھا۔ میرے وظیفوں کی تعداد کئی لاکھ تک جا پہنچی تھی۔ اس ورد کی گرمی سے میرا وجود تنور کی مانند شعلہ صفت ہوچکا تھا۔ میں جب بہت زیادہ بے چین ہوجاتا تو تمام کپڑے اتار کر صرف خود کو ایک بڑی چادر میں ڈھانپ لیتا، جب کہ مری کا موسم انتہا کا سرد ہوتا۔ میرا حال جب وہاں موجود مرید اور خدمت گار دیکھ کر بابا جان کو بتاتے تو وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوجاتے کہ اللہ خیر کرے گا۔ اس دوران وضوک نے ایک بار بھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔ مجھے اس کی فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں ہے، اسی رات وہ خواب میں آگیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سرکار بابا لال شاہ کی حدود میں کسی بھی جنات کا داخلہ منع ہے۔ آپ جلا کر بھسم کردیتے ہیں۔" میں مطمئن ہوگیا۔

☆......☆

ماہِ رمضان شروع ہوچکا تھا۔ میں باقاعدگی سے روزے رکھتا اور صرف کھجور اور پانی سے افطار کرتا، سحری میں ایک گلاس دودھ ہوتا یا ساتھ میں چائے کا پیالہ لیتا۔ یہاں روزہ رکھ کر جو لطف عبادت کرنے میں ملتا، وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ستائیسویں رات عبادت میں مصروف تھا کہ یک دم مجھے اپنے اردگرد ایک ایسی روشنی کا احساس ہوا، جو میں نے کبھی اپنی حیاتی میں کہیں نہیں دیکھی تھی، پھر اس روشنی میں سبز ریشم کے لباس میں نورانی چہرہ بزرگ میرے سامنے موجود تھے۔ میں نے جھک کر ان کو سلام پیش کیا اور ان کی خدمت میں عرض کی کہ آپ اپنا تعارف فرمائیں۔ انہوں نے میرے سلام کے جواب میں فرمایا کہ میں اس ورد کا موکل ہوں اور آج سے آپ کے ہر جائز کام کو کرنا میری ذمے داری میں ہوگا۔ جب آپ یہ لفظ، جو میں آپ کو بتانے لگا ہوں، ایک سوایک بار پاک صاف ہوکر حصار کریں گے تو میں آپ کی خدمت میں آسجاؤں گا۔ یہ یاد رہے کہ ایسی کوئی خواہش یا

حرص و طمع اور غرض، جو اپنی ذات کے لیے ہو، اس سے گریز کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ لوگوں کے بھلے کی ہی کوشش کرنا۔ یہ بتا کر وہ اس روشنی میں مدغم ہو گئے۔

سحری کے وقت بابا جان نے خدمت گار کے ہاتھ مجھے مبارک باد کا پیغام بھیجا اور اپنے پاس بلایا۔ میں سحری سے فارغ ہو کر اپنے دھیان میں لگ گیا اور نماز فجر کے بعد اپنی جہاں جگہ میں پچھلے ساڑھے سات ماہ سے اپنے رب کے حضور گریہ زاری اور عبادت میں مصروف تھا، کو چھوڑ کر بابا جان کی خدمت میں دوسری بار حاضر تھا۔

بابا جان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے میں ان کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ ”محمد حسین مرشد کی یاری پکی ہو گئی نا، اب تمہیں یہاں سے جانا ہو گا۔ سوہنے کے بندوں کی عرضیاں سوہنے کی خدمت میں پیش کرنے، ان کے دکھ بانٹنے۔ یہاں سے جا کر مجھے اپنے تصور میں پکا کرنا۔ جب میرا دھیان تیرے اندر گھر کرنے لگے تو سمجھ لینا تیری منزل آسان ہو گئی۔“

انہوں نے مجھے (سبحان اللہ العظیم باموکل) کا ورد دیا اور اسم اعظم باموکل کی کامیابی پر میں نے گیارہ سو روپے کی مٹھائی منگوا کر بابا جان کی خدمت میں ہدیہ کی، جو انہوں نے دعا پڑھنے کے بعد سب میں تقسیم کر دی اور ایک شاپر میں گھر جانے کے لیے بھی ڈال کر میرے سپرد کر دی اور سب کو روزہ کے افطار میں مٹھائی شامل کرنے کا بھی فرمایا۔

آج میرا دل جہاں ڈھیر ساری خوشی سے بامور تھا، وہاں میری آنکھوں سے اپنے مرشد سے جدائی کا بھی غم تھا۔ سب سے مل کر اجازت لی اور واپس سرکار بری امامؒ کے روضہ مبارک پر جانے کے لیے ویگن میں سوار ہو گیا۔ بابا جان کا بتایا عمل میں نے شروع کر دیا تھا۔ بابا جان کا تصور ابھی دھندلا دھندلا سا تھا، مگر میرے اندر ان کی شبیہ چلتے پانی کی مانند متحرک تھی۔ افطاری سرکار کے لنگر سے کی، نماز دربار شریف کی مسجد میں پڑھنے کے بعد اپنے اگلے سفر، یعنی سیالکوٹ چل پڑا۔ اٹھتے بیٹھتے ”سبحان اللہ العظیم باموکل“ کا ورد شروع تھا۔ اس کی بابا جان کی جانب سے مجھے باضابطہ اجازت تھی۔ ان کا تصور پکا کرنے کی، جس کی کوشش میں نے شروع کر دی تھی۔

مری سے سیالکوٹ تک آتے آتے بابا جان کا تصور ذہن میں پکا کرنے اور عمل کا ورد کرنے میں مصروف رہا۔

☆......☆

گھر آ کر جو اپنے لوگوں سے سننا پڑا، اس میں ڈانٹ بھی شامل تھی۔ گھر کا ایک کمرہ صاف ستھرا کر کے میں نے فرش پر بوریا بستر لگا لیا تھا۔ جب میں اپنے کمرے میں آ جاتا تو گھر والی خود اور بچوں کو اپنے روم میں لے جاتی، باقی چرند پرند تو ترک کر دیے تھے میں نے، مگر اب دال، سبزی، چاول، روٹی کم مقدار میں شروع کر چکا تھا۔ وضوک کا آنا جانا لگ چکا تھا اور میں اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اب معاملہ یہ طے پایا کہ میں خود اس عیسائی عامل کے پاس جاؤں اور جب وہ وضوک کو حاضر کرنے کا عمل شروع کرے تو میں اس کے مقابل اسم اعظم کا ورد شروع کر دوں۔

☆......☆

ایک دن میں تیار ہو کر اس گاؤں کی طرف چل پڑا، جہاں مریض لے کر چھوڑنے گیا تھا۔ گاؤں میں اس عامل بشیر مسیح کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا اور میں گاؤں میں الگ عیسائیوں کی چھوٹی سی بستی میں پہنچ گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اسے میں نے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ میں آپ کے پاس اپنا حساب لگوانے آیا ہوں۔ بہ طور نذرانہ میں نے ہزار کا ایک نوٹ پہلے سے اس کی خدمت میں پیش کر دیا اور اُسے تھوڑا سا تعریف کا چھینٹا لگایا کہ سنا ہے آپ کے پاس ہوائی چیزیں بھی موجود ہیں۔ اگر آپ ان سے میرا کام کروا دیں تو میں آپ کی بھرپور خدمت کروں گا۔ وہ فوراً راضی ہو گیا اور مجھے اپنے مکان کے اوپر والے حصے میں لے آیا۔ جوں ہی اس نے اپنا علم شروع کیا، میں نے حصار کرتے اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ وضوک کے آنے کے آثار شروع ہو گئے۔ میرے ورد میں تیزی آ گئی، یک دم بشیر مسیح پڑھتے پڑھتے زمین بوس ہو گیا۔ وضوک نے اسے دبوچ رکھا تھا اور اس کے منہ سے بکواس جاری تھی اور اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔

بشیر مسیح تمہیں ان چھوٹے سے بچے پر اپنا عمل کرتے شرم نہ آئی۔ اس سے پہلے کہ یہ تجھے تیری زندگی

سے آزاد کر دے، اس کو اپنی سفلی قید سے رہا کر دو۔"

بشیر مسیح نے اشارے سے، رضامندی سے وضوک کو آزاد کرنے کا اقرار کیا تو فوراً وضوک نے اُسے چھوڑ دیا اور غائب ہو گیا۔ بشیر مسیح نے جیب سے میرا دیا ہوا ہزار روپیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بڑے دکھی لہجہ میں کہا۔

"چشتیہ صاحب آپ نے میری چلتی روزی بند کرا دی ہے۔"

"بشیر مسیح رزقِ حلال اور حرام میں تمیز رکھو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ہزار روپے کا نوٹ دوبارہ اس کی طرف کرتے ہوئے اُسے سمجھایا اور اس کے مکان سے باہر نکل آیا۔

میں واپس جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ وضوک بچے کی شکل میں آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا، پھر میرے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ سیٹ پر میرے برابر ہی بیٹھا تھا اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے گھر والوں کو خبر کر دی تھی اپنی آزادی کی۔ وہ میرے ساتھ گھر آ گیا۔ میری بیگم نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ بچہ تھا اپنے والد کے ساتھ جو آپ کی غیر موجودگی میں پیسے دے کر گئے تھے۔

وضوک میرے بچوں میں گھل مل گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کہ اگر ان سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ جن ہے تو سب کی جان نکل جائے گی۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر وضوک کو بلایا اور اُسے گھر جانے کے لیے کہا۔

"جی بابو جی"

وہ اپنے والد کو بھی بابو جی کہہ کر بلاتا تھا اور آج پہلی بار اس نے مجھے بابو جی کہہ کر جواب دیا تھا۔

"بابو جی ایک اجازت لینا چاہتا ہوں آپ کی؟"

"ہاں بیٹا بولو!"

"اگر کبھی آپ کو اور ماں جی یا اپنے بہن بھائی کو ملنے کا دل چاہے تو میں آ جایا کروں۔"

"کیوں نہیں بیٹا سو بار" میں نے محبت سے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہ سلام کر کے غائب ہو گیا۔

میری بیگم چائے دینے آئی تو اس نے میرے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وضوک کو نا پا کر وہ پریشان ہو گئی۔

"کدھر گیا وہ بچہ"

"وہ تو چلا گیا" میں نے پلیٹ میں سے ایک کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو سامنے بیٹھی ہوں، اُڑ کر چلا گیا کیا؟"

میری بیگم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک بار پھر کمرے میں نظر دوڑائی۔ میں نے دوسرا کپ اُسے خود پینے کے لیے کہا، جو وہ وضوک کے لیے زیادہ دودھ ڈال کر لائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی تاثرات مجھے نمایاں دکھائی دے رہے تھے، پھر وہ کپ واپس لے گئی۔ میں بابا جان کا بتایا وظیفہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ تصور کا حصار بھی قائم کرتا رہا۔

☆......☆

شاہ صاحب کے پاس دن میں ایک دو بار اوپر قلعے میں ضرور جانا ہوتا تھا۔ شام کو جب میں اُن کے پاس گیا تو وہاں کافی لوگ موجود تھے اور شاہ جی ایک اٹھائیس تیس سالہ خاتون کے گرد حصار کھینچ رہے تھے۔ اس پر آسیب تھا اور وہ غرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اُلٹی ہو رہی تھیں اور اس کے حلق سے طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ کافی دیر تک وہ پڑھتے رہے، مگر وہ کسی طرح بھی قابو نہیں آ رہی تھی، پھر وہ تیر کی سی تیزی سے کھڑی ہوئی اور بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹی اور شاہ صاحب کو نیچے گرا کر ان کے سینے پر سوار ہو گئی اور اپنے نوکیلے ناخنوں سے شاہ صاحب کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ وہاں موجود تمام لوگ سہمے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ آسیب شاہ صاحب پر غالب آ چکا تھا۔ میرے قریب کھڑے لوگوں میں سے ایک آہستہ سے بولا۔

"اس بدبخت نے بہت سے عاملوں کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے، جو شاہ صاحب کے ساتھ کر رہا ہے۔" شاید وہ اس خاتون کے لواحقین میں سے کوئی تھا۔ اچانک جیسے مجھے ہوش آ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر حصار کیا اور اپنے مرشد اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اسم اعظم کا ورد کرنے لگا۔ یک دم وہ خاتون شاہ صاحب کو چھوڑ کر میری طرف جھپٹی، مگر میں نے آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لیے اور

ورد کی رفتار تیز کر دی۔ اسی لمحے اسم اعظم کا موکل حاضر ہو گیا اور میرے وجود کو اپنے زیر اثر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس کے بال چھوڑ دو یہ ابھی دفع ہو جائے گا۔" میں نے پڑھتے پڑھتے اس خاتون پر پھونکا تو وہ مردانہ آواز میں چیخنے چلانے لگی۔

"مجھے معاف کر دو، میں چلا جاتا ہوں۔" میں نے اپنے موکل کی طرف دیکھا، جنہوں نے فرمایا۔

"اس سے وعدہ لے کر جانے دیں۔ اس طرح یہ آپ کا ہمیشہ کے لیے تابع ہو جائے گا۔" لوگ حیران تھے کہ میں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ خاتون زمین پر اوندھے منہ لیٹی گریہ زاری کر رہی تھی۔ میں نے سخت لہجہ اختیار کرتے اس چیز کو مخاطب کیا۔

"کون ہو تم اور کیوں اس بے چاری کو بے حال کر رکھا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی بدبخت۔ کہاں سے آئے ہو؟"

جواب میں اس خاتون نے مردانہ آواز میں بتایا۔

"میرا نام ضرغام ہے اور میں آزاد کشمیر میں رہتا ہوں۔"

"اب تم جاؤ گے یا میں تمہیں بھسم کر دوں۔" میرا ورد اندر سے مسلسل جاری تھا۔ میرے موکل نے فرمایا کہ اس سے جانے کی نشانی مانگیں۔ میں نے ضرغام کو تحکمانہ دوبارہ اس خاتون کو چھوڑنے کا کہا تو اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔

"تو نشانی کیا دیتے ہو جانے کی۔" ضرغام نے فوراً اس خاتون کے جسم کو چھوڑ دیا جو زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ سب لوگوں کے سامنے قریب لگے درخت کی بڑی سی شاخ یک دم ایک جھٹکے سے ٹوٹی اور میرے قدموں میں آ پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بدصورت جن موجود تھا، جو کسی مجرم کی طرح گردن جھکائے میرے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ میرے موکل نے سر سے اس کو دفع ہو جانے کا فرمایا تو میں نے دوبارہ نہ آنے کا اس سے وعدہ لیا اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ یک دم ہوا کی سی تیزی سے غائب ہو گیا۔ میں نے خاتون کے پورے وجود پر اسم اعظم پڑھ کر پھونک ماری اور اس کے لواحقین کو گھر جا کر نیاز دینے کا کہا۔ وہ خاتون بالکل نارمل حالت میں ایک طرف سہمی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے گلاس میں پانی منگوا کر دم کیا اور اسے پینے کے لیے کہا۔ خاتون کو لائے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے بتایا کہ بہت سے عامل آئے اور اس آسیب نے ان کا بڑا حشر کر کے بھگایا۔ شاہ صاحب نے ان کو جانے کا کہا اور مجھے لے کر اپنے حجرے میں آئے۔ جوں ہی میں نے دھیان ہٹایا تو میرا موکل بھی تشریف لے گیا۔

"محمد حسین مجھے خوشی ہوئی ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے تیری محنت کا پھل تیری جھولی ڈالا۔"

ان کی گردن پر لگنے والے ناخنوں سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا، جو انہوں نے باہر والا ان میں ہر وقت جلنے والے بچ سے راکھ اُٹھا کر ان خراشوں کے اوپر لگا دی۔ وہاں موجود لوگوں کے ہجوم نے یہ سارا واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نیچے چاروں طرف یہ بات پھیل گئی کہ محمد حسین چٹھہ کے پاس کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے۔

آہستہ آہستہ بھائی ریاض کی دکان پر مجھے ملنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ لوگ میرے پاس آتے۔ میں ہر وقت اپنے مرشد کا دیا ہوا وظیفہ پڑھتا رہتا اور اپنے مرشد بابا لال شاہ سرکار کا تصور اپنے دل و دماغ میں پکا کرتا رہتا اور لوگوں کے مسائل سن کر اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کر دیتا۔ دور دور سے لوگ آتے۔ رش کی وجہ سے بھائی ریاض کے کام کا حرج ہونے لگا تو میں نے وہ جگہ چھوڑ کر اسٹیشن کے ایک تنہا گوشے میں پناہ لے لی۔ میرے چاروں طرف ایسے لوگوں کی بھرمار ہوتی جو خود کو میرا مرید کہتے، مگر میں تو خود مرید تھا سرکار کا، میں کسی کو کیا مرید کرتا۔ کئی بار ایسے واقعات رونما ہوئے جن کو دیکھ کر لوگ آگے ہی آگے پھیلا دیتے اور دکھ مصیبت کے مارے لوگ میرے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ مرشد کا تصور پکا ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کو فیض ہو رہا تھا۔

ایک حافظ قرآن بچی، جس کو یوٹرس کینسر تھا اور سب علاج، لاعلاج ثابت ہوئے تھے۔ وہ جہلم سے میرے پاس لائی گئی تھی۔ میں نے پانی دم کر کے اسے دیا اور اسم اعظم کی برکت سے اس کی بیماری تیزی سے کم ہونے لگی۔ وہ بالکل تندرست ہو گئی تو وہ ہزاروں روپے کا نذرانہ اور بہت کچھ لائے، مگر میں نے ان سے کوئی بھی

چیز نہیں لی، صرف ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کی گھر جا کر نیاز دینے کا کہا۔ وہ گھر جانے کی بجائے ادھر ہی دو دیگوں کا سامان لے آئے اور باورچی کا انتظام بھی انہوں نے ادھر ہی کیا۔ نیاز کی دو دیگوں کو ادھر ہی میرے سامنے تقسیم کر دیا۔

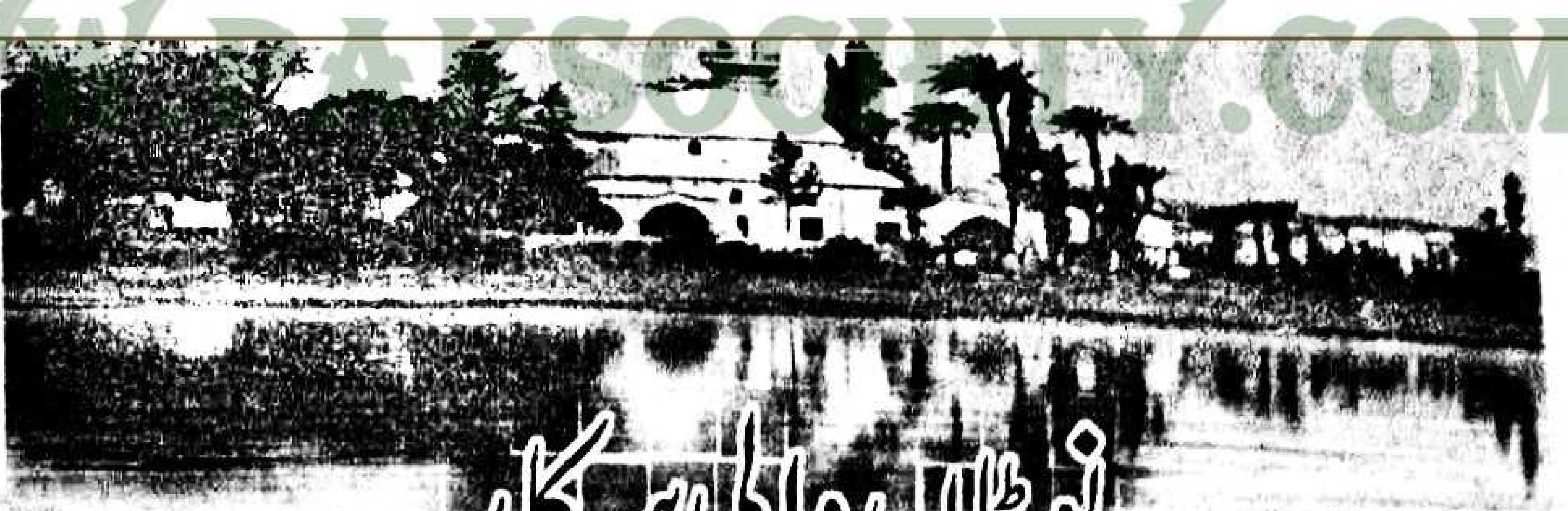
میرا حج چابڑھتا جا رہا تھا اور میں اپنی عبادت کو بڑی مشکل سے جاری رکھے ہوئے تھا۔

ایک روز خواب میں میرے مرشد بابا لال شاہ تشریف لائے اور حکم دیا کہ تم لالچ اور طمع کا شکار ہو رہے ہو، اس سے کنارہ کشی کرنے کی کوشش کرو۔

میں صبح اُٹھا اور سب لوگوں کو چھوڑ کر گھر آیا اور اپنی بیگم کو ضروری سامان باندھنے کا کہا۔ اس کرماں والی نے کوئی سوال جواب نہ کیا۔ بچوں کو تیار کیا اور ضروری سامان باندھ لیا۔ بھائی ریاض کو بلا کر میں نے سارے حالات سے آگاہ کیا۔ ان کی کار کرائے پر مانگی راول پنڈی جانے کے لیے۔ انہوں نے بڑے تحمل سے کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر ایک مشورہ ہے کہ تم پہلے جا کر وہاں رہائش اور کام کا بندوبست کرو۔ جب وہاں تمہارے پاؤں جم جائیں، مجھے فون کرنا میں سب کچھ خود آ کر چھوڑ جاؤں گا۔“ ان کا مشورہ مجھے اچھا لگا اور میں نے سیالکوٹ کو خیر باد کہا اور رات کو بس میں سوار ہو گیا۔ تمام راستے میرا ورد جاری رہا۔ صبح راول پنڈی پہنچ کر سب سے پہلے کام کی تلاش میں نکل پڑا۔ میرے پاس لائسنس موجود تھا۔ ایک اللہ کے ولی نے ٹیکسی کا بندوبست کر دیا اور میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا کام میں لگ گیا۔ چند دن تک مجھے خاص خاص مقامات ازبر ہو گئے اور رہائش کے لیے بھی ایک دوست نے انتظام کر دیا۔ یہاں میں صرف گم نام رہ کر ایک ٹیکسی ڈرائیور کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ میری کوشش ہوتی کہ سواری اسلام آباد کی ہی ملے۔ اس بہانے سرکار بری امامؒ کی چوکھٹ کی حاضری بھی مل جاتی۔ میں اب مکمل طور پر بہتر محسوس کرتا روزمرہ کے کاموں میں اپنے مرشد لال حسین شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ وہ مجھ پر خاص شفقت رکھتے تھے۔ گھر والوں کو میں نے مستقل سیالکوٹ سے راول پنڈی شفٹ کر لیا تھا اور یہاں روٹی روزی کی فراوانی تھی۔ دن رات رزق حلال کے لیے کوشاں رہتا۔ جب کوئی ضروری معاملہ درپیش ہوتا تو میں اپنے اسم اعظم کے موکل کی مدد بھی حاصل کر لیتا۔ وضوک، یولیس اور اس کے خاندان کے لوگ متعدد بار مجھ سے ملاقات کر چکے تھے۔ یولیس نے قرآن پاک کو دو بار مکمل کر لیا تھا اور پہلا پارہ حفظ کرنے میں مصروف تھا۔ وضوک میرے یاد کرنے پر فوراً حاضر ہو جاتا۔ وضوک کو میں نے سرکار بابا لال حسین شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ان کے ہاتھ پر اس کی بیعت کروا دی تھی اور وہ بھی نورانی قاعدہ شروع کر چکا تھا۔ سرکار خود اس کو روز سبق دیتے اور وہ بڑی توجہ سے یاد کرتا۔ نماز بھی شروع کر دی تھی اس نے۔ میری عبادت کا سلسلہ اسی انداز میں جاری تھا۔ جیسا مرشد فرماتے، میں ان کا حکم بجا لاتا۔ پھر ایک پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ گیارہ جون بروز منگل 1967ء سوا تین بجے سرکار بابا لال حسین شاہ صاحب دنیا سے پردہ کر گئے۔ میں دیوانوں کی طرح بھاگا۔ ان کا روضہ سوراسی سیداں کوہ مری ان کے آستانہ شریف پر ہی بنایا دیا گیا۔ میں پورے چالیس روز سوگ میں ان کی قبر کے پاس دن رات عبادت میں مشغول رہا۔ وہ کئی بار میرے خواب میں آئے، مختلف حوالوں میں نظر آتے تھے۔ اب تو ماشاء اللہ ان کا روضہ مبارک وسیع تر ہو چکا ہے۔ گیارہ جون کو بہت بڑا عرس منایا جاتا ہے سرکار کا۔ لاکھوں زائرین سوراسی سیداں کوہ مری میں ان کے عرس پر موجود ہوتے ہیں۔ سرکار بری امامؒ کی محبت اور اپنے مرشد کی حاضری میں یہاں موجود رہتا ہوں۔ چاہ سلطان راول پنڈی میں شایان ٹائر سروس پر لوگوں کے دکھ سکھ میں ہمہ وقت موجود ہوتا ہوں۔ سرکار کا بڑا کرم ہے، لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔ پہلے دن سے لے کر آج تک میں فی سبیل اللہ بندگان خدا کی خدمت میں مصروف ہوں۔ بے شمار لوگ شفایاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اللہ سوہنے کا بڑا کرم ہے یہ صدقہ دن دوگنی رات چوگنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

☆......☆



نوٹاں والی سرکار



ممتاز احمد

سرگودھا سے، ایک برگزیدہ ہستی میاں عبدالرشید المعروف نوٹاں والی سرکار کی فیضیات





میں نے جب ہوش سنبھالا تو گھر میں غربت و افلاس کا راج تھا۔ گھر بھی کیا تھا بس صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس کے سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ اور ایک جانب باتھ روم اور ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ میرے والد نور حسین ایک پلے وار (مزدور) تھے۔ وہ شہر کے وسط میں واقع ایک بہت بڑی اور مشہور دکان پر ٹرکوں سے سیمنٹ، سریا، گارڈر اور ٹی آئرن وغیرہ اُتارتے اور اسی طرح ریڑھیوں اور گاڑیوں میں لوڈ کرتے۔ اسی دکان کے مالک عبدالوحید صاحب نے دکان کے پچھواڑے میں یہ جگہ ہمیں رہنے کے لیے دی ہوئی تھی۔ میری والدہ محترمہ ایک صابر وشاکر مذہبی خاتون تھیں۔ نماز پنجگانہ کی ادائگی کے ساتھ ساتھ وہ نوافل، تہجد بھی ادا کرتیں اور کثرت کے ساتھ کلمہ شریف اور درود پاک کا وِردان کی زبان پر جاری رہتا۔

ہماری گزر بسر بہت مشکل سے ہوتی تھی۔ ہمیں صرف سال میں ایک بار گوشت کھانا نصیب ہوتا تھا، وہ بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر، اگر کسی کے گھر سے آجاتا تو کھا لیتے ورنہ...... باقی پورا سال اچار چٹنی اور کبھی کبھی دال سبزی کھانے کو مل جاتی۔ میں بچپن سے ہی بہت حساس طبیعت کا انسان رہا ہوں۔ میرے والدین کو بہت شوق تھا کہ میں پڑھ لکھ کر معاشرے میں کوئی مقام حاصل کروں، کیوں کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور میری پیدائش میرے والدین کی شادی کے پندرہ سال بعد بڑی منتوں، مرادوں سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ماں باپ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ جب میں سن شعور کو پہنچا تو مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا، جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ میں باقاعدگی کے ساتھ اسکول جاتا اور دل لگا کر پڑھتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہر سال اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لیتا اور رزلٹ والے دن ابا جلیبیاں لے کر آتے، امی جان والہانہ انداز میں مجھے خوب پیار کرتیں۔ زندگی کی اسی ڈگر پر چلتے چلتے میں نے سائنس مضامین کے ساتھ میٹرک کا امتحان دیا۔ ابھی رزلٹ نہیں آیا تھا کہ ایک دن میرے والدین کسی ملنے والے کے گھر سے تانگے پر واپس آرہے تھے کہ اس تانگے کا ایک بس سے ایکسیڈنٹ ہوگیا، جس کے نتیجے میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دونوں اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ مجھ پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ جب ابا اور امی کی میتیں گھر آئیں تو میں ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ مجھ پر غشی کے دورے پڑتے، بڑی مشکل سے لوگوں نے

مجھے سنبھالا اور پھر میرے والدین کو سرگودھا شہر کے مرکزی بڑے قبرستان میں سپردخاک کر دیا گیا۔

میری تو دنیا ہی اُجڑ گئی تھی اور میں یتیم و بے سہارا اور تنہا رہ گیا تھا۔ دکان کے مالک عبدالوحید صاحب مجھے بہت تسلیاں دیتے، میری دلجوئی کرتے اور تین وقت کا کھانا ان کے گھر سے آتا، مگر میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہ کرتا۔ میں سارا سارا دن اپنے والدین کی قبروں پر جا کر روتا رہتا۔ مجھے ایک پل بھی سکون نہ ملتا تھا۔ میری حالت دیوانوں جیسی ہوگئی تھی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ میرے دل میں بڑی بے چینی اور بے سکونی تھی۔ میں اپنے والدین کی قبروں

پانی پیا اور اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے بھی مارے، پھر جب میں واپس جانے لگا تو دیکھا کہ سامنے برآمدے کے نیچے دس بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے ایک تیز آواز آئی۔

”ڈاکٹر اِدھر آؤ۔“ چند لمحوں بعد وہی آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ڈاکٹر اِدھر آؤ۔“

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے اپنے علاوہ وہاں کوئی بھی کھڑا ہوا نظر نہ آیا۔ میں حیرانگی کی کیفیت میں کھڑا تھا کہ برآمدے کے نیچے بیٹھے ایک صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ بیٹا جلدی سے اِدھر آؤ، سرکار تمہیں بلا رہے



کے پاس بیٹھا تھا کہ مجھے بہت تنگی سی محسوس ہوئی اور مجھے اتنی سخت پیاس لگی کہ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے حلق میں کانٹے اور انگارے بھر گئے ہوں۔ میں پانی کی تلاش میں قبرستان سے باہر نکلا اور سڑک پر ایک جانب سے بے سدھ چلنے لگا۔ سخت سردی کا موسم تھا، مگر مجھے جون جولائی کی گرمی کی طرح تپش اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے جب میں تھوڑا آگے بڑھا تو قبرستان کے ساتھ ہی مجھے ایک مسجد نظر آئی۔ میں نے وضو خانے میں جا کر

ہیں۔ جب میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ تشریف فرما ہیں اور وہ مجھے ہاتھوں کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ باقی سب لوگ خاموش مؤدب ان کے اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ سب میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان بزرگ کے قریب پہنچا تو انہوں نے اپنا بازو آگے کیا اور کہنے لگے۔

”ڈاکٹر ذرا میری نبض تو چیک کر۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”سرکار میں تو ابھی بچہ

ہوں، بے آسرا اور یتیم ہوں، میرا تو ابھی میٹرک کا رزلٹ بھی نہیں نکلا، میں کہاں کا ڈاکٹر......؟" تو وہ بزرگ تھوڑے جلال میں آ گئے اور کہنے لگے۔

"تم نے سنا نہیں، تم ڈاکٹر ہو اور میری نبض چیک کرو۔" تو میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ ان کی نبض پر رکھ دیا اور میرے منہ سے نکلا۔

"سرکار آپ کو تو بہت تیز بخار ہے اور آپ کے سر میں بھی درد ہے۔" جس پر وہ بولے۔ "تُو نے میرا مرض بوجھ لیا ہے، اب بتا تُو ڈاکٹر ہے کہ نہیں......؟ اے تُو ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر ہے تُو......تُو ڈاکٹر ہے۔ چل پہلے لنگر کی روٹی کھا اور پھر کل میرے لیے دوا لے کر آنا۔"

انہوں نے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لنگر خانے لے گیا، جہاں سے میں نے روٹی کھائی اور واپس اپنے گھر آ گیا۔

☆......☆

اگلے روز بے اختیار میرے قدم ایک میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھے اور میں نے بخار کی دوا مانگی تو میڈیکل اسٹور کے مالک نے مجھے پیراسیٹامول کی چار گولیاں دیں اور پیسے بھی نہیں لیے۔ میں وہ گولیاں لے کر ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا تو وہ بزرگ فرمانے لگے۔

"ڈاکٹر تُو آ گیا، لا میری دوا دے۔" تو میں نے وہ گولیاں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ انہوں نے دو گولیاں پانی کے ساتھ کھا لیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ فرمانے لگے کہ تُو......تو بڑا پکا سیانا ڈاکٹر ہے، تیری لائی ہوئی دوا سے میری طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے۔"

جب میں وہاں سے واپس آنے لگا تو انہوں نے آواز دی کہ "اپنی فیس نہیں لو گے......؟"۔

میں نے عرض کی "حضور کیسی فیس......؟"

"تم نے میری نبض چیک نہیں کی، دوا نہیں لائے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا اور فرمانے لگے۔

"یہ لے اپنی فیس اور ہاں اس کو سنبھال کر رکھنا، ضرورت کے وقت بہت کام آئے گا اور ہاں اب تم جاؤ، مگر روزانہ یہاں آتے رہنا، ناغہ نہ کرنا۔" پھر میں وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دن وہاں گیا تو وہ بزرگ کہیں جا رہے تھے، مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

"جاؤ وضو کر کے مسجد میں نفل پڑھو، میں تھوڑی دیر تک آ رہا ہوں۔" اور میں نے ایسا ہی کیا۔ نفل پڑھنے کے بعد میں ان کے آستانے پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ وہاں اور بھی بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ تو اس نے بتایا کہ نام تو ان کا میاں عبدالرشید ہے، مگر یہ "نوٹاں والی سرکار" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے پاس بہت سارے پیسے اور نوٹ ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ "ان کے پاس اتنے ڈھیر سارے روپے کہاں سے آتے ہیں؟" تو اس شخص نے بتایا کہ میاں صاحب سڑکوں پر بکھرے کاغذ اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور ان کاغذوں کو اپنی جھولی میں بھر کر لاتے ہیں اور ایک دری کے نیچے رکھ دیتے ہیں اور اگلے روز وہ کاغذ نوٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، پھر ان پیسوں سے غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں، اس لیے ان کو نوٹاں والی سرکار کہتے ہیں۔ پھر اس دن میں نے بڑے غور سے ان کے آستانے کو دیکھا تو ان کے تکیے کے قریب بہت سارے نوٹ بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر گزری تو میاں صاحب اپنی جھولی میں کاغذوں کا ڈھیر اکٹھا کر کے لائے اور ان کو دری کے نیچے ڈال دیا۔ اس دن میں نے دیکھا کہ دسمبر جنوری کی شدید سردی تھی، میاں صاحب نے کوئی سویٹر، جرسی کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کھلی آستین کا ململ کا کرتہ اور دھوتی پہنے رکھتے اور ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے تھے۔

آپ ایک مجذوب صوفی بزرگ تھے اور اکثر حالت جذب میں رہتے تھے۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو دیکھا کہ ایک پچاس پچپن سال کی عمر کے ایک شخص کو دو آدمی سہارا دے کر لا رہے تھے۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ لاٹھی اور دو بندوں کے سہارے بڑی مشکل سے چل کر آیا اور میاں صاحب کے سامنے گڑگڑانے لگا کہ حضور بہت عرصے سے پورے جسم اور خاص طور پر جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوں، چلنے پھرنے

اور اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ بہت سارے ڈاکٹرز اور حکیم آزمائے، مگر معمولی سا بھی فرق نہیں پڑا۔ میں بہت عاجز آ گیا ہوں۔ اس بیماری سے، تو خدا کے لیے میرے حق میں دعا فرمائیں اور کچھ کریں۔

اس وقت میاں صاحب حالتِ جذب میں تھے اور غصّے اور جلال کے عالم میں بولے کہ تُو اس مالک کا دیا ہوا رزق تو کھاتا ہے، مگر اس کا نہ تو شکر ادا کرتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھتا ہے۔ تُو اب شکایت کیسی کرتا ہے؟" یہ سن کر وہ شخص رونے لگا اور معافیاں مانگنے لگا تو اس پر میاں صاحب کہنے لگے کہ معافی مانگنی ہے تو اب رَب سے مانگ اور اسی کی نماز پڑھ اور ہر دم اُسی کا شکر ادا کر۔" پھر اس شخص نے آئندہ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کا وعدہ کیا تو میاں صاحب نے کہا کہ اپنے دونوں ہاتھ آگے کرو۔ جب اس نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف بڑھائے تو انہوں نے کچھ پڑھ کر اس کے ہاتھوں پر پھونک ماری اور کہا کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے پورے جسم پر پھیرو، اس نے ایسا ہی کیا اور سب دیکھنے والوں کو اس وقت شدید حیرت ہوئی کہ جب وہ فوراً ہی بھلا چنگا ہو گیا اور اس کی تمام تکالیف اور درد دُور ہو گئے۔ اس پر سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہو گئیں اور وہ شخص آپ کا شکریہ ادا کر کے جانے لگا تو میاں صاحب نے فرمایا کہ اب ہمیشہ نماز کی پابندی کرنا، صدقہ خیرات دیتے رہنا اور نماز ادا کرنے میں کبھی سستی نہ کرنا، ورنہ دوبارہ تمہاری یہی حالت ہو جائے گی۔ اس نے کہا کہ سرکار وعدہ کر لیا ہے، آئندہ سستی اور غفلت نہیں ہو گی اور وہ لاٹھی پھینک کر صحت مند اور تندرست جوان آدمی کی طرح چلا گیا۔

☆......☆

ایک دن آپ کا ایک مرید بہت دور سے میاں صاحب سے ملنے آیا ہوا تھا تو آپ اچانک بولے۔

"جا تجھے تحصیلدار بنا دیا، بلکہ تحصیلدار سے بھی آگے تُو مجسٹریٹ بن گیا ہے اور اگلے دن واقعی اُس کی ترقی کے آرڈر آ گئے اور وہ تحصیل دار بن گیا۔

میاں صاحب روزانہ لاکھوں روپے محتاجوں، مسکینوں، غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرماتے۔ کسی کو پان منا کر دیتے تو کسی کو نفل پڑھنے کا

بولتے۔ الغرض روزانہ ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا۔ کچھ دن گزرے تو میرا میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ میں نے ہائی فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا تھا۔ بہت شاندار نمبروں کے ساتھ، پورے ضلع میں اوّل آیا تھا۔ اُس دن مجھے اپنے والدین بہت یاد آئے اور میں بہت رویا۔ میری اس شاندار کامیابی کی خوشی منانے والا کوئی نہ تھا۔ جس دکان پر میرے والد صاحب کام کرتے تھے تو اس کے مالک عبدالوحید صاحب نے مجھے انعام کے طور پر دس روپے دیے، جن سے میں نے حافظ سوڈا واٹر کی دکان سے بننے والی بوتل پی اور آئس کریم کھائی، پھر اسکول میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مجھے میٹرک کی سند کے ساتھ انعامی کپ دیا گیا۔ اسی دن میں تو تاں والی سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے رزلٹ کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔

"ڈاکٹر! یہاں اب تمہارا کوئی نہیں ہے، تم فوراً لاہور چلے جاؤ اور اپنی تعلیم جاری رکھو۔" یہ کہہ کر انہوں نے بہت سے روپے مجھے دیے اور نصیحت کی کہ روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا۔ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی اور ایثار کرنا اور ہر کسی کے کام آنا، جاؤ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا رَب ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چناں چہ میں نے گھر آ کر اپنا مختصر سامان سمیٹا، دو تین جوڑے کپڑوں کے اور کتابیں کاپیاں ایک بیگ میں ڈال کر گھر کی چابی اس کے مالک کے حوالے کی، اُن سے مل کر اجازت لے کر اڈے پر آیا اور بس میں بیٹھ گیا اور پھر چار پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد لاہور پہنچ گیا۔

☆......☆

بس سے اُتر کر اپنا بیگ اٹھا کر ایسے ہی ایک طرف چل پڑا اور بے مقصد سڑکوں پر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی اور میں کسی ہوٹل کی تلاش میں تھا۔ اتنے میں ایک مسجد کے پاس پہنچا۔ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے مسجد میں نماز عصر ادا کی تو وہیں پر اعلان ہوا کہ کسی مریض کو، جو کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کو خون کی اشد ضرورت تھی اور خون کے عطیے کے لیے اپیل کی جا رہی تھی۔ میں نے جب

پہنچ گیا۔

اعلان سنا تو فوراً قریبی ایک سرکاری اسپتال پہنچ گیا۔ جب میرا خون کا گروپ چیک کیا گیا تو وہ او نیگیٹیو (O-) تھا اور مریض کو بھی اسی خون کی ضرورت تھی۔ چناں چہ میں نے ایک بوتل خون کا عطیہ دیا اور چپکے سے اسپتال سے نکل آیا اور پیدل ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ بھوک اور پیاس بہت زور کی لگی ہوئی تھی کہ اچانک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرا کر سڑک کے کنارے گر گیا جو ہوش میں آیا تو خود کو ایک پرائیویٹ اسپتال کے ایمرجنسی روم میں پایا۔

جیسے ہی مجھے ہوش آیا تو نرس نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ تب ایک ڈاکٹر صاحب نے آ کر مجھے چیک کیا اور پوچھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے ان کو ساری بات بتا دی۔ مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ جب ڈرپ ختم ہوئی تو ڈاکٹر نے میرے لیے جوس اور کھانے پینے کی چیزیں منگوائیں۔ جب میری طبیعت سنبھل گئی تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اب مجھے کدھر جانا ہے، تو میں نے کہا کہ جدھر تقدیر لے جائے۔ اس پر وہ حیران سے بولے "کیا مطلب؟" اور پھر ان کے اصرار پر میں نے اپنے سارے حالات شروع سے آخر تک بتا دیے اور لاہور آنے کا مقصد بھی بتا دیا۔ میری باتیں سن کر تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد ڈاکٹر صاحب، جو کہ اپنے نام کی طرح انتہائی شفیق، رحم دل، اور مہربان انسان تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ اب تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا، آپ مجھے کہیں نوکری دلوا دیں تو ڈاکٹر صاحب (ان کا پورا نام محمد شفیق تھا) نے کہا کہ میرے تین بچے ہیں اور سب انڈر میٹرک ہیں، تم ان کو ٹیوشن پڑھا دیا کرو تو تمہیں اس کے بدلے رہنے کو جگہ اور کھانا مل جایا کرے گا۔ چناں چہ رات کو اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر شفیق صاحب مجھے اپنی کار میں بٹھا کر اپنی کوٹھی لے گئے اور مجھے اپنے بیوی بچوں سے ملایا۔

ڈاکٹر شفیق صاحب کے تین بیٹے تھے۔ ایک آٹھویں جماعت میں تھا، دوسرا چھٹی میں تیسرا چوتھی میں تھا۔ ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں میرا بیڈ لگا دیا گیا۔

اگلے دن سے میں نے تینوں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور بہت جلد ہم چاروں بہترین دوست بن گئے۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کی بیوی بہت اچھی، نیک اور پرہیز گار عورت تھیں۔ میں ان کو باجی کہتا تو وہ بھی مجھے سگے بھائی کی طرح سمجھتیں۔ مجھے ان سے بہن کا پیار بھی ملا اور ماں کی ممتا بھی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں اور میرے شاندار نمبروں کی وجہ سے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ مل گیا۔

نوتاں والی سرکار کے دیے ہوئے پیسوں سے داخلہ جمع کروایا، کتابیں خریدیں اور میں پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تینوں بچوں کو بھی بڑی توجہ اور محنت سے پڑھاتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تینوں اپنی اپنی کلاسوں میں پہلی پوزیشن لینے لگے۔ وہ تینوں بچے مجھ سے مکمل مل گئے اور مجھے بھائی جان کہتے۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے علاوہ میں گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا، مثلاً سودا سلف لانا، بجلی، گیس، ٹیلی فون کے بل بینک میں جمع کروانا اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی سروس کراو بنا وغیرہ وغیرہ۔

میری شرافت اور بچوں کو محنت سے پڑھانا اور گھروں کے کام کاج کی وجہ سے ڈاکٹر اور باجی مجھ سے بہت خوش تھے۔ اسی روٹین میں ہنستے بستے دو سال گزر گئے اور میرا ایف۔ ایس۔ سی کا بورڈ کا فائنل امتحان سر پر آ گیا۔ میں نے بہت لگن، محنت سے امتحان کی تیاری کی اور امتحان دے دیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے تمام پیپر بہت اچھے ہوئے۔ امتحان کے بعد چار ماہ میں اب بالکل فارغ تھا۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کا ایک بہت بڑا دیرینہ خواب تھا، وہ یہ کہ وہ اپنے مرحوم ماں باپ کے نام پر ایک یادگار پرائیویٹ اسپتال بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے زمین بھی خرید لی تھی اور اس کا نقشہ بھی متعلقہ ادارے سے پاس کروا کر اسپتال کی تعمیر کا کام شروع کروایا ہوا تھا۔ میں چوں کہ فارغ تھا تو اس لیے سارا دن اسپتال کی تعمیر کی نگرانی کرتا تھا۔ اسپتال کی تعمیر کا آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار ماہ گزر گئے اور میرا ایف۔ ایس۔ سی کا رزلٹ آ گیا

اعلان سنا تو فوراً قریبی ایک سرکاری اسپتال پہنچ گیا۔ جب میرا خون کا گروپ چیک کیا گیا تو وہ او نیگیٹو (O-) تھا اور مریض کو بھی اسی خون کی ضرورت تھی۔ چناں چہ میں نے ایک بوتل خون کا عطیہ دیا اور چپکے سے اسپتال سے نکل آیا اور پیدل ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ بھوک اور پیاس بہت زور کی لگی ہوئی تھی کہ اچانک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرا کر سڑک کے کنارے گر گیا جو ہوش میں آیا تو خود کو ایک پرائیویٹ اسپتال کے ایمرجنسی روم میں پایا۔

جیسے ہی مجھے ہوش آیا تو نرس نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ تب ایک ڈاکٹر صاحب نے آ کر مجھے چیک کیا اور پوچھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے ان کو ساری بات بتادی۔ مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ جب ڈرپ ختم ہوئی تو ڈاکٹر نے میرے لیے جوس اور کھانے پینے کی چیزیں منگوائیں۔ جب میری طبیعت سنبھل گئی تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اب مجھے کدھر جانا ہے، تو میں نے کہا کہ جدھر تقدیر لے جائے۔ اس پر وہ حیران سے بولے ''کیا مطلب؟'' اور پھر ان کے اصرار پر میں نے اپنے سارے حالات شروع سے آخر تک بتادیے اور لاہور آنے کا مقصد بھی بتادیا۔ میری باتیں سن کر تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد ڈاکٹر صاحب، جو کہ اپنے نام کی طرح انتہائی شفیق، رحم دل، اور مہربان انسان تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ اب تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا، آپ مجھے کہیں نوکری دلوا دیں تو ڈاکٹر صاحب (ان کا پورا نام محمد شفیق تھا) نے کہا کہ میرے تین بچے ہیں اور سب انڈر میٹرک ہیں، تم ان کو ٹیوشن پڑھا دیا کرو تو تمہیں اس کے بدلے رہنے کو جگہ اور کھانا مل جایا کرے گا۔ چناں چہ رات کو اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر شفیق صاحب مجھے اپنی کار میں بٹھا کر اپنی کوٹھی لے گئے اور مجھے اپنے بیوی بچوں سے ملایا۔

ڈاکٹر شفیق صاحب کے تین بیٹے تھے۔ ایک آٹھویں جماعت میں تھا، دوسرا چھٹی میں تیسرا چوتھی میں تھا۔ ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں میرا بیڈ لگا دیا گیا۔

اگلے دن سے میں نے تینوں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور بہت جلد ہم چاروں بہترین دوست بن گئے۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کی بیوی بہت اچھی، نیک اور پرہیزگار عورت تھیں۔ میں ان کو باجی کہتا تو وہ بھی مجھے سگے بھائی کی طرح سمجھتیں۔ مجھے ان سے بہن کا پیار بھی ملا اور ماں کی ممتا بھی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں اور میرے شاندار نمبروں کی وجہ سے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ مل گیا۔

نوٹاں والی سرکار کے دیے ہوئے پیسوں سے داخلہ جمع کروایا، کتابیں خریدیں اور میں پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تینوں بچوں کو بھی بڑی توجہ اور محنت سے پڑھاتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تینوں اپنی اپنی کلاسوں میں پہلی پوزیشن لینے لگے۔ وہ تینوں بچے مجھ سے گھل مل گئے اور مجھے بھائی جان کہتے۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے علاوہ میں گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا، مثلاً سودا سلف لانا، بجلی، گیس، ٹیلی فون کے بل بینک میں جمع کروانا اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی سروس کرا دینا وغیرہ وغیرہ۔

میری شرافت اور بچوں کو محنت سے پڑھانا اور گھر کے کام کاج کی وجہ سے ڈاکٹر اور باجی مجھ سے بہت خوش تھے۔ اسی روٹین میں ہنستے بستے دو سال گزر گئے اور میرا ایف۔ ایس۔ سی کا بورڈ کا فائنل امتحان سر پر آ گیا۔ میں نے بہت لگن، محنت سے امتحان کی تیاری کی اور امتحان دے دیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے تمام پیپر بہت اچھے ہوئے۔ امتحان کے بعد چار ماہ میں اب بالکل فارغ تھا۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کا ایک بہت بڑا دیرینہ خواب تھا، وہ یہ کہ وہ اپنے مرحوم ماں باپ کے نام پر ایک یادگار پرائیویٹ اسپتال بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے زمین بھی خرید لی تھی اور اس کا نقشہ بھی متعلقہ ادارے سے پاس کروا کر اسپتال کی تعمیر کا کام شروع کروایا ہوا تھا۔ میں چوں کہ فارغ تھا تو اس لیے سارا دن اسپتال کی تعمیر کی نگرانی کرتا تھا۔ اسپتال کی تعمیر کا آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار ماہ گزر گئے اور میرا ایف۔ ایس۔ سی کا رزلٹ آ گیا

جو میں نے ہائی فرسٹ ڈویژن کے ساتھ امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور باجی میری کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے گلے لگا لیا۔ اس موقع پر مجھے اپنے والدین بہت یاد آئے۔ میں بڑی دیر تک ڈاکٹر صاحب کے گلے لگ کر روتا رہا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے مجھے چپ کروایا۔ اگلے دن میں سرگودھا چلا گیا اور نوتاں والی سرکار کی قدم بوسی کی، پھر جب میں ان کو اپنے حالات بتانے لگا تو انہوں نے مجھے روک دیا اور فرمانے لگے کہ مجھے سب معلوم ہے۔ ڈاکٹر تُو بہت اونچا جائے گا۔ تیرا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ بس تُو محنت کرتا رہ۔

پھر ان سے اجازت لے کر میں واپس لاہور آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھ سمیت پوری فیملی کو لے کر سوات، ایبٹ آباد اور مری کی سیر کے لیے گئے، جہاں ہم نے خوب انجوائے کیا۔

میں اب مکمل طور پر ڈاکٹر صاحب کی فیملی کا حصہ بن چکا تھا، پھر جب داخلے شروع ہوئے تو مجھے لاہور ہی کے ایک میڈیکل کالج میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں داخلہ مل گیا۔ میرے شاندار نمبروں کی وجہ سے میرا داخلہ بہت آسانی سے ہو گیا تھا۔ میں نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ ساتھ اب اپنی پڑھائی پر بھی بھرپور توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ٹیوشنز اس لیے جاری رکھیں کہ میں ڈاکٹر صاحب پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے اسپتال کی تعمیر کا کام رُک چکا تھا اس لیے ڈاکٹر صاحب بہت پریشان اور چپ چپ سے رہنے لگے تھے، پھر باجی نے مجھے بتایا کہ پیسے ختم ہو چکے ہیں، جس کی وجہ سے اسپتال کی تعمیر کا کام رُک گیا ہے۔ اب کام کو مزید آگے بڑھانے کے لیے بیس لاکھ روپے کی اشد ضرورت ہے اور کہیں سے بھی مالی سپورٹ نہیں مل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بینک سے قرضہ نہیں لینا چاہتے، کیوں کہ اس رقم میں سود شامل ہوتا ہے اور سود ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب ایسی رقم کو اسپتال کی تعمیر میں نہیں لگانا چاہتے جو حرام ہو۔ یہ بات سن کر مجھے بھی بہت پریشانی ہوئی۔ عشاء کی نماز کے بعد میں نے رو رو کر اللہ کے حضور دل سے دعا کی کہ اللہ پاک بہتر اسباب پیدا فرما دے، تو اسی رات خواب میں مجھے نوتاں والی سرکار کی زیارت ہوئی اور وہ جلال میں مجھ سے مخاطب تھے کہ ڈاکٹر میں نے تم کو جو کاغذ دیا تھا، وہ کس دن کام آئے گا، تم اس کو رکھ کر بھول گئے ہو۔

پھر صبح میں نے اٹھ کر جب اپنی پرانی کتابیں کاپیاں چیک کیں تو ان میں مجھے نوتاں والی سرکار کا دیا ہوا وہ کاغذ مل گیا، دیکھا تو وہ ایک انعامی بانڈ تھا، میں اسی وقت بینک گیا اور جا کر چیک کروایا تو پتا چلا کہ اس پر پچیس لاکھ روپے کا انعام نکلا ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور فوراً گھر آ کر وہ پرائز بانڈ ڈاکٹر صاحب کے حوالے کر دیا اور ان کو سارا ماجرا بیان کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب وہ بانڈ مجھ سے نہیں لے رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا تو انہوں نے اس شرط پر وہ پرائز بانڈ قبول کیا کہ وہ بطور قرض حسنہ رقم لیں گے، دوسرا یہ کہ میں تمام ٹیوشنز چھوڑ دوں اور آئندہ میرے تمام تعلیمی اخراجات وہ برداشت کریں گے۔ مجبوراً باجی کی سفارش پر مجھے یہ شرطیں ماننی پڑیں، مگر میں نے ڈاکٹر کے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ الغرض اس رقم سے ڈاکٹر صاحب نے اسپتال کی تعمیر کا رکا ہوا کام شروع کروا دیا۔ مجھے نوتاں والی سرکار کی بہت یاد ستا رہی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب کو پتا چلا تو ایک دن چھٹی والے روز ہم سب ڈاکٹر صاحب کی کار میں سرگودھا گئے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے والدین کی قبروں پر جا کر فاتحہ خوانی کی، پھر نوتاں والی سرکار کی خدمت میں حاضری کے لیے ان کے آستانے پر گئے۔

جون جولائی کی سخت گرمی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ میاں صاحب نوتاں والی سرکار لحاف اوڑھے سو رہے تھے، جیسے ہی ہم وہاں پہنچے تو نوتاں والی سرکار جاگ گئے اور ہم سب سے ملے اور پھر مجھ سے پوچھنے لگے۔

"ڈاکٹر تُو کیا حال ہے تیرا....؟" میں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔

"حضور اللہ کا کرم اور آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔" فرمانے لگے۔

"تم تو ٹھیک ہو، مگر تمہاری باجی ٹھیک نہیں ہیں۔" معاملہ کچھ یوں تھا کہ پچھلے چھ مہینے سے باجی کے دونوں

پیروں میں بڑی سخت الرجی تھی، شدید خارش کے ساتھ چھالے اور زخم بن گئے تھے، جو ہر وقت رستے رہتے تھے، جن کی وجہ سے باجی کو بہت تکلیف تھی۔ ڈاکٹر صاحب باجی کا جلد کے ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے علاج کروا رہے تھے۔ مہنگی دوائیں، ٹیکے اور کریمیں لگائی جاتیں، مگر نتیجہ وہی کہ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی اور ان کی تکلیف دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی، پھر نوتاں والی سرکار نے مجھے حکم دیا کہ ڈاکٹر جا اور لنگر خانے سے دیگوں کے نیچے سے کوئلوں اور لکڑیوں کی بجھی ہوئی راکھ ایک مٹھی بھر کے لا۔ جب میں راکھ لے کر آیا تو باجی سے فرمانے لگے۔

"بیٹی اپنے پیر آگے کرو۔" جب انہوں نے پیر آگے کیے تو مجھے کہنے لگے کہ یہ ساری راکھ زخموں پر ڈال دو، تو میں نے ایسا ہی کیا۔ فرمانے لگے۔

"بیٹی جا! تُو ڈاکٹر کی ڈالی راکھ سے ٹھیک ہو گئی۔"

پھر نوتاں والی سرکار نے ہمیں دیسی گھی سے بنا لنگر کا کھانا کھلایا، جو کہ بہت عمدہ اور لذیذ تھا، اس کے بعد جب ہم نے ان سے واپسی کے لیے اجازت مانگی تو وہ مجھے مخاطب کرکے فرمانے لگے۔

"او ڈاکٹر! ایثار کرتے رہنا، محسنوں کی ہمیشہ بھلائی کرنا، کبھی غرور نہ کرنا، ہمیشہ عاجزی و انکساری کے ساتھ سب کے کام آنا۔" پھر پیار سے سب کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"چلو اب جاؤ۔" پھر ہم لاہور واپس آ گئے۔

قارئین کرام آپ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ صبح تک باجی کا وہ مرض ٹھیک ہو چکا تھا جو پچھلے چھ ماہ سے مہنگے علاج سے ٹھیک نہ ہوا تھا، لیکن چند گھنٹوں میں فقط ایک فقیر کے آستانے کے لنگر خانے کی راکھ سے ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری فیملی نوتاں والی سرکار کی معتقد ہو گئی تھی۔ اب ہم سال میں دو تین بار نوتاں والی سرکار کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کا اسپتال مکمل ہو چکا تھا۔ بہت شاندار افتتاح ہوا تھا اس کا اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنا ذاتی اسپتال خیراتی طور پر چلانا شروع کر دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور میں نے بہت اعلیٰ نمبروں سے ایم۔بی۔بی۔ایس کا امتحان پاس کر لیا۔ میں مٹھائی لے کر نوتاں والی سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ سے فرمانے لگے۔

"ڈاکٹر ابھی اور پڑھ، تم نے سرجن بننا ہے۔" پھر ہاؤس جاب مکمل کر کے میں مزید تعلیم کے لیے چلا گیا، جہاں کے تمام اخراجات ڈاکٹر شفیق صاحب نے برداشت کیے اور پھر میں ایف۔آر۔سی۔ایس کی ڈگری لے کر لندن سے واپس آ گیا۔

لاہور ایئر پورٹ پر ڈاکٹر شفیق صاحب، باجی اور تینوں بچوں نے میرا شاندار استقبال کیا۔ اب میں ایک سرجن ڈاکٹر تھا۔ پہلی فرصت میں، میں سرگودھا نوتاں والی سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس دن سرکار نے بہت اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور میرے منتظر تھے۔ ان کی قدم بوسی اور سلام کے بعد مٹھائی ان کی خدمت میں پیش کی تو اُس دن انہوں نے کھڑے ہو کر میرا پُرتپاک استقبال کیا اور گلے سے لگا لیا۔ وہ بڑی محبت اور شفقت سے ملے، پھر وہ فرمانے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب، ہمیشہ غریبوں، مسکینوں کا خیال رکھنا۔ رب راضی رہے گا، اب آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہو۔" پھر مجھے کھانا کھلایا۔ کافی وقت میرے ساتھ گزارا، پھر ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا اور مجھے کار تک چھوڑنے خود آئے۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، وہاں سے میں اس دکان کے مالک عبدالوحید صاحب (جہاں میرے والد مزدوری کیا کرتے تھے) کے پاس گیا۔ ان کو ملا تو وہ بھی مجھے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مبارک دی۔ پھر میں واپس لاہور آ گیا اور مجھے سرکار ملازمت مل گئی۔

☆......☆

ایک دن ایمرجنسی میں دو مریض بہت سیریس حالت میں لائے گئے، جن کو میجر سرجری کی ضرورت تھی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ کئی اسپتالوں سے ان کو جواب دے دیا گیا تھا۔ اس دن کوئی بھی سینئر سرجن موجود نہ تھا، بس میں اکیلا ہی تھا۔ ان مریضوں کو باری باری آپریشن تھیٹر لے جایا گیا، تو وہ آپریشن کرنے کے لیے بھی میں تنہا سرجن تھا۔ میں نے

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں "دم"





پاکستان کی اہم خاتون شخصیات کی زندگی اور جدوجہد سے مربوط ایک خاص سلسلہ' جس میں آپ آج کی عورت کا اصل مقام' اُس کی اِس معاشرے میں ثابت قدمی سے منزل کو پانے کی کہانی اور ملکی تاریخ میں اپنا لوہا منوانے کے عزم کو' آپ کے لیے' اُن ہی کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

اُن مایہ ناز خواتین کی کہانی' جن سے ہماری آج کی عورت بہت کچھ سیکھ رہی ہے۔

دوشیزہ ڈائجسٹ کی روایات سے' مربوط' آج کی عورت کی عظمت کا آئینہ

"وجودِ زن سے ہے' تصویرِ کائنات میں "دم"











27 واں
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
انتظار کی گھڑیاں ختم......





وہ تقریب
جس کا انتظار کیا جاتا ہے

ملک بھر سے......
قلم قبیلے کے درخشاں......
نئے اور پرانے ستاروں کا کارواں......
ایک ایسی تقریب جو یادگار رہتی ہے۔
سہام مرزا کے مشن اور ہماری کوششوں ہی کے تحت
ہم اس تقریب کا انعقاد اُسی باوقار انداز میں کررہے ہیں۔








تقسیمِ ایوارڈز کی یہ تقریب انشاء اللہ
ماہِ اپریل 2014ء میں منعقد کی جارہی ہے






اللہ کا نام لے کر اکیلے ہی آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے لگا کہ جیسے نوتاں والی سرکار میرے ساتھ ہیں اور میرے ہاتھ پکڑ کر آپریشن کروا رہے ہیں۔ اس طرح دونوں آپریشن کامیاب رہے اور دونوں مریضوں کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ پر سب سینئر سرجن بہت حیران تھے کہ اتنے پیچیدہ اور سیریس آپریشن میں نے تنہا کیسے کر لیے؟ مگر یہ راز صرف مجھے معلوم تھا کہ نوتاں والی سرکار نے یہ آپریشن کیے تھے، بلکہ میرے ہاتھوں اپنے ہاتھوں کی مدد سے کروائے تھے۔ اب میں ڈاکٹر شفیق صاحب کے اسپتال میں بھی آپریشن کرنے لگا تھا، جہاں غریبوں کا علاج مفت کیا جاتا۔ اس طرح چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔

☆......☆

میری عمر 30 سال ہو چکی تھی اور باجی مجھے بار بار شادی کرنے کا کہہ رہی تھی۔ بلکہ انہوں نے ایک رشتہ جو کہ بہت ہی امیر فیملی سے آیا تھا۔ تقریباً فائنل کر دیا تھا، مگر ابھی میں نے ہاں نہیں کی تھی کہ ایک چھوٹا سا حادثہ ہو گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ ڈاکٹر شفیق صاحب کی ایک چھوٹی بہن ناصرہ تھی جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ پانچ سال پہلے ڈاکٹر صاحب نے اس کی شادی بہت دھوم دھام سے کی تھی، مگر اس کو سسرال اور خاوند اچھے نہ ملے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ پانچ سال تک اس کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ساس اور نندیں اٹھتے بیٹھتے اسے طعنے دیتی رہتیں۔ ان لوگوں نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا اور پھر اس کی ساس کے کہنے پر ناصرہ کے شوہر نے اسے طلاق دے دی اور وہ بے چاری روتی ہوئی ڈاکٹر صاحب کے گھر آ گئی۔ ناصرہ ایک خوب صورت، انتہائی نیک اور خدمت گزار لڑکی تھی، مگر افسوس اس کے خاوند سمیت سسرال والوں نے کوئی قدر نہ کی۔ ناصرہ کی طلاق کی وجہ سے ڈاکٹر شفیق صاحب بہت آزردہ رہنے لگے تھے۔ ایک دن صبح ہی صبح مجھے سرگودھا سے فون آیا اور یہ روح فرسا خبر دی گئی کہ میاں عبدالرشید نوتاں والی سرکار کو ان کے بدبخت بھتیجے نے پستول کے فائر سے شہید کر دیا ہے۔ یہ سن کر میں بہت رویا۔ میں اور ڈاکٹر شفیق صاحب اسی وقت ان کے جنازے میں شرکت کے لیے سرگودھا روانہ ہو گئے۔ رات کو بعد نماز عشاء ان کی نماز جنازہ تھی۔ ان کے مریدین، عقیدت مندوں کے علاوہ تمام مشہور سماجی، سیاسی شخصیات نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ پورا عیدگاہ میدان بھرا ہوا تھا اور پھر نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد 23 جولائی بروز ہفتہ 1994ء کو آہوں اور سسکیوں میں نوتاں والی سرکار کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ واپسی پر میرے کانوں میں نوتاں والی سرکار کے الفاظ گونجنے لگے۔

”ڈاکٹر ایثار کرنا، محسنوں کی بھلائی کرنا۔“ پھر اسی لمحے میں نے ایک فیصلہ کیا اور گھر آ کر باجی سے کہا کہ ناصرہ کی عدت پوری ہو چکی ہے، میں اس سے شادی کرو

نظم

کراچی
ایسی سہاگن ہے
جسے پتی کا پیار نہیں ملا
جسے ایک رات بھی ایسی میسر نہیں
جو اس
ابھاگن کو سہاگن کر دیتی
لیکن یہ روز
اپنے بدن پر
قیمتی کپڑے سجائے
بھاری زیورات چڑھائے
ہونٹوں پہ مسکان سجائے
سب سے ملتی ہے
اور ہر شخص
یہ دعویٰ کرتا ہے
یہ میری ہے
اور یہ شہر کچھ عرصے کے لیے
اس کا ہو جاتا ہے
اور......
اس کا سارا حسن نچوڑ کر
اسے ہر کوئی
پھر سے ابھاگن کر جاتا ہے

ثمرین نعیم، گلستان جوہر کراچی

چاہتا ہوں، تو پلیز آپ اور ڈاکٹر صاحب میری اس درخواست کو قبول کریں۔

یہ سن کر باجی حیران رہ گئیں اور جب ڈاکٹر شفیق صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور رونے لگے اور روتے روتے بے اختیار میرا منہ چومتے تھے۔ الغرض ان کی اجازت اور ناصرہ کی رضامندی سے ایک شام میرا اور ناصرہ کا بڑے باوقار طریقے سے نکاح ہوگیا۔ میں نے ولیمہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا۔ ڈاکٹر شفیق صاحب اور باجی میرے اس فیصلے سے بہت خوش تھے۔ میری بے پناہ چاہت، پیار اور محبت پا کر ناصرہ اپنے پچھلے سارے دُکھ بھول گئی۔ شادی کے بعد فوراً بعد ہم ہنی مون منانے کی بجائے عمرہ کی سعادت اور مدینہ شریف سرکار دوعالم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں روضہ اقدس کی حاضری کے لیے چلے گئے۔ جہاں میں نے اپنے والدین کی مغفرت و بخشش، نوتاں والی سرکار کے درجات کی بلندی اور اولاد کی نعمت کے لیے رو رو کر دعائیں کیں۔ جب واپس آئے تو خواب میں نوتاں والی سرکار کی زیارت ہوئی۔ آپ بہت خوش تھے اور مجھے تین سیب اور دو ناشپاتی عنایت فرمائے۔ پھر اللہ نے کرم فرمایا اور ایک سال کے بعد اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا اور پھر نوازتا گیا۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں میرے رب نے اپنی رحمت سے مجھے دی ہیں۔

ڈاکٹر شفیق صاحب کے تینوں بیٹے ماشاء اللہ بہت بڑے آدمی بن چکے ہیں۔ ہم ہر سال حج و عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کا پچھلے سال انتقال ہوگیا ہے۔ باجی اب بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ اب میں ان کو امی جان کہتا ہوں۔ ان کا سارا دن جائے نماز اور تلاوت قرآن میں گزرتا ہے۔ میں آج ایک مایہ ناز سرجن ہوں۔ آج تک میرا کوئی آپریشن ناکام نہیں ہوا۔ بگڑے ہوئے کیس میرے پاس آتے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے میرے آپریشن سے مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق صاحب نے اپنی موت سے پہلے ہی اپنا اسپتال میرے حوالے کر دیا تھا، جس کا تمام انتظام ناصرہ سنبھالتی ہے اور یہاں غریبوں، مسکینوں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ بہت سارے مخیر حضرات کے مالی تعاون سے مفت ادویات دی جاتی ہیں۔ ہم جتنا اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس سے کئی گنا اللہ ہمیں اور دے دیتا ہے۔ بدلے میں بہت سی دعائیں ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ میری پیشہ ورانہ مہارت کی دھوم بہت دور دور تک ہے۔ اب تو سعودیہ گورنمنٹ نے بھی میری خدمات حاصل کرلی ہیں۔ میں ہر سال اپنی فیملی کے ساتھ میاں عبدالرشید المعروف نوتاں والی سرکار کے عرس مبارک میں لازمی شرکت کرتا ہوں۔

محترم قارئین کرام راوی کی کہانی یہاں مکمل ہوئی۔

اس کہانی کی یہ آخری سطریں میں نوتاں والی سرکار کے مزار پرانوار کی قبر مبارک پر قدموں کی جانب بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں اور نوتاں والی سرکار کی دل موہ لینے والی دلفریب مسکراہٹ اور شفقت و محبت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ رہا ہوں۔ سچ پوچھیے تو جنت کے گوشے میں بیٹھا ہوں۔ وہ اس طرح کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک اور حدیث کا مفہوم ہے کہ ”قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔“ چوں کہ یہ اللہ کے ایک ولی، برگزیدہ بندے، صوفی اور شہید کی قبر مبارک ہے تو یہ جنت کا باغ ہے۔ یہاں رحمتیں برس رہی ہیں، بہت روحانی اور وجدانی فضا ہے۔ بہت سکون مل رہا ہے۔ روح تر و تازہ ہو رہی ہے اور مزار کے ساتھ مسجد ہے جہاں سے نماز عصر کی اذان کی خوب صورت صدا بلند ہو رہی ہے۔

قارئین کرام نوتاں والی سرکار کی قبر مبارک میرے سامنے ہے۔ آج میں نے دیکھا کہ اتفاق سے ان کے قدموں میں بہت سارے نوٹ بکھرے پڑے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دولت جس کے لیے لوگ خونی رشتوں کے دشمن بن جاتے ہیں، اس دولت کو اپنے سروں پر سجاتے ہیں، فخر و غرور کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ دولت، یہ نوٹ، یہ کاغذ کے پرزے اللہ والوں کے قدموں کی دھول ہوتے ہیں۔ یہ دولت تو فقط مٹی ہے۔ نماز عصر کی جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔ نماز ادا کرتا ہوں، دعا ہے اللہ کریم نوتاں والی سرکار کے درجات بلند فرمائے۔ یہ ڈیرہ، یہ دربار سدا آباد رہے۔ حضرت علامہ اقبال نے خوب کہا اور حق کہا کہ:

”نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔“

☆......☆



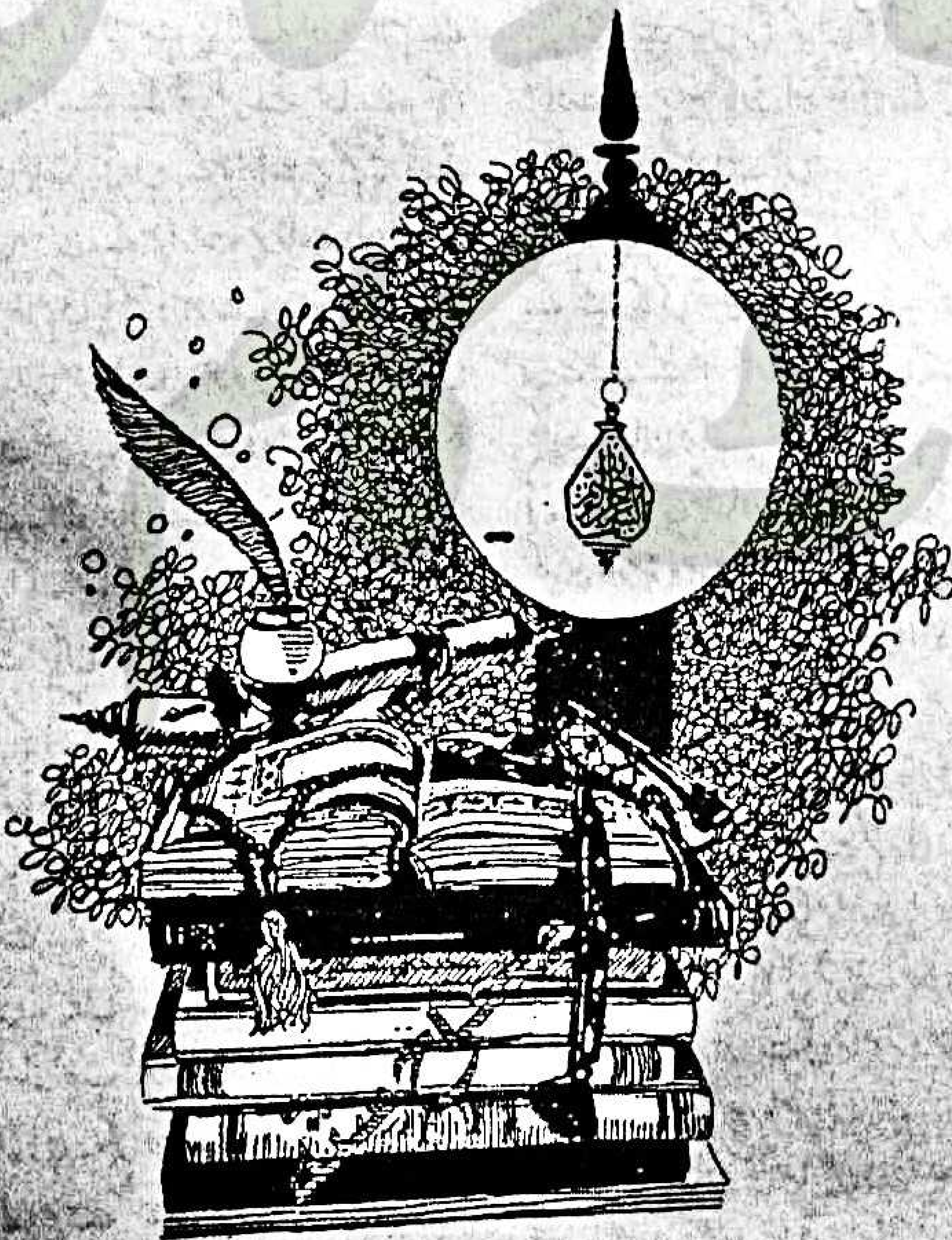
چشمۂ فیض



ملک عاشق حسین ساجد

ہیڈ بکائنی سے ولی اللہ میاں متقی سائیں کی کشف و کرامات

مولانا رومؒ کے قول کے مطابق ''اولیاء'' اپنے وقت کے اسرافیل ہوتے ہیں۔ اسرافیل جب صور پھونکتے ہیں تو مردہ جسموں کو زندہ کرتے ہیں اور اولیاء جب نگاہ کرتے ہیں تو مردہ قلوب کو زندہ کر دیتے ہیں۔



بے شک حضرت انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے اور تمام انسانوں کا تعلق اولادِ آدم سے ہے، مگر ان میں تفرقہ، مذاہب کی وجہ سے ہے، ورنہ تو ہمارے نبی پاک ﷺ محبوب خدا نے اپنے تاریخ ساز خطبے میں اعلان فرما دیا تھا کہ "کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فوقیت نہیں۔ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" ان کا یہ پیغام آج تک ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور اس مشعل کو زندہ رکھنے والی ہستیاں آج بھی ہم میں موجود ہیں اور تا قیامت رہیں گی۔

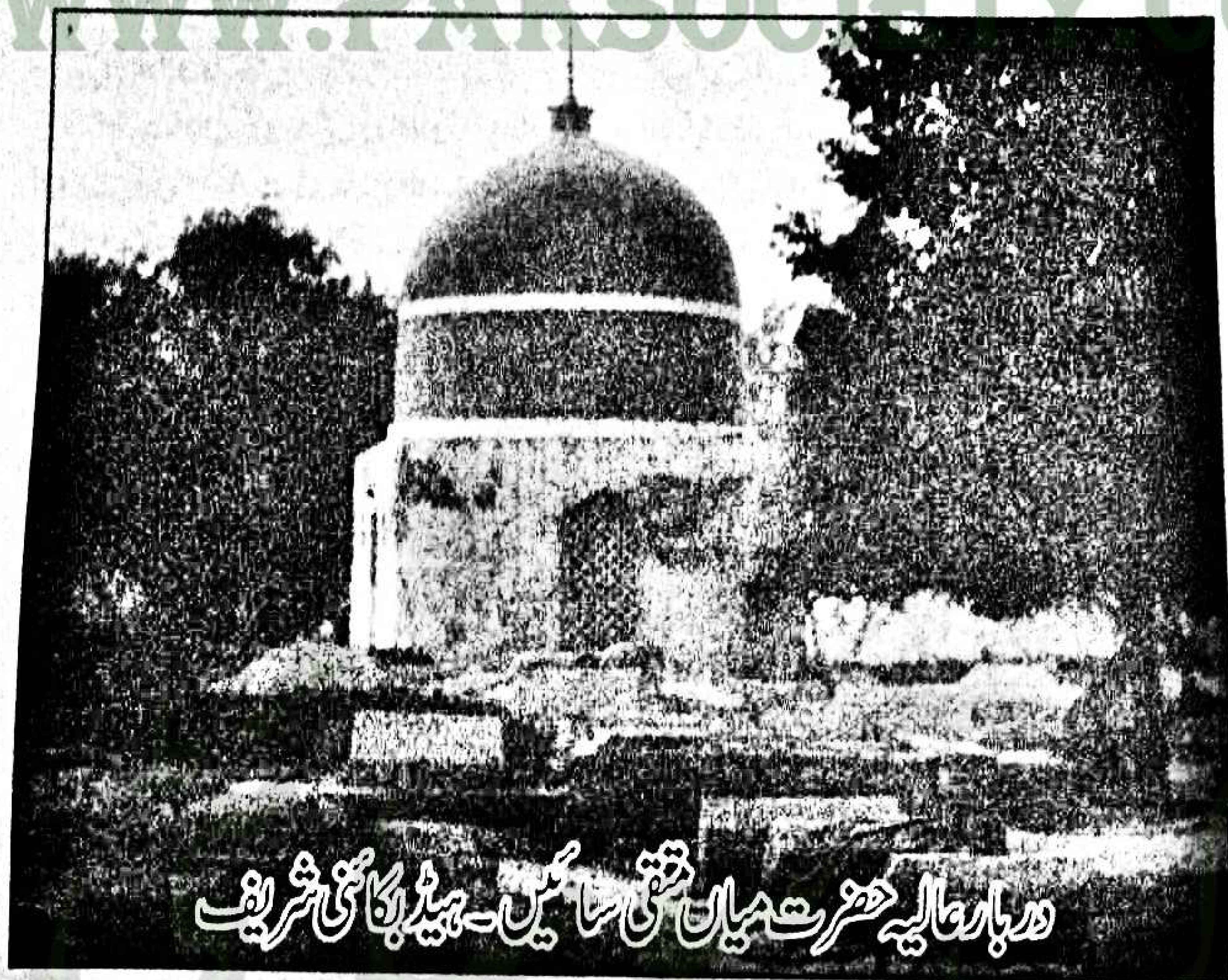
اولیاء کرام نا صرف اپنے کردار، اپنی گفتار اور اپنی ہر بات سے وحدت اور توحید کا درس دیتے ہیں، بلکہ وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جو ان کے قرب سے آگاہ ہو گئے وہ مقصد حیات کے راز سے آشنا ہو گئے۔ رشد و ہدایت کے سلسلے کو لے کر چلنے والے لوگ اس دنیا میں آتے رہے ہیں، جنہوں نے تقویٰ و پرہیز گاری میں اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان برگزیدہ بندوں نے لوگوں کو راہ راست پر لانے اور اسلام کے اصولوں پر زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان نیک ہستیوں کے مزارات پر جم غفیر آتے دکھائی دیتے ہیں، جن کے مزارات پر رات دن قرآن خوانی اور درود و سلام کی پاکیزہ اور روح پرور محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ان مزارات پر جو دلی، ذہنی اور روحانی سکون اور راحت نصیب ہوتی ہے وہ اللہ کے قرب کا خاص ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان نیک اور ولی کامل بندوں میں سے ایک ایسا ہی معتبر نام حضرت میاں فتح محمد المعروف حضرت میاں متقیؒ کلاں سائیں کا ہے جو اپنے نام کی طرح اسم با مسمّیٰ تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اسلامی تعلیمات پر قربان کر دی۔ آپؒ آفتاب ولایت اور شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ آپ قوم کے افغان، بنی اسرائیل ہیں۔ چوں کہ آپ کے جد امجد قیس بن عبدالرشید کا سلسلۂ نسب یہود ابن حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرت میاں متقیؒ سائیں کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ ان ولی کامل کی عظمت و جلال کی کرامات و اخلاق کے چرچے دور دراز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاں دو فرزند پیدا ہوئے، وہ بھی ولایت میں کمال رکھتے تھے۔ آپؒ کے بڑے صاحبزادے کا اسمِ گرامی حافظ محمد صاحب اور چھوٹے فرزند کا نام حافظ احمد تھا، جو کہ لاولد فوت ہوئے، البتہ آپ کے بڑے بیٹے کے ہاں ایک اکلوتا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حافظ میاں محمد اکرم رکھا گیا اور یہ بھی شریعت و معرفت میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کی ولادتِ باسعادت موضع لکھتہ، ضلع ڈیرہ غازی خان میں 1151ھ میں ہوئی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد روحانی فیض حضرت سید عبدالکریم بغدادی سے حاصل کیا جو کہ سلسلۂ قادریہ کے عظیم روحانی پیشوا تھے۔

حضرت میاں محمد اکرمؒ سائیں کا وصال مبارک بروز سوموار 4 صفر المظفر 1215ھ مرقوم ہے۔ آپ کا مزار مبارک کوٹ چھٹہ، ڈی جی خان، بستی "میاں سائیں" دریائے سندھ کے مغربی کنارے جھوک اُترا میں واقع ہے، جو زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت میاں فتح محمد ان کا اصل نام تھا، مگر اللہ کی عبادت اور پرہیز گاری اور تقویٰ کے پیش نظر میاں متقیؒ سائیں مشہور و معروف ہیں۔

آپؒ ہجرت کر کے ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل جتوئی کے قصبے بکائی شریف چلے آئے۔ اس وقت اس جگہ ریت کے ٹیلے اور خار دار جھاڑیاں تھیں۔ آبادی کم اور کھیت کھلیان برائے نام تھے۔ آپ کے تشریف لے آنے سے اس جگہ اور گرد و نواح میں آبادی اور لہلہاتے کھیت اور سبزہ ہوتا گیا۔ آپؒ نے جس جگہ قیام فرمایا اور جہاں مدفون ہوئے، ایک بہت بڑا بکائن کا درخت تھا، جس کے نشان آج بھی ملتے ہیں، پھر اسی علاقے میں ایک بڑی نہر جو تونسہ بیراج براستہ غازی گھاٹ سے مظفر گڑھ کینال نکل کر یہاں سے گزرتی ہے، بعد میں ایک ہیڈ تعمیر کیا گیا۔ ہیڈ کے قیام اور دربارِ عالیہ کی نسبت کے باعث یہ علاقہ ہیڈ بکائی شریف کہلانے لگا، جو ترقی، خوب صورتی اور قدرت کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پورے ملک میں مشہور و معروف ہے۔

حضرت میاں متقیؒ سائیں کی ذات ستودہ صفات متبع شریعت تھی اور کبھی اپنے قدم احاطۂ شریعت سے بہ قدر



دربار عالیہ حضرت میاں مستقی سائیں ۔ ہیڈ بگا صنی شریف

بال بھی باہر نہ رکھا، بلکہ تمام سرود و سماع سے بھی اجتناب فرماتے تھے۔ زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔

ایک مرتبہ ایک مستری آپؒ کے کنویں کا سامان تیار کر رہا تھا۔ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا تھا کہ اسی دوران قریبی مسجد سے اذان سنائی دی۔ مستری اذان سننے کے باوجود کام میں مصروف رہا۔ آپؒ نے دیکھا تو بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ یہ سامان کنویں کے قابل نہیں ہے کہ جب انسان کے کانوں میں اللہ کے نام کی آواز پہنچے، پھر بھی انسان دنیاوی کاموں میں مصروف رہے، بجائے اس کے کہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو کر سجدہ ریزی کا شرف حاصل کرے، جو سامان اذان سننے کے بعد تیار کیا گیا تھا، اسے توڑ کر دوبارہ ازسرِنو تعمیر کیا گیا۔ یہ تھی آپ کی تقویٰ کی ادنیٰ سی جھلک، جس سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آپؒ تقویٰ و طہارت و نظافت میں بہت اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ بعض بزرگوں کی روایت کے مطابق بہت ساری ایسی باتیں اور کرامات مشہور ہیں، جو ان کی اعلیٰ شخصیت کا خاصہ ہیں۔

حضرت میاں مستقی سائیں کے چار خلیفہ تھے۔ آپ کے بڑے خلیفہ خواجہ محمد اشرف تھے، جنہیں آپؒ محبت و الفت میں "خلیفہ صاحب" کہہ کر پکارتے تھے اور یہ محبت بھرا انداز آج تک دونوں خاندانوں میں چلا آ رہا ہے۔ حضرت خلیفہ محمد اشرف کے خاندان کو لوگ آج بھی احتراماً خلیفہ سائیں کہہ کر پکارتے اور یاد کرتے ہیں، بلکہ ان کی بستی کا نام بھی اسی وجہ سے چاہ "خلیفہ والا" مشہور و معروف ہے، ورنہ حضرت خلیفہ محمد اشرف، قریشی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی نسبت سے صدیقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب کی اولاد اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت و خوشنودی میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ احکام شریعہ کی پابند، اسلام سے دلی لگاؤ کی مظہر ہے، جو ایک مثالی نمونہ ہے۔ دوسرے سید رحم علی شاہ صاحب تھے، تیسرے محمد مکرم جہالوری تھے اور چوتھے قاضی غازی الدین پہلاں والے تھے۔

دوسرے خلیفہ سید رحم علی شاہ صاحب کی اولاد جو آج بھی پاکستانی سیاست اور معزز گھرانے کے طور پر خاصی جانی پہچانی ہیں، مثلاً سید محمد عبداللہ شاہ بخاری اور ان کے دونوں صاحبزادے مخدوم سید باسط سلطان بخاری اور مخدوم سید ہارون سلطان بخاری کافی عرصے سے ایم این اے اور ایم پی اے چلے آ رہے ہیں جو حضرت میاں مستقی

سائیں کی اولاد کے خاص مرید اور عقیدت مند ہیں۔

حضرت میاں متقی سائیں کی اولاد "ڈاہا برادری" ان کے تقویٰ و طہارت کی بناء پر علاقے میں خاصی احترام اور عقیدت کی نگاہ سے معتبر ہے اور موثق نظر سے دیکھی جاتی ہے، جو اپنے بزرگ، ولی کامل کی روایات کو تا حال زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ذہنی و روحانی تسکین حاصل کرنے کے لیے دور دراز اور گرد و نواح سے لوگ خاص تعداد میں حضرت میاں متقی سائیں کے دربار عالیہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنی منتیں پاتے ہیں۔

حضرت میاں متقی سائیں کا سالانہ عرس مبارک 14 محرم الحرام کو پوری عقیدت و احترام اور بڑی سادگی کے ساتھ منایا جاتا ہے، جس میں قرآن خوانی، محفل حسن و قرأت و نعت، تقاریر و سیمینار کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور وسیع لنگر کا انتظام بھی میاں صاحبان کرتے ہیں۔

دربار عالیہ کے احاطے میں لوگ مرنے کے بعد مدفون ہونا وصیت کرنے میں سعادت سمجھتے ہیں اور اکثریت میں لوگ مدفون ہیں۔ ان عقیدت مندوں میں جو قومیں شامل ہیں، ان میں سندیلہ، ڈاہا، دایہ، ڈمر، ڈھنہ، گھڑپال، متیلہ، بھٹہ، جھجھرہ، سگو، کبیرا، مسن، لکیہ، کوریہ، ددھہ، تنگھر، ڈوڈھی، چھناوڑ، کونجڑا، جانگلہ، ونیس، رانا، مستانہ، گاذر، مچھو، ایڈبند، جوگی، موہانہ۔

یہ علاقہ بہت عرصہ پہلے خاصا ویران اور سنسان تھا، مگر ان بزرگ ہستی کے تشریف لے آنے سے بہت زرخیز اور ترقی کی منزلیں طے کرتا جارہا ہے۔ کھیت کھلیان مثالی ہوتے ہیں۔ یہاں آم کے بہت بڑے باغات ہیں۔ اس کے علاوہ گندم، کپاس، کماد، سورج مکھی، مکئی، چاول اور مختلف اقسام کی سبزیاں بکثرت کاشت کی جاتی ہیں۔

زیادہ تر زمینیں ان میاں صاحبان ہی کی ہیں جو یہاں کے رئیس اور سردار کہلاتے ہیں۔ کافی اثر و رسوخ رکھنے والے یہ میاں صاحبان یہاں کی غربت عوام کے دکھ سکھ میں شامل بطور ثالث پائے جاتے ہیں۔

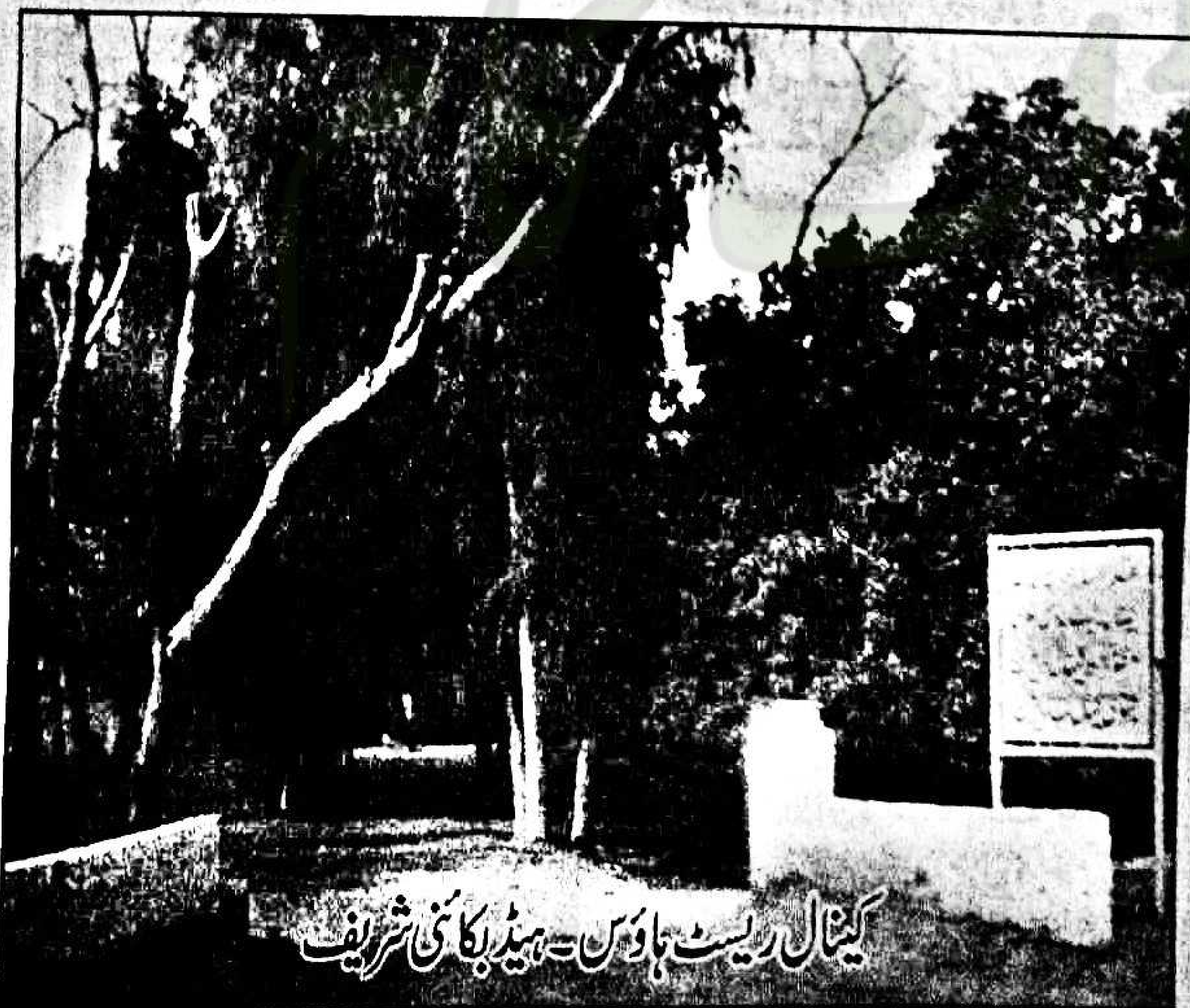
دربار عالیہ سے چند گز کے فاصلے پر قدیمی جامع مسجد ہے جہاں نماز عیدین بھی ادا کی جاتی ہیں، مگر اب پچیس سال سے پہلے موجود چھوٹی سی مسجد کو شہید کر کے اب ایک بہت بڑی جامع مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ قدرت کے حسین شاہکار خدا کے گھر میں اچھی خاصی تعداد میں لوگ نماز جمعہ اور عیدین پڑھنے دور دراز سے آتے ہیں۔ اس علاقے کی مرکزی جامع مسجد میں عوام کی کثیر تعداد میں آنا سعادت اس لیے بھی سمجھتے ہیں کہ اس مسجد میں نماز جمعہ اور عیدین کی نماز علاقے کی مشہور اور نیک شخصیت حضرت والا شان سید فخر الدین شاہ گیلانی اپنی امامت میں پڑھاتے ہیں۔ یہ پیر و مرشد علم و عمل میں اپنا ایک خاص مقام بھی رکھتے ہیں۔

میں بطور راقم ایک ایمان افروز واقعہ بیان کرتا ہوں، جس کا حضرت میاں متقی سائیں کی ذات اقدس سے گہرا تعلق ہے۔ چوں کہ ہیڈ بکائی شریف میں منعقدہ دینی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی تقریبات میں بطور اسٹیج سیکریٹری مجھے اعزاز حاصل ہے۔ آج سے کچھ سال پہلے دربار عالیہ کے احاطے کے ساتھ ہی حضرت میاں متقی سائیں کے عرس کی تقریب میں شامل میں اپنی ڈیوٹی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ ایک نہایت ہی غریب آدمی اکثر سالانہ عرس مبارک کی محفل میں سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ قرأت ہو رہی ہوتی یا نعت خوانی اور یا پھر علمائے کرام کا خطاب، وہ شخص نہایت عاجزی کے ساتھ آنسو بہاتا رہتا تھا اور وقفے وقفے سر اٹھا کر دربار شریف کی طرف رُخ کر کے نامعلوم کیا عرض کرتا۔ اس شخص کو میں نے دربار شریف میں اکثر صفائی اور تزئین و آرائش کرتے دیکھا تھا، جیسے کہ وہ اس دربار کا مجاور ہو۔

عرس کی تقریب اختتام پذیر ہونے کو تھی، آخر میں دُعا مانگی جانے لگی۔ وہی غریب آدمی قریب جا کر عالم دین سے عرض گزار ہوا کہ حضرت! میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ان نیک بخت ولی کامل اور صاحب دربار کے صدقے مجھے حج کی سعادت بخشے۔ اسی طرح سبھی شامل تقریب اشخاص نے آمین کہا۔ محفل برخاست ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ہمارے ہیڈ بکائی شریف علاقے میں مختلف جگہوں پر سالانہ محفل نعت منعقد کی جاتی ہیں اور اس سال بھی جتوئی شہر میں جو پندرہ بیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے، ایک مقامی انجمن کے زیر اہتمام سالانہ کل پاکستان عظیم الشان

محفل نعت منعقد ہو رہی تھی، جس میں ملک کے کونے کونے سے نامور اور مقبول قراء اور نعت خواں حضرات تشریف لا رہے تھے۔ ہر سال اس رنگ و نور کی ایمان افروز محفل میں اردگرد اور دور دراز سے آئے ہوئے عاشقانِ رسول ﷺ کی کثیر تعداد باوضو ہو کر درود شریف پڑھتی ہوئی شامل ہوتی ہے۔ دور دراز سے روحانی و علمی معتبر شخصیات کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ اس محفل کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ جہاں لنگر کا خاص اہتمام ہوتا ہے، وہاں سامعین و حاضرین کے لیے ایک عدد عمرہ ٹکٹ بہ ذریعہ قرعہ اندازی دیا جاتا ہے، جو مہمان خاص اپنے ہاتھ سے عنایت کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ پروگرام کے آخر میں ہوتا ہے۔ شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی کے ساتھ قسمت آزمائی ہوتی ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ گزشتہ برس کی طرح اس مرتبہ بھی گیا تھا۔ گزشتہ برس کی طرح اس سال بھی محفل نعت کا رنگ و سرور عروج پر تھا۔ قراء حضرات تلاوت قرآن مجید کر چکے تھے اور دو تین نعت خواں بھی گلہائے عقیدت پیش کر چکے تھے۔ اسی دوران ایک نیک سیرت سید صاحب جو اپنے بزرگ ولی کامل کے مزار کے سجادہ نشین تھے، پنڈال میں تشریف لائے، جونہی نقیب محفل نے ان کی آمد کا اعلان کیا تو لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے تو عقیدت مند اور پرستار حضرات سلام و مصافحہ کے لیے امڈ پڑے۔ سعادت کے طور پر ہم نے بھی مصافحے کا شرف حاصل کیا۔ ایک آدمی نے جو انداز و لباس سے غریب لگتا تھا، نے سلام و مصافحہ کرنے کی غرض سے اسٹیج کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ انتظامیہ کمیٹی کے ارکان نے اسے اوپر نہ آنے دیا اور واپس پنڈال میں دھکیل دیا۔ اس نے تین بار کوشش کی، مگر اسے اسٹیج پر نہ جانے دیا گیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہی غریب سا شخص تھا جو حضرت میاں متقیؒ سائیں کے دربار میں مجاور بن کر بیٹھا کرتا تھا اور جس نے دعا کے دوران حج عمرہ حاصل کرنے کی دعا کرائی تھی۔ پہچاننے میں دیر اس لیے لگی تھی کہ اس نے اپنے چہرے کو رومال سے ڈھانپ رکھا تھا اور قدرے داڑھی بھی بڑھ آئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسکین صورت غریب آدمی اداسی و مایوسی کے عالم میں روہانسا ہو کر واپس اپنی جگہ بیٹھنے کے لیے نامعلوم کہاں چلا گیا۔ مجھے دلی طور پر دکھ ہوا، کیوں کہ انتظامیہ ارکان کے توہین آمیز سلوک سے اس کی بے



کینال ریسٹ ہاؤس۔ ہیڈ بکائنی شریف

آتشِ جنوں



سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام ونشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا ہارا



چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 26ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت منداور اپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے.....ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے، جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی، راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس، عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں...... عمران اور تیمور شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ عمران سے آملتا ہے۔

ہیں۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں۔

وقارالحسن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی مرسڈیز نظر آتی ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے، جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔ عمران اور ہاشم بڑے محفوظ طریقے سے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اگلے روز وقارالحسن سے ملنے ان کے آفس پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ فکرمند ہو جاتے ہیں۔ عمران وقارالحسن کو اپنی فیملی ٹریجڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی عشبدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقارالحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور "را" کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں نے اخبار میں جاب کر لی۔ میں پاکستان کے کثیرالاشاعت روزنامے کا چیف کرائم رپورٹر اور پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا۔ ان ہی دنوں میں نے بھارت جانے کا پروگرام بنایا۔ میرے دور و نزدیک کے بہت سے رشتے دار یوپی کے مختلف شہروں میں ہیں۔ میں جرنلسٹ کے ویزے پر سفر کر رہا تھا، اس لیے مجھے آٹھ شہروں کا ویزا مل گیا تھا۔ میں نے اور میرے کزن ناصر نے آگرہ جانے کا پروگرام بنایا۔ جہاں تاج محل دیکھنے کے بعد جو کوچ ہمیں آگرہ لے کر آئی تھی، اسی میں ہمیں واپس جانا تھا۔ واپسی پر بس متھرا کے مقام پر رکی جہاں ہم لوگوں نے کھانا کھایا، وہیں ہماری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جس نے اپنا نام صائمہ بتاتے ہوئے کہا کہ آپ جس بس میں سفر کر رہے ہیں، اس میں آپ کے لیے خطرہ ہے۔ تب ہی دو آدمی ہماری طرف آئے اور ہم سے کہا کہ تم لوگ زیر حراست ہو۔ وہ ہماری آنکھوں پر بلائنڈ فولڈ باندھ کر ہمیں اپنے ہمراہ ایک مقام پر لے آئے جہاں مزید چھ سات لوگ موجود تھے۔ ان میں ایک نے مجھے میجر وقار کے نام سے پکارتے ہوئے پوچھا کہ تم کس مشن پر انڈیا آئے تھے۔ میں نے جواب میں بتایا کہ میں میجر نہیں بلکہ وقارالحسن ہوں۔ کالمسٹ اور جرنلسٹ لیکن ان لوگوں نے میری بات پر اعتبار کرنے کے بجائے ونود اور شنکر کے حوالے کر دیا جو مجھ پر شدید تشدد کے ذریعے سچ اگلوانے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی ان کا تشدد جاری تھا کہ ان کا باس کمرے میں آیا، اس نے میری مرہم پٹی اور کھانے کی ہدایت کی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ تمہارے لوگوں نے بھارتی پریس کو اطلاع دی ہے کہ ہم نے کسی پاکستانی جرنلسٹ کو گرفتار کیا ہے اور پریس نے اودھم مچایا ہوا ہے کہ اگر کوئی جرنلسٹ گرفتار کیا گیا ہے تو اسے کورٹ میں پیش کیوں نہیں کیا گیا اور اسے میڈیا سے کیوں چھپایا گیا۔ تمہارا معلوم ہونے کے بعد دہلی کے چیف منسٹر نے بھی پولیس سے جواب طلب کر لیا ہے، لہٰذا تمہیں میڈیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ مجھے بلائنڈ فولڈ پہنا کر لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں ہماری گاڑی روک لی گئی، پھر مجھ سمیت تمام لوگوں کو گاڑی سے اتار لیا گیا۔

گاڑی روکنے والے افراد تعداد میں تین تھے، وہ وقارالحسن سے کہتے ہیں کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم آپ کے دوست ہیں۔ ان لوگوں نے وقارالحسن کے اغوا کنندہ افراد کو گاڑی میں بٹھایا اب بلائنڈ فولڈ ان لوگوں کی آنکھوں پر تھا۔ گاڑی ایک بنگلے پر پہنچتی ہے وہ لوگ وقارالحسن کو ایک بیڈ روم میں چھوڑ کر آرام کرنے کا کہتے ہیں اور ان کے اغوا کاروں کو بنگلے کے دوسرے حصے میں لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ وقارالحسن کو بتاتے ہیں کہ انہیں اغوا کرنے والوں کا تعلق "را" سے ہے۔ تب ان کے روم میں صائمہ نامی لڑکی جو انہیں متھرا میں ملی تھی آتی ہے اور وقارالحسن کو بتاتی ہے کہ اس کا تعلق کشمیر لبریشن فرنٹ کے فارورڈ بلاک سے ہے۔ وہ انہیں ان کزن ناصر کی رہائی کی یقین دہانی کرواتی ہے۔ رہائی کے بعد ناصر اور وقارالحسن امرتسر پہنچتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور قیدی ارشد نامی بھی تھا۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران پولیس والے ان سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ بغیر ویزہ امرتسر آنے پر وقارالحسن کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں ان کی ملاقات کئی ایسے قیدیوں سے ہوتی ہے جو محض مسلمان اور پاکستانی ہونے کے جرم میں پوری پوری عمر میں وہاں کاٹ چکے ہوتے ہیں۔ وکی نامی قیدی ان سے کہتا ہے کہ اس جیل سے تم قانونی طور پر رہا نہیں ہو سکتے اس لیے تمہیں یہاں سے غیر قانونی طریقے سے باہر نکلنا ہوگا، وقارالحسن اس کی اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں اور فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ تب ہی انہیں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

وکی دیوار کے ساتھ لگا لگا بہت پھرتی سے دوسری دیوار تک پہنچا، اسی دوران میں ایک سنتری نے ہمیں دیکھ لیا اور سیٹی بجانے کی کوشش کی لیکن وکی کی ایک ہی لات نے اسے خاموش کر دیا۔ باقی سنتری شاید دوسری طرف جا چکے تھے، جدھر دھماکے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ دھماکے بھی اس کے ساتھی کر رہے ہیں اور ان سے آگ بھڑک گئی ہوگی، کیوں کہ ان دستی بموں میں ایسا کیمیکل بھی ہے جو بہت تیزی سے آگ لگاتا ہے۔ دوسری دیوار پر چڑھنے کے لیے وکی نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا، پھر میرے کندھوں پر چڑھ کر اس نے مجھے کھڑا ہونے کو کہا، پھر وہ ایک جھٹکے میں دیوار پر پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر نہ جانے کیسے اس نے اپنے پنجے دیوار میں پھنسائے اور سر کے بل نیچے کی طرف آ گیا اور بولا۔ "وقار! میرے ہاتھ پکڑ کر اوپر آ جاؤ۔"

میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کے ہاتھ تھام لیے، اس نے مجھ سے کہا۔ "میں اس طرح لٹکا رہوں گا، تم میرے جسم کا سہارا لے کر اوپر دیوار پر پہنچ جاؤ۔ میں اس کے بازو، کمر اور پاؤں پکڑتا ہوا اوپر دیوار تک پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا، اب میرے پاؤں پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچو۔" میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اوپر کھینچے تو وہ بھی قلابازی کھا کر دیوار پر آ گیا۔

جیل کے دوسرے حصے میں ابھی تک سنتریوں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں، وہاں سے شور شرابے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وکی نے مجھے بتایا کہ ان ہی کے ساتھیوں نے جیل کی اس طرف دھماکے کیے ہیں تاکہ سنتریوں کی توجہ بٹی رہے اور ہم لوگ اطمینان سے باہر نکل آئیں۔

ہم لوگ دیوار کی طرف دوڑے، یہاں ہمیں ایک سیڑھی بھی مل گئی، شاید وہ سیڑھی وکی کے ساتھیوں نے پہلے سے رکھی تھی، یا یہ محض اتفاق تھا۔ مجھے یہ اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ وکی سیڑھی اٹھا کر دیوار کی طرف بھاگا، پھر اس نے سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی ہی تھی کہ ایک گونج دار آواز سنائی دی۔

"ہالٹ"

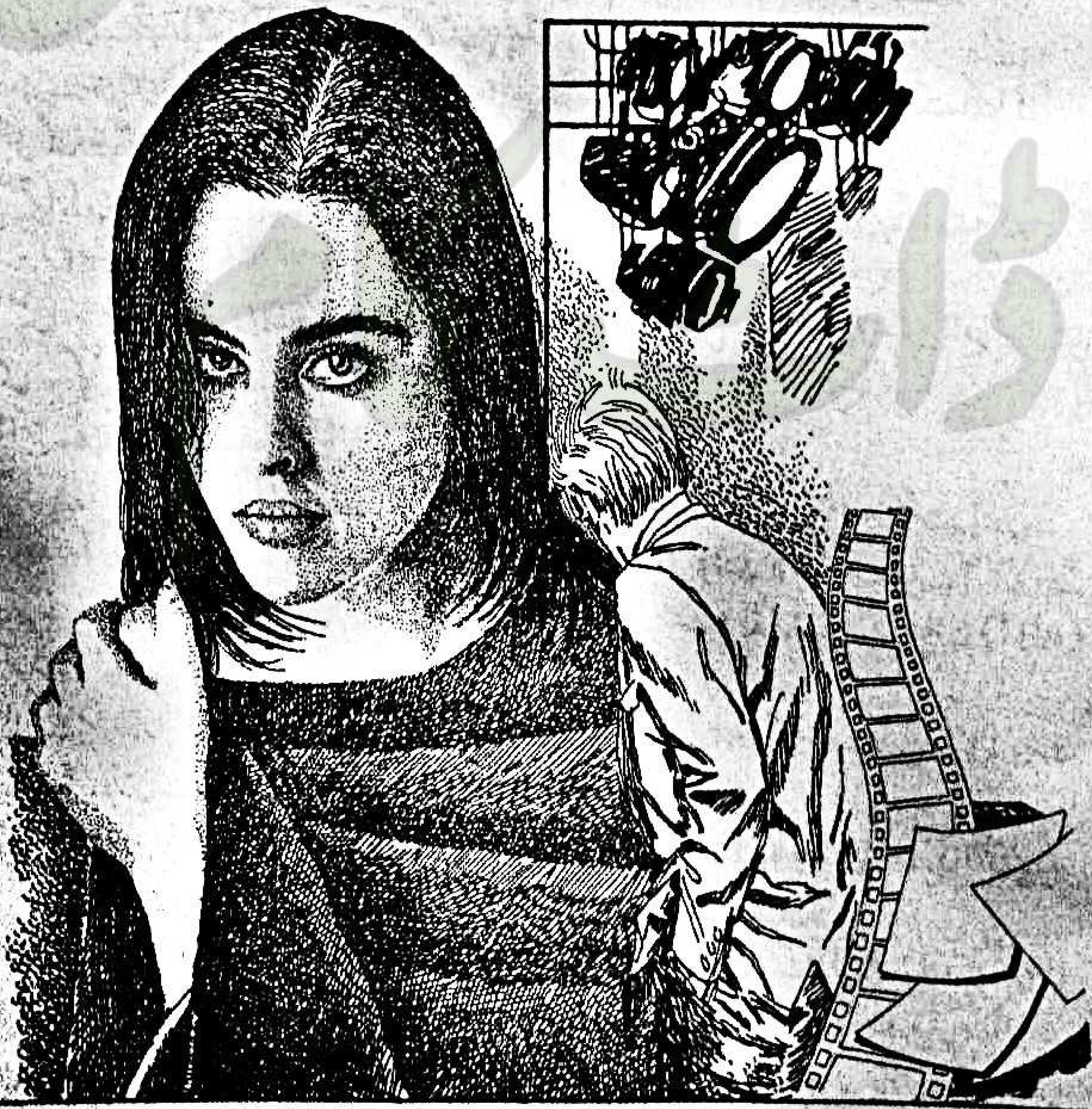
میرے قدم گویا زمین نے پکڑ لیے، لمحے بھر تو وکی بھی سکتے میں آ گیا۔

شور کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وکی نے چیخ کر کہا۔ "جلدی کرو، سوچ کیا رہے ہو؟"

مجھے بھی جیسے ہوش آ گیا، اس دوران میں وکی پھرتی سے سیڑھی کے ذریعے دیوار پر چڑھ چکا تھا اور مجھے بھی آوازیں دے رہا تھا۔

میں دیوار کی طرف لپکا تو پھر وہی گرج دار آواز سنائی دی۔ "رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں اس کی پروا کیے بغیر دیوار کی طرف بھاگا۔ اس وقت ایک فائر ہوا اور گولی میرے سر سے گزرتی ہوئی سامنے والی



دیوار میں پیوست ہوگئی۔ میں گولی کی پروا کیے بغیر بھاگتا رہا، پھر دوسرا فائر ہوا اور میرے بائیں پیر میں گویا انگارے سے بھر گئے، تکلیف کی شدت سے میری کراہ نکل گئی۔ میں لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دیوار کی طرف دیکھا، وکی اب دیوار پر چھپکلی کی طرح لیٹا ہوا تھا اور اب بھی مسلسل چیخ چیخ کر مجھے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا۔ پھر اس پر بھی دو فائر ہوئے، وہ پلک جھپکتے ہی دوسری طرف کود گیا۔

اس وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور مجھے چھ سات سنتریوں نے گھیر لیا۔ ان سب کی رائفلوں کا رُخ میری طرف تھا۔ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ ''کھڑا ہو جا اور بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اس مرتبہ گولی ٹانگ میں نہیں بلکہ تیری کھوپڑی پر پڑے گی۔''

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ میرے پیر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

''یہ تو بہت بری طرح زخمی ہے۔'' سنتریوں میں سے کوئی بولا۔

پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں اردگرد سے بے خبر ہوگیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں کسی بیرک میں تھا، اس کی چھت معمول سے کچھ زیادہ ہی اونچی تھی۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے وہاں مختلف بیڈز پر مزید افراد بھی دکھائی دیے، ایک ڈاکٹر اور ایک نرس بے زاری کے انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے اور انتہائی کرخت لہجے میں ان سے مخاطب تھے۔

میں سمجھ گیا کہ میں اس وقت جیل کے کسی اسپتال میں ہوں۔ وہاں صفائی کا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ فرش سیاہ سیمنٹ کا اور انتہائی گندہ تھا۔ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ بھی گیا تھا، مریضوں کے جو آہنی بیڈ لگائے گئے تھے وہ بھی انتہائی خستہ تھے اور ان پر بستر بھی نہایت غلیظ تھے۔ اسی وقت ڈاکٹر اور نرس میرے پاس آ گئے۔

''کیا حال ہے تمہارا؟'' ڈاکٹر نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''میرے پیر میں...... شدید...... تکلیف ہے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے نحیف آواز میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی تھی۔

''تمہاری پنڈلی میں گولی لگی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہڈی تو محفوظ ہے لیکن خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے، تمہیں بلڈ کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''میں...... خون...... کا بندوبست...... کیسے کرسکتا...... ہوں...... ڈاکٹر!'' میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ ''میرا...... اس ملک میں...... کوئی بھی نہیں...... ہے۔''

ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کیا مطلب......؟ تم غیر ملکی ہو؟''

''جی ہاں ڈاکٹر!'' میں نے کہا۔ ''میں پاکستانی ہوں...... اور...... ناکردہ...... گناہ...... کی سزا...... بھگت رہا ہوں۔''

''او...... آئی سی!'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر وہ نرس سے مخاطب ہوا۔ ''انیتا! اس پیشنٹ کا بلڈ گروپ کیا ہے؟'' نرس نے میرے سرہانے کے ساتھ رکھی ہوئی آہنی ٹیبل سے فائل اُٹھائی اور بولی۔ ''پیشنٹ کا بلڈ گروپ اے بی پازیٹو (AB+) ہے ڈاکٹر شاہد!''

''اوکے مسٹر وقار!'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ نرم تھا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے لیے بلڈ کا بندوبست ہوجائے۔'' پھر وہ نرس سے بولا۔ ''سسٹر! پیشنٹ کا بلڈ سیمپل لے کر لیبارٹری میں بھجوا دیں۔''

پھر ڈاکٹر نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا، نبض دیکھی، اسٹیتھ اسکوپ سے میرے سینے کا جائزہ لیا اور میری فائل پر کچھ دوائیں لکھ دیں۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا، مریضوں میں بھانت بھانت کے افراد تھے، زیادہ تر تو شکل ہی سے پیشہ ور مجرم نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ زخمی اور کچھ بیمار تھے، اس بیرک کی فضا حبس آلود تھی اور وہاں دواؤں اور مریضوں کے پسینے کی بدبو پھیلی ہوئی تھی، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس غلیظ اور حبس آلود بیرک سے بھاگ جاؤں اور کھلی فضا میں

سانس لوں، لیکن میرے پیر میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ میں اسے ہلانے کی کوشش بھی کرتا تھا تو درد کی ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔

تھوڑی دیر میں وہی نرس پھر آ گئی، اس کے ہاتھ میں دواؤں کی ٹرے تھی، اس کا رنگ سانولا لیکن نقوش تیکھے تھے۔ جسم بھی مناسب تھا۔ اگرچہ چہرے پر کرختگی کے آثار نہ ہوتے تو وہ خاصی خوش شکل نظر آتی۔

اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے سہارا دے کر تھوڑا سا اوپر اُٹھایا اور مجھے دو ٹیبلٹ کھلا دیں، پھر وہ کوئی انجکشن تیار کرنے لگی، اس نے کوئی بہت اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا، اس حبس زدہ اور غلیظ ماحول میں اس کے پرفیوم کی مہک مجھے بہت خوش گوار لگی، اس نے انجکشن تیار کیا اور میرے بازو میں لگا دیا۔ پھر وہ اشتعال انگیز چال چلتی ہوئی دوسرے مریض کی طرف بڑھ گئی، پھر مجھ پہ غنودگی طاری ہوگئی، بے خبر ہونے سے پہلے مجھے احساس ہوا کہ سسٹر نے مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دیا ہے۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو اس وقت اس حبس زدہ بیرک میں روشنی تھی، یہ روشنی الیکٹرک بلب کی نہیں بلکہ سورج کی تھی، بیرک میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کھڑکیاں بھی موجود تھیں، ان کھڑکیوں کا احساس مجھے نہیں ہوا تھا، شاید اس وقت رات تھی، کھڑکیوں میں موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس وقت وہاں اتنی گھٹن اور حبس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

میری نظر اپنی بائیں جانب پڑی تو مجھے اسٹینڈ پر بلڈ کا ایک بیگ نظر آیا، اس بیگ میں سے قطرہ قطرہ لہو میرے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔

میں نے ہول کر سوچا، کیا یہ کسی ہندو کا خون ہے؟ کیا میری رگوں میں اب ہندو کا خون گردش کرے گا؟ ایک لمحے کو تو میرا دل چاہا کہ میں اپنے جسم سے خون کی نلکی نکال کر پھینک دوں۔

میں شاید ایسا کر بھی گزرتا کہ اس وقت ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے مسٹر وقار؟“

”اب تو خاصی بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر! یہ بلڈ.....“ میں نے Arrange کیا ہے۔“ ڈاکٹر نے میری بات کاٹ دی۔

”تمہارے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا، اگر تمہیں بلڈ نہ دیا جاتا تو اب تک تم زندہ نہ رہتے، یہ بلڈ کا دوسرا بیگ ہے، ابھی تمہاری ٹانگ کا آپریشن بھی ہوگا۔ آپریشن تو فوری طور پر ضروری تھا لیکن تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ.....“

”ڈاکٹر! یہ خون..... آپ نے..... کہاں سے Arrange کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ.....“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں مسٹر وقار!“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”لیکن خون نہ صرف خون ہوتا ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا..... لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ خون ایک مسلمان کا خون ہے اس سے پہلے بھی بلڈ کا جو بیگ تمہیں دیا گیا ہے، وہ بھی مسلمان ہی کا تھا..... میرا بلڈ گروپ بھی اے بی پازیٹو (AB⁺) ہے۔ وہ بلڈ میں نے تمہیں دیا تھا اور میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔“

میں سناٹے میں رہ گیا، اس دشمن ملک میں جہاں قدم قدم پر مجھے اذیت اور قید و بند کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس ڈاکٹر کی بات عجیب تھی۔ بھارت میں تو اب مسلمان بھی خود کو بھارتی ہی سمجھتے ہیں۔ وہ کسی پاکستانی کی مدد کیوں کرنے لگے؟ پھر میرا یہ سوال زبان پر بھی آ گیا۔

”آہستہ بولو۔“ ڈاکٹر نے اردگرد دیکھ کر کہا۔ ”یہ نہ ہو کہ کسی مسلمان اور وہ بھی پاکستانی جاسوس سے ہمدردی کرنے کی پاداش میں میری بھی جاب جاتی رہے۔“

”لیکن ڈاکٹر.....“

”بس، اب تم کچھ نہیں بولو گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ میری دواؤں کا چارٹ دیکھا، اس میں کچھ لکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں دیر تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہا کہ دشمنوں کے درمیان یہ فرشتہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟

مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک بیڈ پر خوف ناک چہرے والا ایک شخص موجود تھا۔ اس کے گولی لگی تھی یا پھر وہ کسی اور طرح زخمی ہوا تھا، لیکن اسے تکلیف کا ذرہ برابر احساس نہیں تھا۔ احساس ہوگا بھی تو وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا، وہ گھٹے ہوئے جسم، درمیانے قد اور مضبوط ہاتھ پیروں کا گہرا سانولا بلکہ کالا آدمی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس نے سر پہ بڑے بڑے بال اور گھنی

مونچھیں رکھی ہوئی تھیں، زخمی ہونے کے باوجود وہ وارڈ میں ایک آدھ دفعہ ٹہل ضرور لیتا تھا۔
ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ نہ جانے کیا سوچ کر میری طرف آ گیا اور استہزائی انداز میں بولا۔ ''کیا بات ہے بابو صاحب! ڈاکٹر تو کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا ہے لیکن تم سے بہت گھل مل کر بات کر رہا تھا...... اور وہ بلبل بھی تمہارے ساتھ بہت ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی؟'' اس کا اشارہ سسٹر کی طرف تھا۔
''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ تو تم ڈاکٹر صاحب ہی سے پوچھنا۔''
''زیادہ اکڑنے کی کوشش مت کرو۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ''سچ سچ بتا تو نے اس...... ڈاکٹر اور...... نرس کو کتنے پیسے کھلائے ہیں؟'' اس نے ڈاکٹر اور سسٹر کو انتہائی غلیظ گالیاں دیتے ہوئے کہا۔
''یہ بھی تم ان ہی سے پوچھو تو بہتر ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''تو مجھے جانتا ہے؟'' اس نے بھڑک کر کہا۔ ''اس حالت میں بھی کسی کی جرأت نہیں ہے کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کرے۔ ایجنسیوں کے تین بندوں کو جہنم رسید کیا ہے...... اور کچھ پوچھنا ہے؟'' لمحے بھر کو اس کا سیاہ چہرہ مسخ ہو گیا اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا، پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''آپ سچ مچ آئی ایس آئی کے افسر ہو؟''
''میری بات پہ یقین نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لینا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔
''ہاں، تم کس جرم میں جیل آئے ہو، چوری یا ڈکیتی یا جوا کھیلنے کے الزام میں؟''
''میں نے دو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔'' اس نے کہا، پھر ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے بیڈ پر چلا گیا۔
''نور علی!'' ڈاکٹر نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم سے کہا ہے کہ ابھی چلو پھر و مت۔ تمہارے زخم کے ٹانکے کھل جائیں گے، پھر زخم بھرنے میں زیادہ وقت لگے گا۔''
''اس لیے تو یہ بے احتیاطی کرتا ہے ڈاکٹر!'' سسٹر نے کہا۔ ''اسے اسپتال میں زیادہ سے زیادہ رہنے کا موقع مل جائے گا۔''
''مسٹر وقار!'' ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ''کل تمہارا آپریشن ہے، آج رات سے تمہارا کھانا پینا بند کر دیا جائے گا۔'' پھر وہ سسٹر سے مخاطب ہوا۔ ''پیشنٹ کو ایکسرے کے لیے لیبارٹری میں شفٹ کروائیں۔''
''او کے ڈاکٹر!'' سسٹر نے کہا۔
ڈاکٹر دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔
مجھے حیرت تھی کہ اب تک اس اسپتال میں مجھے جو بھی ملا ہے، وہ مسلمان ہے۔ سوائے اس سسٹر کے، یہ محض اتفاق تھا، ورنہ اس طویل و عریض بیرک میں سارے مریض تو مسلمان ہونے سے رہے، تھوڑی دیر بعد ایک وارڈ بوائے وہیل چیئر لے کر آ گیا اور مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر لیبارٹری کی طرف لے گیا۔
بیرک سے باہر نکلنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی جیل کا اسپتال نہیں ہے بلکہ خاصا بڑا جنرل ہوسپٹل ہے۔ باہر او پی ڈی میں بہت رش تھا، اس میں مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں جو اپنے بچوں کو گود میں لیے ہوئے اپنی باری کی منتظر تھیں۔
میرے وارڈ کے باہر پولیس والے موجود تھے، میرے باہر نکلتے ہی سادہ لباس میں دو پولیس والے میرے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، ان میں سے ایک تو میرے ساتھ لیبارٹری میں بھی آنا چاہ رہا تھا لیکن ڈاکٹر شاہد نے کہا۔ ''مسٹر آفیسر! آپ پلیز باہر ویٹ کریں۔''
اس نے ناگواری سے ڈاکٹر کو دیکھا، پھر بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنا خطرناک مجرم ہے۔''
''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ میرا پیشنٹ ہے۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔
ایکسرے کے بعد ڈاکٹر مجھے لیبارٹری کے ایک گوشے میں لے گیا اور بولا۔ ''وقار صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ بے گناہ ہیں اور گزشتہ کئی برس سے اس بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں، میں نے اسکول کے زمانے میں آپ کے کالم بھی پڑھے ہیں جب آپ کو متھرا سے گرفتار کیا گیا تھا تو مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ صدمہ بھی ہوا تھا۔''
''بھارت کی پوری پولیس فورس ''را'' سمیت مجھے آئی ایس آئی کا ایجنٹ سمجھتی ہے اور اب تو یہ بہت پرانی بات ہو گی

ہے، میری جوانی کے سنہرے سال بھارت کی بدترین جیلوں میں تشدد سہتے ہوئے گزر گئے ہیں، باقی عمر بھی گزر جائے گی۔"

"اتنی مایوسی کی باتیں کرتے ہیں وقار صاحب! اب بھی آپ بوڑھے تو نہیں ہو گئے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ڈاکٹر! آج نہ سہی تو کل میں ان ہی جیلوں میں بوڑھا ہو کر ایک دن دم توڑ دوں گا۔ اب تو میری فردِ جرم میں جیل سے فرار ہونے کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں وقار صاحب! مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے گا میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔" ڈاکٹر شاہد کے لہجے میں خلوص تھا۔

"میری وجہ سے آپ بھی کسی آفت میں پڑ جائیں گے ڈاکٹر!" میں نے کہا۔ "میں نے تو اب حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔"

"میری فکر مت کریں۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ "اب چلیں، باہر کھڑا ہوا پولیس آفیسر پیچ و تاب کھا رہا ہوگا۔"

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی؟" میں نے کہا۔ "اگر میں ان لوگوں کی نظر میں اتنا ہی خطرناک ہوں تو انہوں نے مجھے علیحدہ کمرے میں کیوں نہیں رکھا؟"

"یہ بیرک دراصل جیل سے آنے والے قیدیوں کے لیے مخصوص ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اس میں باہر جانے کا صرف ایک راستہ ہے، پھر مختلف قیدیوں کے ساتھ پولیس والے بھی ہوتے ہیں، اس طرح اس بیرک کی نگرانی زیادہ بہتر طریقے سے کی جاتی ہے۔"

"میں ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکلا تو پولیس کا وہ آفیسر کوری ڈور میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

ڈاکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ "مسٹر آفیسر! یہ ہوسپٹل ہے، اگر آپ کو اسموکنگ کرنا ہے تو پلیز باہر جا کر کریں۔"

"او کے!" اس نے کہا اور سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔

گولی میری پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن زخم کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر شاہد اس لیے میرا آپریشن کرنا چاہ رہا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا، اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر میرے بیڈ پر سفید براق اجلی بیڈ شیٹ اور نیا کمبل موجود تھا۔

رات کو تقریباً تمام مریض سو رہے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے، میں خود بھی نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ اچانک کسی نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا، میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، وہ نوردین تھا۔ بیرک کی ناکافی روشنی میں اس کا چہرہ زیادہ بھیانک لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے نوردین؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"آہستہ بولیں صاب!" اس نے کہا۔ "ورنہ دوسرے مریض بھی اٹھ جائیں گے، وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔" صاحب! آپ مسلمان ہو اور پاکستانی ہو؟" اس نے گویا تصدیق چاہی۔

"میں تمہیں بتا تو چکا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں بھی مسلمان ہوں۔" اس نے کہا۔ "اور آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے مشتبہ نظروں سے اسے گھورا۔ "میری مدد کرنا چاہتے ہو؟" میں نے غیر یقینی سے کہا۔ "کہیں یہ بھی تو تمہاری حکومت کی کوئی چال نہیں؟"

"کس حکومت کی بات کر رہے ہو صاب؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ حکومت جو مسلمانوں کو اچھوت سمجھتی ہے؟ ان پر تعلیم اور روزگار کے دروازے بند ہیں۔ میں بھی کوئی پیدائشی ڈاکو نہیں ہوں صاب! میں نے مزدوری کی تلاش میں بہت دھکے کھائے ہیں، بہت ذلیل ہوا ہوں، دب کے چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے صاحب، میں تو پھر انسان ہوں۔"

"تم تو خود قیدی ہو نوردین!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم بھلا میری مدد کیسے کر سکتے ہو؟"

"میں خود جیل میں ہوں لیکن میرے ساتھی تو باہر ہیں۔ آپ فکر مت کرو صاب! میں آپ کی ہر طرح سے مدد کروں

گا۔" یہ کہہ کر نورودین واپس اپنے بیڈ پر چلا گیا۔
دوسرے دن میرا بہت چھوٹا سا آپریشن تھا۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹرز نے مجھے مزید دو ہفتے تک مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا۔ ڈاکٹر شاہد کی ڈیوٹی عموماً رات کو ہوتی تھی، اس نے مجھے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ میں سسٹر کی باتوں میں نہ آؤں کیوں کہ مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی ایجنسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بعد سے میں سسٹر کی طرف سے محتاط ہو گیا۔
ان ہی دنوں ایک نیا وارڈ بوائے بیرک میں آیا۔ وہ اپنے حلیے اور شکل و صورت سے وارڈ بوائے نہیں لگتا تھا۔ اس نے اپنا نام ارجن شرما بتایا، لیکن مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ عام بھارتیوں کے مقابلے میں اس کی اردو بہت صاف اور بامحاورہ تھی۔
ایک دن ڈاکٹر شاہد نے بہت عجیب انکشاف کیا۔ اس نے بتایا کہ ارجن کا نام کچھ اور ہے اور وہ مسلمان ہے۔
"ارجن مسلمان ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
"اب میں نے تم سے اتنی باتیں کر ہی لی ہیں تو یہ بھی بتا دوں کہ میرا تعلق کشمیر لبریشن فرنٹ سے ہے اور ارجن بھی اسی جہادی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے، اس کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔"
میں مزید حیرت زدہ رہ گیا۔
"زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر وقار! بھارت میں ہمارا نیٹ ورک بہت وسیع ہے، ہمارا ایک ونگ تو مسلح جدوجہد میں حصہ لیتا ہے اور دوسرا ونگ ان کے سرکاری دفاتر، اسکولوں، مالیاتی اداروں اور اسپتالوں میں سرگرم عمل ہے، ویسے ارجن کا تعلق تنظیم کے مسلح ونگ سے ہے یہاں تو وہ کسی خاص مشن پر آیا ہے۔"
"کیسے خاص مشن پر ڈاکٹر صاحب؟" میں نے پوچھا۔
ڈاکٹر نے ادھر ادھر دیکھا، میں اس وقت ڈاکٹر کے کمرے میں تھا اور وہ میرا جسمانی معائنہ کرنے مجھے یہاں لایا تھا اس لیے اتنی کھل کر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "اسپتال میں کشمیر کی وزارت خارجہ کا ایک بڑا افسر داخل ہے، ارجن اسے ختم کرنے آیا ہے، کیوں کہ اس مردود افسر نے کشمیر میں ہمارے کاز کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ممکن ہے ارجن آپ سے بھی رابطہ کرے اور لگے ہاتھ آپ کی رہائی کی بھی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔"
"اس سے پہلے بھی کچھ دوست مجھے یہاں سے نکالنے کی کوشش کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "غالباً ان کا تعلق بھی آپ ہی کی تنظیم سے تھا۔"
"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ان کا تعلق ایک دوسری جہادی تنظیم سے تھا۔ ہمارے مقابلے میں وہ تنظیم مسلح طور پر زیادہ منظم ہے اور زیادہ وسائل کی حامل ہے، یہ تو آپ کی لک ہے کہ آپ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اب بھی آپ کی رہائی کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔"
ڈاکٹر سے فارغ ہو کر میں ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلا تو میرے نگراں دونوں یاجوج ماجوج روح کے فرشتوں کی طرح میرے سر پر تھے۔
"یار تم لوگوں کو کیا دھڑکا ہے؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "کیا میں اس حالت میں یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں یا دھواں بن کر تحلیل ہو سکتا ہوں جو تم لوگ سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے ہو؟"
"ہم تو خود اس ڈیوٹی سے بیزار ہیں صاحب!" ان میں سے ایک بولا۔ ان دونوں میں غالباً وہ سینئر تھا۔ "لیکن کیا کریں، ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے، ہم آپ کو بلاوجہ پریشان نہیں کرتے، باعزت طریقے سے بات کرتے ہیں، کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ اپنے ملک کے ایک بڑے افسر ہیں۔"
اس دوران میں وارڈ بوائے میری وہیل چیئر وارڈ میں پہنچا چکا تھا۔
میں ابھی جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ارجن ایک ٹرے میں دوائیاں لے کر آ گیا، اس نے مجھے ٹیبلٹس دیں، اس کے ساتھ میں غیر محسوس طریقے پر اس نے مجھے ایک پرچہ بھی دے دیا، میں نے کاغذ کو فوراً اپنے تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ ڈاکٹر

مجھے اس کے بارے میں بتا چکا تھا، ورنہ شاید میں اسے بھی بھارتی حکومت کی کوئی چال سمجھتا۔
اس کے جانے کے بعد میں نے تکیے کے نیچے سے وہ پرچہ نکالا اور اسے ایک میگزین میں رکھ کر پڑھنے لگا۔ انگلش کے میگزین بھی ڈاکٹر لایا تھا۔
پرچے میں کسی کو مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو بے گناہ پھنسایا گیا ہے، آپ کا زخم اگلے ہفتے تک اتنا بھر جائے گا کہ آپ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے، ہاں اسپتال کے عملے کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہو۔"
میں نے دو تین دفعہ وہ مختصر سا پیغام پڑھا، پھر اس کی گولی بنا کر منہ میں ڈال کر چبایا اور اچھی طرح چبانے کے بعد اسے تھوک دیا۔
تھوڑی دیر بعد اسپتال کا ایک خبیث صورت والا وارڈ بوائے آیا اور مجھ سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ کو سہارا دے کر چلاؤں۔"
"میری ٹانگ تو ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ دیر پہلے میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی تو مجھ سے کھڑا نہیں ہوا گیا، مجھے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ میری زخمی ٹانگ ربر کی ہے اور وہ میرا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔"
"آپ کوشش تو کریں۔" وہ بولا۔ "آیئے، میں آپ کو باہر لے چلتا ہوں۔"
اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور مجھ سے زخمی ٹانگ زمین پر رکھنے کو کہا۔ میں نے زخمی ٹانگ زمین پر رکھ دی اور اس پر جسم کا بوجھ ڈالا۔ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ میری ٹانگ میرے جسم کا بوجھ اٹھا سکتی ہے، اس کے باوجود تکلیف کی شدت سے میرا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا، پھر مجھے خیال آیا کہ ارجن کی ہدایت کے مطابق مجھے ابھی خود کو صحت مند ظاہر نہیں کرنا ہے۔
یہ سوچ کر میں چیختا ہوا وارڈ بوائے پر ڈھے گیا۔
اس وقت ڈاکٹر شاہدا گئے۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" ڈاکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔
وارڈ بوائے کچھ گڑبڑا گیا اور بولا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پیشنٹ کو واک کرانے کی کوشش کرو۔"
"ابھی پیشنٹ نے پوری طرح Recover نہیں کیا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ابھی انہیں کچھ دن آرام کرنے دو۔"
وارڈ بوائے کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا۔
"مسٹر وقار! اب آپ کی ٹانگ کا کیا حال ہے؟"
"میں کوشش کروں تو چل سکتا ہوں، مجھے فرش پر قدم رکھتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی میں نے ظاہر کی ہے۔"
"گڈ!" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مزید دو دن میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے، ویسے آپ کا زخم بھی بہت تیزی سے بھر رہا ہے لیکن آپ کی مکمل فٹ نیس کی رپورٹ تو میں ہی دوں گا، میں اب آپ کو طاقت اور توانائی کے لیے ملٹی وٹامنز کی ٹیبلٹس اور کیپسول دے دیتا ہوں، آپ کی ڈائٹ میں بھی اضافہ کروں گا۔" پھر اس نے معمول کا چیک اپ کیا اور روانہ ہو گیا۔
اسی دن شام کو وہ وارڈ بوائے میرے پاس آیا جس کا فرضی نام ارجن تھا، اس کے ہاتھ میں دواؤں کی ٹرے تھی، مجھ سے پہلے دو تین مریضوں کو دوائیں دیں، پھر وہ میری طرف آیا اور سرسری انداز میں بولا۔ "وقار صاحب! پرسوں تک آپ کی حالت کافی حد تک ٹھیک ہو جائے گی، پرسوں ہم آپ کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔"
"مسٹر ارجن!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "آپ پرسوں شام کو تیار رہیے گا۔"
"لیکن یہاں تو پولیس کے گارڈ بھی موجود ہیں اور ہوسپٹل کی سیکورٹی بھی ہے۔"
"اس کی فکر آپ مت کریں۔" ارجن نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں، بس آپ تیار رہیے گا۔"
"اچھا اپنا نام تو بتا دو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرا نام ارجن ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"میں تمہارا اصل نام جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"وقت آنے پر وہ بھی بتا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔
دوسرے دن شام تک میری حالت مزید بہتر ہوگئی۔ ڈاکٹر شاہد بھی معمول کے راؤنڈ پر آیا اور اس نے میرا بلڈ پریشر چیک کرتے کرتے بہت صفائی سے میرے تکیے کے نیچے کچھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولا "میں نے آپ کے تکیے کے نیچے کچھ رقم رکھ دی ہے، اس کی آپ کو ضرورت پڑے گی۔ دیگر چیزوں کا بندوبست ارجن کے آدمی خود کر دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ رات کو جب تقریباً سارے مریض سو گئے تو میں آہستہ سے اٹھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہوں بھی یا نہیں؟ زمین پر قدم رکھتے ہوئے مجھے کچھ تکلیف ہوئی لیکن یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں بغیر کسی سہارے کے چل سکتا ہوں۔ مجھے اب زیادہ کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا وارڈ میں تھوڑی دور تک گیا، پھر اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ اب مجھے بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار تھا اور اس دن بھارت میں ہولی کا تہوار تھا۔ اسپتال کا سارا اسٹاف بھی اس دن کام کے موڈ میں نہیں تھا۔ صرف ایمرجنسی وارڈ کا اسٹاف مصروف تھا، باقی تو سب ہولی منانے میں مصروف تھے۔ یوں بھی آدھے سے زیادہ اسٹاف تو چھٹی پر تھا۔
شام کو ارجن وارڈ میں آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا تھال تھا، اس نے وہاں تمام مریضوں کو مٹھائی بانٹنا شروع کر دی، اس سے پہلے کچھ این جی اوز بھی مریضوں میں گفٹ پیک تقسیم کر گئی تھیں۔
ارجن میرے پاس آیا اور مٹھائی دیتے ہوئے بولا۔ "دو گھنٹے بعد آپ تیار رہیے گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا کچھ دیر بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا "یہ ایک این جی او کی طرف سے گفٹ پیک ہے، ہوسپٹل کا اسٹاف شاید آپ کو دینا بھول گیا ہے۔" وہ شاپر دے کر چلا گیا۔
اس شاپر میں ایک ٹی شرٹ اور جینز تھی، میں سمجھ گیا کہ یہ انتظام ڈاکٹر شاہد یا ارجن نے کیا ہے۔
اس وقت ہر شخص مگن تھا، میری طرف کسی کا دھیان ہی نہیں تھا، میں خاموشی سے اُٹھا اور باتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لیے، ہوسپٹل کے کپڑے میں نے اسی شاپر میں رکھ دیے، مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن وارڈ میں لگی ہوئی وال کلاک سے معلوم ہوا کہ ارجن کے دیے ہوئے وقت میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔
باتھ روم وارڈ کے باہر کوریڈور کے سرے پر تھے، وارڈ کے دروازے پر جو سنتری بیٹھے تھے، وہ بھی آپس میں بلند آواز میں گفتگو کر رہے تھے، ان میں سے کئی کے کپڑوں اور چہرے پر رنگ بھی لگا ہوا تھا، انہوں نے میری طرف توجہ بھی نہیں دی۔
میں کپڑے بدل کر باتھ روم سے نکلا ہی تھا کہ کسی نے میرے چہرے اور کپڑوں پر رنگ کی پچکاری ماری، میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ارجن تھا، اس نے مختلف رنگ میرے چہرے پر مزید مل دیے اور ہنس کر بولا۔ "اس حال میں آپ کو سنتری بھی نہیں پہچان سکیں گے۔" لائیں یہ کپڑوں کا تھیلا مجھے دے دیں اور میرے پیچھے چلے آئیں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "میں نے تمام پولیس والوں اور سکیورٹی گارڈز کو بھنگ کے لڈو کھلا دیے ہیں۔"
میں اس کے پیچھے پیچھے کوریڈور سے باہر نکلا اور وارڈ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ ابھی کوئی سنتری مجھے روک دے گا کہ باہر کہاں جا رہے ہو؟ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، میں اطمینان سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا اسپتال کے لان میں آ گیا، وہاں بھی کئی مریض اور ان کے لواحقین ہولی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔
میں ارجن کے پیچھے ٹہلنے والے انداز میں ہوسپٹل کے گیٹ سے باہر نکل گیا، وہاں بہت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔
اس وقت اسپتال کے مین گیٹ پر پولیس کی ایک جیپ رکی اور اس میں سے انسپکٹر برآمد ہوا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا میرا دل چاہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ایسا کرتا تو میں ان کی نظروں میں مزید مشکوک ہو جاتا اس لیے میں اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتا رہا۔
انسپکٹر میری طرف دھیان دیے بغیر سیدھا ہوسپٹل کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک موڑ مڑنے کے بعد اسپتال ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے ایک سوزوکی ہائی روف میرے سامنے آ کر رکی اور فوراً ہی اس کا سلائیڈنگ دروازہ کھل گیا۔

ارجن مجھ سے بے اختیار بغل گیر ہوا اور بولا۔ ”جایئے وقار صاحب! اللہ حافظ! زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، یہ سب ہمارے لوگ ہیں اور آپ کو سرحد پار کرا دیں گے۔“

اس سے ملتے وقت میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور میں نے بھی بہت سختی سے اسے بھینچ لیا، پھر میں نے کہا۔

”بھائی! اب تو تم اپنا اصلی نام بتا دو۔“

”میرا نام جان کر کیا کریں گے آپ؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تمہاری شخصیت کے ساتھ یہ ہندوانی نام میں نہیں یاد رکھنا چاہتا۔“ میں نے کہا۔

اس نے چند لمحے سوچا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”میرا نام ارسلان ہے۔“

”پھر میں گاڑی میں سوار ہو گیا اور گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ میں نے سرحد کیسے پار کی اور پاکستان تک کیسے پہنچا لیکن بھارت میں جتنے بھی لوگوں سے ملاقات ہوئی، اس میں وکی، ارسلان، ڈاکٹر شاہد اور نور دین نے میرے ذہن و دل پر بڑے نقوش چھوڑے ہیں۔“

☆......☆

ارلان کا نام سن کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چل پڑی تھیں، ضروری نہیں تھا کہ وہ میرا بھائی ہی ہو لیکن نام سن کر میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ یہی حال تیمور کا بھی تھا، وہ بھی بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ جذبات کی شدت سے مجھ سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ تیمور نے پوچھا۔ ”انکل! کیا آپ ارسلان کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟“

”حلیہ؟“ انہوں نے کہا۔ ”اس کی ایک ایک حرکت، چال ڈھال، بولنے کا انداز سبھی کچھ میرے ذہن پر نقش ہے، وہ خاصا دراز قد نوجوان تھا، کسرتی جسم تھا، سرخ و سفید رنگت اور براؤن بال، اپنے حلیے اور چہرے سے وہ ہندو تو لگتا ہی نہیں تھا لیکن پنجابی ہندو عموماً گورے چٹے ہوتے ہیں اس لیے......“

”ایک منٹ انکل۔“ تیمور نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”وہ رسٹ واچ پہنتا تھا؟“

وقار صاحب نے تھوڑی دیر غور کیا، پھر بولے ”میں نے اس کے ہاتھ میں کبھی رسٹ واچ نہیں دیکھی۔“

”اس کی کلائی پر کٹ کا نشان تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وقار انکل پھر ذہن پر زور دے کر بولے۔ ”کٹ کا نشان...... ہاں اس کی دائیں کلائی پر کٹ کا نشان تھا۔“ میں جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ نے اسے کبھی چائے پیتے دیکھا تھا؟“

”ہاں، دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔“ وہ الجھ کر بولے۔ ”چائے تو انڈیا اور پاکستان کے کروڑوں لوگ پیتے ہیں۔“

”وہ چائے کا مگ یا کپ کیسے پکڑتا تھا؟“ میں نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

”بھئی! جیسے سب پکڑتے ہیں۔ وہ بھی......“ وہ بولتے بولتے رک گئے۔

”ہاں، مجھے یاد آیا، وہ چائے کا کپ کبھی اس کے ہینڈل کی طرف سے نہیں پکڑتا تھا، ہینڈل کا رخ اس کے چہروں کی طرف ہوتا تھا اور وہ ہینڈل استعمال کیے بغیر چائے کا مگ یا کپ گلاس کی طرح اپنے ہاتھ میں پکڑتا تھا۔“ انہوں نے کہا۔

ان کی بات سن کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہی میرا بھائی ارسلان تھا۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ وہ زندہ سلامت ہے۔“ تیمور کی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی، وہ روتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا اور میری طرح سسکنے لگا۔

انکل وقار نے ہم دونوں کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولے۔ ”یہ تو خوشی کا موقع ہے اور تم لوگ آنسو بہا رہے ہو؟“

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں انکل!“ میں نے کہا۔ میں اپنے جس بھائی کو اب تک مردہ سمجھ رہا تھا، وہ زندہ ہے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اچانک میری جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیت میں دوگنا اضافہ ہو گیا ہو۔“

"اس جیسے بہادر اور ذہین لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔" تیمور نے کہا۔ "اب میں اس مشہدی کو بھی دیکھ لوں گا اور اس کے سرپرستوں کو بھی۔"

اس اضطراب اور جوش و خروش میں نادیہ پر تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ وہ تنہا ایک طرف بیٹھی سسک رہی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "بس کرو نادیہ۔" نادیہ نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بے اختیار میرے گلے سے لگ جاتی لیکن اس وقت تو ہم دونوں ہی مجبور تھے۔

"اب اگر تم لوگوں کے رونے دھونے کا پروگرام ختم ہو گیا ہو تو میں کھانا لگوا دوں۔" انکل وقار نے ہنس کر کہا۔

ضرور لگائیں انکل۔" نادیہ نے کہا۔

"بھوک کے مارے میرے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی اب نقاہت سے ہلکان ہو گئے ہیں۔"

کھانے کی میز پر انکل وقار کی بیگم بھی موجود تھیں، ان سے پہلے سرسری سی ملاقات تو ہو چکی تھی، اس وقت ملازمہ سے وہی کھانا لگوا رہی تھیں۔

میں نے بہ غور ان کا جائزہ لیا، وہ بھرے بھرے جسم، سرخ و سفید رنگت اور پرکشش چہرے کی مالک تھیں، ان کی عمر چالیس اور بیالیس سال رہی ہو گی لیکن اپنے متناسب جسم اور پرکشش چہرے کے باعث وہ بتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھیں۔

کھانے کی میز پر ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور انکل وقار ہنس کر بولے۔ "بھئی ہم تو یہاں سے منگنی کرنے کے بعد بھارت گئے تھے اور ارادہ تھا کہ وہاں سے واپسی پر سال چھ مہینے بعد ہماری شادی ہو گی، اس وقت تمہاری آنٹی کی عمر صرف سترہ سال تھی اور یہ کالج میں پڑھ رہی تھیں، وہاں جب برسوں گزر گئے تو ہم بھی ان کی طرف سے مایوس ہو گئے ہمارا خیال تھا کہ یہ کہیں بیاہ رچا کر بیٹھ گئی ہوں گی لیکن آفرین ہے ان پر۔ انہوں نے ہمارا برسوں انتظار کیا، اس تمام عرصے میں انہوں نے ہر طرح کا دباؤ برداشت کیا، اپنے گھر والوں کے طعنے سنے لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔"

"انکل! پھر تو آپ کو آنٹی کی بہت قدر کرنا چاہیے۔" نادیہ نے کہا۔ "انہوں نے اپنی جوانی کے بہترین دن آپ کی آس میں گزار دیے۔"

"بھئی ان کی قدر کیا، ہم تو ان کی پوجا کرتے ہیں۔" انکل مسکرا کر بولے۔

"اچھا، اب خاموشی سے کھانا کھائیے، بچوں کے سامنے ایسی باتیں کر کے آپ کو شرم نہیں آتی؟"

"بچے؟" انکل نے ہنس کر کہا۔ "یہ بچے ہمارے مقابلے میں زیادہ ذی شعور اور ذہین ہیں۔"

"اچھا، آپ لوگ یہ بتائیں کہ کھانے کے بعد کافی پئیں گے یا چائے؟" آنٹی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! اگر زحمت نہ ہو تو کافی پلا دیں۔" نادیہ نے کہا۔

"میں جانتا تھا کہ وہ کافی اتنے شوق سے نہیں پیتی ہے، صرف میری خاطر کافی کی فرمائش کر رہی ہے۔"

کھانے کے بعد ہم کافی پی ہی رہے تھے کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی، میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ بلوچ کی کال ہے۔

میں نے سیل فون کا بٹن دبایا اور اسے کان سے لگا کر وہاں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

"ہاں بلوچ؟" میں نے پوچھا۔ "سب خیریت ہے نا؟"

"سب خیریت ہے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "آپ کے لیے ایک بہت زبردست خبر ہے۔"

"زبردست خبر؟" میں نے پوچھا۔ "کیسی خبر بلوچ؟"

"شائستہ بہن کا پتا چل گیا ہے۔" اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"کب...... کہاں...... وہ کہاں ہے؟" میرے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

"میں آپ کے گھر آ رہا ہوں۔"

بلوچ نے کہا۔ "پھر آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی گھر پہنچ رہا ہوں۔"
میرا مضطرب انداز دیکھ کر تیمور بھی میرے پاس آ گیا اور بولا۔ "کیا بات ہے بھیا؟ سب خیریت تو ہے؟"
"ہاں، سب خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "بلوچ کا ٹیلی فون تھا، وہ بتا رہا تھا کہ شائستہ کا پتا چل گیا ہے۔"
"شائستہ کا؟" تیمور نے کہا۔ "کہاں ہے وہ؟"
"یہ تو بلوچ ہی بتائے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ ابھی گھر پہنچ رہا ہے۔"
"کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟" انکل وقار نے کہا۔
"نہیں انکل!" میں نے ہنس کر کہا۔ "خوشی کی بات ہے، میری گم شدہ بہن شائستہ کا سراغ مل گیا ہے۔"
"شائستہ کا سراغ مل گیا ہے؟" نادیہ خوش ہو کر بولی۔ "وہ اس وقت کہاں ہے؟"
"یہ تو بلوچ ہی بتائے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر پہنچ رہا ہے۔"
"تمہاری بہن......" انکل نے کہا۔ "تم نے شاید بتایا تھا کہ اسے شہدی نے اغوا کر لیا تھا؟"
"میں نے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "میں نے تو آپ کو نہیں بتایا۔"
"ہاں، مجھے یاد آیا۔" انکل وقار نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا تذکرہ مجھ سے نادیہ ہی نے کیا تھا۔"
"او کے انکل!" میں نے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیں، اس وقت تو مجھے جانا ہے آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔"
"تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی ہے؟" انکل نے پوچھا۔
"میرے ایک دوست نے بتایا ہے۔" میں نے کہا اور نادیہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔
"تم لوگ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" انکل نے پوچھا۔
"اس وقت تو ہم اس دوست کے گھر جا رہے ہیں، اس نے مجھے سیل فون پر بتایا ہے کہ وہ بھی گھر پہنچ رہا ہے۔"
وہاں سے رخصت ہونے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو اسٹیئرنگ پر حسب معمول تیمور تھا، اس نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نادیہ نے کب انکل کو شائستہ کے بارے میں بتا دیا؟"
"میں نے تو انکل کو نادیہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"
"پھر...... پھر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ شائستہ کو شہدی نے اغوا کیا تھا؟" میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ میں نے بلوچ کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔ "بلوچ! تم ہماری طرف مت آؤ، ہم تمہاری طرف آ رہے ہیں۔"
"کیوں والجہ؟" بلوچ چونک کر بولا۔
"میں، میں احتیاطاً ایسا کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
"لیکن والجہ! ہم تو آپ کے گھر پہنچ بھی چکا ہوں۔"
"تم گھر پہنچ چکے ہو؟" میں نے کہا۔
"راستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"
"گڑبڑ کیسی والجہ؟" بلوچ نے الجھ کر پوچھا۔ "کیا کسی سے کوئی خطرہ ہے؟"
"تم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ کسی نے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہمارا پیچھا کون کرے گا والجہ؟" بلوچ نے الجھ کر کہا۔ "ہم پیچھے بھی دو آنکھیں رکھتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور سیل فون بند کر دیا۔
"تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے کامران؟" نادیہ نے پوچھا۔
"میں اب اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے لگا ہوں۔" میں نے کہا۔ "انکل وقار کو کیسے معلوم ہوا کہ شائستہ کو شہدی نے اغوا کیا تھا؟"
"تو بھئی۔ وہ جرنلسٹ ہیں۔" نادیہ نے کہا۔ "کرائم رپورٹنگ ان کا شعبہ ہے، انہیں تو کہیں سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

''پھر انہوں نے یہ کیوں کہا کہ مجھے اس بارے میں نادیہ نے بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ سوچنے والی بات ہے۔'' تیمور نے تشویش سے کہا۔ ''انہیں بھلا غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی؟''

اس دوران میں ہم گھر پہنچ چکے تھے، تیمور نے بھی پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ کسی بھی گاڑی نے ہمارا تعاقب نہیں کیا، پھر بھی اس نے یوں ہی تصدیق کے لیے گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑایا لیکن کوئی گاڑی ہمارے پیچھے نہیں تھی، نادیہ مسلسل پیچھے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہم گھر پہنچے تو بلوچ بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ ''واجہ! اتنا دیر کہاں لگا دیا؟ ہاشم بھائی تو بتا رہا تھا کہ آپ لوگ ادھر ڈیفنس ہی میں کہیں گئے ہو؟''

''بس واپسی میں تھوڑی سی دیر لگ گئی۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، تمہارے پاس کیا خبر ہے؟''

''شائستہ بہن کا سراغ مل گیا ہے۔'' بلوچ نے کہا۔ ''وہ آج کل میرپور خاص میں ہے اور کسی پیر کی حفاظت میں ہے۔''

''پیر کی حفاظت میں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، سندھ کا کوئی مشہور پیر ہے، وہ اس کی حفاظت میں ہے۔''

''تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا ایک آدمی رمضان بلوچ اس پیر کا مرید ہے اور مہینے میں ایک دفعہ ضرور اس کی زیارت کو جاتا ہے، اس نے شائستہ بہن کو اتفاق سے وہاں دیکھ لیا ہے۔'' بلوچ نے کہا۔ وہ پیر صاحب کے زنان خانے میں رہتی ہے، اس مرتبہ جب رمضان وہاں گیا تو پتہ جانے کیسے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے پیر صاحب کے گھر میں آگ لگ گئی، رمضان بلوچ الیکٹریشن بھی ہے، اس نے پہلے سوئچ کا تار کاٹا، پھر آگ بجھانے کے لیے اندر چلا گیا، وہاں اس کی نظر شائستہ پر پڑ گئی۔''

''وہ شائستہ کو پہچانتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں واجہ! ایک دفعہ آپ لوگ کھلے سمندر میں سیر کے لیے گئے تھے، اس وقت آپ کا دوست ناصر زندہ تھا، اس کی بوٹ میں آپ لوگ گئے تھے، اس دن میرے ساتھ رمضان بلوچ بھی تھا، میں تو اکثر ناصر صاحب کی بوٹ پر ہوتا تھا، رمضان نے شائستہ بہن کو وہیں دیکھا تھا، پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے مشہدی نے اغوا کر لیا تھا، جلد ہی وہ مشہدی کی قید سے فرار ہو گئی تھی۔''

''رمضان بلوچ اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ میرے ساتھ ہی آیا ہے واجہ!'' بلوچ نے ہنس کر کہا۔ ''اس وقت وہ میرے دوسرے آدمیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوگا۔''

''اسے بلاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

بلوچ ہمیشہ اپنی گاڑی میرے بنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑی کرتا تھا، کبھی وہ تنہا ہوتا تھا، کبھی اس کے آدمی بھی ساتھ ہوتے تھے، پہلے اس کے پاس ایک جیپ تھی لیکن مشہدی کا اسلحہ بردار عزقاب کرنے کے بعد اس نے ڈبل کیبن پک اپ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے آدمی پک اپ کے کھلے حصے میں بیٹھ کر ارد گرد نظر رکھتے تھے، اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بھی اس کا کوئی گارڈ ہوتا تھا۔ میں کبھی رمضان سے ملا نہیں تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ بلوچ کا کوئی گارڈ ہوگا۔

بلوچ نے جیب سے سیل فون نکالا اور بلوچی میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔

سیل فون جیب میں رکھ کر اس نے کہا۔ ''رمضان کو میں نے ادھر ہی بلا لیا ہے واجہ!''

''تیمور!'' میں نے کہا۔ ''تم مین گیٹ پر جاؤ ورنہ ہمارے آدمی اسے اندر نہیں آنے دیں گے۔''

''گیٹ پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' نادیہ نے کہا۔ ''گیٹ پر موجود گارڈز کو انفارم کر دو کہ رمضان یہاں آ رہا ہے۔''

''میری بھی عقل ضبط ہو کر رہ گئی ہے۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔ پھر موضوع بدلنے کو میں نے کہا۔ ''یہ ہاشم کہاں ہے، ابھی تک نظر نہیں آیا؟''

"جب ہم ادھر آیا ہوں واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "تو ہاشم بھائی کہیں جا رہا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد رمضان ہمارے سامنے کھڑا تھا، وہ درمیانے قد اور گٹھیلے اور مضبوط جسم کا آدمی تھا، اس کے ہاتھ پیر مضبوط تھے اور سر پر بلوچوں کی طرح مخصوص گنگھریالے بال تھے۔

اس نے مجھے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"یہ رمضان ہے واجہ!" بلوچ نے بتایا۔

"بیٹھو رمضان!" میں نے کہا۔ "تم کھڑے کیوں ہو؟"

وہ ایک کرسی پر ٹک گیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ پیر صاحب کے گھر میں تم نے جس لڑکی کو دیکھا تھا، وہ شائستہ ہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"سولہ آنے یقین ہے صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "معاف کرنا صاحب! آپ کا بہن اتنا خوب صورت ہے کہ اسے ایک دفعہ دیکھنے کے بعد کوئی بھول ہی نہیں سکتا ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب......! ایسا لگ رہا تھا...... جیسے وہ...... وہاں...... اپنی مرضی سے نہیں رہ رہی ہے۔"

میں اور تیمور اس کی بات سن کر چونک اُٹھے۔ میں نے کہا۔ اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"جب پیر صاحب کی حویلی میں آگ لگا تو آپ کا بہن جس کمرے میں تھا، وہ باہر سے بند تھا۔ پیر صاحب نے اس کمرے کو کھولا اور بہن کو باہر نکالا، پھر میں نے اس کمرے کی وائرنگ میں لگی ہوئی آگ بھی بجھائی، آگ اس وقت تک زیادہ نہیں پھیلی تھی، تھوڑی دیر میں پیر صاحب کے بہت سے مرید وہاں آ گئے اور ان سب نے مل کر آگ بجھا دی۔"

"پھر شائستہ کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"پیر صاحب نے اسے کمرے سے باہر نکال کر حویلی کے کسی دوسرے حصے میں پہنچا دیا تھا۔" رمضان نے کہا۔

"یہ پیر صاحب کیسے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو صاحب بہت نیک اور اللہ والے آدمی ہیں، لوگ دور دور سے اپنی مرادیں پوری کرانے کے لیے ان کے پاس آتے ہیں اور ان کی دعا میں ایسی تاثیر ہے کہ لوگوں کی مرادیں پوری بھی ہو جاتی ہیں۔"

"کیا نام ہے ان پیر صاحب کا؟" میں نے پوچھا۔

"پیر احسان الحق شاہ صاحب ان کا نام ہے۔" رمضان کے لہجے میں عقیدت تھی۔

میں پیر احسان الحق کا نام سن کر چونکا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔"

میں نے بلوچ کو اشارہ کیا، اس نے رمضان سے کہا۔ "ٹھیک ہے رمضان، تم اب جا کر گاڑی میں بیٹھو۔"

"ارے، میں نے ان کے لیے چائے بنوائی ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "رمضان بھائی بھی چائے پی کر جائیں گے۔"

"چائے......؟ ...... تکلف نہیں ہے بہن!" رمضان نے کہا۔ "ہم لوگ کے پاس بس تھرماس میں چائے ہے، ادھر آنے سے پہلے بھی میں چائے ہی پی رہا تھا۔" پھر وہ مجھے سلام کر کے چلا گیا۔

"بلوچ!" میں نے کہا۔ "مجھے یہ پیر احسان الحق شاہ کچھ گڑبڑ لگ رہا ہے۔"

"واجہ! ہم بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" بلوچ نے کہا۔ "ہم نے رمضان کے سامنے یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ اس کو بُرا لگتا۔ وہ تو اپنے پیر پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔"

"اب سوال یہ ہے کہ شائستہ وہاں کیا کر رہی ہے؟" تیمور نے کہا۔

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "شائستہ وہاں اپنی مرضی سے تو رہ نہیں رہی ہے، رمضان کا بیان بھی اس بات کی تصدیق کر رہا ہے، اگر وہ اپنی مرضی سے وہاں رہ رہی ہوتی تو اس کا کمرا باہر سے لاک نہ ہوتا۔"

"پھر، کیا میرپورخاص چلیں۔" تیمور نے پوچھا۔

"ہاں، وہاں تو جانا ہی پڑے گا۔"

"پر واجہ! رمضان کو اس کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔"

"اسے ہم میں سے تو کوئی بتانے سے رہا۔" میں نے کہا۔

"وہ پوچھے گا ضرور کہ جب کامران صاحب کا بہن مل گیا ہے تو وہ اسے لینے میر پور خاص کیوں نہیں جاتے؟" پھر وہ خود ہی ہنس کر بولا۔ "میں اس سے کہہ دوں گا کہ کامران صاحب کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ ان کی بہن محفوظ ہاتھوں میں ہے، وہ پیر صاحب کی پناہ میں ہے، وہاں تو پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔"

"پھر تم عارف اور احسان کو روانہ کر دو۔"

"اسے چھوڑ کر آنا پڑے گا واجہ!" بلوچ نے کہا۔

"وہ بہت جی دار آدمی ہے، اگر وہ پیر صاحب کا مرادی نا ہوتا تو اس موقع پر ہمارے بہت کام آتا، وہ میرا اتنا وفادار ہے کہ میرے پسینے کی جگہ خون گرانے کو تیار رہتا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "فکر مت کرو واجہ! میرے پاس رمضان بلوچ جیسے بہت سے آدمی اور بھی ہیں۔"

"آدمیوں کی تو ہمارے پاس بھی کمی نہیں ہے بلوچ!" میں نے کہا۔

"پھر کیا ابھی میر پور خاص کے لیے نکلنا ہے؟" بلوچ نے پوچھا۔

"میں تو ابھی نکلنا چاہتا تھا لیکن یہ ہاشم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا، اب اس کی واپسی پر مشورہ کر کے ہی کوئی پروگرام بنائیں گے۔"

"ٹھیک ہے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "پھر ہم چلتا ہوں، مجھے ایک دو دوسرے ضروری کام دیکھنا ہیں۔ جیسا بھی پروگرام ہو مجھے بتا دینا۔"

نادیہ نے اس دوران ہی کافی منگوالی تھی، اس نے بلوچ کے لیے خاص طور پر سینڈوچز، کباب اور دوسری چیزیں بھی منگائی تھیں، ہم لوگ تو کھانا کھا کر آ گئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ بلوچ نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہوگا۔

چائے اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر بلوچ جانے لگا تو میں نے کہا۔ "بلوچ! ذرا احتیاط سے جانا اور اپنے ارد گرد نظر رکھنا۔"

"یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "میں ہمیشہ اپنے ارد گرد نظر رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم لوگ دیر تک خاموش رہے، پھر اس خاموشی کو تیمور نے توڑا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وقار انکل کو شائستہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"تم ابھی تک اس میں الجھے ہوئے ہو؟" نادیہ نے کہا۔

"بات اہم ہے نادیہ!" میں نے کہا۔ "اگر انہیں اپنے ذرائع سے اس بات کا علم ہوا تھا تو انہیں غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پر تشویش لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ......"

"ابھی مطلب نکالنے میں اتنی عجلت مت کرو۔" نادیہ جلدی سے بولی۔

"بعض اوقات ہمیں بالکل سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں۔"

اسی وقت بنگلے کا آہنی دروازہ کھلنے اور کسی گاڑی کے اندر آنے کی آواز سنائی دی۔

کچھ دیر بعد ہاشم کمرے میں داخل ہوا اور مسکرا کر بولا۔ "اوہو، یہاں تو پوری کیبنٹ موجود ہے، لگتا ہے، کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے؟"

"ہاں یار مسئلہ تو اہم ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا، پھر اسے اپنے تفکرات اور وقار انکل کی باتوں سے آگاہ کر دیا۔

میری بات سن کر ہاشم بھی فکر مند ہو گیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ وقار صاحب کو غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اچانک نادیہ پر جوش لہجے میں بولی۔ "تم سب کی یادداشت شاید جاتی رہی ہے..... مجھے یاد آ گیا کہ وقار انکل کو شائستہ کے بارے میں، میں نے بتایا تھا۔"

"تم نے بتایا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کب؟"
"جب وقار انکل سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔ "کامران، یاد کرو، تم بھی تو میرے ساتھ تھے۔"
"مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا ہے؟" میں نے الجھ کر کہا۔
"تم نے وقار انکل سے ارسلان کے بارے میں بات کی تھی؟" نادیہ نے کہا، تم نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ تمہارا گھر ایک دھماکے میں تباہ ہو گیا تھا؟" نادیہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہاشم نے بتایا تھا کہ مشہدی میرے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا ہے، اس کی وجہ سے میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے۔" میں نے انہیں بتایا تھا کہ اس نے کامران کی بہن شائستہ کو اغوا کر لیا تھا اور یہ کہ اپنے جس بھائی کو تم مردہ سمجھ رہے تھے، اس کے بارے میں تمہیں اطلاع ملی ہے کہ وہ زندہ ہے اور بھارت میں ہے۔"
میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور مجھے انکل وقار سے کی ہوئی پوری گفتگو یاد آ گئی، مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ انہیں نادیہ ہی نے شائستہ سے بارے میں بتایا تھا۔
میں نے سکون کا ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ "میرا تو ذہن آج کل کام نہیں کر رہا ہے، تم لوگوں کے ذہن کو کیا ہوا ہے؟"
"ہماری ذہنیت تم سے مختلف نہیں ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "تم ہمیں خود سے الگ سمجھتے ہو؟"
"اب مسئلہ ہے میر پور خاص جانے کا۔" ہاشم نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ ہم لوگ علی الصبح روانہ ہو جائیں تو صبح نو، ساڑھے نو بجے تک میر پور خاص پہنچ جائیں گے۔" تیمور نے کہا۔
"اتنی صبح وہاں جا کر کیا کریں گے؟" ہاشم نے کہا۔
"اس وقت تو پیر صاحب کا آستانہ ویران ہو گا، وہ تو شام ہی کو رونق افروز ہوتے ہوں گے۔"
"اس دوران میں ہمیں وقت مل جائے گا کہ ہم ان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔" تیمور نے کہا۔
"ہاں، اس لحاظ سے تمہارا خیال درست ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "لیکن ہم اگر صبح نو بجے بھی یہاں سے نکلیں گے تو ساڑھے بارہ، ایک بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔" ہاشم نے کہا۔ "اس وقت بھی معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس کئی گھنٹے ہوں گے۔"
"ہاں بہ قول بلوچ کے پیر احسان الحق وہاں کی معروف شخصیت ہے، وہاں کا ہر فرد اسے جانتا ہوگا۔" میں نے کہا۔
"تیمور! تم اپنے کم سے کم چار آدمیوں کو تیار کر لو۔ نہ جانے ہمیں وہاں کس قسم کے حالات سے سابقہ پڑے۔"
"لیکن لینڈ کروزر یا پجیرو جیسی گاڑیاں استعمال مت کرنا۔" ہاشم نے کہا۔ "اس قسم کی گاڑیاں وہاں بہت کم ہیں اور عموماً بڑے زمین داروں کے پاس ہیں اس لیے فوراً نظر میں آ جائیں گی۔"
"میں خود بھی ایسی کوئی گاڑی استعمال نہیں کرنا چاہتا، میرا خیال ہے کہ ہم ڈبل کیبن پک اپ استعمال کریں۔" میں نے کہا۔
"تو پھر ابھی سے اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ صبح روانگی کی تیاری کر لیں۔" ہاشم نے تیمور سے کہا۔ "میری گاڑی تو اس قسم کے کاموں کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔"
"تو کیا تم اپنی گاڑی لے جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔" ہاشم نے جواب دیا۔ "اوّل تو ڈبل کیبن پک اپ میں اتنی جگہ ہی نہیں ہوگی کہ اس میں اتنے لوگ سوار ہو سکیں، پھر میں تم لوگوں سے دور رہ کر تمہیں کور بھی کر سکوں گا، میرے ساتھ صرف تیمور کو اپنا ایک بہترین کمانڈو بٹھانا ہوگا۔"
"تو پھر یہ طے ہے کہ ہم کل صبح نکل رہے ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔ "میرے آدمی یوں تو ہر دم تیار رہتے ہیں لیکن میں انہیں ایک مرتبہ پھر کل کی تیاری کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "بھیا! ہمیں کتنے آدمیوں کو ساتھ لینا چاہیے؟"

"بھئی، میں اور تم تو ہوں گے ہی۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ چار آدمیوں کو مزید لے لو۔" ہاشم اور ان کا ایک ساتھی ہوگا۔ میرے خیال میں چھ آدمی بہت ہیں، یوں بھی ہمیں کسی ملک کو فتح نہیں کرنا ہے کہ کسی فوج کی ضرورت پڑے۔"

"اس سب معاملے میں میرا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے؟" نادیہ نے کہا۔

"تمہارا تذکرہ اس لیے نہیں ہے کہ میں تمہیں وہاں لے کر جانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" نادیہ چڑ کر بولی۔

"کیا میں لڑکی ہوں اس لیے؟"

"بات یہ نہیں ہے نادیہ!" میں نے کہا۔ "وہ اجنبی جگہ ہے، اجنبی لوگ ہوں گے۔"

"وہاں تو ہمیں سر چھپانے کے لیے کوئی چھت بھی میسر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تمہارا وہاں جانا......"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" نادیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں، اور بس!"

"سمجھا! وہاں رہنے کو تو ہمیں جگہ مل جائے گی، میرا ایک دوست ممتاز سومرو بھی میر پور خاص میں رہتا ہے اور وہاں اس کی خاص عزت بھی ہے، وہ بہت بڑا جاگیردار تو نہیں ہے، لیکن اچھا خاصا زمیں دار ہے، میں ابھی اسے ٹیلی فون کر دیتا ہوں، ہمارے رہنے کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔ پھر میں وہاں کون سا دو چار ہفتے یا دو چار مہینے رہنا ہے، ہمیں مشکل سے ایک رات وہاں رہنا ہے۔"

"اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" ہاشم نے کہا۔ "یہ اندرون سندھ کے وڈیرے، پیر اور جاگیردار بہت سرکش ہوتے ہیں۔ وہاں ہمیں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "نادیہ کو ساتھ لے ہی چلو تو زیادہ اچھا ہے، پیر صاحب کے زنان خانے تک جانے کے لیے ہمیں ایک عورت کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔"

نادیہ نے فتح مندی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "ہاشم! تمہارا بھی یہی فیصلہ ہے کہ میں نادیہ کو لے جانے کو تیار ہوں، تم بہ ہر حال مجھ سے سینئر اور زیادہ تجربے کار ہو۔"

تیمور خلا میں دیکھ کر گانے لگا۔ "پیر کا وعدہ ایسا نبھائیں......کوئی جدا کرنے نہیں پائے......میں بھولوں تو......"

"تیمور!" نادیہ نے اسے جھڑک دیا۔ "کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔"

"ویسے یار، تم گاتے بہت اچھا ہو۔" ہاشم نے تعریف کی۔

"لیکن موقع محل دیکھے بغیر گاتے ہو۔" نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"چلو، پھر اب محل دیکھ کر میں گاؤں گا۔ میں نے سنا ہے کہ سندھ کے بڑے بڑے پیروں کی حویلیاں بھی کسی محل سے کچھ کم نہیں ہوتیں۔"

"تمہیں فالتو کی بکواس کرنے کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔" نادیہ نے کہا۔

میں نے تیمور کو آنکھوں آنکھوں میں مزید بولنے سے منع کر دیا، ورنہ عین ممکن تھا کہ نادیہ منہ پھلا کر وہاں سے اٹھ جاتی۔ "اس وقت تو ہاشم جیسے سیریس اور سوبر آدمی نے بھی تیمور کے گانے کی تعریف کر دی تھی۔

"اچھا، اب تم بک بک ہی کرتے رہو گے یا مجھے کچھ سوچنے بھی دو گے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"ضرور سوچیں، میں ذرا اپنے اس دوست کو ٹیلی فون کر دوں جو میر پور خاص میں رہتا ہے!" تیمور نے جیب سے سیل فون نکالا اور کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

پھر وہ دیر تک سیل فون پر بات کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آ کر بتایا کہ ممتاز سے بات ہو گئی ہے، اس کی ایک حویلی شہر سے باہر ہے، وہ اس میں ہمارے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔"

"یہ ممتاز تمہارا دوست کب سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ہم لوگوں کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا، مجھ سے زیادہ اس کی دوستی ارسلان سے تھی، ہم لوگ سال میں ایک

دفعہ چھٹیوں کے موقع پر وہاں جایا کرتے تھے اور اس کے ابا کی دونالی بندوق سے خوب شکار کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ارسلان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔''

مجھے یاد آ گیا کہ ممتاز اسکول کے زمانے میں جب وہ غالباً او لیول میں تھا تو چھٹیوں میں اکثر اپنے ایک دوست کے پاس گاؤں جایا کرتا تھا، اس کے گاؤں کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا لیکن یہ ضرور یاد آ گیا کہ ارسلان وہاں شکار کھیلا کرتا تھا اور واپسی میں اپنے شکار اور نشانے کے قصے سنایا کرتا تھا۔

''ممتاز کو تمہاری اور ارسلان کی موجودہ سرگرمیوں کے بارے میں کچھ علم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھیا!'' تیمور نے کہا۔ ''وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے جب آپ کے بنگلے کے دھماکے سے اڑانے کی خبر سنی تھی تو اسے بہت صدمہ ہوا تھا اور اس نے کئی بار تو مجھے ٹیلی فون کیا تھا، وہ کراچی آنا چاہتا تھا لیکن پھر یہ کہہ کر ٹیلی فون ہی پر رونے لگا کہ اب میں کراچی آ کر کیا کروں گا؟ اب تو نہ وہاں ارسلان ہے، نہ چاچا ہیں اور نہ چاچی۔ بھائی کامران کو میں جانتا نہیں اور ویسے بھی ان سے مل کر میری حالت بہت خراب ہو جائے گی، میں انہیں جوان بھائی کی موت کا پُرسا کیسے دے سکتا تھا۔''

☆......☆

صبح جب ہم روانہ ہوئے تو میرے جسم پر شلوار سوٹ تھا۔ تیمور اور دیگر افراد نے بھی شلوار سوٹ پہن رکھے تھے۔ نادیہ کے جسم پر بھی شلوار سوٹ تھا اور تیمور نے احتیاطاً ایک برقع بھی رکھ لیا تھا، میر پور خاص میں اب وہ پہلے والی بات تو نہیں تھی لیکن معزز گھرانوں کی بیگمات اور لڑکیاں اب بھی شہر میں برقع یا بڑی بڑی چادروں سے اپنا جسم ڈھانپتی تھیں۔

ہم لوگ ٹویوٹا کی ایک ڈبل کیبن پک اپ میں سوار تھے، اسٹیئرنگ پر تیمور تھا، اس کے ساتھ نسیم بیٹھا تھا۔ ڈبل کیبن کے دوسرے کیبن میں نادیہ اور میں تھا، پک اپ کے پچھلے کھلے حصّے میں تین مزید افراد تھے، اس کے علاوہ اس حصّے میں ہماری ضرورت کی کچھ چیزیں، کپڑے اور کھانے پینے کا سامان تھا۔

ہماری گاڑی کے پیچھے ہاشم کی ٹویوٹا تھی، اس میں ہاشم کے ساتھ تیمور کا ایک کیا نڈر ندیم تھا۔ وہ کمانڈر تو تھا ہی لیکن باقاعدہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر اور سرجن تھا، اس موقع پر اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی تھی۔ اس کے پاس نہ صرف اس کے میڈیکل بیگ تھا بلکہ اس میں بہت سی دوائیاں بھی تھیں، اس کے علاوہ ایک دوسرے بیگ میں سرجری کے آلات تھے۔ اگر ہم میں سے خدانخواستہ کسی کو گولی لگ جاتی تو ہمیں کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی، ندیم خود ہی اس قسم کے زخموں اور علاج کا ماہر تھا۔

ہم لوگ صبح ساڑھے نو بجے ناشتا کرنے کے بعد گھر سے نکلے تھے، نکلنے سے پہلے اچانک مجھے بلوچ کا خیال آیا تھا، میں نے فوراً اسے ٹیلی فون کیا، اس نے پہلی ہی بیل پر ٹیلی فون ریسیور کر لیا، گویا وہ میری کال کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

''ہاں واجہ!'' اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں پوچھا۔ ''کب نکلنا ہے؟''

''ہم بس نکل ہی رہے ہیں، تم بھی ابھی کراچی سے نکل جاؤ اور ٹول پلازہ پر ہمارا انتظار کرو، اگر تم پہلے پہنچ گئے تو ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

''ٹھیک ہے واجہ! ہم بھی ابھی نکل رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم ٹول پلازہ سے نکلے تو بلوچ وہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی ڈبل کیبن پک اپ میں موجود تھا۔ میں نے رکنے کی بجائے اسے اشارہ کیا اور اس کی گاڑی بھی حرکت میں آ گئی۔ اس کے ساتھ صرف تین آدمی تھے۔ ایک پسنجر سیٹ پر تھا اور دو پک اپ کے پچھلے کھلے حصوں میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ بلوچ نے اس موقع کے لیے اپنے بہترین آدمیوں کا انتخاب کیا ہوگا۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہماری گاڑی کے پیچھے ہاشم کی گاڑی تھی، اس سے کچھ فاصلے پر بلوچ کی پک اپ

تھی، ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ہمارے پاس سیل فونز تھے۔

ہم میر پور خاص میں داخل ہوئے تو دو پہر کا ایک بجنے والا تھا۔

موجودہ حالات کے پیش نظر پولیس نے میر پور خاص کے داخلی راستے پر ایک چوکی بنا رکھی تھی، روڈ پر ایک بیریئر بھی موجود تھا۔

میں جب پولیس چوکی کے پاس پہنچا تو وہاں کھڑے ہوئے ایک پولیس اہل کار نے بیریئر ہٹانے کی بجائے پہلے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا، میں شلوار سوٹ میں ضرور تھا لیکن وہ شلوار سوٹ بہت قیمتی کپڑے کا تھا، اس پر خاصی مہنگی واسکٹ تھی اور میرے چہرے پر رے بین کا چشمہ تھا، وہ میری شخصیت سے تو پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا، نادیہ پہ نظر پڑتے ہی وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اپنے دوسرے ساتھی سے بیریئر اٹھانے کو کہا۔

جیسے ہی تیمور نے گاڑی آگے بڑھائی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں سلام بھی کیا۔

ہم چوکی سے کچھ فاصلے پر پہنچے تھے کہ ہاشم کی کرولا چوکی پر پہنچی، پولیس اہلکار گاڑی کی چمک دمک دیکھ کر ہی مرعوب ہو گیا، اس کے باوجود اس نے کھڑکی پر جھک کر ہاشم سے کچھ سوالات کیے پھر بیریئر ہٹا دیا گیا۔

تیمور نے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی تھی، اس لیے ہم لوگ سب دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد بلوچ کی ڈبل کیبن پک اپ چوکی پر پہنچی، پولیس اہلکار نے کھڑکی پہ جھک کر بلوچ سے کچھ سوالات کیے اور اسے گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں اضطراب کے عالم میں بل کھا کر رہ گیا۔

اس نے بلوچ کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے ریوالور برآمد کر لیا، ان کی آوازیں تو مجھ تک نہیں آ رہی تھیں لیکن پولیس والا ریوالور کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا، میں سمجھ گیا کہ وہ اس سے لائسنس کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

بلوچ کی نفی میں سر ہلانے پر اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو آواز دی اور اس سے کچھ کہا۔ اس نے بلوچ کو اپنی رائفل کے نشانے پر لے لیا اور اس سے چوکی میں چلنے کو کہا۔

بلوچ کے ساتھیوں نے بھی اپنے ہتھیار نکال لیے۔

میں نے عجلت میں سیل فون نکالا اور بلوچ کا نمبر ڈائل کر دیا، بلوچ نے پولیس والے سے فون اٹینڈ کرنے کو کہا۔ اس کی اجازت پر وہ بولا۔ ”جی سر! حکم؟“

”اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ پرسکون رہیں، میں ابھی آ رہا ہوں۔“

”سر، میں نے تو انہیں بتایا کہ ہم جاگیردار علی اکبر جتوئی صاحب کے باڈی گارڈز ہیں لیکن یہ لوگ نہیں مان رہے۔“

بلوچ خاصا ذہین تھا۔ سر سے سوال کے جواب میں اس نے کچھ دوسری کہانی شروع کر دی تھی۔

اس وقت وہاں پولیس کی ایک جیپ آ کر رکی، اس میں سے ایک سب انسپکٹر اور دوسرا غالباً انسپکٹر تھا۔ مجھے اتنے فاصلے سے اس کا رینک واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا، اس نے کرخت لہجے میں کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے پولیس والے نے بلوچ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور اس کے ساتھیوں کو بھی گن پوائنٹ پر لے لیا، بلوچ نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا، ان لوگوں نے اپنے ہتھیار جھکا لیے۔

میں نے تیمور سے کہا۔ ”گاڑی کا رخ موڑو اور فوراً چوکی کی طرف چلو۔“

تیمور نے پھرتی سے یوٹرن لیا اور اسی دوران میں نے سیل فون نکال کر اپنے آدمیوں کو ہوشیار ہونے کو کہا۔ پھر ہماری گاڑی بگولے کی طرح پولیس کی چوکی کی طرف بڑھی۔

☆......☆

ہیجان خیز، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ”سچی کہانیاں“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عقل کو خیرہ کر دینے والی، روحانی کرامات سے منور،

وہ سچی کتھائیں، جن کے کردار آج بھی زندہ ہیں

☆ دُعا۔ صفدر علی حیدری

اُچ شریف سے وسیلۂ دُعا کے ذریعے منزل پانے والے ایک انجینئر کی داستانِ عجب

☆ وہ سو روپے۔ بشیر احمد بھٹی

پاک پتن شریف کی زمین پر مانگی گئی ایک عاشقِ گنج شکرؒ کی مقبول دعا کا حال

☆ پڑوسی۔ گلِ رعنا

قومِ جنات کے پڑوس میں بسنے والے ایک گھرانے کی روحانی آپ بیتی، کراچی سے

☆ درِ توبہ کھلا ہے۔ مجید احمد جائی۔

گناہوں سے تائب ہونے والے ایک ڈاکو کی سرگزشت ملتان سے

☆ شانِ مولا۔ صدف آصف۔

کراچی سے ایک ایسی عورت کی کہانی جس نے دنیا ہی میں اپنے لیے احتساب کا رستہ چن لیا۔

☆ رتی اللہ دالی۔ جیجل میتلو۔

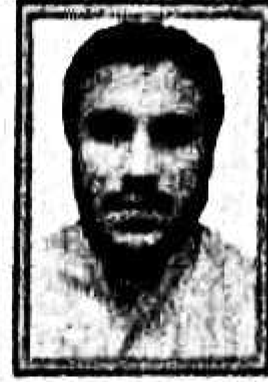
ایک دوشیزہ کی زندگی میں آسودگی کا بیج بونے والی ایک فقیرنی کی داستان، کراچی سے

☆ وہ میرا مہرباں۔ حنا بشریٰ۔

لاہور سے، خدا کی قدرت کا ایک رنگ



دُعا



صفدر علی حیدری

اُچ شریف سے وسیلۂ دعا کے ذریعے منزل پانے والے ایک انجینئر کی داستانِ عجب





یہ واقعہ میری اوائل عمری کا ہے، تب آتش جواں تھا اور دنیا کو روند ڈالنے اور اپنی فتح کا پرچم سربلند کرنے کا جذبہ قلب میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ یہ میری طالب علمی کے دن تھے۔ ایف۔ایس سی کرنے کے بعد میں نے اپنے آبائی قصبے اُچ شریف کو خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں بی۔ایس۔ سی آنرز کر رہا تھا۔ میرا تعلق ایک انتہائی متوسط طبقے سے تھا۔ گھر والوں سے جو ہفتہ وار جیب خرچ ملتا وہ اتنا مختصر ہوتا کہ اس میں عیاشی کا تو تصور ہی کیا گزر بسر بھی بڑی مشکل سے ہوا کرتی تھی۔ بس ضروریات زندگی کسی نہ کسی طرح میسر آ ہی جاتے کہ ایسے میں انسان اپنی خواہشات کا دامن سمیٹ لیا کرتا ہے اور ویسے بھی خواہشات کا کیا ہے یہ تو بادشاہوں تک کو رُلاتی اور حسرت میں مبتلا کر دیا کرتی ہیں۔

آج جو واقعہ میں آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں، وہ گویا میری زندگی کا ایک ایسا لمحہ ہے، جس نے میری زندگی میں دیرپا اور دوررس اثرات چھوڑے۔ میں اس مختصر سے واقعے کے درمیاں سے خود کو ہٹاتا ہوں، تاکہ آپ بغور اسے پڑھ سکیں۔ امید ہے دیدہ دل سے پڑھنے والوں کو اس میں بہت کچھ ملے گا۔ اگر کسی ایک قاری نے بھی اس کا اثر لے لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر آپ کو اس میں کوئی تاثیر دکھائی دے تو یہ میرے لفظوں کا نہیں اس واقعے کا معجزہ ہوگا۔

بہاول پور میں ہم نے چند ساتھیوں سے مل کر کرائے پر ایک چھوٹا سا مکان لے رکھا تھا۔ ہاسٹل کے اخراجات زیادہ تھے اور وہاں لڑائی بھڑائی کا بھی ہر دم دھڑکا سا لگا رہتا تھا، سو ہم نے کرائے کا مکان لینے میں ہی عافیت جانی۔ شروع شروع میں ہوٹل کے کھانے سے بچنے کے لیے کھانا بھی ہم خود مل جل کر پکا لیا کرتے اور پھر جیسا بن جاتا زہر مار ہو جاتا، لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ ہم نے اپنی یہ روش ترک نہ کی تو اچھے باورچی تو بن جائیں گے، لیکن اچھے ڈاکٹر یا انجینئر کبھی نہیں بن سکیں گے۔ ان دنوں غریبوں کے خواب بھی امیروں جیسے ہوا کرتے تھے اور تعلیم ہی وہ ذریعہ تھا جو ہمارے ان شاہی خوابوں کو تعبیر کا روپ دے سکتا تھا، سو "سیلف سروس" کا گھریلو سلسلہ موقوف ہو گیا اور ہم نے ایک چھپر ہوٹل کا رخ کر لیا۔ انتخاب کی بڑی وجہ کہ وہ ہماری رہائش کے بہت قریب پڑتا تھا۔ کھانا معیاری تھا اور سستا بھی، اس لیے ہم اپنے اس فیصلے سے خاصے مطمئن سے تھے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ

کہ وقت کی بچت ہو جاتی تھی۔ ہم نے جسے غنیمت جان کر پڑھائی میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ غربت اور مسافرت مل جائیں تو انسان کی زندگی اجیرن اور حال بدحال کر دیتے ہیں، پھر یہ بدحالی لہجے میں تلخی بن کر پھوٹتی ہے۔ میں بھی کبھی کبھی تلخ ہو جایا کرتا۔ ہمارے ایک ساتھی تنویر کو میری اس بات سے سخت چڑ تھی۔ ایک دن اس سے رہا نہ گیا تو بول اٹھا۔

''میں نے کہیں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو وحی کی کہ اے موسیٰ! ہم نے علم کو خالی پیٹ اور مسافرت میں رکھ چھوڑا ہے، لیکن لوگ اسے بھرے ہوئے پیٹ اور اپنے وطن میں ڈھونڈتے ہیں، جو چیز جہاں ہوتی ہے وہیں ملتی ہے۔''

''تو میرے بھائی ہم تو خوش نصیب ہیں کہ ہم علم کی صحیح راہ پر چل رہے ہیں اور اتفاقاً ہی سہی، ان تقاضوں کے حامل ہیں جو حصول علم کے لوازمات میں شامل ہیں۔''

اس نے یہ بات ایسے دل کش پیرائے میں کہی کہ دل میں گھر کر گئی۔ میں نے اسی دن اس کا نام ''دانش مند'' رکھ دیا، پھر دانش مند نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''صاحبو! ویسے بھی بھرے ہوئے پیٹ سے ڈکاریں تو آسکتی ہیں علم نہیں''۔

اور ہم سب اس بات پر خوب ہنسے تھے۔ آج بھی یہ بات لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

سو ہمارا تعلیمی قافلہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف کامیابی سے رواں دواں تھا۔ ہر ہفتہ کی شام ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جایا کرتے، جہاں سے پیر کی صبح ہماری واپسی ہوتی اور ہم ''ڈائریکٹ'' یونیورسٹی میں لینڈ کرتے تھے۔ یوں ہم



بہر حال گھر کی یاد سے بچے ہوئے تھے۔ کرایہ بچانے کے لیے ہم لوگ ویگن کی بجائے بس کا انتخاب کرتے تھے۔ یوں ایک آدھ گھنٹہ تو زیادہ لگ جاتا پیسے نہیں لگتے تھے اور یہی نکتہ ہمارے لیے مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اسے کہتے ہیں کم خرچ بالا نشین۔ انسان کو اگر احساس ہو اور آگاہی کے دراس پہ وا ہو جائیں تو مفلسی راہ کی دیوار نہیں بنتی۔ اس پانی کی طرح جو اگر کشتی کے نیچے رہے تو اپنے کندھوں پر اسے اٹھا کر دریا پار کرا دیتا ہے۔ یہ راز ہمارے دانش مند نے جان لیا تھا اور جب یہ راز مجھ پر منکشف ہوا تو راہ کی مشکلات سے بھی میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔

☆......☆

یہ ان دنوں کا ذکر ہے کہ جب فرسٹ ٹرم جاری تھے۔ اپنا مقام پیدا کرنے اور اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے لیے ہم سارے ”مکان میٹ“ خود کو مٹا کر پورے زور شور سے اس کی تیاری میں جتے ہوئے تھے۔ پیپر بہت اچھے ہو رہے تھے، سو اس بات نے ہمارے اندر بجلیاں سے بھر دی تھیں۔ نقشِ اول سے نقشِ ثانی بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور سوائے میرے سب کا آخری پیپر تھا۔ میرا آخری پرچہ پیر کے دن تھا، سو میں نے گھر جانے کا ارادہ بدل دیا تھا کہ وہاں اچھی تیاری نہیں ہو پائے گی۔ سب ساتھی نہا دھو کر ناشتے کے لیے جانے لگے تو میں نے ”بھوک نہیں ہے“ کا بہانہ بنا ڈالا۔ دانش مند نے نہ جانے کیسے جان لیا کہ بھوک تو ہے پیسا نہیں ہے۔ اس نے یہ راز افشا کیا تو میرے چلتے ہی بنی۔

ہمارا یہ دستور تھا کہ پیر کے دن ایک طے شدہ رقم بطور حصہ سب ساتھی دانش مند کو جمع کرا دیا کرتے تھے اور جمعے تک اس میں سے خرچ کرتے رہتے۔ وہ رقم بس اتنی سی ہوتی تھی۔ اب یہ دانش مند کی کفایت شعاری تھی کہ وہ اس کو جمعے تک چلا لیا کرتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ رقم وقت سے پہلے ختم ہو گئی ہو۔ ہفتے کے دن اول تو ہم ناشتا کرتے ہی نہیں تھے اور اگر کرنے کا موڈ ہوتا بھی تو ہر ساتھی اپنی جیبِ خاص کو ”ہوا“ لگوایا کرتا تھا۔ ”یونی“ سے واپسی پر ہم رختِ سفر باندھ کر گھروں کی سمت بھاگتے تھے۔ ہم نے بچت کی خاطر ہوٹل پر ماہانہ میس بھی نہیں رکھا تھا کہ ہمیں ہفتہ وار پیسے ملا کرتے تھے۔ آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں، ہم میں سے کسی کو بھی ماہانہ جیب خرچ نہیں ملتا تھا۔ سب ساتھیوں کے والد ”تازی“ والے تھے۔ یعنی روز کماتے اور جو ہاتھ آتا خرچ کر ڈالتے۔ کسی کا بھی والد نوکری والا نہیں تھا، جو اپنے لاڈلے کو کوئی طے شدہ رقم ہر ماہ ہاتھ میں تھما سکتا۔ ہفتہ وار جیب خرچ بھی نہ جانے وہ کتنے جتن کر کے ہمارے لیے بچاتے ہوں گے؟ اس بات نے ہمیں ذمے داری کے احساس سے سرشار کیا تھا اور جتنی بھی رقم ہتھیلی پر آتی، ہم بجائے اعتراض کرنے کے، گزر بسر کی کوشش کرتے تھے۔ البتہ یہ دیکھ کر دل دکھی ضرور ہو جایا کرتا کہ یونی میں ہمارے کئی ایک ساتھی ایک دن میں اتنی رقم خرچ کر ڈالتے تھے، جتنی ہمیں پندرہ دن کے لیے بھی نہیں ملتی تھی، پھر ان کا لباس، رہن سہن بھی تو ہم سے کہیں بہتر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دل کچھ زیادہ ہی بجھ جایا کرتا تو دانش مند کی پیار بھری ڈانٹ اور نصیحت کام آتی۔ اب بھی ان دنوں کی یاد آتی ہے تو دل تنویر کی عظمت کو سلام کرنے لگتا ہے۔ اگر اس کا ساتھ نہ ہوتا تو ہم تو شاید کب کے بکھر گئے ہوتے، خاص طور پر میں کہ جو بہت جذباتی ہوا کرتا تھا۔ بات نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی؟ محسوس نہ کیجیے گا کہ سنہرے وقت کی یاد مجھے ہی کیا، سب پر سحر طاری کر دیا کرتی ہے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میرا آخری پرچہ پیر کو تھا، سو ناشتا کرنے کے بعد وہ سب تو پرچہ دینے چلے گئے اور میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا اور تیاری میں جُت گیا۔ میرے ساتھی واپس آئے اور اپنا اپنا ”ضروری سامان“ جس میں عموماً میلے کپڑوں کی بہتات ہوتی، اٹھا کر چلتے بنے، جب کہ میں بدستور تیاری میں لگا رہا۔ دوپہر کو مجھے بھوک نے آن گھیرا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی، سو مجبوراً ٹیک کر بیٹھا رہا۔ دھیان بٹانے کے لیے خود کو اور زیادہ پڑھنے میں منہمک کر لیا۔ سنا تھا اللہ کی نظر میں بھوک سے بڑھ کر کوئی کھانا نہیں، جبھی تو اس نے مسجد میں آئے اس مہمان کو، جسے بھی

میں کسی نے پناہ نہیں دی تھی، بھوکا سلا دیا تھا۔ آج پہلی بار یہ کھانا نصیب ہوا تو پتا چلا کہ یہ کتنا "لذیذ" ہوتا ہے۔ سہ پہر تک میری حالت خستہ ہو چکی تھی۔ گرمیوں میں دن بھی تو بہت طویل ہوتا ہے، شیطان کی آنت سے بھی کہیں زیادہ طویل۔ جون کے جھلسا دینے والے اس دن نے مجھ پر اپنی شدت کے سارے در وا کر دیے تھے، پھر پیٹ میں کچھ نہ ہو تو "مرے پر سو دُرّے" والی بات صادق آتی ہے۔

اللہ اللہ کر کے دن ڈھلا اور میں نے عصر کی نماز بھی جیسے تیسے پڑھ ہی لی۔ شام کے سائے پھیلے تو لگا امید کے چراغ جل اٹھے ہوں۔ رات پہلی بار خاصی دل کش اور رومانی سی لگی۔ مغرب کی اذان ہوا کے دوش پر سوار ساعت سے آن ٹکرائی تو کچھ دیر کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے بھوک کی چمک کچھ مدہم سی گئی ہو۔ میں نے اللہ کو یاد کیا۔ کلمہ شریف کا ورد کرتے ہوئے اٹھا اور مالک حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ یہ دانش مند کی تبلیغ کا اثر تھا کہ ہم نے جو ہفتے میں ایک نماز کے عادی تھے، باقاعدگی سے نماز ادا کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ نماز پڑھنے سے وقت میں برکت پڑ جاتی ہے اور ہم نے آزما کر بھی یہی دیکھا تھا۔ جسم میں چوں کہ کمزوری کا غلبہ تھا اور چلنے جلنے کی قوت کمزور پڑ چکی تھی، سو آج ساری نمازیں گھر میں ادا ہو رہی تھیں، پھر عشاء بھی اول وقت میں ادا کر کے میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ بھوک سے وقتی نجات کی یہی ایک صورت بچی تھی کہ نیند کی بانہوں میں کھو کر خود کو فراموش کر ڈالتا۔ میرے پاس اپنی بھوک "مٹانے" کی یہی ایک مفت ترکیب تھی۔ اگر میں چاہتا تو ہوٹل والوں سے کھانا ادھار میں کھا سکتا تھا، لیکن ......آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیوں نہ کیا؟ (آج سوچتا ہوں تو بے اختیار اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا ہے کہ میں نے ادھار کھانا نہ کھا کر کتنا اچھا کیا) آپ اسے شرم اور جھجک کا نام دے سکتے ہیں۔ یونیورسٹی میں آ جانے کے باوجود بھی میں ایک شرمیلا سا نوجوان تھا اور پھر ادھار مانگنے سے تو ویسے ہی میری جان جاتی تھی۔ مجھے وہ لمحہ کبھی نہیں بھولتا، جب بہاول پور آنے سے پہلے میری خالہ مجھے ملنے آئی تھیں۔ گھر والوں نے حسب رواج، خیرات کے گڑ والے میٹھے چاول پکائے تھے۔ خاندان اور آس پڑوس کے کئی لوگ میرے "یونیورسٹی" جانے کی خوشی میں میرے گھر جمع تھے اور مجھے اور میرے گھر والوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے خاندان کا وہ پہلا فرد تھا جس نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی اور اب تو میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اس جگہ جا رہا تھا کہ خاندان کے کئی لوگ جس کے نام تک سے نا واقف تھے۔ میری اکلوتی خالہ میرے پاس آ بیٹھیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمے لہجے میں بولیں۔ "پتر! تم بہاول پور جا تو رہے ہو اور میری دعا ہے کہ کامیاب و کامران لوٹو، مگر میری چند باتیں یاد رکھنا۔ وہ بڑا شہر ہے اور تم ایک غریب باپ کے بیٹے۔ تیرے خاندان کے لوگ تو وہاں کا نام تک نہیں جانتے جہاں تُو پڑھنے چلا ہے۔ تیرا ابا بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اب اس کی ہڈیوں میں جان نہیں رہی۔ سب کی مخالفت کے باوجود وہ تجھے بھیجنے سے باز نہیں آیا۔ پتر اسے شرمندہ نہ کرانا۔ دل لگا کر پڑھنا اور صرف اپنے کام سے کام رکھنا۔ کبھی کسی سہارے کا محتاج مت ہونا، کیوں کہ سہارے کمزور کر دیتے ہیں۔ جیب دیکھ کر خرچ کرنا اور جیب خالی ہو تو کبھی بھی ادھار مت لینا، چاہے پیٹ خالی رہ جائے اور جان لبوں تک آ جائے۔" پھر انہوں نے بڑی عجیب بات کی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ ان کی بات میں دانش کا سمندر موجزن تھا۔ میری حیرت بھی بجا تھی کہ میری خالہ چٹی اَن پڑھ تھیں۔

"پتر انسان کا منہ دو مقام پر ٹیڑھا ہوتا ہے۔ ایک مرتے وقت اور دوسرا کسی سے کچھ مانگتے وقت۔"

ان کی یہ بات میرے دل میں یوں اتری کہ روح کا حصہ بن گئی۔ میں تو اس معاملے میں ویسے بھی خاصا شرمیلا سا تھا اور اب تو مجھے اس کا ایک مضبوط جواز بھی مل گیا تھا۔ انہی باتوں کے زیرِ اثر میں نے بہاول پور آتے ہوئے بس میں سفر کے دوران ہی زندگی میں پہلی بار اپنے رب سے ایک عہد کیا۔

"اے میرے رب، میرے پالن ہار! آج [illegible] کو گواہ بنا کر میں تجھ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک

رہوں گا، میرا یہ منہ سوائے تیرے کسی اور کے آگے ٹیڑھا ہوگا اور نہ یہ سر تیرے علاوہ کسی غیر کے آگے جھکے گا۔"

میرا ایمان ہے کہ اگر میں اپنے وعدے پر کاربند رہا تو مرتے وقت جب لوگ میرا آخری دیدار کریں گے تو میرا منہ انہیں کبھی ٹیڑھا نہیں لگے گا۔ جس نے کبھی مخلوق کے سامنے منہ ٹیڑھا نہ کیا ہو، کیا اس کا رب اس کا اتنا سا بھرم بھی نہیں رکھے گا؟

میں با آسانی اپنے دوستوں سے ادھار پکڑ سکتا تھا، مگر میں نے ایسا نہ کیا۔ کیا میں نے نہ لے کر اچھا کیا یا مجھے لے لینا چاہیے تھا؟ کسی پر بوجھ بننا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ وہ بھی تو سفر پر جارہے تھے، انہیں اس وقت مجھ سے کہیں زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ کبھی بھی کوئی ہنگامی صورت پیش آسکتی تھی۔ اگر میں لے لیتا تو یہ پرلے درجے کی خود غرضی ہوتی، جو مجھے زیب نہیں دیتی تھی۔ ان کے پاس اگر اضافی پیسے ہوتے تو وہ مجھے ضرور دے جاتے، کیوں کہ وہ خوب جانتے تھے کہ میری جیب خالی ہے۔ سوچوں کے اسی ادھیڑ بن میں گم تھا کہ آپ ہی آپ نیند کی وادی میں گم ہوگیا۔ رات میں کئی بار نیند بھوک کی وجہ سے ٹوٹی۔ کہتے ہیں بھوکا چاند کو بھی دیکھے تو اسے چپاتی کا خیال آتا ہے۔ مجھے بھی رات بھر خواب میں روٹیاں ہی ناچتی دکھائی دیں۔ بارہا خود کو ایک بڑے دسترخوان پر موجود پایا، جیسے کوئی بہت بڑی ضیافت میں بلوایا گیا ہوں۔ انواع واقسام کے کھانے اور پھلوں کے برتن بڑی نفاست سے سجے ہوئے تھے، جنہیں دیکھ کر ہی رال ٹپکنے لگتی اور آپ ہی آپ ہاتھ اس جانب بڑھنے لگتا اور پھر ہوتا یہ کہ جس بھی چیز کی طرف ہاتھ بڑھتا، خود بخود میری رسائی سے دور ہوتی جاتی۔ میں بدحواسی میں دوسری کسی چیز پر جھپٹتا تو اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز دور ہوتی جاتی۔ میرے لالچی ہاتھ آخر میں روٹی کی طرف بڑھتے جو دسترخوان پر موجود آخری چیز ہوتی تو کوئی نادیدہ ہاتھ اسے بھی مجھ سے دور لے جاتا۔ میں جھنجلا کر رہ جاتا، پھر اس سمت بھاگنے لگتا، جہاں کھانے کی ساری چیزیں غائب ہوجاتی تھیں۔ اسی کشمکش میں دوڑ دوڑ کر میرا حال خراب ہوجاتا اور بھوک کا احساس اور بڑھ جاتا۔ کئی بار حلق سوکھ کر کانٹا ہوجاتا تو آنکھ کھل جاتی اور میں پانی پی کر پھر نیند کی وادی اتر جاتا۔ اسی کشمکش میں قیامت کی رات گزر گئی۔

آنکھ کھلی تو کافی دیر بے سدھ پڑا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اٹھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا میں برسوں کا بیمار ہوں جو بستر سے لگ جائے تو ساری توانائی کھو دیتا ہے اور شاید امیدیں بھی۔ فاقہ کیے چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس دوران پانی اور سانس کے علاوہ کچھ بھی تو حلق سے نہیں اترا تھا اور اب تو پانی کو دیکھ کر ہی جی الٹنے لگتا تھا۔ کافی دیر یونہی پڑے رہنے کے بعد میں نے اپنی تمام تر ہمتیں یک جا کر کے اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہا۔ میرا ارادہ نہانے کا تھا، سو اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ کافی دیر پانی سے شغل کرتا رہا، جس سے یوں محسوس ہوا جیسے وجود ہلکا پڑ گیا ہو۔ نہانے کا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ جسم میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی، جس نے طبیعت کو کچھ سنبھالا سا دیا تھا۔ تاہم شدید درد سر کی کیفیت بہر حال موجود تھی کہ یہ بھوک کا نتیجہ تھی اور تبھی دور ہوسکتی تھی، جب پیٹ کی حاجت پوری ہوجاتی، لیکن ابھی تو ایک طویل دن میرا منتظر تھا۔ تنویر نے عشاء کے بعد روانہ ہونا تھا اور میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ واپسی پر میرے گھر سے پیسے لیتا آئے۔ کیسے گزریں گے یہ اٹھارہ گھنٹے؟ اس کا تصور ہی دہلا دینے والا تھا، لیکن یہی تو آزمائش کی گھڑی تھی۔ میں نے اپنے رب سے جو عہد کیا تھا، آج اسے پورا کر دکھانے کا دن تھا۔ آج ہی تو مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں اپنے قول میں سچا ہوں......؟

"کیا وہ نہیں جانتا کہ میں کتنے پانی میں ہوں"

یوں لگا ایک سرگوشی سی میرے اندر کہیں ابھری ہو۔

"وہ تو ماں سے بھی ستر گنا زیادہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہے۔ وہ کب یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ خود کو ہلاکت میں ڈالے؟ جان بچانے کے لیے حرام تک کھانے کی اجازت ہے۔ خود کو ہلاکت میں مت ڈالو کہ یہ خودکشی ہے، جو ابدی ہلاکت کے سوا کچھ اور نہیں۔ جاؤ اور ہوٹل سے کھانا کھالو، رات کو پیسے دے دینا۔ کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ دنیا کا نظام ادھار پر ہی تو چل رہا ہے۔ تم نے خوامخواہ الٹی منطق اپنالی۔ کسی نے سن لیا تو پاگل مشہور کردے گا۔ اگر بھوک سے مارے گئے تو پھر

کہاں جائے گا تمہارا سارا فلسفہ۔"

یہ آواز میرے وجود میں بڑی ہلچل سی پیدا کر گئی۔ ساری باتیں معقول ہی تو تھیں۔ خود کو ہلاکت میں ڈالنے سے کیا حاصل؟ اپنی جان کو بچانا عین تقاضائے فطرت ہے اور دین فطرت کی مخالفت کی اجازت نہیں دیتا۔ جبھی تو اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ میرے اندر طرح طرح کے خیالات چکراتے پھرتے تھے، جنہوں نے مجھے بھی چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"مت بھولو تم نے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ تم کسی کے آگے منہ ٹیڑھا نہیں کرو گے۔ یہ تیری آزمائش کا دن ہے۔ وہ تو جانتا ہے کہ تو کتنے پانی میں ہے، بس تجھے دکھانا تھا کہ تیری اوقات کیا ہے۔ دیکھ لے ایک ذرا سی مشکل آئی تو تجھے اپنے رب سے کیا اپنا پہلا وعدہ ہی بھول گیا، بس اس نے دکھا دیا نا کہ تو کتنے پانی میں ہے؟ کیا تو نے نہیں دیکھا اللہ والوں کو کتنی سنگین مشکلات پیش آتی رہی ہیں۔ وہ جان سے گزر گئے، مگر ایمان سے نہیں۔ انہوں نے اُف تک نہ کی نہ کبھی کسی کے آگے سر جھکایا۔ ہاں سر کٹانا پڑا تو بھی پروا تک نہ کی۔ آج ہی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا ہے۔ تم نے دیکھ لیا نا کہ تو ناخالص ہے، تو دودھ نہیں نرا پانی ہے۔ گدلا، بدبودار اور ناپاک پانی۔ تجھ میں اور کسی جانور میں فرق ہی کیا ہے؟ اس کی طرح تیری ہمتیں بھی تو بس پیٹ تک محدود ہیں۔ اپنی ذات کے آگے دیکھنا اور اپنی ذات سے ہٹ کر سوچنا کبھی تجھے نصیب نہیں۔ رب کی رضا پر روٹی کو ترجیح دی تو ثابت ہو جائے کہ تُو ایک جانور ہے... نرا حیوان..." کوئی میرے بہت قریب سے بولا تھا۔

اس وقت میری کیفیت غنڈوں میں پھنسے اس آدمی جیسی تھی جسے تابڑ توڑ حملوں نے فٹ بال بنا دیا ہو۔ پیٹ کی جنگ نے جسم کو کمزور کیا تھا تو نظریاتی جنگ نے میری روح کو۔ نہ جانے کتنا وقت اس کش مکش کی نذر ہو گیا۔ قریب تھا کہ میری ہمت جواب دے جاتی کہ میرے باطن (میرے ضمیر) نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ جونہی میرا جھکاؤ روحانیت کی جانب پایا تو گرم لوہے پر ایک بار پھر بھرپور وار کیا اور بڑی زبردست چوٹ کی۔

"کیا سوچ رہا ہے؟ کیا اب تم میں اتنی سی بھی ہمت نہیں رہی کہ اپنے رب سے کیا اپنا وعدہ نبھا سکے۔ شرم کر، تجھے تو ڈوب مرنا چاہیے۔ اب ایسی بھی کیا مجبوری کہ آدمی بالکل ہی جانور بن جائے۔ پیٹ کی خاطر رب کو پیٹھ کی تو کل حشر کے دن کیسے اس کا سامنا کرے گا اور اسے کیا منہ دکھائے گا؟"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زوردار ٹھوکر مار کر میرے اندر کے انسان کو جگا دیا ہو۔ ایک دم میرا ایمان انگڑائی لے کر بےدار ہوا اور مجھے لگا جیسے کسی نے بھنور میں پھنسی میری ناؤ کو پھر سے سنبھال لیا ہو۔ اب میں اندر سے پھر سے خود کو طاقت ور پاتا تھا۔ بھوک، پیاس اور منفی جذبات کا سونامی گویا تھم سا گیا تھا۔ میں اگرچہ ہانپ گیا تھا، لیکن شکر ہے کہ میں اس طوفان میں بہا نہیں تھا، سلامت لوٹا تھا۔ اب جان بچے یا نہ بچے ایمان ضرور بچا کر رہوں گا۔ میرے عزم پر پھر سے جوانی آ گئی تھی۔

میں ان لوگوں میں سے تو سے ہرگز نہیں تھا جو صرف کھاتے ہیں اور اسی ایک کام کے لیے زندہ ہوتے ہیں، جن کا مقصود کھانا ہوتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرا جا سکے اور پھر اسے خالی ہی اس لیے کرتے ہیں کہ اسے دوبارہ بھرا جا سکے، لیکن میں جس "لکڑ ہضم پتھر ہضم" عہد سے گزر رہا تھا، اس کا تو خاصہ ہی بھوک کا بڑھا ہوا احساس ہوتا ہے، پھر جب بندہ امتحان میں ہو اور اسے کسی کام پر مجبور اور پابند کر دیا جائے تو رائی بھی پہاڑ بن جایا کرتی ہے اور پھر مجھے تو کچھ کھائے ہوئے بھی تیس گھنٹے گزر گئے تھے اور ابھی تو دس بارہ گھنٹے کا قیامت خیز انتظار باقی تھا۔ اب میں کر ہی کیا سکتا تھا، سوائے صبر اور دعا کے کہ یا تو کھانے پینے کے اسباب جھٹ سے فراہم ہو جائیں (اور ایسا صرف خواب میں ہی ممکن تھا) یا پھر پلک جھپکتے وقت گزر جائے.... لیکن مصیبت میں تو وقت بھی کٹتا نہیں کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

اور پھر اچانک ایک جھماکا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے تاریکی میں کوئی راہ مجھ پر روشن ہو گئی ہو۔ تنویر ہی کا خیال اس تاریکی میں جگنو بن کر چمکا تھا۔ یکایک مجھے دعا کے حوالے سے اس کی گفتگو یاد آ گئی۔ میں غریب گھرانے کا ایک عام سے نوجوان تھا، جس نے اپنے ارد گرد زندگی کو رینگ رینگ کر چلتے اور قدم قدم پر سسکتے دیکھا تھا، سو

جب دیکھتا کہ جان توڑ کوشش کے باوجود بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں آتیں، تو میں شکوہ کناں ہوجاتا کہ اللہ تو نے بھی ہمیں پیدا کرکے بھول ہی گیا ہے۔ ہمیں تو دعا تک کا سہارا میسر نہیں۔ ہماری دعا بھی قبولیت سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ مجھے یہ باتیں دانش مند کو کہنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے اسے یہ سب معلوم ہوگیا۔ حسب دستور اس سے رہا نہ گیا۔

"واہ جی واہ! یہ بھی خوب رہی۔ ہم بھی کتنے بڑے ظالم ہیں۔ شکر نہیں کرتے، شکوہ کرتے ہیں۔ صبر نہیں کرتے، واویلا کرتے ہیں۔ جو ہر حال میں اپنے پالنے والے کو یاد رکھتے ہیں، کبھی تمہاری طرح مایوس نہیں ہوتے۔ دعا ان کی مشکل کشائی کرتی ہے، جبھی تو وہ مایوسی کو کفر گردانتے ہیں۔ کس نے کہا تمہیں دعا کا سہارا نہیں ملتا۔ تم نے کبھی دعا اس طرح مانگی ہی کب ہے جیسے مانگنے کا حق ہے۔ دعا قبول کرانا تو بچوں کا کھیل ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی آنکھیں میں جھانکا تھا جہاں یقین کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

"بچوں کا کھیل"....؟ شدتِ حیرت سے میری زبان سے بمشکل یہی نکلا تھا۔

"ہاں بچوں کا کھیل، بس آدمی کو پھر سے بچہ بننا پڑتا ہے اور یوں گوہر مقصود ہاتھ آجاتا ہے۔"

"یار تنویر، صاف صاف بتاؤ۔ فلسفہ نہ جھاڑو...؟ میں نے قدرے زچ ہوکر کہا تھا۔

"بچے کو دیکھا ہے کبھی؟ اسے ماں باپ سے کچھ منوانا ہوتو چند آنسو بہاتا، روتا اور منہ بسورتا ہے اور بالآخر جو چاہتا ہے منوالیتا ہے، کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی اسے ملنا ہے، گھر سے ہی ملنا ہے۔ بچہ بن کر کبھی اپنے رب کو پکار کر تو دیکھو.... دان نہ کردے تو کہنا۔ تم دعا کی انتہا کردو وہ عطا کی انتہا کردے گا۔"

میں اسے یونہی تو دانش مند نہیں کہتا تھا، وہ تھا ہی ایسا اور پھر میں نے بھی پھر سے بچہ بننے کا ارادہ کرلیا۔ اپنی تمام تر توانائیاں مجتمع کرتے ہوئے بدقت تمام اٹھا اور وضو کرنے لگا۔ آج مجھے اپنے رب سے بچہ بن کر راز و نیاز جو کرنا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رات تک بھوک برداشت کرنا میرے لیے ناممکن سا تھا۔ اگر تنویر رات کو نہ آتا تو مجھے صبح پیپر بھی بھوکے پیٹ ہی دینا پڑتا اور دوپہر کو کہیں جاکر مجھے کھانا نصیب ہوتا اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ دوپہر تک آجاتا۔ اس کے پیپر ختم ہوگئے تھے، عین ممکن تھا، وہ چند دن گھر پر رک جاتا۔

دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد میں نے ہاتھ اس کے حضور پھیلا دیے کہ بقول تنویر کے خالی لوٹا دینا جس کی شانِ کریمی کے شایانِ شان نہیں۔

" اے اللہ......! اے میرے رب.... تیرا یہ عاجز و گنہ گار بندہ تیرے حضور حاضر ہے......

اور آج اسے تجھ سے ایک سوال کرنا ہے......

اس بندے نے کہ جس نے کبھی کھانے کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی......

آج اسی کھانے نے اسے لاچار کر ڈالا ہے......

تیرا کتنا بڑا اکرم ہے تو نے کبھی بھوکا نہیں سلایا......

کبھی فاقہ کی نوبت نہیں آنے دی......

روکھی سوکھی جیسی بھی نصیب ہوئی تیرا شکر کرکے کھالی......

اگر کبھی شکوہ لب پر آیا بھی تو جب جب اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہوئی، معافی مانگنے میں کبھی دیر نہیں کی......

اے میرے پالن ہار! تجھ سے پہلی بار ایک عہد کیا تھا......

بڑے بول بولے تھے......

کہ یہ منہ زندگی بھر کسی کے آگے ٹیڑھا نہیں ہوگا سوائے تیری ذات کے......

میرے کریم رب! تو دیکھ لے تیرے اس کمزور بندے نے اس عہد کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے......

اور اب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے......

میرے مالک! میری لاج رکھ لے......

میرے رب...... میرے مالک...... میرے پالن ہار...... میرے رازق......

"میری امیدوں کے محور و مرکز......"

نہ جانے اتنے بہت سے آنسو میری آنکھ میں کہاں سے امڈ آئے تھے؟ میں پھوٹ پھوٹ اور بلک بلک کر بالکل بچوں کی مانند رو رہا تھا۔ یاد نہیں پڑتا کبھی اتنے آنسو بہائے ہوں۔ روتے روتے گلا رندھ گیا اور میرے الفاظ میرے گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ میں کہاں تھا، مجھے خود اس کی خبر کہاں تھی؟ مجھے یوں لگتا تھا

جیسے میں ایک دم ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہوں، مگر نہیں یہ میں کہاں تھا؟ میں تو شاید ایک آواز کے روپ میں ڈھل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا وجود کہیں ملتا ہی نہیں تھا۔ اب میں صرف ایک آواز تھا ایک آواز۔ لرزتی، چکراتی اور لہراتی ہوئی ایک ایسی آواز جو نہ جانے کس وجود سے آ رہی تھی۔ میں شاید مر چکا تھا یا میری روح دعا کے دوران میرا وجود چھوڑ کر ہوا میں منتشر ہو چکی تھی، پھر مجھے یوں لگا جیسے میری آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی ہو یا شاید میری سماعت نے ہی کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا مجھ پہ کیا بیت رہی تھی؟ میں کیا تھا؟ کہاں تھا؟ زندہ بھی تھا یا نہیں، کچھ پتا نہ تھا۔ شاید میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل گیا تھا۔ کبھی احساس ہوتا میرا وجود پہلے آواز میں تبدیل ہوا پھر آنسو کا روپ دھار گیا تھا۔

کہتے ہیں جہاں لفظوں کی سرحد ختم ہوتی ہے، اس سے آگے صرف آنسوؤں کی راج دھانی ہوتی ہے۔ لفظ ساتھ چھوڑ جائیں تو جذبے بول اٹھتے ہیں اور وہ صرف اشکوں کی زبانی ظاہر ہوتے ہیں۔ میرے بھی جذبے بول اٹھے تھے۔ آخری احساس یہ تھا کہ دعا مانگتے مانگتے میں سجدے میں جا گرا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایک دن، ایک مہینہ، ایک سال یا پھر ایک صدی...... میں زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہو کر شاید کسی انوکھی دنیا میں جا بسا تھا۔ من و تو کے فاصلے مٹ سے گئے تھے۔ نہ جانے یہ محویت کب تک برقرار رہتی کہ اچانک دستک کی تیز آواز نے مجھے شاید پھر سے زندہ کر دیا اور ہوش وحواس کی دنیا میں لا پھینکا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے وجود کا سراغ پایا اور خود کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ خود کو زندہ پا کر مجھے ایک انوکھی مسرت کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے میں نے پھر سے ایک نیا جنم لیا ہو۔ دستک بدستور جاری تھی۔ میں بہ وقت تمام اٹھا اور دروازے تک پہنچا۔ کھول کر دیکھا تو تنویر کو اپنا منتظر پایا اور میرے رکے ہوئے آنسو پھر سے رواں ہو گئے۔

میری کیفیت سے بے نیاز وہ اندر داخل ہوا اور نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا؟ مجھے کچھ پلے پڑا تو فقط اتنا کہ میری امی نے میرے لیے بہ طور خاص کھانا پکا کر اسے دوپہر کو ہی میری طرف روانہ کر دیا تھا...... اور میں نے ایک بار پھر خود کو حالت سجدہ میں پایا....

یہ سجدۂ شکر تھا، اس رب قدیر کے حضور کہ خالی لوٹانا جس کی شان کریمی سے بعید ہے۔

بعض واقعات اپنی کیت کے لحاظ سے بہت محدود ہوتے ہیں، لیکن اپنے حجم کے لحاظ سے بے انتہا پھیلے ہوئے۔ ان میں اتنا پھیلاؤ ہوتا ہے کہ پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا کہ جس نے میری حیات اور کائنات کو گھیر لیا تھا اور آج تک میں اسی کے حصار میں ہوں۔ میں جو کبھی کبھی اپنی ذہنی کثافت کے سبب شکوہ کناں ہو جایا کرتا تھا۔ اس واقعے کی لطافت نے میری وہ کثافت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دھو ڈالی تھی۔

آج بہت سے لوگ مجھے انجینئر شکیل احمد کے طور پر جانتے ہیں۔ میرے قریبی لوگ مجھ پر رشک کرتے ہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میں نے جو چاہا مجھے مل گیا۔ میں اب انہیں کیسے سمجھاؤں کہ مجھے خدا مل گیا تھا اور اس سے رابطے اور پہنچنے کا سلسلہ بھی۔ ظاہر ہے جسے دعا کا وسیلہ مل جائے، اس کے پاس بھلا کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن...... کوئی دعا ایسی نہیں جو میں نے مانگی ہو اور اس بے نیاز نے رد کی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دعا مانگتے ہوئے یہ خیال ضرور رکھتا ہوں کہ اس کی رضا کے منافی کچھ بھی نہ مانگو۔

”اے میرے رب! جو کچھ تجھ سے مانگا ہے، اگر تیری رضا کے منافی نہیں تو نواز دے اور اگر منافی ہے تو اس کا نعم البدل عطا کر دے اور مجھے اپنی تقسیم پر راضی رکھ۔“

جب جب یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوتے ہیں تو مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جایا کرتی ہے، جس نے کبھی مجھے انجانی دنیا کا مسافر بنا دیا تھا اور مجھے دعا کے دوران ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ میری دعا نے قبولیت کا شرف پا لیا ہے اور پھر مجھے میرا مقصود یا اس کا بہترین نعم البدل دان کر دیا جاتا ہے۔

☆......☆



بشیر احمد بھٹی

پاکپتن شریف کی زمین پر مانگی گئی ایک عاشقِ گنج شکرؒ کی مقبول دعا کا حال



میں نے اپنے لڑکپن میں اپنے بزرگوں سے ایک روحانی واقعہ داتاؒ صاحب کی کرامت سے متعلق سن رکھا تھا کہ ایک آدمی حضرت گنج بخش داتا ہجویریؒ کے مزار پر گیا اور صدا لگانا شروع کردی کہ داتا پانچ روپے دے، جب کافی دیر تک وہ یہ صدا لگاتا رہا تو قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور سوالی کو دیتے ہوئے بولا۔

''یہ لے پانچ روپے، داتا تجھے پانچ روپے نہیں دے گا۔'' اس سوالی نے پانچ کا نوٹ جیب میں ڈالا اور یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا کہ واہ داتا، پانچ روپے دلوائے بھی تو اس سے، جس کا عقیدہ ہی کمزور ہے۔''

☆......☆

قادری صاحب کراچی سے ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ ہر سال محرم میں پاک پتن جاتے ہیں۔ جب وہ پاک پتن روانہ ہوئے تو میں بھی اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا۔ ہم پاک پتن پہنچ گئے، ہم نے ایک مکان چند روز کے لیے کرائے پر لے لیا اور اس میں اپنا سامان سیٹ کردیا۔ محرم میں چوں کہ مزار مبارک پر زائرین کا بہت زیادہ رش ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں کے مقامی باشندے اپنے فالتو مکان کرائے پر دے دیتے ہیں۔



مزار سے متصل ''بابِ جنت'' ایک کا نام ہے، جسے ''بہشتی دروازے'' کا نام دیا جاتا ہے۔ تمام زائرین ایک خاص عقیدت کے ساتھ اس دروازے سے گزرتے ہیں۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو بھی اس سے گزرے گا، وہ سیدھا جنت میں جائے گا، اس لیے لوگ بڑے ذوق و شوق سے اس دروازے سے گزرتے ہیں۔ زائرین کی قطار کے نظم و ضبط کے لیے یہاں پولیس کا پہرہ بھی ہوتا ہے۔ کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قطار میں چلنا پسند نہیں کرتے اور وہ پولیس والوں کو پچاس یا سو روپے کا نوٹ دے کر اُن کی مٹھی گرم کرتے ہیں، گویا لوگ جنت میں جانے کے لیے پولیس کو رشوت دیتے ہیں۔ پولیس والے اُن لوگوں کو اپنے ہمراہ لے کر دروازے تک جا پہنچتے ہیں، پھر وہ اُن کو اپنے رعب و دبدبے سے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان لوگوں کو ان سے آگے قطار میں کھڑا کردیتے ہیں۔ اس طرح رشوت دینے والے لوگ جلد بہشتی دروازے سے گزر کر شہر کے اوپر سے چکر کاٹ کر اپنے ٹھکانے پر واپس آ جاتے ہیں۔

لوگ مغرب سے پہلے اس قطار میں لگ جاتے ہیں۔ یہ قطار دو طرفہ ریلنگ کے درمیان چلتی ہے۔ کئی

www.paksociety.com



میل لمبی اس قطار میں شامل ہونے کے لیے اسٹیشن کی طرف جانا پڑتا ہے۔ قطار میں موجود لوگ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ کسی طریقے سے وہ بہشتی دروازے سے گزر جائیں۔ جب مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے اور مسجدوں کے اسپیکر سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے، ہر طرف سے اذان کی آواز آرہی ہوتی ہے، اللہ بہت بڑا ہے، آؤ نماز کی طرف، آؤ فلاح کی طرف۔ تو کوئی بھی شخص جو قطار میں موجود ہے، دیہاتی، شہری اذان کی پروا نہیں کرتا۔ ایک ہڑبونگ سی مچی ہوتی ہے۔ شور شرابہ، ہُو ہکار اور جوتیاں سب کی بغلوں میں دبی ہوئی۔ بس اس وقت سب کو بہشتی دروازے تک جانے کی پڑی ہوتی ہے اور نماز ادا کرنے کا کسی کو بھی ہوش نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ کئی زائرین ساری ساری رات قطار میں رینگ رینگ کر چلتے ہوئے صبح کی اذان کے قریب دروازے تک جا پہنچتے ہیں۔ اس سفر میں وہ کافی تھک بھی جاتے ہیں، لیکن جب وہ دروازے سے گزر کر مزار کے دوسری طرف سے برآمد ہوتے ہیں تو پولیس والے اُن کو اس طرف دھکیل دیتے ہیں، جو راستہ جنگل اور کھیت، کھلیانوں کی طرف جاتا ہے۔ اس ویرانے کا چکر کاٹ کر پھر شہر کے اوپر سے گھوم کر واپس شہر میں آنا پڑتا ہے۔ اس طرح زائرین تھک جاتے ہیں اور پھر جب صبح کی اذان ہوتی ہے تو وہ مسجد میں جانے کی بجائے اپنی رہائش گاہ پر جاکر سو جاتے ہیں اور پھر دن کے بارہ بجے تک سوتے رہتے ہیں۔ اس خوشی میں کہ اب وہ بہشتی ہو چکے ہیں۔

بہشتی دروازے سے گزرنے والوں سے استدعا ہے کہ وہ پانچ وقت نماز بھی ادا کیا کریں، کیوں کہ نماز کی معافی تو کسی صورت نہیں ہے اور پھر آپ جس در پہ عقیدت و احترام سے آئے تو خود بابا فریدؒ نے بھی کبھی نماز ترک نہیں کی۔ کسی بزرگ، ولی نے جب نماز کی ادائیگی میں سستی نہیں کی تو ہمارا بھی فرض ہے کہ بہشتی دروازے سے بھی گزریں اور نماز کی بھی پابندی کریں۔ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے کہ نماز جنت کی کنجی ہے۔

☆......☆

میں خود بھی بہشتی دروازے کی خواہش لے کر پاک پتن گیا تھا۔ میری خواہش پوری ہوئی۔ قادری صاحب، جن کا اصل نام عبدالصمد قادری ہے، کورنگی نمبر 4 کراچی کے رہائشی ہیں۔ میں نے قادری صاحب کے ہمراہ بہشتی دروازے سے گزرنے کی سعادت حاصل کی۔

بہشتی دروازے سے گزر کر میں بہت خوش ہوا، لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا تھا کہ لوگ دروازے سے

گزرنے کے شوق میں اپنی نمازیں چھوڑ دیتے ہیں۔ نماز ترک کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ (اللہ ہمیں پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین)

☆......☆

عرس مبارک بابا فرید کا ہو یا حضرت داتا ہجویری کا۔ تقریباً ہر مزار پر قوالی تو ہوتی ہے اور دور دراز سے قوال آتے ہیں، صاحب مزار کی شان میں منقبت پڑھتے ہیں اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔ یعنی نوٹوں سے جھولیاں بھر کے لے جاتے ہیں، جو صاحب مزار کے محبین و معتقدین اس بزرگ کی محبت اور کلام کی خوب صورتی پر انہیں عقیدت ومحبت میں دیتے ہیں، پھر بھی قوال حضرات اکثر شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ آئے ہیں، ''آئے ہیں تیرے در پر جو کچھ نہ کچھ لے کے جائیں گے، ورنہ جان دے کے جائیں گے۔'' ایسا ہوا تو کبھی نہیں کہ کسی قوال نے جان دی ہو، کیوں کہ من کی آشا جو پوری ہو جاتی ہے، یعنی نوٹوں سے تھیلے بھر جاتے ہیں۔ پاک پتن شریف میں بھی گرد و نواح اور کراچی سے کافی قوال آئے ہوئے تھے۔ دن بھر مزار کے احاطے میں قوالی ہوتی تھی۔ لوگ جھوم جھوم کے وجد میں آ جاتے تھے۔ قوالوں پر نوٹوں کی بارش برستی رہتی تھی۔ جو قوال دربار کے احاطے میں قوالی گا لیتے پھر فارغ اوقات میں وہ اُن مکانوں کا رُخ کرتے، جن میں زائرین کی رہائش ہوتی۔ کیوں کہ مزار کے احاطے میں قوالوں کی ترتیب سے وقت دیا جاتا تھا، جن قوالوں کا ایک بار نمبر آ جاتا یعنی ان کی حاضری ہو جاتی تھی تو پھر دوبارہ نمبر ذرا دیر سے آتا تھا۔ اس لیے وہ پرائیویٹ سیکشن کا رُخ کرتے، یعنی مکانوں میں جا کر قوالی شروع کر دیتے۔ دولت کی ہوس ہی ایسی ہے کہ انسان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس لیے قوالوں کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ سیزن سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور زیادہ سے زیادہ نوٹ سمیٹ لیں۔ اسی خواہش میں وہ زائرین کے مکانوں اور ٹھکانوں میں قوالی کرتے تھے۔ اُن کے اس اقدام سے زائرین کے بچے کھچے نوٹ بھی قوالی کی نذر ہو جاتے تھے۔ قادری صاحب کے مرشد ننھے میاں صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ قوالوں کی اُن سے خوب جان پہچان تھی۔ اس لیے ہم جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، اکثر قوال اس مکان میں آ جاتے قوالی شروع ہوتی۔ ہم لوگ اس خوشی میں اُن پر نوٹ پھینکتے کہ اب ہم بہشتی دروازے سے گزر کر جنتی ہو چکے ہیں، اب روپے پیسے سے ہمارا کیا سروکار۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تقریباً قلاش ہو گئے۔ ایک روز دوپہر کو قوالی ہو چکی تو ایک قوال جو قوالوں کا سردار تھا، قوالی کے اختتام پر آگے بڑھا، ننھے صاحب کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سرنگوں ہوا۔ ان کے ہاتھ چومے اور اجازت چاہی۔ ننھے صاحب نے اپنے آگے جھکے ہوئے قوال کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اسے خوش خبری سنائی کہ رات کو بھی ہمارے پاس آنا اور قوالی سنانا۔ وہ قوال معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''جناب ہم معافی چاہتے ہیں۔ ہماری سیٹیں تیز گام کے اے سی کلاس کمپارٹمنٹ میں بک ہیں۔ ہم نے شام کو ساہیوال روانہ ہو جانا ہے۔ اگر ہم وقت پر اسٹیشن نہ پہنچے تو تیز گام نکل جائے گی، پھر ہمیں دوسری ٹرین میں بغیر سیٹوں کے ذلیل وخوار ہو کر سفر کرنا پڑے گا۔ اگلے عرس مبارک پہ بابا فریدؒ نے حاضری کے لیے بلایا تو آپ کے ہاں بھی حاضری دیں گے۔'' قوال کی معذرت پر ننھے میاں نے اُن کو اجازت دے دی۔ وہ اپنے طبلے باجے لے کر اُلٹے قدموں کمرے سے نکلے اور چلے گئے۔ جاتے جاتے وہ قوال ایک قول پورا کر گئے، یعنی انہوں نے ایک ایسا آدمی ہمارے کرائے کے مکان پر بھیج دیا، جس کی گردن ''ککڑوں کوں'' یعنی مرغ کی طرح پتلی اور بال لمبے لمبے تھے، اجازت طلب کر کے وہ ہمارے کمرے میں آیا۔ آتے ہی اس نے تین چار زور دار چھینکیں ماریں۔ جیب سے میلا سا رومال نکالا اور پھوں پھاں کر کے رومال سے ناک صاف کیا، پھر رومال جیب میں ڈالا اور آگے کی طرف بڑھا۔ اس وقت ننھے میاں صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سگریٹ نوشی کا مزا لے رہے تھے۔ اُن کے انگوٹھیوں والے ہاتھ میں سگریٹ تھی۔ دھوئیں کے مرغولے کمرے میں رقصاں تھے۔ ان کے قریب مرید دائیں بائیں سر جھکائے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ قوال آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے ننھے صاحب کا وہ ہاتھ جس میں سگریٹ

نہیں تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ اس کو چوما، پھر دونوں ہتھیلیاں نیچے بچھے قالین پر ٹکا کر رکوع کی حالت میں مخاطب ہوا۔

"جناب نے جانے والے قوالوں سے قوالی کے لیے فرمایا تھا۔ اُن کی سیٹیں بک ہیں، آج ہی اُن کا جانا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے سرکار کے ہاں بھیجا ہے۔ اب سرکار کا کیا حکم ہے۔ رات کو میں مع ساتھیوں کے حاضر ہو جاؤں۔" بنے صاحب نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کے بجھایا اور اُسے کہنے لگے۔

"ضرور...... ضرور...... تم رات کو بعد نمازِ عشا ضرور آنا۔"

جب رات ہوئی تو قوالوں کی پوری ٹیم آدھمکی۔ قوالی صحن میں شروع ہوئی۔ مکان کے کمرے تنگ تھے۔ قوالوں کی یہ ٹیم مریل سی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بوسنیا، چیچنیا کے فاقہ کش انسان پاکستان میں آگئے ہوں۔ نہ آواز نہ سُر، صرف طبلے اور تالیوں کا شور۔ بہر حال منچلوں نے ان پر نوٹ پھینکنے میں کنجوسی نہیں کی۔ ایک حقہ قوالوں کے پاس تھا، جو ایک ترچھی چارپائی، جو قوالوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس پر ایک بڑا سا تکیہ پڑا تھا، اس کے پیچھے ان کا حقہ رکھا ہوا تھا۔ جب کسی قوال کو تمباکو کی طلب ہوتی تو وہ آہستہ سے چارپائی کے پیچھے رینگ جاتا اور حقے کے دو چار کش لے کر واپس آ کے اپنی قطار میں بیٹھ کے جھومتے ہوئے تالیاں بجانے لگ جاتا۔ یہ تھے پیلے پیلے دانتوں والے تمباکو پسند قوال۔ اُن کی قوالی سن کے کئی لڑکوں نے ڈالے دھمال۔

☆......☆

پھر یوں ہوا کہ قوالوں نے ہمارا مکان ٹیپ لیا۔ روز کوئی نہ کوئی پارٹی آ جاتی۔ آخر ساتویں روز وہی پتلی گردن اور لمبے بالوں والا "گکڑوں کوں" قوال پھر آموجود ہوا۔ اس دفعہ بنے میاں نے ہتھیار ڈال دیے، وہ قوال سرنگوں ہو کر جب ان کے ہاتھ چوم چکا تو بنے میاں نے اپنی شیروانی سے کچھ نوٹ نکالے، قوال سمجھا، شاید نذرانہ پیشگی مل رہا ہے، مگر معاملہ کچھ اور تھا۔ بنے صاحب نے اپنے ہاتھوں پر نوٹ رکھ کے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"میاں...... اب تو یہ ہی نوٹ بچے ہیں اور یہ ہمارے واپسی کا کرایہ ہے، ہم نے بھی کراچی جانا ہے، یہاں نہیں ٹھہرنا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے سال اسی جگہ یا کسی اور مکان میں ملاقات ہوگی۔"

بنے میاں کی بات سن کر قوال کا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے ان کے ہاتھ چومے اور الٹے قدموں واپس ہولیا، جوتا پہنا اور خاص خاموشی سے دروازے سے باہر نکل گیا تو پھر ہماری بھی جان میں جان آئی، کیوں کہ ہمارے پاس بھی قارون کا خزانہ تو تھا نہیں، جو آنکھیں بند کر کے لٹاتے۔ صرف واپسی کے کرائے جیبوں میں پڑے ہوئے تھے، وہ بھی پسنجر ٹرین کے۔ جبکہ قوال تیز گام، یعنی بڑی ٹرینوں میں بکنگ کرا چکے تھے۔ کچھ چلے گئے تھے اور کچھ جانے والے تھے۔

پاک پتن، جس کا پرانا نام اجودھن تھا۔ یہ مین لائن سے ہٹ کر ہے، دریائے ستلج کی سمت، پاکپتن کے سیدھ میں ساہیوال ہے۔ لاہور سے کراچی کے لیے بڑی ٹرینیں ساہیوال سے گزرتی ہیں، اس لیے کراچی کے قوال ساہیوال اتر کے بذریعہ بس پاک پتن جاتے ہیں۔ پاک پتن کے لیے ایک ہی بڑی ٹرین بابا فرید ایکسپریس چلائی گئی تھی، لیکن جس وقت کا میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں، اس وقت فرید ایکسپریس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس لیے پاک پتن، سیکشن پر پسنجر ٹرینوں کی بھرمار تھی۔ زائرین زیادہ تر ان پسنجر ٹرینوں یا بسوں میں پاک پتن پہنچتے تھے، جبکہ قوال بڑی ٹرینوں میں آرام وہ سفر کرتے تھے۔

☆......☆

اب ایک دن بعد ہماری واپسی تھی۔ میں قادری صاحب کے ہمراہ پاک پتن کے بازار میں گھوم رہا تھا۔ قادری صاحب شاپنگ کرتے پھر رہے تھے۔ اُن کو فیصل آباد، ساہیوال اور پاک پتن کی لنگیاں یعنی دھوتیاں بہت پسند ہیں۔ یہ دھوتیاں یہاں کراچی کی نسبت سستی ملتی ہیں، اس لیے قادری صاحب جب بھی یہاں آتے ہیں، دو چار دھوتیاں ضرور خریدتے ہیں۔ وہ خریداری کر رہے تھے اور میں یونہی ساتھ میں گھوم رہا تھا۔ رقم ہوتی تو میں

بھی شاید تھوڑی بہت خریداری کرتا، لیکن رقم تو میں قوالوں پر لٹا چکا تھا اور اب صرف واپسی کا کرایہ ہی کھیسے میں بچا تھا۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ لوگ بزرگوں سے جو مانگتے ہیں، وہ ملتا ہے اور یہ تو پاک پتن شریف ہے، بابا فرید کا شہر۔ اے کم عقل تُو باباجی کا مہمان ہے، اُن سے کچھ مانگ لے، دیکھ تو سہی، ملتا ہے کہ نہیں۔ چلو اس بہانے آزمائش ہی سہی۔ یہ سوچ کر میں نے دل ہی دل میں کہا۔ بابا فریدؒ مجھے سو روپے عنایت کردیں، کیوں جب داتا ہجویریؒ لاہور والی سرکار سے ایک آدمی نے پانچ روپے مانگے تھے، تو اس کو وہ مل گئے تھے، میں اب آپ سے سو روپے مانگ رہا ہوں۔ آپ کا شہر ہے، میں مسافر ہوں، پردیسی ہوں، مجھے سو روپیہ عنایت فرمائیں، پھر میں نے زمین کی طرف دیکھنا شروع کردیا کہ شاید باباجی کا عنایت کیا ہوا سو کا نوٹ زمین پر پڑا نظر آجائے۔ لیکن وہاں مجھے کوئی نوٹ نظر نہیں آیا۔ میں سڑک پر گلی میں مکان تک آتے آتے زمین کو دیکھتا ہوا آیا، لیکن کوئی نوٹ نظر نہیں آیا۔ وہ دن گزر گیا۔ دوسرے دن ہماری تیاری ہوگئی۔ ہم سامان باندھ کے تانگے پر بیٹھ کے اسٹیشن آگئے۔ اس دوران بار بار مجھے خیال آتا رہا کہ افسوس بابا فریدؒ نے میری ایک چھوٹی سی فرمائش پوری نہ کی، بلکہ رد فرمادی لیکن مجھے علم نہ تھا کہ مجھے سو کا نوٹ ملنے والا ہے اور وہ بھی پاک پتن کی حدود میں۔ بعد میں مجھے حیرانی کا جھٹکا اس وقت لگا۔ جب سو روپے مجھے ملے۔ وہ کس طرح؟ بتاتا ہوں۔ سو کا نوٹ مجھے ملا اور وہ بھی ٹھگوں کے ہاتھوں سے۔ جی ہاں، باباجی نے مجھے سو روپے دلوائے اور وہ بھی ایسے ٹھگوں سے، جن کے بارے میں، ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

☆......☆

ہوا کچھ یوں کہ جونہی ہم اسٹیشن پر پہنچے اور تانگے سے سامان اتار کے نیچے رکھا تو قادری صاحب نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ میری اور اپنی ٹکٹ خرید لاؤ۔ بھنے صاحب اور اُن کے مرید اپنے اپنے ٹکٹ خود خرید کریں گے۔ میں سو روپے کا نوٹ لے کر ٹکٹ گھر کی طرف بڑھا، جو اسٹیشن سے باہر درختوں کے نیچے والی عمارت میں تھا۔ میں جب برآمدے میں پہنچا تو ٹکٹ گھر کی دری ویران پڑی تھی اور کوئی ٹکٹ خریدار کھڑکی پر موجود نہ تھا۔ میری مٹھی میں سو روپے کا نوٹ دبا ہوا تھا۔ ٹکٹ دینے والا ملازم اپنی کرسی پر نہیں تھا، کچھ دور کمرے میں ایک ریلوے ملازم کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آگیا۔ ”دو ٹکٹ بہاولپور کے“ میں نے اُسے کہا تو اس نے دو ٹکٹ نکالے اور ایک مشین میں ڈال کے موجودہ تاریخ اُن پر پنچ کی، پھر ٹکٹ میرے سامنے ڈال کے اس نے پوچھا۔ ”کتنے پیسے دیے ہیں۔“ میں نے اُسے یہ نہیں کہا کہ (سو روپے دیے ہیں) میں نے اُسے صرف اتنا کہا کہ (سو روپے) میں نے یہ بات سوچ سمجھ کر کہی تھی۔ اگر وہ واویلا مچاتا تو میں کہہ سکتا تھا۔ کہ میں نے کہا ہے کہ سو روپیہ دیا ہے، میں نے تو صرف سو روپے کا نام لیا ہے، جو میرے پاس ہے۔ ”یہ لو۔“ بات ختم ہوجاتی اور میرے جھوٹ کا بھرم رہ جاتا، پھر اس نے اپنی دراز میں دیکھا اور پھر ایک روپیہ دراز سے اٹھا کے میرے سامنے پھینکا، پھر پانچ کا نوٹ میرے سامنے پھینکا، اس کے بعد دس روپے کا نوٹ، پھر پچاس روپے کا میرے آگے نوٹ ڈال کے وہ جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ سو کا نوٹ میری مٹھی میں تھا، جو اس نے نہیں لیا تھا۔ سترہ روپے کا ایک ٹکٹ تھا۔ دو ٹکٹوں کی قیمت چونتیس روپے بنتی تھی، چھیاسٹھ روپے بقایا (مجھ سے سو کا نوٹ لیے بغیر) اس نے میرے سامنے ڈال دیے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ سو روپے کا نوٹ اُسے دے دوں، یہ نہ ہو کہ وہ مجھے آزما رہا ہو اور جب میں چلنے لگوں تو فراڈ کیس میں وہ مجھے حوالۂ پولیس کردے۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا، لیکن پھر بھی میں نے مفت میں ملنے والی بقایا رقم اس ہاتھ میں دبالی، جس میں سو کا نوٹ تھا۔ اس طرح میرا نوٹ بقائے میں چھپ گیا۔ اب مجھے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں سے کھسک لوں۔ میں اس خیال سے ڈرا ہوا تھا کہ کہیں وہ ملازم کہیں ڈراما نہ کر رہا ہو۔ یہ نہ ہو کہ جب میں چلنے لگوں تو یہ شور مچا کے مجھے پولیس کے حوالے کردے اور میں بنے میاں، قادری صاحب اور کراچی کے مہمانوں کے سامنے تماشا بن جاؤں۔ سو روپے کا فراڈ ہو یا ایک روپے کا، فراڈ تو پھر فراڈ ہوتا ہے۔ میرا

ضمیر اس طرح کے فراڈ کی اجازت نہیں دیتا، لیکن جب سامنے بھی معاملہ فراڈیوں کا ہو تو ضمیر کی آواز (جو پہلے ہی دھیمی ہوتی ہے) کو دبانا پڑتا ہے۔

ریلوے ملازمین کی یہ کارستانیاں سب پر عیاں ہیں کہ وہ مسافروں کو لوٹنے پر کمربستہ رہتے ہیں آج بھی تقریباً صورت حال یہی ہے کہ وہ کھڑکی سے جاری کردہ ٹکٹ پر دس بیس روپے زیادہ اینٹھ ہی لیتے ہیں۔ اس طرح دوران ڈیوٹی وہ کافی رقم بٹور چکے ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن کے ایسے کارناموں کا کئی بار شکار ہو چکا تھا۔ اس لیے میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں انہیں سو روپے کی ڈز لگانے لگا تھا۔ اب معاملہ وہاں سے کھسکنے کا تھا، لیکن میرا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، پھر میرا معاملہ بھی کچھ نازک تھا۔ کراچی کے معتبر لوگوں کے سامنے میں ذلیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ قدرت نے یا پھر بابا فریدؒ نے میرا مسئلہ حل کیا یا پھر قدرتی طور پر ایک واقعہ میری معاونت میں سامنے آ گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ چند دیہاتی جن کے سروں پر بڑے بڑے پگ بندھے ہوئے تھے، وہاں آ گئے اور انہوں نے آتے ہی ٹکٹ والی کھڑکی کو محاصرے میں لے لیا۔ ایک دیہاتی نیچے کو جھک کر کھڑکی سے کمرے میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”تسی کے نوں ستا ٹکٹ دیندے او تے کے نوں مہنگا۔ میرے کولوں (بیس) وی روپے ٹھا نیں زیادہ لیے نیں تے میرے سنگی کولوں وی روپے گھٹ لیے نیں۔ اے کی وجہ اے۔“

جب میں نے دیکھا کہ کھڑکی پر ہڑبونگ مچ گئی ہے اور اب بھاگنے کے لیے یہ موقع مناسب ہے تو...... بھاگ بندے۔ اب دیر نہ کر، میں نے دل میں سوچا اور پھر فوراً ہی وہاں سے چپکے سے کھسک لیا۔

عرس مبارک کا موقع تھا اور ریلوے والے زائرین سے لوٹ مار کے ذریعے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ ہر سواری کو بیس روپے کا ڈز کا دے رہے تھے، پھر ایسے لوگوں سے مجھے سو روپے مل رہے تھے تو میں کیوں کفرانِ نعمت کرتا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ جہاں عبدالصمد قادری صاحب شیشم کے درختوں تلے اپنے سامان کے پاس کھڑے تھے۔ یہاں میں یہ بھی بتاتا

چلوں کہ قادری صاحب کورنگی کے ایک بڑے دینی مدرسے میں بطور الیکٹریشن ملازم ہیں۔ میں نے سو روپے کا نوٹ جیب میں ڈال لیا اور جو نوٹ مجھے قادری صاحب نے دیا تھا، اس میں سے چھیاسٹھ روپے بچے تھے، وہ میں نے قادری صاحب کو دے دیے جو انہوں نے جیب میں ڈال لیے، انہوں نے دونوں ٹکٹ میرے پاس ہی رہنے دیے۔ سبز رنگ کے پسنجر ٹرین کے ٹکٹ تھے اور لاہور کی جانب سے پسنجر ٹرین آ رہی تھی، جس میں ہم بے زر مجبور قوالوں کے ہاتھوں لٹنے والے مسافروں نے سفر کرنا تھا۔ ہمارے خود ساختہ مقدر نے ہمیں پسنجر ٹرین پر سفر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جب کہ قوال طبلے کی تھاپ پر اپنا مقدر خود سنوار کے تیز گام کے مسافر بن چکے تھے۔ بنے صاحب پلیٹ فارم پر جا چکے تھے ان کے مریدان کے ہمراہ تھے۔ میں عبدالصمد قادری صاحب کے ساتھ تھا۔ قادری صاحب نے کچھ سامان اُٹھا لیا اور کچھ میں نے اُٹھا لیا۔ ہم اسٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھے، تاکہ پلیٹ فارم پر موجود بنے صاحب کے پاس پہنچ جائیں، عین اُسی لمحے بنے صاحب کا ایک مُرید ہمارے قریب سے گزرا۔ وہ اب ٹکٹیں لینے کے لیے اس ٹکٹ گھر کی طرف جا رہا تھا، جہاں سے میں دو عدد ٹکٹ لے آیا تھا۔ ہم پلیٹ فارم پر پہنچ گئے، مسافروں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ وہاں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میں سوچنے لگا۔ بابا فرید کا عرس مبارک ہے اور ان عقیدت مندوں نے اس شہر کو رونق بخشی ہوئی ہے، لیکن ریلوے والوں نے ہر ٹکٹ پر ان کو لوٹا ہے، کتنے نوٹ جمع کر لیے ہوں گے ان ظالموں نے۔ اب مجھے اپنی وہ سو روپے والی دعا یاد آ گئی کہ میں نے حضرت بابا جی سے سو روپے مانگے تھے۔ اب تمام معاملہ مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔ میں ابھی تک پاکپتن کی حدود میں تھا اور بابا جی نے مجھے سو روپے ٹھگوں سے لے دیے تھے۔ میں نے اصل معاملے پر اب غور کیا تھا۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ جس طرح داتا ہجویریؒ نے دیوانے کو اپنے نہ ماننے والے سے پانچ کا نوٹ لے کر دیا تھا، اسی طرح بابا فرید گنج شکرؒ نے مجھے ریلوے والوں سے سو روپے دلوائے تھے۔

قارئین یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ کوئی گھڑی گھڑائی کہانی نہیں ہے۔

اب سنیے، مزید دل دھڑکانے والا قصہ، سو روپے کا نوٹ میری جیب میں تھا اور میرا دل اس اندیشے سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ میری تلاش میں پلیٹ فارم پر نہ آجائیں۔ مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ وہ جب حساب کتاب کریں گے اور ٹکٹوں کی فروخت کے حساب سے کیش میں سو روپیہ کم پائیں گے تو فوراً اُن کو میرا خیال آئے گا یا پھر وہی ملازم جس نے مجھے ٹکٹ دیے تھے، اُن کو بتادے گا کہ فلاں حلیے کا شخص سو روپے کی چکر بازی کر گیا ہے۔ اس طرح وہ مجھ تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ یہ صرف میرا وہم تھا جو مجھے بُری طرح ستا رہا تھا۔ لوگوں سے ہزاروں روپیہ بٹورنے والے بھلا سو روپے کے بارے میں کیوں سوچیں گے؟ اس طرف میرا خیال بھی نہ گیا تھا! بہر حال جرم تو پھر جرم ہے، پانچ روپے کا ہو یا پانچ سو روپے کا۔ آخر ٹرین آ ہی گئی۔ ٹرین آئی، لیکن پلیٹ فارم نمبر 1 کے قریب والی لائن پر نہیں آئی، بلکہ وہ دوسری لائن پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ پاکپتن سیکشن پر پلیٹ فارموں کے درمیان دو سے زیادہ لائنیں ہیں۔

اگر دو لائنیں ہوتیں تو لامحالہ ٹرین رائٹ لائن پر آتی۔ اس وقت بکنگ نظام کا دور نہیں تھا۔ جو مسافر جس سیٹ پر بیٹھ جاتا، وہ اسی کی ہوجاتی تھی، جونہی ٹرین رُکی، لوگ لائن میں اُتر گئے اور جلدی جلدی اپنا سامان اُٹھا کے ڈبوں کے دروازوں میں رکھنے لگے، تاکہ خالی سیٹوں پر قابض ہوسکیں۔ عبدالصمد قادری صاحب کے کہنے پر میں بھی لائن میں اُتر گیا اور جلدی جلدی سامان کے تگ اُٹھا کر ایک بوگی کے دروازے میں رکھنا شروع کردیے۔ بڑے صاحب کے آدمی بھی اس کام میں لگ گئے۔ بوگی میں سامان رکھ کے ابھی ہم نے سیٹوں پر قبضہ کیا ہی تھا کہ ٹرین چل پڑی۔ یہ میرے حق میں تھا، میں خوش ہوگیا کہ چلو خوف سے جان چھوٹی اب بھلا کون آ کے مجھے چلتی ٹرین میں دھمکائے گا کہ میاں سو روپے کا فراڈ کر کے کہاں چلے، لیکن یہ خوشی مجھے راس نہ آئی۔ آؤٹر یعنی آخری سگنل پر جا کے ٹرین رک گئی، وہ چند لمحے رُکی رہی، پھر ریورس گیئر لگ گیا اور وہ واپس پلیٹ فارم کی طرف جانے لگی، چلتے چلتے اب وہ پلیٹ فارم نمبر 1 والی لائن پر جا کے ٹھہر گئی، میں اس خیال سے گھبرا گیا کہ شاید ریلوے والوں کو میرے فراڈ کا علم ہوگیا ہے۔ اس لیے انہوں نے شاید اسٹیشن ماسٹر تک بات پہنچادی ہے کہ اس میں ایک فراڈی موجود ہے، جسے پکڑنا ہے۔ شاید اسی لیے ٹرین کو روک کر واپس لایا گیا ہے۔ اس خیال سے میری سٹی گم ہوگئی، حالاں کہ ایسی بات نہ تھی۔ ٹرین کا پاکپتن میں پونے گھنٹے کا اسٹاپ تھا، جو اس نے پہلی لائن پر کھڑے ہو کر پورا کرنا تھا، تاکہ تمام مسافر اس میں سوار ہوجائیں اور اُترنے والے مسافر جن میں بوڑھے، ضعیف اور خواتین، بچے شامل تھے، آسانی سے پلیٹ فارم پر اُتر جائیں۔

میں نے کھڑکی کا شٹر نیچے گرا دیا اور کونے میں دبک کر بیٹھ گیا تاکہ کوئی کھڑکی سے مجھے پہچان نہ لے۔ سو روپیہ تو باباجی نے مجھے دلوا دیا تھا، مگر مارے خوف کے میرا حال برا ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے پونا گھنٹہ پورا ہوا اور ٹرین چلی۔ جب ٹرین رفتار میں تیزی آگئی تو میں نے شٹر اوپر اٹھا دیا۔ پیچھے گرد ہی گرد اُڑ رہی تھی۔ پاکپتن کی عمارتیں پیچھے کو دوڑتی جارہی تھیں۔ آؤٹر سگنل کے قریب جو پھاٹک تھا، وہاں سے ٹرین گزری۔ دونوں طرف ٹریفک رُکی کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی سے سر نکالا اور پلیٹ فارم کی طرف نگاہ ڈالی جو نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ پاکپتن پیچھے ہوتا جارہا تھا۔ اب مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ میں خطرے سے باہر ہوں، ایک بات کا مجھے قلق تھا۔ میں سوچ رہا تھا، بے وقوف انسان تو نے سو روپے میں اپنی دعا کیوں ضائع کی۔ شنوائی کی گھڑی تھی اگر تو بابا فریدؒ سے اس گھڑی لاکھ روپے بھی مانگتا تو تجھے ملتے، افسوس کہ تو نے سو روپے میں اپنی قیمتی دعا ضائع کردی۔ مجھے بابا فریدؒ پر بڑا پیار آرہا تھا، جنہوں نے اپنے دیوانے کی دعا کو اللہ کے ہاں منظور کرا کے سو روپیہ دلوایا تھا۔ انسان کو اگر یہ علم ہوجائے کہ یہ دعا کی قبولیت کی گھڑی ہے تو وہ اپنے من کی مرادیں ایک ہی بار پالے۔

☆......☆

پڑوسی

گلِ رعنا

قومِ جنات کے پڑوس میں بسنے والے ایک گھرانے کی روحانی آپ بیتی، کراچی سے




مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ نئے گھر میں شفٹ ہوئے ہمیں دوسرا روز تھا کہ اگلے دن شب برأت آ گئی تھی۔ امی جان ہر مذہبی تہوار کو بہت اہتمام کے ساتھ منایا کرتی تھیں۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا۔ عبادت کا خصوصی اہتمام اور ساتھ میں حلوہ بنانے کی روایت۔ نئے گھر میں محلے کی کوئی جان پہچان نہ ہونے کے باوجود امی جان نے حلوہ بنا کر پلیٹ میں ڈالا اور اس پر کروشیا سے بنا خوب صورت رومال ڈال کر پلیٹ مجھے پکڑا دی کہ جا کر پڑوس میں دے آؤ۔ میں اور میرا اکلوتا چھوٹا بھائی جس کی عمر محض پانچ سال تھی۔ حلوہ دینے پڑوس کے گھر جا پہنچے۔

ماحول میں عجیب سا سناٹا تھا۔ مغرب کا جھٹ پٹا پھیلا ہوا تھا، فضا میں اگربتی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ پڑوس کا دروازہ بہت اونچا تھا۔ سیاہ لوہے کا بنا ہوا۔ دل پر عجیب سی ہیبت طاری کر رہا تھا اور میری عمر بھی اس وقت محض دس برس تھی۔ اس عمر میں ویسے بھی بچے جلدی ڈرتے، جلدی ہنستے، جلدی روتے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے میری دو تین بار کی زوردار دستک کے بعد دروازہ کھلا۔ میں جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بہت لمبا تھا۔ بڑے بڑے ہاتھ پیر۔ تنومند جسم۔ آدھا چہرہ سفید کپڑے سے چھپا ہوا۔ آدھے چہرے سے جھانکتی ایک آنکھ میں سرد مہری تھی، اجنبیت تھی۔

"السلام علیکم۔" میں نے امی جان کی ہدایت کے مطابق سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" آواز میں حلیے کے برعکس نرمی تھی۔

"جی...... یہ حلوہ۔ آج شب برأت ہے نا۔ تو امی نے......" میری بات کاٹ کر اس نے عجیب انداز میں ہنکارا بھرا اور پلیٹ میرے ہاتھ سے لے کر پیچھے ہٹا۔

"آؤ، اندر آ جاؤ۔"

"نہیں۔ امی جان نے گھر میں اندر جانے سے منع کیا ہے۔" میں نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

"اچھا۔" مجھے لگا آدھے چہرے سے جھانکتی آنکھ میں مسکراہٹ جاگ اٹھی ہو۔

"کیوں بھلا؟" اس کے سوال کے جواب میں میں نے صاف گوئی سے بتا دیا کہ امی جان کسی بھی اجنبی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتیں۔ وہ کہتی ہیں۔ "زمانہ بہت خراب ہے۔ لوگ بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ انہیں بیچ دیتے ہیں۔"

"اچھا...... مگر میں تو تمہارا پڑوسی ہوں۔ میں بھلا ایسے کیوں کرنے لگا۔" بھاری آواز میں نرماہٹ تھی، تحمل کی۔

"بس پتا نہیں۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"وہ مجھے زہرہ باجی اور جنید کو ہر وقت سمجھاتی رہتی ہیں کہ زمانہ بہت خراب ہے، پھر تمہارے ابو بھی نہیں ہیں۔ اس لیے ہر وقت محتاط رہا کرو۔"

"ابو کہاں ہیں تمہارے؟" پلیٹ کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

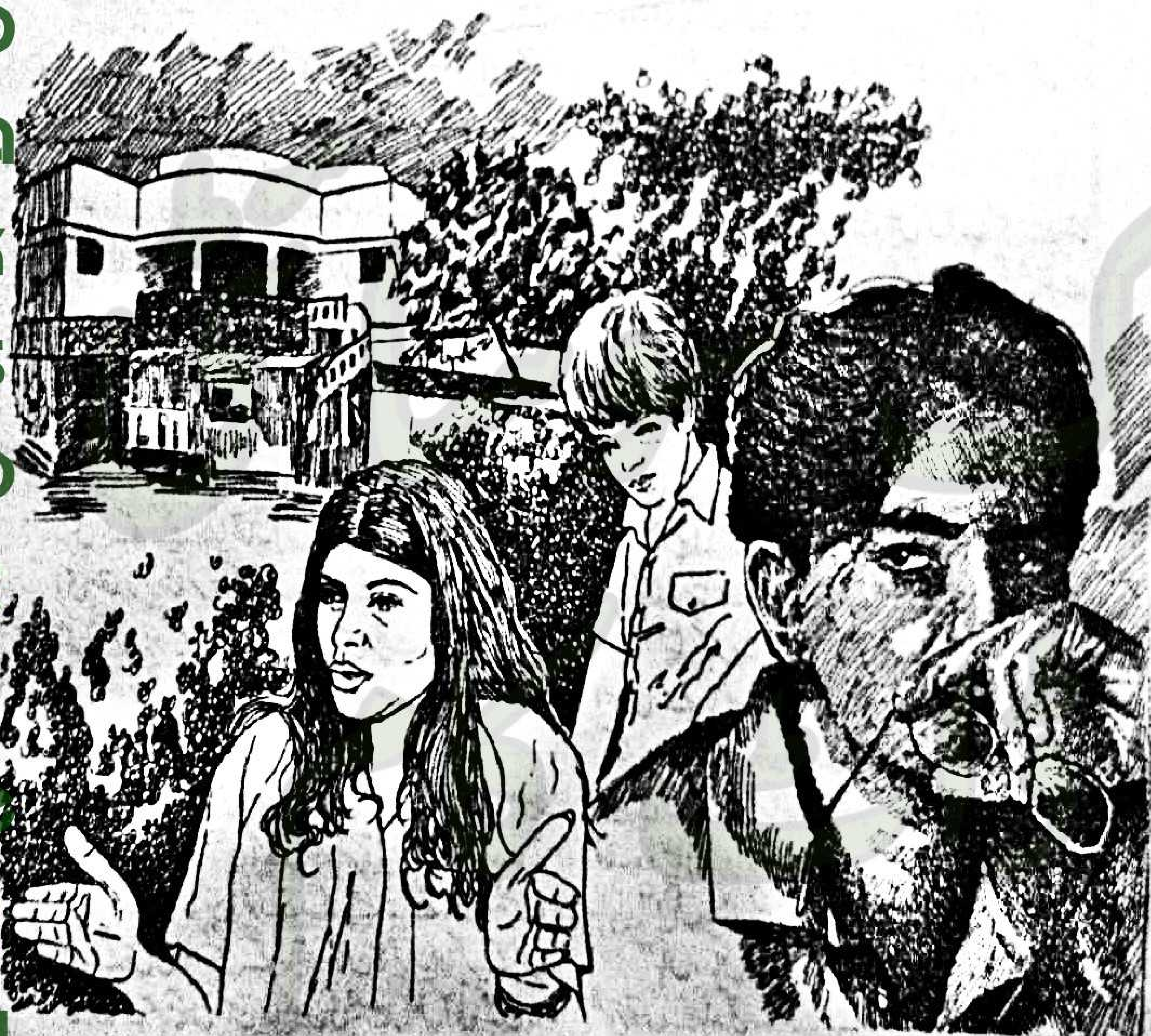
"اللہ میاں کے پاس۔" مجھے لگا۔ میرے جواب پر وہ ہلکا سا جھٹکا کھا گیا۔

"اللہ حافظ۔ پھر آنا۔" دعوت دے کر اس نے دروازہ بند کردیا۔ میں نے پلیٹ امی جان کو واپس کی تو وہ چونک اٹھیں۔

"تم نے رومال پر پرفیوم لگایا تھا۔ عائشہ؟؟"

"نہیں تو امی جان۔"

"اچھا...... مگر، اُف فوہ۔ اس پلیٹ سے بھی کیسی اچھی مہک آرہی ہے۔ لگتا ہے پڑوسیوں نے پرفیوم کا



"تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

"زہرہ باجی، میں اور جنید۔ اب پلیٹ خالی کرکے واپس کردیں، امی جان انتظار کررہی ہوں گی۔"

"اچھا...... اچھا۔" میری دلچسپی ختم ہوتے دیکھ کر اس نے ہاتھ پھیلایا لمحے بھر میں پلیٹ خالی ہوئی اور میرے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔ مجھے ایسا لگا، بس یا وہم سا ہوا۔ دس سال کی بچی کا دماغ کتنا چلتا ہے۔

"اچھا، انکل۔ اللہ حافظ۔"

اسپرے کردیا ہے۔"

"پتا نہیں۔" اس کے بعد میں دائیں طرف کے پڑوس میں حلوہ دینے گئی۔ وہاں ایک بے زار صورت بکھرے بالوں والی خاتون نے حلوہ وصول کرکے پلیٹ واپس تھمادی۔

شب برأت کا پندرہ روزہ ٹائم نکل گیا اور رمضان المبارک کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ نیک لوگ اللہ کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہوگئے۔ اب امی جان کا کافی

لوگوں سے محلے میں تعارف ہو چکا تھا۔ اچھے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ ملنا جلنا، غم خوشی میں شریک ہونا۔

بائیں طرف کے پڑوس میں سناٹا ہی رہتا۔ بس ایک کشش تھی اس گھر میں کہ وہاں شہتوت کا بہت بڑا درخت دیوار سے جھانکتا نظر آتا۔ کالے کالے شہتوتوں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا، مگر ایک بات عجیب تھی کہ محلے کے بچے بھی اس سے پھل توڑنے کی ہمت نہ کرتے۔

میں زہرہ باجی اور جنید اپنے کام سے کام رکھتے۔ اسکول جاتے، واپس آتے۔ امی جان بھی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ اسکول واپسی پر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔ کبھی کبھار ہم لوگ ماموں کی طرف چلے جاتے۔ امی جان اور ماموں جان بس دو ہی بھائی بہن تھے۔ ابو کی ناگہانی موت کے بعد ابو کے چار بھائیوں نے امی اور ہم بہن بھائیوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ ہم آبائی گھر جو دادا نے سب اولادوں جو کہ پانچ بیٹوں پر مشتمل تھی، کے لیے بنایا تھا۔ اس میں حصہ نہ مانگ بیٹھیں۔ امی مقدر پر شاکر ہو کر ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر میں منتقل ہو گئیں۔ ابو کی تھوڑی سی بچت کی رقم کو بینک میں محفوظ کر کے وہ خود ملازمت کرنے لگیں۔ یوں زندگی گزرنے لگی۔

اس دن بھی امی بہت پریشان تھیں۔ رمضان کا مہینا آ پہنچا تھا، مگر لگی بندھی آمدنی اور کمر توڑ مہنگائی کے زمانے میں رمضان کا راشن ڈلوانے کے پیسے نہ تھے۔ بجلی، گیس، پانی کے بل کی ادائیگی کے ساتھ مکان کا کرایہ ادا کر کے بس اتنا ہوتا کہ ہم تینوں بہن بھائیوں کی فیسیں نکل آتی تھیں۔

امی جان سوچ رہی تھیں کہ شام کے اوقات میں دو چار ٹیوشن بھی پکڑ لیں تاکہ ہاتھ میں کچھ زائد رقم آ جائے، مگر امی جان ایسی روایت پسند تھیں کہ رمضان میں افطاری کا اہتمام ضرور کرتیں۔ چاہے وہ چند پکوڑوں، کھجوروں اور شربت کے گلاس پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو اور وہ افطاری میں پڑوسیوں کو شریک کرنا بھی بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ اس روز بھی انہوں نے تھوڑی سی چنے کی چاٹ بنائی، پکوڑے بنائے، شربت کا ایک گلاس بنا کر بڑے اہتمام سے ٹرے سجائی۔ میں اور جنید بائیں طرف کے پڑوس میں افطاری دینے پہنچے۔ دستک دینے پر وہی صاحب باہر آئے۔ آج ان کے ہاتھ میں تسبیح بھی تھی۔ آدھا چہرہ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔

"ارے بچوں۔" وہ جھجکے۔ "اس دن کے بعد تو تم لوگوں نے شکل ہی نہیں دکھائی۔ بھائی تمہارا حلوہ تو لاجواب تھا۔ اب کیا لائے ہو؟ دکھاؤ، دکھاؤ۔" ان کی بے تابی پر میں ہنس پڑی۔

"انکل۔ امی نے افطاری بھیجی ہے اور شکل کیا دکھاتے، محلے والوں نے ڈرا ہی اتنا دیا تھا۔"

"کیا؟؟؟" وہ چونکے۔

"ہاں نا۔ محلے والے کہتے ہیں کہ آپ کسی سے ملنا ہی پسند نہیں کرتے۔ بچے آپ کے گھر میں لگے شہتوت پر پتھر ماریں تو جواب میں آپ اندر سے پتھر مارتے ہیں۔ گیٹ ہر وقت بند رکھتے ہیں۔ اندر سے اکثر لڑائی کی آواز آتی ہے۔" میں نے محلے داروں کی زبانی سنی ساری بات بتا دی۔

"اچھا۔" وہ حیران ہوئے۔ "مگر میں تو کبھی کسی بچے کو نہیں ستاتا۔ مجھے تو بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"پتا نہیں۔" میں نے ٹرے اندر بڑھائی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر لے لی اور وہیں کھڑے کھڑے ٹرے واپس کر دی۔ میں نے پلکیں جھپکیں۔ جنید کی طرف دیکھا۔ شہتوتوں سے درخت جھکا پڑا تھا۔ وہ للچائی آواز میں بولا۔

"انکل۔ میں تھوڑے سے شہتوت لے لوں؟"

"ہاں، ہاں، یہ لو۔" لمحے بھر میں ہماری ٹرے شہتوتوں سے لد گئی۔

"تھینک یو انکل۔" مجھ سے ٹرے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ہانپتے کانپتے گھر پہنچی۔ امی جان حیرت زدہ رہ گئیں۔

"تم نے درخت پر چڑھ کر توڑے شہتوت۔"

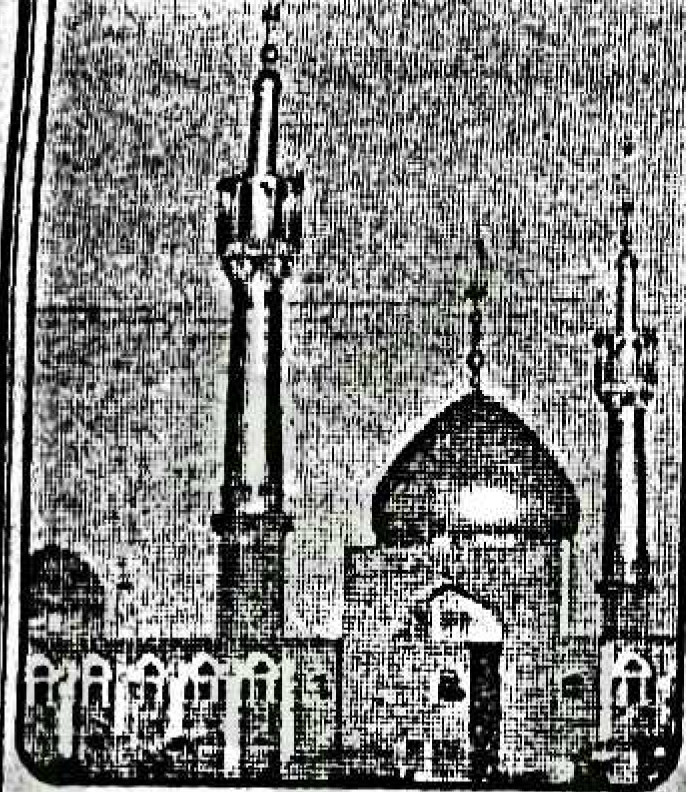
ان کے سوال پر میں کچھ کنفیوز ہوگئی۔

"نا نہیں امی جان، انکل نے..... مگر انکل تو وہیں کھڑے تھے۔ پھر شہتوت۔" میں نے امی جان کو بتایا۔

وہ حیران ہوئیں۔

امام خمینی





ایران میں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے خلاف احتجاجی تحریک نے 1979ء میں ایک انقلابی تحریک کا روپ دھار لیا۔ 16 جنوری 1979ء کو شہنشاہ ایران سے فرار ہو کر مصر گیا۔ یکم فروری 1979ء کو ایران کے ہر دلعزیز رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی، چودہ برس کی جرمنی جلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے۔ 30 مارچ 1979ء کو ریفرنڈم کے ذریعے عوام نے اسلامی نظام کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ 1979ء ہی میں ایرانی عوام نے ریفرنڈم کے ذریعے ایران کا نیا آئین بھی منظور کر لیا اور امام خمینی کو تاحیات اپنا قائد مان لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"ارے اندر سے کسی نے پہلے کے توڑے شہتوت دے دیے ہوں گے۔" زہرہ باجی نے مداخلت کی۔

"ہاں...... ایسا ہی ہوا ہوگا۔" امی جان مطمئن ہو گئیں، مگر مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

سارے محلے میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ کالے گیٹ والا گھر پراسرار لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ سوائے ایک لمبے چوڑے شخص کے کسی نے اس گھر میں کسی کی آمد و رفت نہیں دیکھی تھی، مگر گھر سے بہت آوازیں آتی تھیں لڑنے کی، رونے کی۔

ہمارے گھر کی دیوار پڑوس کے گھر کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ امی جان بہت خوف زدہ تھیں۔ نجانے کیسا پڑوس ملا تھا۔ آج کل دہشت گردی کا دور تھا، مگر سوائے باتوں کے کبھی کوئی غلط واقعہ نہیں ہوا تھا۔

ایک دن امی جان اسکول سے واپس آ رہی تھیں تو انہوں نے کالے گیٹ والے گھر سے ایک ڈاکٹر کو نکلتے دیکھا۔ گلے میں اسٹیتھو اسکوپ ڈالے سفید گاؤن پہنے وہ امی کے قریب سے گزرا تو امی جان نے ازراہِ ہمدردی پوچھ لیا۔

"خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحب، کس کی طبیعت خراب ہے؟"

"جی، وہ شمس صاحب کی طبیعت خراب ہے۔"

"کیا ہوا انہیں؟"

"بس بخار، نزلہ وغیرہ۔" امی نے نوٹ کیا۔ ڈاکٹر امی سے نگاہیں ملائے بنا بات کر رہا تھا۔

"اوہ تو۔ ان کے گھر والے، میرا مطلب؟"

"جی وہ سب گئے ہوئے ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا غائب ہو گیا۔

امی نے گھر آ کر ہم کو یہ بات بتائی۔

جلدی سے چائے بنائی، ساتھ میں پاپے رکھے اور ٹرے پکڑ کر مجھے اور جنید کو لے کر پڑوس کے دروازے پر پہنچیں۔

دستک کے جواب میں کوئی جواب نہ آیا۔ دوپہر کا سناٹا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں...... امی جان نے ہمت کر کے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے قدم اندر رکھا۔ صاف ستھرا آنگن، آنگن کے ساتھ ساتھ سرخ اینٹوں والی کیاریاں جس میں موسم

کے رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ جعفر والا برآمدہ، برآمدہ پار کیا تو سامنے کمرہ تھا۔ بیڈ پر شمس صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ رومال سے چہرہ ڈھانک رکھا تھا۔

''انکل، السلام علیکم۔'' میرے بولنے پر وہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔ رومال چہرے سے ڈھلک گیا۔

''اوہ، خدایا...... میں نے زندگی میں اتنا پُرنور...... اتنا حسین چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ امی بھی سکتہ زدہ کھڑی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے رومال چہرے پر لٹکا لیا۔

''بھائی صاحب...... ابھی آپ کے گھر سے ڈاکٹر کو نکلتے دیکھا تو......''

''آیئے آیئے میری بہن۔'' وہ کھڑے ہونے لگے، مگر لڑکھڑا سے گئے۔

''آپ! آپ آرام سے لیٹے رہیے۔ یہ میں آپ کے لیے چائے اور پاپے لائی ہوں۔ دوا کھالی آپ نے؟؟''

امی جان کے پوچھنے پر انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔ انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے چہرہ اوپر کیا تو ان کی نظر آنے والی آنکھ میں آنسو چمک رہا تھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ میری بہن۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور ہم لوگ کبھی اس شخص کو نہیں بھلاتے جس کا نمک کھالیں۔''

''ارے کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، بھائی صاحب۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ آپ میرے پڑوسی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آپ تنہا ہیں تو میں چائے بنا کر لے آئی۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ویسے اگر آپ بُرا نہ منائیں تو پوچھ سکتی ہوں۔ بھابی اور بچے کہاں ہیں؟''

انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

''ہمارے بچے نہیں ہیں اور آپ کی بھابی اپنے میکے میں ہیں۔ تنہائی کی وجہ سے تھوڑی سی بدمزاج ہوگئی ہیں۔''

''اچھا...... کبھی آئیں تو بتایئے گا، میں ان سے ملوں گی۔''

وہ چپ رہے۔ امی اور ہم واپس آگئے۔

شام کو امی عصر کی نماز کے بعد تسبیح کا ورد کررہی تھیں کہ لگا دروازے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دستک تھی کہ صور اسرافیل۔ ہم سب بھاگے، اس سے پہلے کہ دروازہ ٹوٹ جاتا، میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

''اچھا، تو وہ تم ہو فتنی۔ میرے پیچھے میرے میاں کو بہکانے والی۔ تمہاری شکل دیکھ کر اسے بچوں کی کمی کا احساس ستانے لگا۔'' لمبی چوڑی کرخت چہرے والی عورت نے میری کلائی دبوچ کر مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میں لوٹ پوٹ ہوگئی۔

''امی، امی۔'' میں روتی بلکتی امی کی طرف بھاگی۔

امی نے درودِ پاک کا وِرد مکمل کر کے میری اور اس عورت کی طرف پھونک ماری۔ اب کے جھٹکا کھانے کی باری اس کی تھی۔ وہ ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''السلام علیکم۔'' امی کی نرم وقار بھری آواز ابھری۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

''آؤ بہن، اندر آجاؤ، دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

وہ مرے مرے قدموں سے آگے بڑھ آئی۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا شکایت ہے تم کو میری بچی سے۔''

''یہ...... یہ روز روز تحفے لے کر میرے میاں کے پاس جاتی ہے۔ انہیں بچے بہت پسند ہیں۔ پہلے وہ میرے ہزار لڑنے جھگڑنے پر بھی بچوں کی محرومی کا طعنہ نہیں دیتے تھے، مگر اب ذرا سی لڑائی ہو تو فوراً کہتے ہیں کہ تم تو مجھے عائشہ جیسی ایک بیٹی بھی نہ دے سکیں۔ میں...... میں اس کو درخت پر ٹانگ دوں گی۔ اس کو دھواں بنا کر اُڑا دوں گی۔ تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ میں قومِ جنات میں سے ہوں، میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے تمہیں۔''

امی تحمل سے مسکرائیں۔

''آؤ بہن، میرے پاس آؤ۔ میں تمہاری بڑی بہن جیسی ہوں، یقیناً تم مسلمان ہو، کیوں کہ مسلمان ہی سلام کا جواب دیا کرتے ہیں۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی بہن ہوا کرتا ہے، خواہ وہ آگ سے بنا ہو یا خاک سے۔ عائشہ کا بھلا اس میں کیا قصور کہ وہ تمہارے

میاں کو اچھی لگتی ہے۔ ایسا کرو تم بھی غصہ تھوک دو اور عائشہ کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھو۔"

قوم جنات کا لفظ میرے سر سے تو سرسری سا گزرا، مگر زہرہ باجی نے لپک کر مجھے اپنے سے لپٹا لیا۔

"بس...... بس، زیادہ نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس لڑکی کو چھوڑوں گی نہیں۔" وہ عجیب سر پھری سی عورت تھی۔

"بہن...... میں تمہیں سمجھا رہی ہوں اور تم کو سمجھ نہیں آ رہی۔"

امی نرمی سے بولیں۔ "یہ بچہ ہے، تحفے میں نے بھیجے ہیں۔"

"اچھا...... تو پھر تم بھی سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے کہا اور ہاتھ میں پہنی چوڑی اُتار کر امی کی طرف پھینکی۔ امی نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح آگے کر دی۔ چوڑی ایسے پگھلی جیسے دھوپ میں رکھی برف پگھلتی ہے۔ "اب اگر میں نے جوابی کارروائی کی تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔" امی کے کہنے پر وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور امی کے قریب آنا چاہا۔ امی نے گلے میں پہنا تعویذ چٹکی میں پکڑ کے اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹی اور الٹی چلی گئی۔

"بہت شعبدے آتے ہیں تجھے، اب دیکھنا میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔" وہ پل بھر میں نظروں سے غائب ہو گئی۔

امی نے اللہ کا کلام پڑھ پڑھ کر گھر کا اور سب بچوں کا حصار کیا۔ رات بھر گھر کے صحن میں پتھر برستے رہے۔ دروازے کھڑکیاں بجتے رہے، جیسے باہر زبردست طوفان آیا ہو۔ ہم بچے بے حد خوف زدہ تھے۔

رات گزری، صبح کی پُرنور کرنوں نے رات کی ہیبت کا پردہ چاک کر دیا۔

اس روز نہ امی اسکول گئیں، نہ ہم بچے...... گھر سے نکلتے خوف آ رہا تھا۔

امی مسلسل ورد کر رہی تھیں۔ اب طوفان تھمنے کے بعد والی خاموشی تھی۔ شاید کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ۔

اچانک دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ امی نے ہمت کی۔ دروازہ کھولا تو سامنے شمس صاحب کھڑے تھے۔

"بہن...... میں۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے امی نے دروازہ کھول کر انہیں اندر بلا لیا۔

شمس صاحب کی زبانی پتا چلا کہ وہ خاتون شمس صاحب کی بیوی تھی۔ بچوں کی محرومی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا اور اپنے میاں کی زبانی عائشہ یعنی میری تعریف سُن سُن کر وہ حسد میں مبتلا ہو گئی تھی۔ خود ہی اس نے اپنے ہمارے ساتھ "معرکے" کی تفصیل بھی سنا دی تھی۔

شمس صاحب رات کو گھر پر نہیں تھے۔ صبح آئے تو صورت حال سے واقف ہوئے۔

انہوں نے دست بستہ ہو کر امی سے معافی مانگی، کیوں کہ وہ امی کو دل سے اپنی بہن مان چکے تھے۔

امی نے ان سے کہا کہ وہ ہرگز ان سے ناراض نہیں ہیں۔ ہاں اگر ہو سکے تو اپنی بیوی کا دل صاف کرنے کی کوشش کریں۔

وعدے کے مطابق وہ اپنی بیوی کو بھی لے کر آئے۔ اس نے اپنے رویے کی معافی بھی مانگ لی، مگر اس کے چہرے پر چھائی کرختگی اس کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

ایک عرصہ گزر گیا۔ ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ زہرہ باجی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن کر اپنا گھر بسانے چلی گئیں۔ جنید انجینئر بن کر امریکا سدھارا۔ امی کی عبادتیں مزید طویل ہو گئیں ہیں اور میں...... میں بھی پڑھ لکھ کر ٹیچر بن گئی ہوں۔ شہر کے بہترین اسکول میں پڑھاتی ہوں، مگر ایک تو...... میرا گھر نہ بس سکا۔ کسی نے آج تک مجھے پسند ہی نہیں کیا۔ لاکھ رشتے آئے، مگر شاید آسمان پر جوڑا ہی نہ بنا۔

شمس صاحب اسی گھر میں رہ گئے تھے۔ وہ مجھ سے بدستور محبت کرتے تھے اور ان کی بیوی بدستور نفرت۔ چکی کے یہ دو پاٹ ہمیشہ مجھے پیستے رہے۔ اب بھی کبھی میں دُکھی ہوں یا مالی تنگی کا شکار تو میری الماری میں دراز میں بچھے کاغذ کے نیچے ڈھیروں روپے نظر آنے لگتے ہیں اور ایک خوشبودار رومال۔ جس کے ایک کونے پر لکھا ہوتا ہے۔ "تمہارا شمس ماموں" یہ کیسی محبت ہے...... انہیں میری ہر حال میں خبر رہتی ہے۔

☆......☆





درِ توبہ کھلا ہے

مجید احمد جائی

گناہوں سے تائب ہونے والے ایک ڈاکو کی سرگزشت، ملتان سے

التوار کا دن تھا۔ ملتان کی سرزمین پر اولیاء اللہ کا عرس مبارک تھا۔ ایک عالم مجمع سے سحر انگیز خطاب فرما رہے تھے۔ حاضرین محفل ندامت سے سر جھکائے اشکوں کی برسات میں نہا رہے تھے۔ نعروں کی گونج سے فضا معطر تھی۔ ملتان کے وسط میں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کا مزار شریف ہے۔ اس اولیاء اللہ کے ہند و سندھ میں چرچے ہیں۔ پنجاب کے ساتھ ساتھ سندھ سے مریدین ننگے پاؤں ہر سال حاضری دیتے ہیں اور اپنی مرادیں اس اولیاء اللہ کے وسیلے سے پاتے ہیں۔

اس سال بھی اس عظیم ہستی کا عرس مبارک تھا۔ اتوار کا دن تھا، مجھے آفس سے چھٹی بھی تھی۔ میں عرس شریف میں شرکت کے لیے صبح ہی صبح تیار ہو کر گھر سے روانہ ہو گیا۔ موسم کے کیا کہنے۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سے رحمت کا نزول ہو رہا ہو۔ رحمت کے فرشتے جوق در جوق آ رہے ہوں۔ جہاں انسان کثیر تعداد میں شامل تھے، وہیں پر نوری فرشتے بھی اپنی اپنی حاضری لگوا رہے ہوں گے۔ عالم خطاب فرما رہے تھے۔ میں دبے پاؤں ندامت سے سر جھکائے محفل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ جہاں مجھے جگہ ملی، قریب ہی ایک خوبرو نوجوان بُراجمان تھا۔ میری نظریں جب اس کے چہرے کی طرف گئیں تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ارے اچھو...... اچھو اور یہاں'' بے اختیار میرے لبوں نے حرکت کی۔

اشرف، جسے زمانہ اچھو کے نام سے جانتا تھا، مکروہ دھندے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس نے اس کے سر کی بازی کروڑوں روپے لگائی ہوئی تھی۔ کتنے قتل کر چکا تھا، کوئی گنتی نہیں تھی۔ ہر طرف اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ کتنی سہاگنیں اس نے بیوہ کی تھیں۔ کتنی ماؤں کے لختِ جگر اس نے موت کے گھاٹ اتارے تھے۔ وہ کالج جاتی بے شمار نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر چکا تھا۔

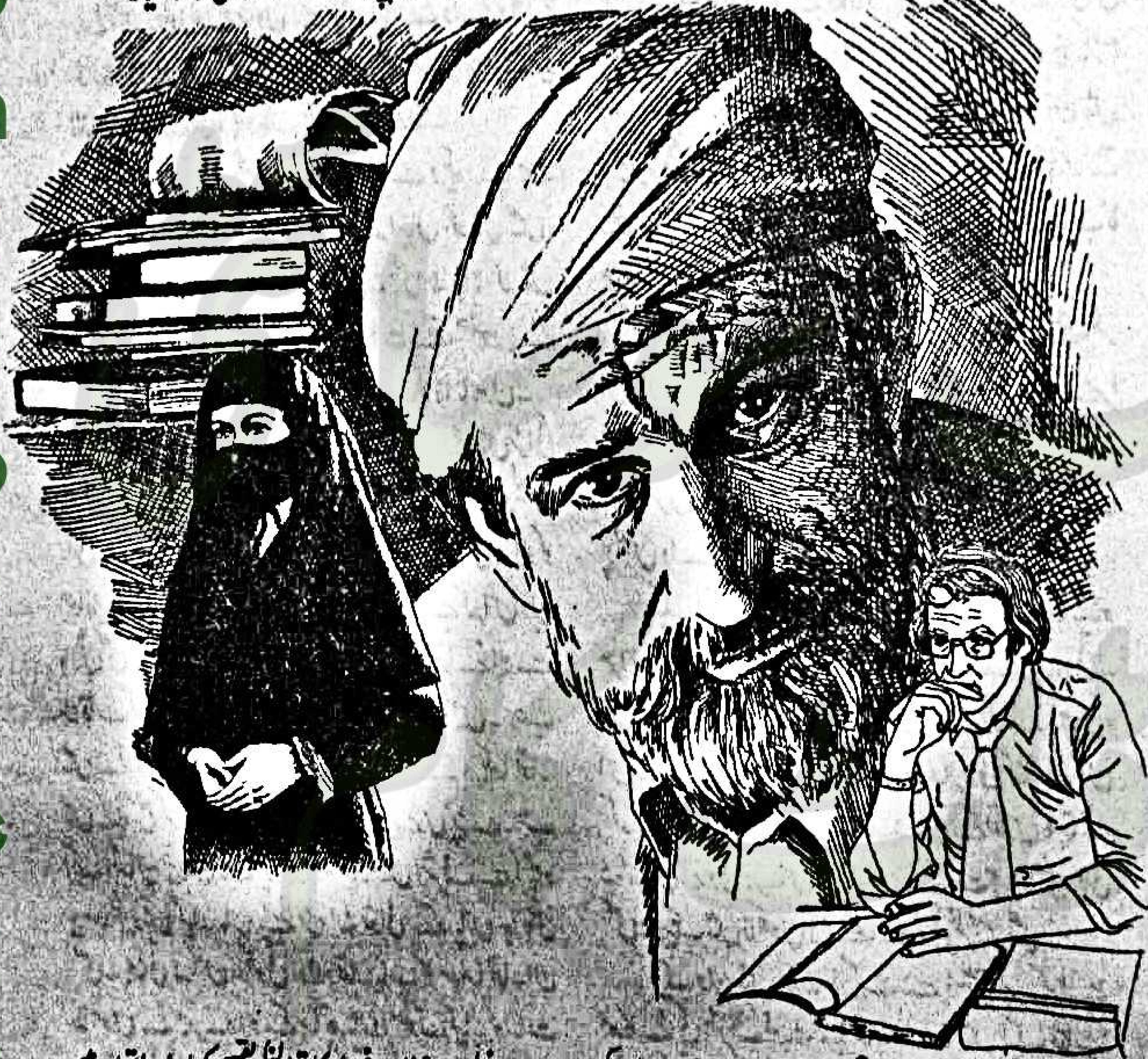
میرے ذہن میں اچھو کے گناہوں کی لمبی فہرست بنتی چلی گئی۔ میں حیران تھا، سوچوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ اچھو میرے ہی علاقے کا تھا۔ میرے گھر سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی ایکڑوں اراضی پر مشتمل کوٹھی تھی۔ جس میں ہر وقت شراب اور شباب کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اہل علاقہ نہ صرف ان سے تنگ تھے، بلکہ نجات کے لیے رب تعالیٰ سے بدست دعا تھے۔

کہتے ہیں دعائیں عرشِ معلیٰ تک ہلا دیتی ہیں۔ اچھو کی اس پاک محفل میں شرکت انہی دعاؤں کا اثر تھی۔ زمانے بھر کا بدمعاش پاک محفل میں شامل تھا۔ ایک خیال آیا کہ کہیں تخریب کاری کا ارادہ نہ رکھتا ہو، لیکن ایسی محفلوں کی حفاظت

کے لیے تو فرشتے مامور ہوتے ہیں، پھر یہاں دہشت گردی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے سوچ کا نیا پہلو کھلا، لیکن اندر جو جنگ جاری تھی، وہ کسی صورت ختم نہیں رہی تھی۔ میں معاملے کی تہ میں جانا چاہتا تھا۔ ساتھ بیٹھے ایک شخص کو اپنی جگہ بٹھایا اور میں سرکتا ہوا اس شخص کی جگہ پر پہنچ گیا۔ میرے اور اچھو کی درمیان صرف ایک ہی شخص حائل تھا۔ میں سرکتے سرکتے اچھو کے پہلو میں پہنچ چکا تھا، مگر اچھو

ہے۔ دل پر لگی کالک آنسوؤں سے دھل رہی تھی۔

میں اچھو کو پانچ سال بعد دیکھ رہا تھا، کیوں کہ اچھو کسی پولیس افسر کو قتل کرکے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا تھا۔ پولیس اس کو ڈھونڈ رہی تھی، لیکن آج یوں اچانک میری نظروں کے سامنے آنا کرشمے سے کم نہیں تھا۔ جب میں اچھو کو پہچان چکا تھا تو ہزاروں کی تعداد میں پولیس والے کیوں نہیں پہچان سکے تھے۔ سوال الجھتا گیا۔



کو خبر تک نہیں تھی۔ اچھو اردگرد سے بے نیاز اپنی دُنیا میں گم تھا۔ من میں چھپے شخص نے مجھے آواز دی۔

کمال اچھا موقع ہے۔ پولیس کو فون کرکے اسے پکڑوا دو، فریضہ بھی ہے اور تمہیں انعام بھی مل جائے گا، لیکن دل کہہ رہا تھا، نہیں کمال ایسا ہرگز نہ کرنا، دل اور ضمیر کی جنگ جاری تھی۔ میں نے ایک نظر اچھو کی طرف ڈالی آنسو اس کے رخساروں کو چومتے ہوئے زمیں بوس ہو رہے تھے۔ رخساروں پر بنی آنسوؤں کی لکیریں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ دل سے زنگ اتر رہا ہے۔ دل صاف ہو رہا

خطیب خطاب فرما چکا تھا، لنگر تقسیم کیا جا رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اچھو کو بازوؤں سے پکڑا۔ بازو پر ہاتھ رکھتے ہی اچھو میری طرف متوجہ ہوا۔

”ارے کمال آپ...... آ...... آپ کب آئے۔“

اچھو ہمدردانہ لہجے سے مخاطب تھا۔

”ہاں مگر...... آ...... آپ اور یہاں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”ہاں، کیا مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”نہیں...... نہیں۔“ ابھی میں کچھ بول نہیں پایا کہ

اچھو مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں کمال مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کئی گھر اجاڑ دیے۔ عزت دار لوگوں کی عزتیں تار تار کیں۔ مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ میں اس قابل کہاں تھا کہ پاک محفلوں میں میرے ناپاک قدم ہوتے، مگر...... مگر اس عظیم ہستی نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ مجھے حیوان سے انسان بنا دیا۔ شرابی سے نمازی بنا دیا۔ شراب خانے سے اٹھوا کر عبادت خانے لے آیا۔ بہنوں کے سروں سے چادر اتارنے والے کو ان کا محافظ بنا دیا۔ ہاں مجھے انسان بنا دیا۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہی اچھو بلک بلک کر رونے لگا۔

"کمال آپ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہو۔ میں بدمعاش تھا، برا تھا، زمانے بھر کی برائیاں مجھ میں تھیں، مگر...... آپ کے ساتھ ساتھ دُنیا نے بھی نہ جانا کہ میں اشرف سے اچھو کیسے بنا۔ ایسے کیا محرکات تھے، جنہوں نے ایک انسان کو حیوان بنا دیا تھا۔ آج میں آپ کو بتاتا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری برادری میں لڑائی ہوئی تھی۔ سب الزام میرے پاپا پر لگا دیے گئے۔ پولیس آئی، اس نے حقائق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ابو کو حوالات میں بند کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن بارش تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں تھانے ابو سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ میری نظریں پتھرا سی گئیں۔ جب میں نے ابو کو بے دردی سے مار کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے منع کرنا چاہا تو پولیس والے مجھ پر برس پڑے۔ تب ایک انسان حیوان بننے پر مجبور ہو گیا۔ میں اشرف سے اچھو بدمعاش بن گیا۔ ماں پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے پاس جا چکی تھی۔ بھائی نہ بہن، اکلوتی اولاد تھا۔ باپ کا سہارا تھا۔ ان ظالموں نے میرے ابو کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ حوالات سے تو رہائی مل ہی گئی، مگر وہ زندگی کی رنگینیوں میں نہ لوٹ سکے۔ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک دن وہ اسپتال میں مجھے روتا، چیختا، چلاتا چھوڑ گئے۔ ابو کے جانے کے بعد میرا کوئی نہیں تھا۔ میں لوفر بن گیا۔ بدمعاش بن گیا۔ لوہا گرم تھا، بس چوٹ لگنی باقی تھی۔ مجھے ایک گروپ ایسا ملا، جو مکروہ دھندے میں اپنا مقام رکھتا تھا۔

اس پولیس والے کا چہرہ میری آنکھوں کی اسکرین پر پیوست ہو گیا تھا۔ بدلے کی آگ مجھے لمحہ لمحہ جلاتی رہی تھی۔ میں چور، ڈاکو بن گیا تھا۔ دودھ پینے والا بچہ شراب پینے پر مجبور ہو گیا۔ شراب کے نشے نے مجھے انسانیت سے بہت دور کر دیا۔ جب میں شراب پی لیتا تو مجھے سکون ملتا۔ اپنی ذات کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

میرے دن، رات اسی طرح گزرتے رہے تھے۔ میں نے بینک بھی لوٹے۔ امیر، جاگیردار سب کو لوٹا، حتیٰ کہ عالی شان محل تعمیر کروا لیے۔ اونچی اونچی عمارتیں بنا لیں۔ میں اس گروپ کا سردار بن گیا۔ میرے حکم کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مارتی تھی۔ آئے روز ڈکیتی کرتے ہم امیروں کی اولادیں اغوا کرنے لگے۔ اغوا کاری کا سلسلہ عروج پکڑتا گیا۔ ہم اسکولوں سے لڑکیاں اغوا کرنے لگے۔ ان میں ضمیر فروش اساتذہ کو بھی شامل کر لیا تھا، جو ہماری مدد کرتے تھے۔ دن کو لوگوں کو لوٹتے تھے اور شام کو شراب اور شباب کا مزہ لیتے تھے۔ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

میں نے اونچے اونچے محل تعمیر تو کروا لیے تھے، مگر ان میں رہائش نہیں رکھتا تھا۔ کوئی نہیں جان پایا تھا کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہوتا ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ میرے آدمیوں نے اس پولیس والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ایک انسان، دوسرے انسانوں کو قتل کرنے لگا۔ جو مزاحمت کرتا، دوسرے لمحے گولی اس کے سینے کے پار ہوتی۔ میں حیوان تھا، مجھے کوئی غرض نہیں تھی کہ جس کو مار رہا ہوں، اس کے بچے ہوں گے۔ اس کے خاندان کی کفالت کون کرے گا؟ میں کمینگی پر اتر آیا تھا۔ نہ ماں کے تقدس کا پتا تھا، نہ بہن کی آبرو کی خبر۔ اس طرح میں نے بہت سی اراضی بنا لی تھی۔ بینک میں لاکھوں جمع تھے، مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔

ایک دن میں ایک مارکیٹ سے ڈکیتی کر کے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ راستے میں ایک نقاب پوش لڑکی نظر آئی، جس کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں، پھر کیا تھا، شیطانیت زور پکڑ گئی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی اس کے آگے روکنے کو کہا۔ ڈرائیور نے میرا حکم مانا اور دوسرے ہی لمحے گاڑی لڑکی کے آگے رکی تھی۔ میرے کارندوں نے پلک جھپکتے ہی اسے گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکی کو اٹھاتے ہی گاڑی اسپیڈ پکڑ گئی۔ ہم شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ تھوڑی مسافت کے بعد ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ لڑکی کو کارندوں نے کمرے میں بند کر دیا۔ اب رات کا انتظار تھا۔ جیسے ہی رات نے اپنے پر پھیلائے

ہماری محفل سج جاتی، پھر شراب اور شباب کے مزے اڑاتے۔ اپنے خاص دوستوں کو دعوت دے دی تھی۔ شام ہوگئی تھی، مگر میرے دوست ابھی تک نہیں آئے تھے۔ مجھے جلدی تھی۔ میں لڑکی کو نوچنا چاہتا تھا، لیکن دوست نجانے کہاں مر گئے تھے۔ رابطہ کیا تو وہ شہر میں رکے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی نکالی اور ان کی طرف چل پڑا۔ گاڑی کی اسپیڈ تیز ہوتی گئی، ایسا لگتا تھا جیسے ہوا میں اڑ رہی ہو۔ اچانک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی الٹ گئی۔ میں بُری طرح زخمی ہو گیا تھا، گاڑی کے اندر ہی دوستوں کو کال کر کے آگاہ کیا۔ ابھی موبائل میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ میرے دوست میرے اردگرد جمع تھے۔ اسپتال ہمارا اپنا ہی تھا۔ رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ دوستوں کو آرام کرنے کو کہا۔ تمام دوست ساتھ والے روم میں سونے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر میں مجھے بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ نیند کا آنا تھا کہ میری کایا پلٹ گئی۔ میری کھوٹی قسمت ہری ہوگئی۔ میں حیوان سے پھر سے انسان بن گیا۔ اس رات نیند کا آنا تھا کہ میرے خواب میں ایک سفید پوش، سفید داڑھی والے بزرگ آئے۔ میری عیادت کی اور کہا۔ "بیٹا......اس راستے سے واپس آجاؤ۔ یہ راستہ تمہیں جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ امتِ محمدی کا کوئی فرد جہنم کی آگ میں جلے۔ جس لڑکی کو تم اغوا کر کے لے گئے ہو، وہ حافظِ قرآن ہے اور میری مریدنی ہے۔ تم اسپتال میں پڑے ہو اور وہ کمرے میں تلاوتِ قرآن مجید کر رہی ہے۔ جس کے سینے میں قرآن سمایا ہو، اس کا حامی خدا ہوتا ہے۔ میرے خدا نے ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ بس تم توبہ کر لو اور رب کی رحمت کے طلب گار بن جاؤ۔ بہت ہو گئے گناہ بیٹا اور اس راستے کی طرف پلٹ آؤ، جس راستے پر اللہ تعالیٰ انعام و کرام سے نوازتا ہے۔"

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرے دل میں نور ہی نور تھا۔ اسپتال کے بستر سے اٹھتے ہی میں تمام برائیاں چھوڑ چکا تھا۔

اس بزرگ نے میری زندگی بدل دی۔ میں نے سچی توبہ کر لی۔ دوست حیران ہوئے تو ان کو تمام واقعہ گوش گزار کیا۔ میرے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی توبہ کر لی۔

میری زندگی میں بہار لانے والے، کمینے کو انسان بنانے والے کوئی اور نہیں یہی بزرگ تھے، جن کے عرس پر میں اور آپ شریک ہیں۔ بہاؤالدین زکریاؒ نے میری کایا پلٹ دی۔ وہ لڑکی میری بیوی کے روپ میں میرے آنگن کو سجائے ہوئے ہے۔ اسی بزرگ کے وسیلے سے میری شادی اس مہ جبیں سے ہوگئی۔ آج میں خوش حال زندگی گزار رہا ہوں۔

کمال آپ سوچ رہے ہوں گے، پولیس کو میں مطلوب تھا، لاکھوں روپے میرے سر کی قیمت لگی ہوئی تھی۔ درجنوں کیس چل رہے تھے ان کا کیا بنا؟ میرے بھائی، جب انسان سچائی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے تو غفور الرحیم اس کا مددگار ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنا نام اور حلیہ تبدیل کر لیا۔ میں اچھو سے شریف الدین بن گیا۔ تھانے میں میرے خلاف کوئی مقدمہ، کوئی پرچہ نہیں رہا، کیوں کہ جو اچھو کے خلاف پرچے تھے، اسی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ میرا ہم شکل شخص جو میرے ہی ساتھ کام کرتا تھا، اسی دن اپنے گھر سے میرے پاس آرہا تھا کہ راستے میں پولیس سے مزاحمت ہوگئی۔ ایک گولی اس کا سینہ چھلنی کرتی چلی گئی۔ پولیس اچھو کو مارنے میں کامیاب ہوگئی اور یوں میرے خلاف تمام مقدمے، پرچے ختم ہو گئے۔ اب آپ کے سامنے، اچھو نہیں، شریف الدین بیٹھا ہے۔ شریف الدین، غریبوں کا ہم نوا، مسکینوں کا مددگار، بہنوں کی عزتوں کا محافظ، سب کا خیر خواہ بنا ہوا ہے۔

شریف الدین، جسے میں اشرف کے نام سے جانتا تھا، اپنی بات مکمل کر چکا تھا اور میں رب کے حضور سر بہ سجود تھا۔ بے شک توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ذات معاف کرنے والی ہے، کیوں نہ ہم توبہ کر کے دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہو جائیں۔ جس بزرگ کے در پر آج ہم بیٹھے ہیں، انہی کے وسیلے سے ہماری آخرت سنور سکتی ہے۔ بس نگاہِ کرم ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی توفیق عطا کرے اور شریف الدین کی طرح ہمیں بھی رہبر مل جائے۔ آمین

☆......☆

شانِ مولا!

صدف آصف

کراچی سے ایک ایسی عورت کی کہانی جس نے دنیا ہی میں اپنے لیے احتساب کا راستہ چُن لیا

"یا اللہ ......مدد......" نوشابہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... ٹرک کا ایک بڑا سا ٹائر اس کے ہاتھوں پر تھا، ایسا لگا کہ آخری وقت قریب ہو، دم نکلنے لگا، سانسیں اٹکنے سی لگیں۔ چہرے کا ایک حصہ جو تپتی سڑک سے لگا ہوا تھا، جھلس سا گیا۔ پسینے سے تر بتر تھی یا اپنے ہی خون میں نہائی ہوئی تھی۔ اس کا وجود شعور اور لاشعور کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا۔

جائے حادثہ پر لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں کانوں میں پڑنے لگیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ درد کی لہر نے وجود کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ اتنی بے بس تو وہ زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی۔ لوگ اس پر جھکے ہوئے تھے۔ کوئی اظہار افسوس کر رہا تھا، تو کوئی اس بس کو پھونکنے کی صلاح دے رہا تھا جس سے اس کی شاندار گاڑی ٹکرائی تھی۔ اس کا ڈرائیور تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنی گاڑی کا ایسا برا حال دیکھ کر زمین آسمان ایک کر دیتی، لیکن اس وقت جو اس کا حال تھا، اس سے برا شاید ہی کچھ اور ہو سکتا تھا۔

"بڑا برا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، خاتون کے بچنے کی امید کم ہی لگ رہی ہے" کسی کونے سے ایک آدمی نے اظہار افسوس کیا۔ سب زبانی ہمدردی میں مصروف تھے، عملی قدم اٹھانے سے سب بچتا چاہ رہے تھے۔

"ارے کوئی پولیس کو فون کرو، ایدھی والوں کو بلاؤ۔ بیچاری کو اسپتال لے جایا جا سکے" ایک ہمدرد باپردہ عورت اندھیرے میں روشنی کی کرن بنی بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھی۔ جھک کر اس کو سہارا دیتے ہوئے چلائی۔ اس نے نوشابہ کے منہ پر کہیں سے پانی لا کر چھینٹے مارتے ہوئے لوگوں سے بار بار مدد کی التجا کی۔ اتنے بڑے ہجوم میں سارے لوگ تماشا بین تھے ہمدرد نہیں۔

نوشابہ جیسی عورت جس نے ساری عمر لوگوں کا تماشہ بنایا وہ کبھی اپنی ایسی بری حالت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، پر آج نوشابہ کے سارے احساسات جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی ذات سے ہٹ کر سوچا۔ وہ سارے منظر نگاہوں میں گھومنے لگے، جو اس نے لوگوں کے ساتھ روا رکھے۔ یوں زمین پر بے کسی کی حالت میں پڑے پڑے، اسے بہت سے ایسے لوگوں کی یاد دلا دی، جنھیں اس کی زور آوری نے بے کس کیا۔ رخ موڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ فٹ پاتھ ایک بچے سے آئینے میں ڈھل گیا، جس میں اسے اپنا ماضی بہتے

طمطراق سے دکھائی دیا۔

"چل بڑھیا! جینا حرام کر رکھا ہے۔ ہر وقت کی نصیحتیں، روک ٹوک۔ بڑا زعم ہے تجھے اپنے گھر پر نہ اب بیٹھ کر چاٹتی رہنا اور تم کیا کھڑے کھڑے منہ تک رہے ہو جلدی سے سامان لوڈ کرواؤ نا" نوشابہ کی بوڑھی ساس اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی رہ گئی، پر وہ شوہر کو لے کر الگ ہوگئی۔ سوزوکی میں بیٹھتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے مڑ کر نجمہ خاتون کو دیکھا، جو اپنے بیٹے ممتاز علی پر بڑی نازاں تھیں۔ وہ آج بیوی کے پلو سے جڑا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نجمہ خاتون دہلیز تھامے بلکتی رہ گئیں۔

"یہ میں ہوں اتنی بدصورت عورت" نوشابہ جس کے حسن کے قصیدے زمانہ پڑھتا تھا، جس کے زور پر وہ ممتاز علی کو انگلیوں پر نچاتی۔ ماضی کے آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی، آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ اچانک منظر بدل گیا۔

"خالہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ارشد بھائی سے صرف حساب کا یہ سوال پوچھنے آئی تھی" پرانے محلے کی پڑوسن جمیلہ کی بیٹی بیلا رو رو کر اس کے ہاتھ پاؤں جوڑ رہی تھی، مگر وہ گلی میں اس کا تماشا لگانے سے باز نہ آئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ نوشابہ نے بیٹے کے منع کرنے کے باوجود اس پر جھوٹا بہتان تھوپ دیا۔

"آخ..... تھو..... بڑی آئی تھی مجھے وعظ کرنے والی پہلے اپنی بیٹی کو تو سنبھال۔" اس نے استانی جمیلہ کے دروازے پر تھوکتے ہوئے نفرت سے کہا۔ جو ہمیشہ اس کی سچ جھوٹ کی عادت اور محلے کی عورتوں کی غیبت کرنے پر سمجھانے بیٹھ جاتی۔ آج نوشابہ نے اس کی بیٹی پر الزام دھرنے کے ساتھ اپنا بدلہ بھی لے لیا۔ اسے جمیلہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آہ بھرتی نظر آئی۔ نوشابہ کا دل ڈولا۔

"اے ...... چھوٹی بہو! اگر اس دفعہ بیٹا نہ ہوا تو اسپتال سے سیدھے اپنے باوا کے گھر چلی جانا، لوٹ کر یہاں نہ آنا۔" نوشابہ کے چہرے پر پھیلی رعونت کا جواب نہیں تھا۔ سامنے کھڑی اس کی حاملہ بہو حمیرا اس کے جلال پر تھر تھر کانپنے لگی۔ نوشابہ کو اپنے آپ سے



کراہیت محسوس ہوئی۔ بہو سجدے میں گری بیٹے کے لیے دعائیں مانگتی بڑی مجبور دکھائی دی۔ نوشابہ کا بس نہیں چل رہا تھا، وقت کی چرخی کو الٹا چلا کر اپنے سارے برے کرم اس میں سے صاف کر ڈالے۔

''تائی اماں! یتیموں کا مال تم کو ہضم نہ ہوگا۔ یاد رکھنا تمہاری قبر میں کیڑے پڑیں گے۔ دنیا والے نہ سہی، خالق کائنات ہمارے ساتھ ہے۔'' اس کے مرحوم دیور کا بیٹا بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ نوشابہ نے مرنے سے پہلے بڑی چالاکی سے کاغذات پر انگوٹھا لگوا کر دیور کا مکان اور دکان اپنے نام کروالی۔ پولیس کو پیسے کھلا کر جب وہ ان سب کو بے دخل کروانے گئی تو فراز چیخ چیخ کر اسے کوسنے لگا، مگر اس کے پتھر دل پر کیا اثر ہوتا۔ وہ فخر سے سر اٹھا کر اپنی قیمتی گاڑی میں واپسی کے لیے سوار ہوئی۔

باہر بہت گرمی تھی۔ گاڑی میں اے سی کی خنکی نے اسے بڑا سکون پہنچایا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں......کہ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ اچانک نشے کی حالت میں بس چلانے والے نے اس کی شاندار گاڑی کو اس برے طریقے سے ٹکر ماردی۔ وہ کھڑکی سے نکل کر چلتی ہوئے روڈ پر جا گری۔ سامنے سے آنے والا ٹرک بے قابو ہو کر اس کے ہاتھ پر چڑھ گیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا نہ، جس کے اشارے پر وہ ساری دنیا کو نچاتی تھی۔

''آہ......آہ......'' اس کے منہ سے کراہیں جاری تھیں پر یہ جسمانی تکلیف سے زیادہ روحانی اذیت کے باعث تھیں، دل تھر تھرانے لگا۔ اسے لگا اب آخری وقت سر پر آ کھڑا ہوا ہے۔

''یا اللہ میری ساری عمر کی پونجی میں برے اعمال کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ میرے تو دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ میں کس منہ سے تیرا سامنا کروں گی۔'' اپنی پچاس سالہ زندگی میں اس نے گنتی کی نمازیں پڑھی ہوں گی۔ روزے رکھنے سے اسے اختلاج ہونے لگتا، زکوٰۃ دینے کی وہ قائل نہ تھی۔ صلہ رحمی پر اسے یقین نہ تھا۔ دامن میں تو غیبت، ناانصافی، بدزبانی اور بداخلاقی کے سانپ بچھو بھرے پڑے تھے، جو آج اس کے وجود پر رینگتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے وجود سے نفرت کرنے لگی۔

''میرے خالق کا کتنی بار بلاوا آیا، ''حی علی الفلاح'' کی شیرینی دل تک پہنچنے نہ پائی۔'' نوشابہ کو پچھتاوے کے ناگ ڈسنے لگے، اس کے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایکسیڈنٹ ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے، لیکن اسے لگا وہ پانچ صدیوں کا سفر کر آئی ہو۔

''بہن کلمہ پڑھو۔ استغفار کرو۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے تمہاری تکلیف میں کمی واقع ہوگی۔ اس مصیبت سے نجات ملے گی۔'' ہمدرد عورت نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور کان میں بولنے لگی۔ نوشابہ نے کوشش کی مگر اسے لگا کے ذہن کی سلیٹ سے کلمہ مٹنے سا لگا تھا۔ استغفار منہ سے نکل ہی نہیں پایا۔ الفاظ قابو میں نہیں آپا رہے تھے۔ وہ دنیا کی پجارن تھی۔ ساری زندگی خودغرضی میں گزاری۔ اپنے فائدے کے لیے سامنے والے کا گلا کاٹنے سے بھی باز نہ آئی۔ ساری زندگی لوگوں کے حقوق غصب کیے۔ دنیا کے مکروفریب میں جکڑی عورت کے لیے بھلا کہاں کا دین؟ اور کہاں کی عبادت؟......وہ تو خود اپنی تقدیر لکھنے پر تلی بیٹھی تھی۔ پر آج کیا ہوا؟ جیسے اس کے سارے پر کٹ گئے۔ وہ بادلوں پر تیرنے والی زمین پر اتر آئی تو، ان لوگوں کے دکھ قریب سے نظر آئے جن کا دل دکھاتے ہوئے اس سے لمحے بھر کی چوک نہ ہوئی۔

نوشابہ نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر وہ جو بڑی آن و بان سے سر اٹھا کر فخر سے چلتی ہے۔ کبھی ایسے بے یارومددگار پڑی مٹی چاٹ رہی ہوگی۔

''چلو بہن میرے ساتھ پڑھو ''استغفر اللہ'' اے اللہ میں اس وقت اور آئندہ ساری زندگی تیرے عفو و درگزر کی طلب گار ہوں۔'' ہمدرد عورت اس کی تکلیف پر بے چین ہو کر خود ہی پڑھنے لگی۔ اس کے خشک لب بھی دہرانے لگے۔ اس عورت نے کئی دعائیں خود بھی پڑھیں اور اسے بھی پڑھوائیں۔ اچانک تپتی جلتی سڑک اس کے لیے نرم گرم بستر بن گئی، ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی، بے قراروں کو قرار حاصل ہو گیا، آنکھوں سے ندامت کے آنسو جاری ہوئے۔ وہ بھکتی چلی گئی۔

ایمبولینس آچکی تھی، اسے اسپتال لے جایا جانے

لگا۔ سر پر لگنے والی چوٹ سے بہت خون بہ چکا تھا۔ کمزوری سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔

☆......☆

انسان کا جسم ایک مکان سا ہوتا ہے۔ روح کی اچھائیاں ہی اس میں روشنی پھیلاتی ہیں۔ نیکیاں بطور ایندھن، ہماری زندگی کو اجالا فراہم کرتی ہیں جبکہ منفی سرگرمیاں روح کو اندھیروں کے عمیق گڑھوں میں دھکیل دیتی ہے۔ جہاں جانے کے بعد واپسی اتنی آسان نہیں رہتی۔'' نوشابہ کے کانوں میں جمیلہ کے الفاظ گونج تھے، وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ یاد ماضی واقعی اس کے لیے عذاب بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کو برائی کے اندھیروں کے ساتھ پروان چڑھایا۔ ہمیشہ لوگوں کا حق مارا، شوہر کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ بوڑھی ساس کی خدمت تو ایک طرف، بیٹے کو بھی ملنے نہ دیتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اپنے دو بیٹوں کو شادی کی تو لڑکی والوں کو فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ تھمادی۔ ہمیشہ بہوؤں پر سختی رکھی، پاس پڑوس والوں کو اپنی زبان سے ایذا پہنچائی۔ پر قدرت اسے توبہ کا ایک موقع فراہم کیا۔ ایک واقعے نے جیسے اس کی زندگی کی کایا بدل کر رکھ دی۔

''اللہ جی! میری دادی اماں کو صحت عطا کردیں۔'' اپنی پوتیوں کی معصوم چہچہاہٹ پر اس کی آنکھیں کھلیں سامنے ہی اس کے بچے، شوہر اور عزیز رشتے دار فکرمند کھڑے تھے۔ وہ پوتیاں جنہیں اس نے کبھی پیار کی نظر سے نہیں دیکھا، اپنی دعاؤں کی حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ میں تسبیح تھامے، سر پر اسکارف باندھے اس پر قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ نوشابہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پلنگ میں جکڑے ہاتھ کو ہلا کر بڑی دقتوں سے ان کو اپنے سے قریب کیا۔ اس کو ہوش میں آتا دیکھ کر اہل خانہ میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بہوویں جن کی اس نے ہمیشہ بے عزتی کی تھی، شکرانے کے نفل ادا کرنے دوڑیں۔ شوہر اور بیٹے بھی اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوئے۔

''ممتاز علی! کاغذات بنوایئے۔ میں ارشاد علی کی جائیداد اس کے بچوں کے نام کرنا چاہتی ہوں۔'' دو تین بعد جب وہ اٹھ بیٹھنے کے قابل ہوئی تو اس نے شوہر سے پہلی خواہش یہ کی۔ اپنی دونوں بہوؤں سے وہ ہاتھ جوڑ کر پہلے ہی معافی مانگ چکی تھی۔ ابھی اسے بہت سارے حساب چکانے تھے، قرض ادا کرنا تھا، جو اس کی روح پر بھاری پڑ رہے تھے۔ پرانے محلے جا کر ارشد اور بیلا کی شادی کے لیے جمیلہ کو ہاتھ جوڑ کر منانا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لگائے ہوئے الزامات کی وجہ سے وہ آج تک اسی دہلیز پر بیٹھی ہے۔ آنکھیں تھیں کہ نیر بہائے جا رہی تھیں۔ وہ جو ایک سخت دل عورت تھی، رونے والوں کو کمزور جانتی تھی، پر آج کل بات بات پر اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

''میڈم! دوا کھالیں۔'' نرس دروازہ بجاتی داخل ہوئی تو اسے اشاروں سے نماز پڑھتا دیکھ کر واپس لوٹ گئی۔ نوشابہ ہر پل اپنے خالق و مالک کا شکر ادا کرتی، جس نے اسے گمراہیوں کے عمیق گڑھوں سے نکال لیا۔ اس کی توبہ قبول کرتے ہوئے زندگی بخش دی۔ وہ پاک ذات اگر سنبھلنے کا موقع نہ دیتی تو اس کی دنیا تو تباہ تھی ہی، آخرت بھی برباد ہو جاتی۔

نوشابہ عشاء کی نماز ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی، ندامت تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

''یارب العالمین''

میرے دل کو اپنی چاہت سے بھر دے
میرے دل میں تیرے قہر کا خوف جاگے
میرے خیالات میں تیرا قرب جھانکے
اب میری زندگی کی ہر سانس، تیری رضا کی محتاج ہو
تیرا شکر ادا کرتے ہوئے یہ جاں نکلے

اے میرے مالک اگر میں ایسے ہی دنیا سے خالی ہاتھ چلی جاتی تو تیری بارگاہ میں کیا منہ دکھاتی۔ بے شک تو بڑا مہربان اور نہایت ہی رحم کرنے والا ہے۔'' نوشابہ کے دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھ جیسے روشنیوں سے بھر گئے تھے، کیوں کہ خدا نے اپنی شان دکھا دی تھی۔

☆......☆

رتّی، اللہ والی



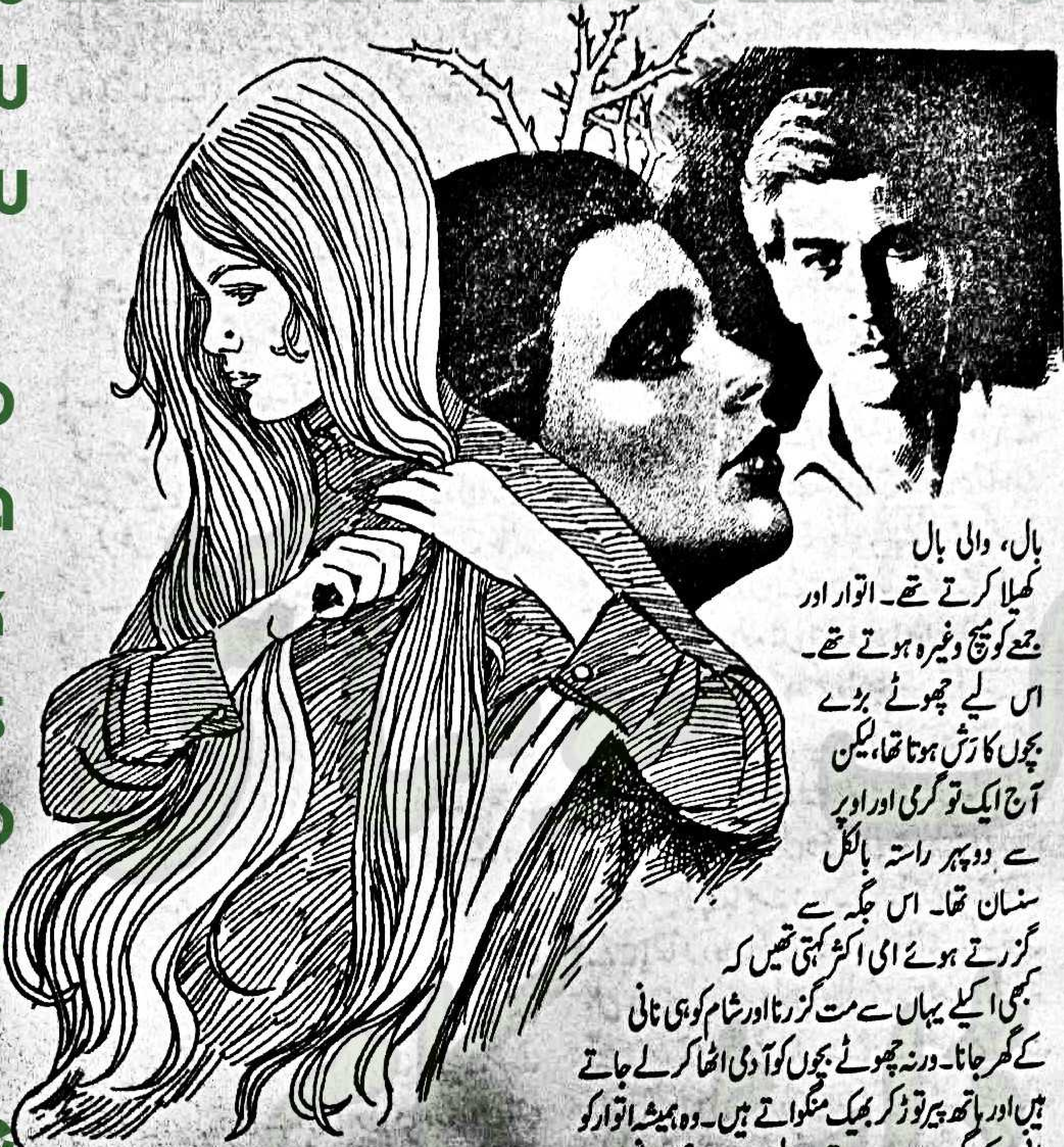
جیجل میتلو

کراچی سے، ایک دوشیزہ کی زندگی میں آسودگی کا بیج بونے والی، ایک فقیرنی کی داستان

میرے بابا مجھے خاص یاد نہیں ہیں، کیوں کہ جب میں اور میرا بھائی بہت چھوٹے چھوٹے تھے، وفات پا گئے تھے۔

امی نے عزیز آباد میں پلاٹ لے کر اس پر تین کمروں کا مکان بنوالیا تھا، کیوں کہ بابا کی وفات کے بعد امی کی سسرال نے پوچھا نہیں اور میکے میں بھائیوں پر وہ بوجھ بننا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے جو جمع پونجی تھی اس سے 120 گز کا پلاٹ لے کر مکان بنوالیا اور امی، نانا ابو اور ہم وہیں رہنے لگے۔ تب عزیز آباد نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ عزیز آباد نمبر 4 پر ہماری نانی رہتی تھیں۔ امی ایک پرائمری اسکول ٹیچر تھیں۔ رام سوامی میں امی کا اسکول تھا۔ میں ان دنوں آٹھ سال کی ہوں گی۔ بھائی مجھ سے بھی چھوٹا تھا۔ میں، بھائی اور نانا گھر میں ہوتے تھے اور روزانہ نانی سے پڑھنے جایا کرتے۔ میں تیسری کلاس اور بھائی ابتدائی قاعدہ پڑھتا تھا۔ ساتھ ہی نانی کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کر دیا کرتے تھے۔ مجھے پڑھنے سے زیادہ کھیلنے کا شوق تھا، لیکن امی کے ڈر سے اتنا پڑھ لیتی تھی کہ ششماہی اور سالانہ امتحان میں پاس ہو جاتی۔ نانی بھی اپنے زمانے میں پرائمری اسکول ٹیچر تھیں اور ہیڈ مسٹریس ہو کر ریٹائر ہوئی تھیں۔ اس طرح میری اردو بہت اچھی تھی۔ میں تیسری کلاس سے ٹارزن کہانی اور بچوں کے رسالے جس میں بادشاہوں، شہزادوں، جادوگروں کی کہانیاں ہوتی تھیں، بڑے شوق سے پڑھتی تھی اور خود کو بھی کبھی جادوگر یا شہزادی سمجھتی تھی۔ میری ایک خیالی دنیا تھی اور اب تک ہے۔ خیالوں ہی خیالوں میں بڑے بڑے کام کر لیتی ہوں، بلکہ ہر فن مولا ہوں۔

نانی ہمیں بہت اچھا پڑھاتی تھیں، ورنہ امی کو تو وقت ہی نہیں تھا۔ وہ صبح اسکول جاتیں اور چھٹی کے بعد دو تین بچوں کو ٹیوشن پڑھاتیں۔ اس طرح شام پانچ بجے تک گھر آتیں۔ سردیوں میں تو رات ہو جاتی۔ ہماری امی نے ہمارے لیے بہت محنت کی۔ وہ مکان جس میں ہم رہتے تھے، ابھی نامکمل تھا، جسے امی گرمیوں کی چھٹیوں میں سال بھر پیسے جمع کر کے بنواتی جاتی تھیں۔ اس طرح تین چار سال میں گھر مکمل ہوا، پھر امی نے کرائے پر ایک ٹیچر کو دے دیا۔ اس طرح زندگی گزر رہی تھی۔ ایک دن میں اور میرا بھائی، دوپہر کا وقت تھا، گرمیوں کے دن تھے، نانی کے گھر جا رہے تھے۔ روڈ سے جاؤ تو کافی دور پڑتا تھا اس کے علاوہ ایک اور راستہ تھا جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا کیکر کا جنگل تھا، جو کہ کہیں سے بہت گھنا تھا پھر بچوں کے کھیل کا میدان تھا۔ جہاں شام کو بچے کرکٹ



بال، والی بال کھیلا کرتے تھے۔ اتوار اور جمعے کو میچ وغیرہ ہوتے تھے۔ اس لیے چھوٹے بڑے بچوں کا رش ہوتا تھا، لیکن آج ایک تو گرمی اور اوپر سے دوپہر راستہ بالکل سنسان تھا۔ اس جگہ سے گزرتے ہوئے امی اکثر کہتی تھیں کہ کبھی اکیلے یہاں سے مت گزرنا اور شام کو ہی نانی کے گھر جانا۔ ورنہ چھوٹے بچوں کو آدمی اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ہاتھ پیر توڑ کر بھیک منگواتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اتوار کو نانی کے گھر ہمارے ساتھ چلتے ہوئے ہمیں نصیحت کرتیں۔ ویسے تو نانا ہوتے تھے، اس لیے ہم ان کے ساتھ یا پھر شام کو ہی آتے تھے، مگر آج نانا بھی کسی کام سے چلے گئے تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا چلو خالی بیٹھے ہیں، نانی سے پڑھیں گے بھی اور کھانا بھی کھائیں گے۔ یہ سوچ کر ہم دونوں بھائی بہن چل پڑے۔ اب ایک دیوار کے سائے میں کھڑے تھے کہ اب کیسے جائیں، ڈر لگ رہا تھا۔ نہ آدم نہ آدم ذات سنسان میدان اور جلتی ہوئی جھاڑیاں۔ یہ سب مکانوں کی پچھلی گلی تھی اور ہم آخری مکان کے دیوار کے سائے میں کھڑے تھے۔ نہ معلوم کتنا وقت گزرا ہوگا کہ اچانک شور سن کر پیچھے دیکھا تو ایک پگلی خود سے باتیں کر رہی تھی۔ ہم اور ڈر گئے کہ یہ کہاں سے آ گئی۔ وہ ہماری طرف آ رہی تھی اور ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہی تھی جاؤ...... چلے جاؤ۔ میں نے یہ سن کر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگا دی اور نانی کے دروازے پر آ کر دم لیا۔ گھر میں داخل ہوئے تو نانی کمرے میں لیٹی پڑوسن سے باتیں کر رہی تھیں۔ بنگالن خالہ آئی ہوئی تھیں اس لیے دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ نانی نے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا، کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ وہ اٹھ کر ہمارے قریب آ گئیں۔

"وہ پاگل۔" یہ کہہ کر بھائی رونے لگا نانی سے لپٹ کر......

"اچھا...... کسی پاگل کو دیکھ کر ڈر گئے ہو...... تو پھر اتنی دھوپ میں آنے کی کیا ضرورت تھی......" وہ بھائی کو بہلاتے ہوئے بولیں...... "وہ آپا نے کہا تھا اس لیے۔" بھائی نے وجہ بتائی۔ "ارے منا...... تم تو بڑی ہو تمہیں

عقل نہیں آئی، ناحق خود بھی پریشان ہوئیں اور بھائی کو بھی ڈرا دیا۔ تمہارے نانا نے تمہیں آنے دیا، اتنی دوپہر دھوپ میں۔" نانی نے ہلکی ڈانٹ پلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ نانا تو صبح سے کہیں چلے گئے تھے۔" میں نے بتایا۔

"اچھا چلو ہاتھ منہ دھو کر پہلے کھانا کھاؤ، آرام کرو، پھر پڑھیں گے۔"

پھر کئی دن گزر گئے، میں روز استانی جمیلہ سے قرآن پاک کا سبق لینے جاتی تھی۔ آج بھی جا رہی تھی کہ دوسری گلی سے بچوں کا شور سنائی دیا۔ کیا ہے یہ دیکھنے کی غرض سے میں بھی تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں پہنچی تو بچے رتی، رتی، کہہ کر شور مچا رہے تھے اور دائرے کی صورت بنا کر کھڑے تھے۔ درمیان میں وہی پگلی بلی کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے ایک شیشی میں سے ایک میلے سے پیالے میں دودھ ڈال کر بلونگڑے کے آگے رکھ دیا جسے وہ جلدی جلدی چاٹنے لگا، پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ بچے کچھ دور ہٹ گئے، میں تو ویسے ہی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ نہ گالیاں دے رہی تھی نہ بچوں کو مارنے دوڑ رہی تھی۔ خاموشی سے کھڑی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ بچے بھی خاموش ہو چکے تھے اور بلی کے بلونگڑے کو دودھ پیتا دیکھ رہے تھے۔ کندھوں تک آتے سنہرے بال جن میں مانگ نکلی ہوئی تھی اور اس نے خاکی رنگ کی پینٹ شرٹ جیسے کہ فوجی وردی ہوتی ہے، پہنی ہوئی تھی اور پیروں میں پٹھانی چپل، شاید چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا حلیہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔ ایک خاص بات اس کی یہ مجھے محسوس ہوئی تھی کہ اس کی نظر جب بھی میری طرف اٹھتی تھیں اک چمک سی میری آنکھوں سے ٹکرائی تھی جس کا احساس مجھے آج تک ہے۔ پتا نہیں میں نے امی سے یہ ذکر کیوں نہیں کیا۔ اکثر میں سوچتی مگر بھول جاتی۔ آج پھر نانا یہ کہہ کر کہ میں ماموں اصغر کے گھر جا رہا ہوں تم بھائی کا خیال رکھنا، کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ میں دوپہر تک لوٹ آؤں گا۔ نانا گیٹ کو باہر سے تالا لگا کر گئے تھے، کیوں کہ اس دن دوپہر میں نانی کے گھر جانے والی حرکت پر امی بہت ناراض ہوئی تھیں اور اب نانا جاتے تو گیٹ کو تالا لگا دیتے جس کی ایک چابی امی کے پاس اور ایک نانا کے پاس تھی جو پہلے آتا وہ گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہوتا۔ دوپہر تک تو ہم بھائی بہن کھیلتے رہے اور امی جو دو پراٹھے پکا کر ہمارے لیے رکھ کر گئی تھیں وہ بھی ہم نے کھا لیے، پھر ہم نے مل کر برتن دھوئے، گھر کی جھاڑو لگائی، اب کیا کریں؟ نانا ہوتے تھے تو ہمیں پڑھاتے یا باتیں کرتے کہانیاں سناتے۔ آج تو جیسے دن گزر ہی نہیں رہا تھا۔

"آپا مجھے بھوک لگ ہے۔" بھائی نے کہا۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ نانا ہوتے تھے تو کبھی کھچڑی کبھی سالن بناتے اور پھر تندور سے روٹی لے آتے تو ہم سب مل کر کھاتے، لیکن آج تو کوئی نہ تھا، اب کیا کریں؟" پھر سوچا آج روٹی بنانے کا تجربہ کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہم دونوں نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

"تم آٹا چھانو، میں اسٹوو جلاتا ہوں......" بھائی نے کہا، لیکن پھر چولہے کا اسکرو ڈھیلا ہونے کی وجہ سے ہم جتنی ہوا بھرتے چولہا پمپ ہوتا ہی نہیں، ہمارے ہاتھ تھک گئے۔ اسٹوو ہم سے نہ جلنا تھا نہ جلا۔ امی کھانا بنانے کے بعد اسٹوو کا اسکرو کھول دیتی تھیں، تاکہ بچے اگر زیادہ ہوا بھر دیں تو چولہا پھٹ نہ جائے۔ یہ ہمیں بعد میں امی نے بتایا تھا کہ وہ ایسا کرتی تھیں، تاکہ کوئی بچہ یا گھر ہی نہ جل جائے۔ خیر ہم دونوں بھائی بہن نااُمید ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں افسوس میں منہ لٹکائے بیٹھے تھے کہ گیٹ بجنے کی آواز آئی، ہم دونوں دوڑ کر گیٹ تک گئے، گیٹ پر کوئی نہ تھا۔ میں نے نیچے سے جھانکا تو رتی پگلی کھڑی تھی، میں ڈر گئی، جلدی سے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اندر بھاگی...... "بھاگو...... پگلی رتی ہے۔ ہمیں مارے گی۔" میں نے جلدی سے بھائی سے کہا...... اور اندر آ کر کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی سے دیکھنے لگے کہ وہ کس طرح اندر آتی ہے۔ اس نے ہاتھ گیٹ کے نیچے کیا...... ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے کہ ابھی اندر آئی، تب آئی، لیکن اس نے ایک لفافہ گیٹ کے نیچے سے اندر رکھ دیا۔ نہ معلوم کیا کیا کہہ رہی تھی۔ ہم دونوں چپ چاپ سہمے ہوئے کھڑے تھے، کافی دیر ہو گئی...... بالکل خاموشی تھی۔ وہ لفافہ ویسے ہی گیٹ کے پاس پڑا تھا۔

"آپا دیکھیں تو اس میں کیا ہے؟" میرے بھائی نے کہا۔ "اچھا......" میں نے بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور

ہو کر کہا۔ پھر ہم ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ پیر رکھتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھے اور میں نے لفافہ اٹھا کر، کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اور کنڈی لگا کر لفافہ کھولا تو لفافے میں دو سموسے، پکوڑے اور ایک پراٹھا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے، جب سب کچھ کھا لیا تو یاد آیا کہ امی کاغذ دیکھیں گی تو ماریں گی، کیوں کہ وہ منع کرتی تھیں، کسی کا دیا ہوا بھی نہ کھایا کرو اور کسی سے مانگ کر بھی مت کچھ لیا کرو، ورنہ میں بہت پٹائی لگاؤں گی، لہٰذا کاغذ بھی گیٹ کے باہر پھینک دیے اور اندر آ کر لیٹ گئے۔ اب ڈر بھی ختم ہو گیا تھا۔ لیٹے لیٹے نہ معلوم کب ہمیں نیند آ گئی۔ شام کو امی کے آنے پر ہم جاگے۔ اس دن کے بعد سے رتی مجھے اچھی لگنے لگی اور ڈر بھی ختم ہو گیا۔

پھر دو تین سال گزر گئے میں بھی اب سمجھ دار ہو گئی تھی۔ گھر کے سارے کام امی اور نانا نے سکھا دیے تھے۔ بھائی تیسری اور میں پانچویں میں آ گئے۔ امی کو فکر تھی کہ اب میں چھٹی کہاں پڑھوں گی...... کیوں کہ تب ہمارے محلے میں کوئی سرکاری اسکول نہ تھا اور رام سوامی سے بسوں میں جانا مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ بس میں سفر کرنا مجھے آج بھی پسند نہیں ہے۔ خیر امی کو میری پڑھائی کی بہت فکر تھی، وہ اکثر نانا سے کہتیں کہ اب منو کو میں کہاں داخل کرواؤں گی۔ کم از کم بیٹی ذات ہے، اتنا تو پڑھ لے اگر کوئی میری طرح بُرا وقت آئے تو عزت کی روٹی تو کما سکے۔ نانا کہتے، تم مایوس نہ ہو، اللہ کرے گا کوئی سبیل نکل ہی آئے گی اور سبیل نکل آئی۔ ہماری نانی کا انتقال ہو گیا اور تعزیت کے لیے ہمارے چچا اپنے بیٹے کے ساتھ آ گئے۔ سالوں بعد اپنے چچا اور کزن سے مل کر ہم بہت خوش ہوئے۔ وہ دو تین دن رہے جب جانے لگے تو امی نے میری پڑھائی کا ذکر کر دیا اور اپنی پریشانی بھی بتائی، تب چچا جو کہ خود بھی ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں استاد تھے، نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے میرے ساتھ بھیج دو۔ ثناء کے ساتھ یہ بھی اسی اسکول میں پڑھ لے گی۔ ثناء میری چچا کی بیٹی ہے اور وہ ساتویں میں پڑھتی تھی۔ اس طرح امی کئی سالوں کے بعد چچا کے ساتھ اپنی سسرال آ گئیں۔ ہم بھی اپنے کزنز سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ سب نے بہت محبت دی اور امی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہماری چچی نے ہمارا بہت خیال رکھا اور اس طرح ہم دونوں پڑھنے لگے۔

ہماری پھوپی جو کہ ساتھ میں رہتی تھیں، ان کے اور چچا کے گھر کے درمیان دیوار تھی اور دیوار میں ایک چھوٹا گیٹ تھا جو کہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ گھر کے چھوٹے بڑے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ ان کے بھی بچے چھوٹے تھے جو کہ بھائی کے ساتھ کھیلتے بھی تھے اور جھگڑتے بھی تھے۔ تب پھوپی بہت ناراض ہوتیں اور قصور وار بھائی کو ہی ٹھہراتیں اور غصے میں نہ معلوم امی کو اول فول کہتیں جس کا مجھے بہت دُکھ ہوتا۔ ہم نے ننھیال میں کبھی ایسے رویے نہیں دیکھے تھے۔ وہاں سب ہم سے پیار کرتے تھے۔ چچا اور چچی تو بہت خیال رکھتے، امی بھی چھٹی جب بھی ملتی چاہے دو دن کے لیے ہی، ضرور آ جاتیں اور ہمیں پیسے وغیرہ دے جاتیں۔ سب کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لاتیں۔ مجھ سے بھی پوچھتیں کہ اگر تکلیف ہو تو میں تمہیں لے جاؤں لیکن میں نے کبھی پھوپی کے رویے کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ امی بہت خوش تھیں کہ ہم پڑھ رہے تھے اور محفوظ ہاتھوں میں تھے، ورنہ امی کہتی تھیں کہ ایک دن بھی میں اسکول میں چین سے نہیں ہوتی تھی کہ میرے بچے گھر میں اکیلے ہیں...... میں امی کو پریشان نہیں کر سکتی تھی اور مجھے بھی اپنا اسکول اور وہاں کا ماحول بہت پسند تھا اور اسکول قریب ہی تھا۔ میں ثناء کے ساتھ پیدل ہی چلی جاتی تھی۔ اس بار بھی امی خیر سے ہو کر گئی تھیں۔ میں اور چچی امی ہی کی باتیں کر رہے تھے کہ پھوپو بولی۔ ”بھئی ان کی ماں کے تو مزے ہیں، بچے دوسروں پر ڈال کر خود عیش کر رہی ہیں۔“

”ریحانہ تم ایسا کیوں کہتی ہو...... منو ہرٹ ہو گی۔“

”میں تو سچ کہتی ہوں بھابی...... کسی کو اچھا لگے نہ لگے۔“ اور میں بجھ سی گئی...... اور اندر آ کر میں نے امی کو خط لکھا لیکن مجھے عقل آ گئی تھی۔ میں نے بس امی کو یہ ہی لکھا کہ آپ بہت یاد آ رہی ہیں اور پھر خود ہی خط دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیا اور اسکول میں بھی میں بہت اداس رہی، میں سوچتی کہ اگر ہمارے ابو بھی زندہ ہوتے تو ہماری امی بھی پھوپی اور چچی کی طرح گھر میں ہوتیں اور یہ باتیں بھی نہیں سننی

پڑتیں، کیوں کہ مجھے اپنی امی کا بہت احساس تھا کہ وہ کتنی تگ و دو کر رہی تھیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور ہماری بہترین زندگی کے لیے۔ وہ اکثر کہتیں کہ میں خدا سے تم دونوں کے سکھ کے لیے التجا کرتی ہوں کہ تم دونوں، دونوں جہاں کی نعمتیں پاؤ، نماز و روزے کی پابند تھیں اور وظائف وغیرہ بھی کیا کرتی تھیں۔ اسکول سے اداس اداس سی آرہی تھیں۔ شاید آنکھوں میں آنسو بھی تھے کہ ایک گلی مڑتے ہوئے اچانک مجھے رتی نظر آ گئی۔ وہ کچھ فاصلے سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آج ثناء بھی نہیں تھی۔ میں تنہا تھی اس لیے روتی ہوئی آرہی تھی۔ رتی کو دیکھ کر میں رک گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں بہت حیران تھی کہ رتی کراچی سے یہاں خیر پور کیسے آ گئی۔ آج مجھے بالکل ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا بلکہ میں نے سوچا کہ رتی اللہ والی ہے، تبھی تو جب میں دکھی ہوتی ہوں تب وہ مجھے نظر آتی ہے اور اللہ کے نیک بندے جہاں چاہے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے جیسے ڈھارس ہوگئی اور پھر بنا منہ سے بولے میں نے دل میں رتی سے کہا۔

”رتی دعا کرو میری امی کا ٹرانسفر ہوجائے۔“ میں نے دل ہی میں رتی کو مخاطب کیا اور اس کی طرف دیکھا۔ رتی نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

”وہ آجائے گی۔ جا...... جا...... وہ آجائے گی......“ یہ کہہ کر وہ گلی میں مڑ کر غائب ہوگئی۔

میں گلی کے موڑ پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں گئی۔ یہ سوچتے ہوئے میں گھر کی طرف چل دی۔ کوشش کرتی تھی کہ بھائی پھوپو کی طرف نہ جائے اور نہ بچے لڑیں، نہ پھوپو جلی کٹی سنائیں۔ کیا پھوپیاں ایسی ہوتی ہیں۔ ابھی ہمیں سال بھر ہونے کو تھا میرے چھٹی کے پیپر تھے۔ چچا نے فون لگوایا تھا اور امی ہر روز شام کو فون کرتیں۔ انہوں نے بھی ہم سے بات کرنے کے لیے گھر پر فون لگوالیا تھا۔ روزانہ میرے پیپر کے متعلق پوچھتیں...... میں امی سے بات کرتی، چچی کرتیں، کبھی کبھی پھوپو بھی بات کرلیتیں۔ محنت سے پڑھنا بھائی کا خیال رکھنا تم بڑی ہو جس چیز کی ضرورت ہو، مجھ سے ہی کہنا، کسی سے نہ مانگنا اور چچی کا گھر کے کام میں ہاتھ بٹایا کرنا۔ وہ ہمیشہ ہمیں اچھی نصیحتیں کرتیں۔ چھٹیاں ہم نے کراچی میں امی کے ساتھ گزاریں اور اکثر رات کو میں جب بیدار ہوجاتی تو دیکھتی امی جائے نماز پر بیٹھی ہیں اور آنسوؤں کی لکیریں گالوں پر نظر آتیں۔ تب میرا جی چاہتا، میں امی کے سارے غم دور کردوں۔ چھٹیوں میں امی نے ہمیں خوب کراچی گھمایا۔ کلفٹن، کیماڑی، منوڑا، ہل پارک، چڑیا گھر، سینما میں فلمیں وغیرہ دکھائیں۔ کھلایا پلایا۔ جوتے چپلیں، کپڑے لے کر دیے۔ بڑی یادگار چھٹیاں تھیں، وہ ہماری، پھر ہم واپس خیر پور آگئے۔ اتنے دن امی کے ساتھ رہ آئی تھی تو امی بہت یاد آتی تھیں، پھر صرف ایک ہفتے بعد امی آگئیں اور بتایا کہ میری ٹرانسفر خیر پور کے P.C اسکول میں ہوگئی ہے۔ ہم تو خوشی سے ناچنے لگے۔ امی بھی بہت خوش تھیں اور انہوں نے بتایا کہ وہ تب سے ٹرانسفر کی کوشش میں لگی تھیں جب سے ہم یہاں آئے تھے۔ خیر پور کی ایک ٹیچر کراچی گئی۔ اس کی وہاں شادی ہوئی تھی اور اس کی جگہ امی آئی تھیں۔ بس پھر بڑے علم کے محلے میں امی نے کرائے پر گھر لیا اور ہم امی کے ساتھ اپنے گھر آگئے...... ایک دن میں اپنے گھر کے دروازے سے باہر گلی میں بھائی اور بچوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھی کہ کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا...... تو رتی اللہ والی کھڑی تھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو اب تو خوش ہو نا۔ میں نے بھی خوشی سے ہاں...... میں گردن ہلائی...... اتنے میں بچوں نے شور مچایا۔ آؤٹ...... آؤٹ، تو میرا دھیان بٹ گیا، پھر جو دیکھا تو رتی اللہ والی جا چکی تھی۔

ماہ و سال گزرتے گئے۔ میں انٹر میں تھی کہ میرا رشتہ آ گیا۔ رشتہ ددھیال سے تھا اور اس طرح میں بیاہ کر گاؤں آ گئی۔ میرے سسر کی زمینیں تھیں، یعنی وہ گاؤں کے چھوٹے زمیندار تھے اور میرے شوہر نوکری کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے اور ہر ویک اینڈ پر گھر آتے تھے۔ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ ساس بھی نہیں تھی۔ زندگی بہت تنہا تنہا اور بے کیف تھی۔ ان دنوں کتا...

ہوتیں اور میں، اولاد بھی نہیں ہو رہی تھی۔ دو تین سال گزر گئے۔ امی کے پاس بس چھ چھ ماہ بعد جاتی۔ وہ جلدی جلدی آجاتی تھیں، کیوں کہ بس کا سفر مجھے پسند نہ تھا اور (تانگہ) اپنا تھا، لیکن اس میں جاتے جاتے میں بور ہو جاتی تھی۔ اس لیے کم جاتی تھی۔ زیادہ تر دل اُداس ہی رہتا، پھر دو تین ابارشن ہو گئے تو رشتے دار عورتیں میرے سسر کو بیٹے کی دوسری شادی کے مشورے دینے لگیں، لیکن میرے شوہر اور سسر نے بھی اس بات کا ذکر مجھ سے نہ کیا۔

کورٹ کچہریاں تو گاؤں میں چھوٹے بڑے زمینداروں کی چلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح میرے سسر میاں جی کا بھی کوئی مقدمہ چل رہا تھا۔ ایک دن وہ کچھ کاغذ لے کر میرے پاس آئے اور کہا اس پر دستخط کر دو۔

"یہ کیا ہے میاں جی؟" میں نے پوچھا...... کہنے لگے۔

"میں زمین تمہارے نام کر رہا ہوں۔"

"میرے نام......" میں حیران ہوئی۔

"ہاں...... کل پیشی پر مجھے رتی اللہ والی ملی تھی اس نے کہا...... زمین، گھر میں جو بیل ہے نا...... اس کے نام کر دے...... کبھی مقدمہ نہ ہوگا اور بیل پر پھول بھی لگیں گے۔ جا...... جا...... میری بات پر دل سے لگا لے...... بس میں نے سوچا...... کتنے سالوں سے میں اس کیس میں پھنسا ہوا ہوں۔ ویسے بھی میرے بعد یہ سب تمہارا ہی تو ہے۔ اس لیے یہ اسٹام پیپر لیتا آیا ہوں۔" اور میں نے بھی خوشی سے دستخط کر دیے۔

یقین جانیے اسی مہینے فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا اور اسی سال مجھے اُمید ہوئی اور جب میں چھ ماہ کے حمل سے تھی تو عارف، میرے شوہر کو اچھی گورنمنٹ نوکری ملی، جیسے کہ زندگی پر بہاروں کا سایہ ہو گیا۔

اس زمین پر کھجور کا باغ ہے۔ امی اور میاں جی گزر چکے ہیں۔ بھائی بھی گورنمنٹ آفیسر ہے۔ عارف بھی بائیس گریڈ کے آفیسر ہیں۔ 2 بیٹے ہیں جو کہ باہر سے پڑھ کر آئے ہیں اور جاب کر رہے ہیں۔ بیس بائیس سال جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے ہیں۔ اپنا گھر، سرکاری گاڑی کے علاوہ اپنی گاڑی۔ زندگی بہت سکون واطمینان سے گزر رہی ہے۔ اب بھی میں رتی کو نہیں بھولی۔ ابھی شادی کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا، لیکن میاں جی نے جو حلیہ مجھے بتایا وہ بھی ویسے ہی تھا جیسے کہ میں نے روبرو رتی اللہ والی کو دیکھا تھا۔ سنہرے کانوں تک بال اور فوجی پینٹ شرٹ میں ملبوس، ہاتھ میں چھوٹی سی اسٹک۔ لوگ اسے پگلی رتی کے نام سے پکارتے ہیں، لیکن میں اسے "رتی اللہ والی" کہتی ہوں۔

☆......☆

وہ میرا مہرباں



حنا بشریٰ

لاہور سے خدا کی قدرت کا ایک رنگ

"اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات اور کمالات میں منفرد ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بھی کسی امر اور کسی فعل میں ہرگز شریک نہیں۔ وہ یہ ذات خود موجود ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اقتدار واختیار اور امتیاز سے نوازتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ سب اسی کے محتاج ہیں۔" مولانا صاحب کے درس سے لگ رہا تھا کہ قلب ونظر میں ایک نورانی سماں سا بندھ گیا تھا۔ شاہ زیب نے جذب سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"مولانا صاحب کچھ علم کے متعلق بھی ارشاد فرمائیں!" حاضرین میں سے کسی نے کہا۔

"انسان کے علم کی اوقات اتنی ہے کہ وہ اپنے اردگرد ہونے والے محیر العقول واقعات وحقائق سے اپنے رب کی عظمتوں کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتا۔ انسان کے علم کی عظمت یہ ہے کہ وہ مالک کائنات کے آگے سربسجود ہے۔ وسعتِ علم کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جتنا حاصل کرے لیے ہر دم احساس رہے کہ وہ بحرِ آگہی میں ایک ادنیٰ سا قطرہ ہے، مگر ایک بات طے ہے کہ علم کے مستند ذرائع دو ہی ہیں۔ اول قرآن کریم اور دوم خاتم النبیین ﷺ کی حیات پاک، باقی تمام علوم انہی کے تابع ہیں۔"

مولانا صاحب نے اپنی بات مکمل کر کے حاضرین پر ایک شفقت بھری نگاہ ڈالی۔ آہستہ آہستہ تمام لوگ جاتے جا رہے تھے۔ درس کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا، مگر شاہ زیب ہنوز اپنی جگہ پر بیٹھا نجانے کن اسرار و رموز میں کھویا ہوا تھا۔

"ہاں تو برخوردار! تمہیں کوئی سوال کرنا ہے؟" مولانا صاحب نے شاہ زیب پر مسکراتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی مولانا صاحب!" ان کے مخاطب کرنے پر شاہ زیب ان کے قریب آ کر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"مولانا صاحب! روحانیت کیا ہے؟" شاہ زیب کے ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال لبوں پر آ گیا تھا۔

"شاہ زیب بیٹا! دراصل روحانیت ہمارے اندر ہی ہے۔ یہ کوئی ہم سے الگ شے نہیں ہے کہ جس کو ہم اِدھر اُدھر تلاش کرتے پھریں، فقط اہل علم کی صحبت اسے مزید نکھار دیتی ہے۔ روحانیت دراصل اس کیفیت کا نام ہے جب انسان کا رابطہ غیب کی دنیا سے ہونے لگے۔ انسان مادیت پرستی چھوڑ کر روحانیت کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے اور پھر انسان کو قربِ الٰہی حاصل ہونے لگتا ہے۔ روحانیت تو ہر مسلمان کے اندر ہوتی ہے لیکن اسے کھوجتا وہی ہے، جس پر رب کریم کا کرم ہوتا ہے۔ وشت روحانی

کی سیاہی ہر کسی کے نصیب میں نہیں آتی۔ عام کو خاص بنانا اسی کا کام ہے۔" مولانا صاحب نے بڑی وضاحت سے جواب دیا۔

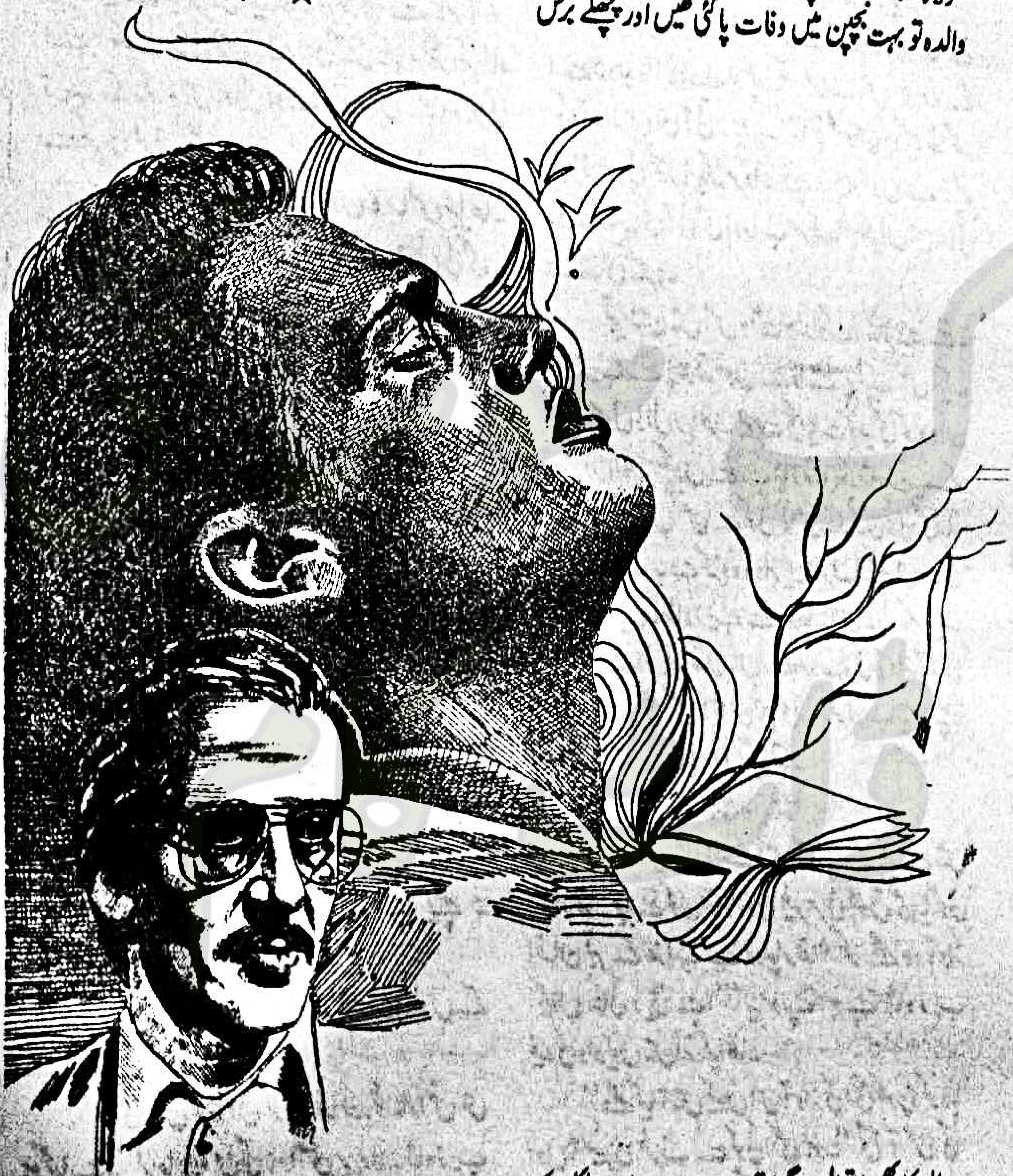
☆......☆

شاہ زیب حسن کا یہ عرصے سے معمول تھا کہ وہ مولانا صاحب کے پاس ہر جمعرات کو حاضری دیتا تھا۔ والدہ تو بہت بچپن میں وفات پا گئی تھیں اور پچھلے برس

پیروں، فقیروں نے انسانیت کو لوٹنا شروع کیا ہوا ہے وہاں مولانا صاحب کی بے لوث شخصیت انسانیت کی خدمت کر رہی تھی۔

شاہ زیب باقاعدگی سے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جاتا تھا۔ وہاں جا کر اسے بہت روحانی اور قلبی سکون ملتا تھا۔

☆......☆



والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ کوئی بہن، بھائی تھا نہیں۔ مولانا صاحب کی ذات سے اسے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ نماز کا پابند تو وہ ہمیشہ سے ہی تھا، مگر اب مولانا صاحب کی باتوں پر بھی عمل کرتا تھا۔ آج کل کے دور میں جہاں جھوٹے اور دھوکے باز

سردیوں کا بے حد خوبصورت دن تھا۔ شاہ زیب آفس سے واپسی پر قبرستان میانی صاحب آ گیا تھا۔ فاتحہ پڑھ کر اس نے قبروں پر پھول ڈالے تھے اور کچھ دیر کے لیے وہیں بیٹھ گیا تھا۔ یکایک اسے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاہ زیب نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو قبرستان میں وہ اس وقت بالکل تنہا تھا، مگر سسکیوں کی آوازیں اسے مسلسل آرہی تھیں۔ سردی کے باوجود شاہ زیب کو پسینا آگیا تھا۔ نظر کوئی نہیں آرہا تھا، مگر آوازیں قریب ہی سے آرہی تھیں۔ شاہ زیب کو ایک دم اپنے تنہا ہونے کا خیال آیا تھا اور پھر وہ رُکا نہیں، بلکہ تیزی سے چلتا ہوا قبرستان سے باہر نکل گیا تھا۔ قبرستان سے باہر آکر اسے سسکیاں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ باہر نکل کر شاہ زیب کے کچھ حواس بحال ہوئے تھے، اس لیے وہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیا تھا۔

گھر آکر شاہ زیب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے کوئی کتاب نکال لی تھی۔ پڑھنے کے دوران بھی بارہا اُسے ان آوازوں کا خیال آرہا تھا۔ ڈر کے مارے شاہ زیب نے کتاب بند کردی اور وہ دُعائیں پڑھنے لگا تھا جو مولانا صاحب نے اسے بتائی تھیں۔ دُعائیں پڑھ کر اُسے کچھ سکون ملا تھا اور پھر وہ سکون کی نیند سو گیا تھا۔

☆......☆

جب وہ صبح اُٹھا تو اس کے ذہن سے کل کا واقعہ محو ہوگیا تھا۔ ناشتا کرکے وہ آفس چلا گیا تھا۔

"یہ تُو کہاں تھا کل؟ کتنی دفعہ کال کی مگر تو ریسپانس۔" فرحان نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"وہ...... دراصل کل میں قبرستان چلا گیا تھا اور موبائل گھر پر ہی رہ گیا تھا۔" شاہ زیب نے وجہ بتائی۔

"دھیان سے کہیں کوئی روح اپنے پیچھے نہ لگوالینا۔" فرحان نے اُسے ڈرایا۔

"اچھا زیادہ بکواس مت کر۔" شاہ زیب اس کے بے تکے مذاق پر چڑ سا گیا تھا۔

"بھئی میں تو مذاق کررہا تھا اور تُو ناراض ہی ہوگیا ہے۔" فرحان اُس کی ناراضگی پر بولا۔ شاہ زیب خاموشی سے جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ فرحان کے مذاق نے اُسے کل کا واقعہ یاد دلا رہا تھا اور پھر اس کا دل ایک دم گھبرا سا گیا تھا۔

فرحان نے اس کی خاموشی دیکھی تو خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

آج دو دن کے بعد شاہ زیب قبرستان آیا تھا۔ دل میں خوف تھا، مگر ایک انجانی طاقت اُسے وہاں بلا رہی تھی۔ اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر اُسے بے حد سکون ملا تھا کہ یکا یک پھر کسی کے رونے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ رفتہ رفتہ رونے میں شدت آتی جارہی تھی۔ "نجانے کون ہے؟" شاہ زیب نے سوچا۔

"کون ہے؟" ہمت کرکے آخر شاہ زیب نے اسے نادیدہ ہستی سے پوچھا، مگر جواب میں بس رونے کی آوازیں ہی آتی رہیں۔ اتنا تو محسوس ہوگیا تھا کہ آواز نسوانی نہیں بلکہ مردانہ ہے۔ چند لمحوں کے لیے رونے میں کمی آئی تھی اور اب صرف سسکیاں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

قبرستان میں اُس وقت چند لوگ آجا رہے تھے۔ شاہ زیب سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک شخص ایک قبر پر پھول ڈال رہا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ اُن آوازوں اور سسکیوں سے بے نیاز تھا، بلکہ شاہ زیب کے دیکھنے پر بھی اُس شخص نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آوازیں صرف مجھے ہی سنائی دے رہی ہیں۔ شاہ زیب نے سوچا۔ اس نے پھر ایک بار اُس طرف دیکھا تھا جہاں سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ بات ابھی بھی ناقابلِ فہم تھی۔ شاہ زیب یہ سوچتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆

رات میں شاہ زیب اُسی آواز کے بارے میں متفکر تھا۔ نجانے کون تھا؟ کوئی غیر مرئی مخلوق تھی یا کوئی انسان قبر کے عذاب سے دوچار تھا؟ مگر مجھے وہ آواز کیوں سنائی دیتی ہے؟" یہ سوچتے سوچتے شاہ زیب نیند کی وادیوں میں اُتر گیا تھا۔

"مجھے کیا؟ میں کیوں اس آواز کی اتنی کھوج کررہا ہوں؟ میری طرف سے کوئی بھی ہو۔" صبح آفس کی تیاری کے دوران شاہ زیب مسلسل یہ باتیں سوچ رہا تھا۔ ناشتا کرکے وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اُسے اب اس کوئی بات نہیں سوچنی اور نہ ہی کوئی غور کرنا ہے اور پھر آفس کی بے تحاشا مصروفیات کے باعث اگلے چند دنوں تک وہ نہ تو قبرستان جا سکا تھا اور نہ ہی اسے [illegible]

خیال آیا تھا۔ البتہ مولانا صاحب کے درس کے لیے اس نے وقت نکال لیا تھا۔ مولانا صاحب سے اُسے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی باتوں سے اُسے روحانی سکون میسر آتا تھا۔ مولانا صاحب بھی شاہ زیب سے بے حد محبت سے پیش آتے تھے۔

☆......☆

آفس کی بے حد تھکا دینے والی مصروفیات کے بعد آج کافی دنوں کے بعد شاہ زیب نے قبرستان جانے کا سوچا تھا۔

''اور تم کب تک جاؤ گے؟'' فرحان نے اسے کام کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''بس جانے ہی والا ہوں۔'' شاہ زیب نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''تو پھر ساتھ ہی نکلتے ہیں۔'' فرحان اس کی بات سن کر سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بس پانچ منٹ اور رکو، پھر ہم چلتے ہیں اور ہاں آج تو میں قبرستان بھی جاؤں گا، کافی دن ہو گئے ہیں۔'' شاہ زیب نے کام کرتے کرتے کہا۔

''بھئی ذرا دھیان سے جایا کر، کوئی چڑیل وڑیل نہ تیرے پر عاشق ہو جائے۔'' فرحان نے ازراہِ مذاق کہا۔

''بس تیری بکواس شروع ہو گئی۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں میں، ایسی ویران جگہوں پر ایسی ہی چیزیں پائی جاتی ہیں اور پھر کوئی لڑکا جو تیری طرح خوب صورت بھی ہو تو پھر خیر نہیں۔'' فرحان مسخرے پن سے بولا۔

''اچھا بابا چلتے ہیں، وہاں اگر کوئی چڑیل ملی تو اسے تیرا پتا اور فون نمبر دے دوں گا کہ یہاں ایک حسین و جمیل لڑکا رہتا ہے، رابطہ فرمالیں۔'' شاہ زیب نے بھرپور شوخی سے جواب دیا تھا۔ اس کی بات پر فرحان اپنے قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔

☆......☆

قبرستان آتے ہوئے شاہ زیب کے ذہن سے اس آواز کا خیال نکل چکا تھا۔ وہ قبروں پر فاتحہ پڑھنے لگا تھا کہ ایک دم اسے پھر رونے کی آواز آئی تھی۔ شاہ زیب نے آواز کے تعاقب میں دیکھا تھا کہ چند قبروں کے فاصلے پر ایک قبر کے پاس ایک 18 سالہ لڑکا مسلسل رو رہا تھا۔

''تم کیوں رو رہے ہو؟'' شاہ زیب نے اس کے قریب جا کر پوچھا، مگر وہ لڑکا اب بھی رو رہا تھا۔

''آخر کون سی بات ہے جس نے تمہیں اس قدر پریشان کر دیا ہے؟'' شاہ زیب نے پھر ہمدردی سے پوچھا۔

شاہ زیب کی بات پر پہلی بار اس نے سر اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھا تھا۔ شاہ زیب کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کافی خوش شکل لڑکا تھا اور اتنے دنوں سے جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں، تو وہ یہی لڑکا تھا۔'' شاہ زیب نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

لڑکا پھر دوبارہ رو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی تکلیف میں ہو۔ کسی درد کی وجہ سے وہ کراہ رہا ہو۔ شاہ زیب دل گرفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اسی دوران قریب سے گزرتے ہوئے دو آدمیوں نے شاہ زیب کو رُک کر دیکھا۔ وہ صرف شاہ زیب کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظریں اُس اجنبی لڑکے پر نہیں تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ لڑکا صرف شاہ زیب کو نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں آدمی شاہ زیب کو حیرت سے دیکھ کر گزر گئے۔

''تم کون ہو؟ آخر کیا مسئلہ ہے؟ تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو اور یہ کس کی قبر ہے؟'' شاہ زیب نے عالم پریشانی میں ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''عثمان احمد میرا نام ہے۔'' اس تمام وقت میں وہ پہلی بار شاہ زیب سے مخاطب ہوا تھا۔

''تم مجھے بتاؤ عثمان، میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔'' شاہ زیب نے نرمی سے پوچھا۔

''بابو جی کوئی مسئلہ ہے؟'' پاس سے گزرتے ہوئے گورکن نے شاہ زیب سے پوچھا۔

''نہیں تو! میں تو بس ویسے ہی یہاں کھڑا تھا کہ......'' شاہ زیب نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

''آپ کافی دیر سے یہاں کھڑے تھے کہ مجھے لگا کوئی کام نہ ہو۔'' گورکن نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''نہیں نہیں، بس شکریہ! میں بھی ابھی واپس جا رہا تھا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

اس دوران اس نے ایک بار بھی عثمان احمد کی طرف

پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔

گورکن کے جانے کے بعد شاہ زیب نے پلٹ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا، مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا، کیوں کہ عثمان احمد اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔

”یہ کہاں گیا؟“ شاہ زیب نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ ”ابھی تو یہیں تھا، پھر اتنی جلدی کہاں چلا گیا؟“ شاہ زیب کا ذہن اُلجھ گیا تھا۔ اسی اثناء میں شاہ زیب کی نظر اُسی قبر پر پڑی تھی، جہاں عثمان احمد موجود تھا۔ نام پر نظر پڑتے ہی شاہ زیب کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ قبر پر عثمان احمد کا نام لکھا تھا۔ شاہ زیب کا کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اتنی دیر سے ایک روح سے مخاطب تھا۔ یہ سوچ کر اُسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ جلدی جلدی قرآنی سورتوں کا وِرد کرتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

گھر جا کر بھی شاہ زیب کا دل مضطرب تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی پریشانی بھی اس کے دل کو لاحق تھی۔

”نجانے کیا بات ہے؟“ شاہ زیب نے اُکتا کر سوچا۔ ”آخر عثمان احمد مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اس بات کا کوئی سِرا اس کے ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ وہ صرف مجھے ہی کیوں نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ شاہ زیب کے ذہن میں سوال تو بہت سے تھے، مگر جواب کوئی بھی نہ تھا۔

رات کو نجانے کس پہر شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ خوف کے مارے اُسے پسینا آ گیا تھا۔ کسی نے اُس کا نام لے کر پکارا تھا۔ آواز بہت واضح نہیں تھی۔ خواب میں عثمان احمد اسے نظر آیا تھا جو اب بھی رو رہا تھا۔ شاہ زیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”یا الٰہی میری مدد فرما، میری صحیح رہنمائی فرما!“ شاہ زیب نے صدقِ دل سے خدا کو پکارا، دُعا مانگ کر شاہ زیب کو نہایت اطمینان سا ہوا تھا۔

☆......☆

شاہ زیب نے صبح آفس جاتے ہوئے ارادہ کیا تھا کہ آج مولانا صاحب سے ضرور ملاقات کروں گا۔ وہ ضرور اس بارے میں میری کوئی رہنمائی کریں گے۔ شام کو وہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ شاہ زیب کے کچھ بتانے سے پہلے ہی مولانا صاحب نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

”تو برخوردار خوف زدہ ہو!“ شاہ صاحب نے اُسے دیکھا۔

شاہ زیب اُن کی بات پر ابھی حیرت زدہ تھا کہ کیا جواب دے کہ وہ دوبارہ بولے۔

”بھئی اُس سے پوچھو کہ وہ کیوں پریشان ہے؟“ مولانا صاحب گویا تمام حالات سے واقف تھے۔

”مگر مولانا صاحب! وہ مجھے کیوں نظر آ رہا ہے؟ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“ شاہ زیب نے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اُس دن تم سے روحانیت کے متعلق پوچھا تھا۔ اب روحانیت کے قریب جا رہے ہو تو خوف زدہ ہو۔“ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب مولانا صاحب!“ شاہ زیب نے ناسمجھی سے سوال کیا۔

”بھئی صاف بات ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔ وہ جس کو جس قابل سمجھتا ہے، اُسے وہ کام سونپ دیتا ہے جو وہ اُس بندے سے کروانا چاہتا ہے۔“ مولانا صاحب نے وضاحت کی۔

”مگر وہ مجھے کیوں نظر آ رہا ہے؟ اور لوگ بھی تو ہیں، انہیں بھی تو وہ مخاطب کر سکتا ہے۔“ شاہ زیب اب بھی پریشان تھا۔

”بیٹا دراصل خدا کے کام بڑے نرالے ہیں۔ اُس کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ تمہارے اندر ضرور کوئی ایسی بات ہوگی کہ وہ روح تم تک آسانی سے پہنچ گئی اور وہ تمہیں نظر بھی آ گئی۔ یہی روحانیت کا کمال ہے کہ جب انسان کا باطن روشن ہو جائے تو پھر انسان وہ بھی دیکھ لیتا ہے جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔“ مولانا صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔

”اب تمہیں وہ نظر آئے تو تم خوف زدہ ہونے کے بجائے اُس کی پریشانی پوچھو اور اُس کی مدد کرو۔“ مولانا صاحب نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ایک بات ہمیشہ یاد رکھو کہ ہم انسان خود

بھی نہیں کر سکتے، اگر وہ نہ چاہے اور اگر وہ ارادہ باندھ لے کر فلاں بندے سے فلاں نیکی کروانی ہے تو پھر وہ اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے، ورنہ بندے کی کیا مجال۔'' مولانا صاحب شفقت سے بولے۔

مولانا صاحب کے کہنے پر وہ قبرستان گیا تھا، مگر عثمان احمد سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ چند دن مسلسل جانے کے باوجود اب تک کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی۔

شاہ زیب نے تمام صورت حال مولانا صاحب کے گوش گزار کر دی تھی۔ انہوں نے ایک وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا تھا۔

''یہ وظیفہ کشف القبور ہے۔ یہ تم عثمان احمد کی قبر پر پڑھنا، اُمید ہے کہ وہ تمہیں نظر آئے گا، پھر تم اس سے اُس کی تکلیف کے بارے میں معلوم کرنا۔'' مولانا صاحب نے اسے ہدایت کی۔

☆......☆

شاہ زیب نے مولانا صاحب کا دیا ہوا وظیفہ عثمان احمد کی قبر پر پڑھا، مگر عثمان احمد سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ مایوس ہو کر گھر آ گیا تھا۔

''مجھے کیا؟ میں کن چکروں میں پڑ گیا ہوں۔'' شاہ زیب کے دل نے دلیل دی۔

''خوامخواہ وقت برباد کیا۔ اس کا جو بھی مسئلہ ہو، میری بلا سے۔'' شاہ زیب نے خود غرضی سے سوچا۔

''اچھا ہے وہ اب نظر نہیں آ رہا، میں کیوں اس کی فکر میں مرا جا رہا ہوں۔'' شاہ زیب مسلسل سوچ رہا تھا۔

ایک انجانی سی بے کلی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسلسل عثمان احمد کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی تکلیف کے بارے میں فکر مند ہو رہا تھا۔ حالاں کہ وہ اپنے آپ کو روک بھی رہا تھا، مگر سوچیں بے لگام ہوئی جا رہی تھیں۔

اس کے دل کے کسی گوشے میں عثمان احمد سے شدید ہمدردی پیدا ہو رہی تھی، مگر وہ اپنی ان کیفیات سے انجان اور بے خبر ہونا چاہ رہا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ شاہ زیب ناشتا کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ فرحان کی آمد ہوئی تھی۔

''اور سناؤ کیسے آنا ہوا؟'' شاہ زیب نے اس کے لیے چائے بناتے ہوئے کہا۔

''بس یار تیری یاد آ رہی تھی۔'' فرحان شگفتگی سے بولا۔

''میں کون سا امریکہ سے آیا ہوں جو تجھے میری یاد آ رہی تھی۔'' شاہ زیب بھی آج بڑے موڈ میں تھا۔

''اچھا! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں چلا جاؤں۔'' فرحان اُٹھتے ہوئے بولا۔

''ارے بابا بیٹھ جا! میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' شاہ زیب نے اُسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ لے یہ ثانیہ کی شادی کا کارڈ ہے اور تو نے ضرور آنا ہے۔'' فرحان نے کارڈ میز پر رکھ دیا۔

ثانیہ فرحان کی چھوٹی بہن تھی اور شاہ زیب کے ساتھ بھی ثانیہ کی بے حد اچھی دوستی تھی۔ شاہ زیب بھی اُسے چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتا تھا۔

''ہاں، ہاں ضرور آؤں گا۔'' شاہ زیب نے کارڈ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور تم سناؤ...... تم کب تک شادی کرو گے یا یونہی کنوارے رہو گے۔'' فرحان نے اُسے چھیڑا۔

''ابھی تو کوئی پروگرام نہیں ہے، مگر میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے، یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں۔ اس میں بھلا میں کیا کہوں۔'' شاہ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

آج کل دل کو جو پریشانی لاحق تھی۔ اس نے شاہ زیب کو باقی باتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ عثمان احمد کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ فطرتاً شاہ زیب نرم دل انسان تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ عثمان احمد کس تکلیف میں ہے؟ اور وہ مجھ سے ہی کیوں مدد مانگ رہا ہے؟

☆......☆

رات کے نجانے کس پہر شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ اُسے صاف اپنا نام سنائی دیا تھا۔ شاہ زیب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تھا، مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اوپر چھت پر بلیوں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

شاہ زیب کو یاد آیا کہ ابھی وہ خواب دیکھ رہا تھا کہ عثمان احمد اسے بلا رہا ہے۔ وہ رو رہا تھا، تکلیف میں تھا، مگر شاہ زیب تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ اُسی لمحے شاہ زیب

کی آنکھ کھل گئی تھی۔

صبح میں ضرور مولانا صاحب سے ملاقات کروں گا۔اس مسئلے کا اب ضرور کوئی حل نکلنا چاہیے۔اس نے دل میں سوچا۔

☆......☆

مولانا صاحب نے تمام ماجرا بہت غور سے سُنا تھا اور چند لمحوں تک مکمل خاموش رہے تھے۔

"شاہ زیب بیٹا! غیب کی دنیا کے بھی نرالے معاملات ہوتے ہیں۔ہم اہل دنیا تو انہیں ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پاتے اور وہاں کے رہنے والے جو اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، وہ وہاں کے اصولوں کے پابند ہو جاتے ہیں۔ ان کی مرضی اپنی نہیں رہتی۔ سب کچھ مالک کائنات کے حکم پر رہتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کو وسیلہ بنا دیتا ہے اور اپنے بندے کی مشکل دور کر دیتا ہے، مگر یہ سب بھی اس قدر آسان نہیں ہے۔اس دنیا اور اس دنیا کے درمیان حائل پردے کو ہٹانے آسان نہیں ہے۔" مولانا صاحب متفکر انداز میں بولے۔

"تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہوگا؟" شاہ زیب ابھی تک اُلجھن کا شکار تھا۔

"تم نے وظیفہ پڑھا، کوئی فائدہ نہیں ہوا تو پھر برخوردار اب ایسا کرو کہ ایک اور وظیفہ دیتا ہوں، وہ تم رات کو کرنا، ممکن ہے وہ تمہارے خواب میں نظر آئے اور اپنا مسئلہ بیان کرے، آگے اللہ بہتر مسبب الاسباب ہے۔" مولانا صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔

☆......☆

رات کو عشاء کی نماز کے بعد شاہ زیب نے وظیفہ پڑھا اور مکمل کر کے دعا مانگی اور سو گیا۔ پہلی رات تو کچھ نہ نظر آیا۔ دوسری رات وظیفہ کرنے کے بعد عثمان احمد خواب میں نظر آیا تھا اور وہ رو رہا تھا، مگر اس سے زیادہ کچھ نہ نظر آیا۔ تیسری رات وظیفہ کرنے کے بعد شاہ زیب نے خواب میں دیکھا کہ عثمان نظر آیا ہے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس وہ بے حد پریشان تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی چھپا رکھا تھا۔ شاہ زیب کو دیکھ کر وہ اُس کی طرف بڑھا تھا کہ دو نادیدہ ہستیاں اسے پکڑ کر لے گئی تھیں اور عثمان احمد بے بسی سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا تھا۔

اب شاہ زیب کو ضد ہو گئی تھی کہ جب تک یہ معاملہ حل نہ ہو جائے، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

مولانا صاحب کو تمام صورتحال بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ جمعرات کے دن عثمان احمد کی قبر پر جاؤ اور فاتحہ پڑھو۔ شاہ زیب جمعرات کے دن قبرستان پہنچ گیا۔ اس نے والدین کی قبروں پر پھول چڑھائے اور فاتحہ پڑھی، پھر عثمان احمد کی قبر پر پھول چڑھائے اور فاتحہ پڑھی۔ شاہ زیب آنکھیں بند کر کے دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ "اے اللہ تو ہی اپنے بندوں کو مشکلات اور پریشانیوں سے نکالنے والا ہے، تو ہی میری مدد فرما۔"

"تم آ گئے۔" شاہ زیب نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو سامنے عثمان احمد کھڑا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔" شاہ زیب نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"میں کہاں جا سکتا ہوں۔ میں تو یہیں تھا، مگر تم نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔" عثمان احمد افسردگی سے بولا۔

"میں تو آیا تھا، مگر تم مجھے نظر ہی نہیں آئے تھے۔" شاہ زیب کی آواز میں شکوہ تھا۔

"ہاں تم بھی صحیح کہہ رہے ہو، مگر میری مجبوری تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی تم تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ میں بے حد بے بس تھا۔" عثمان احمد کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

شاہ زیب کی نظر اچانک اس کے بازو کی طرف گئی تھی، جسے اس نے چھپا رکھا تھا، مگر تکلیف کی شدت سے بار بار اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا تھا۔

"یہ تمہارے بازو کو کیا ہوا ہے؟" شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" عثمان احمد نے تکلیف سے کہا۔

"کیا مطلب؟" شاہ زیب اس کی بات پر ازحد حیران رہ گیا تھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے بازو میں کیا تکلیف ہے، مگر میں مسلسل اس درد اور عذاب سے گزر رہا ہوں۔" عثمان احمد کی آواز میں بے حد کرب تھا۔

"دیکھو عثمان! مجھے ٹھیک طرح سے بتاؤ کہ میں

تمہاری کیا مدد کروں، اس طرح تو میں کچھ سمجھ نہیں پارہا۔'' شاہ زیب نے دل کی بات کہہ دی۔

''ٹھیک ہے تو پھر سنو۔'' عثمان احمد نے کہنا شروع کیا۔

''میں بھی اسی فانی دنیا کا پجاری تھا، جہاں اخلاق و محبت کی بجائے مادیت پرستی کو اہمیت حاصل ہے۔ رشتے ناتے دولت کے چند سکوں کے عوض فروخت کر دیے جاتے ہیں۔ میرا دل بھی اس دنیا کے ہنگاموں میں مگن تھا اور اس راستے سے ہٹ گیا تھا، جس کے لیے میرے مالک و معبود نے مجھے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ دنیا کی رنگینیوں نے میرے وجود کو گھیر لیا تھا۔ بُرائی نے میرے دل میں پنجے گاڑ لیے تھے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں رحمٰن کا نافرمان ہو گیا تھا اور شیطان کا فرماں بردار بن گیا تھا۔ میری بیوہ ماں اور ایک بہن تھی۔ جن کا مجھے خیال کرنا تھا، مگر مجھے ان کی کوئی فکر نہیں تھی۔ محلے کے اوباش لڑکوں میں میرا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ کون سی بُرائی تھی جس سے میں دور تھا۔ ہر وقت انہیں تنگ کیا کرتا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد مجھے ان کا سہارا بننا تھا، لیکن میں لٹیرا بن گیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' شاہ زیب کا ذہن لفظ ''لٹیرا'' میں ہی اُلجھ گیا تھا۔

''وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' عثمان احمد اس کے بولنے پر خاموش ہوا تھا اور پھر بولا۔

''بجائے اس کے کہ میں ان کے لیے کچھ کما کر لاتا، ان کا ہاتھ بٹاتا، اُلٹا وہ مجھے پال رہی تھیں۔ امی سارا دن لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں اور بہن امی کی مدد بھی کرتی تھی اور محلے کے بچوں کو گھر پر پڑھاتی بھی تھی۔ میں خود تو ناکارہ تھا، وہ جو کچھ کماتی تھیں میں ان سے وہ بھی چھین لیتا تھا۔ اس وقت مجھے کسی بات کا غلطی کوئی احساس نہیں تھا، لیکن اب شدت سے ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ میں اُن کا محافظ بنتا، میں خود ہی لٹیرا بن گیا تھا۔ بہن تو صرف آنسو بہا کر رہ جاتی تھی، مگر امی مجھے خوب بُرا بھلا کہتی تھیں، لیکن مجھ پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔''

یہ کہہ کر عثمان احمد خاموش ہو گیا تھا کہ جیسے طویل مسافت کے بعد انسان کا سانس پھول جاتا ہے۔ شاہ زیب اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور شاید انتظار بھی کر رہا تھا کہ دیکھو وہ آگے کیا کہنے والا ہے۔

''اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے پیسوں کے لیے خوب ہنگامہ کیا اور آخر ان سے پیسے چھین کر باہر بھاگ گیا۔ تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے مجھے سامنے سے آتی کار بھی نظر نہ آئی اور اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میرا بازو شدید تکلیف میں تھا۔ یوں لگتا ہے کہ بازو سے جیسے آگ نکل رہی ہو، کسی پل چین نہیں تھا۔ اب تم ہی میری امی سے جا کر کہو کہ مجھے معاف کر دیں، ورنہ میں یونہی عذاب میں رہوں گا۔'' یہ کہہ کر عثمان احمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ شاہ زیب دل گرفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

شاہ زیب کے پوچھنے پر اس نے اُدھورا سا پتا بتایا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب کچھ اور پوچھتا۔ عثمان احمد نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا تھا، مگر شاہ زیب اسی اُمیڑ بن میں ابھی تک وہیں کھڑا ہوا تھا۔

''بھائی صاحب کیا بات ہے؟ آپ کافی دیر سے یہاں کھڑے کس سے مخاطب ہیں۔'' ایک صاحب کافی فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

''کچھ نہیں جناب، دراصل مجھے خود کلامی کی عادت ہے......بس اور کوئی بات نہیں۔'' شاہ زیب نے شائستگی سے جواب دیا اور قبرستان سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

شاہ زیب ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ فرحان کی آمد ہوئی تھی۔

''خیریت تم اس وقت۔'' شاہ زیب نے اُسے دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''ویسے ہی بس یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے ملتا ہوا جاؤں۔'' فرحان کہتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

''اور سناؤ ثانیہ کی شادی کی تیاری کہاں تک پہنچی۔'' شاہ زیب نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے، بس دُعا کرو کہ سب خیر خیریت سے ہو جائے۔'' فرحان کے لہجے میں بہن کے لیے پیار تھا۔

''ان شاء اللہ ضرور، ایسا ہی ہوگا۔'' شاہ زیب بھی دل سے دعا گو تھا۔

''اور سناؤ کوئی نئی تازی۔'' فرحان نے چائے

پیتے ہوئے پوچھا۔ شاہ زیب نے لمحے بھر کے لیے سوچا تھا کہ فرحان کو اس تمام معاملے کے بارے میں بتا دوں یا نہیں، پھر آخر شاہ زیب نے تمام بات فرحان کے گوش گزار کر دی۔ فرحان کے مزاج میں سنجیدگی تو نام کی بھی نہیں تھی، سنتے ہی فوراً بولا۔

''یار یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ روح تم سے مدد مانگ رہی ہے، ویری فنی۔'' فرحان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔'' شاہ زیب نے اسے غصے سے دیکھا۔

''نہیں یار...... میں مذاق نہیں اُڑا رہا، مگر تم خود سوچو کہ آج کل یہ باتیں کون مانتا ہے۔ انسان چاند پر چلا گیا ہے اور ہم آج تک اپنے قصے کہانیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔'' فرحان اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔ جواباً شاہ زیب خاموش رہا تھا۔

ویسے یار ایک بات تو بتا، مجھے تو آج تک کوئی روح نہیں نظر آئی، تجھے کہیں وہم تو نہیں ہو گیا۔'' فرحان نے اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''فرحان تمہیں یقین نہیں آ رہا تو مت کرو۔ میں نے صرف دوست ہونے کے ناتے تم سے ایک بات شیئر کی تھی۔'' شاہ زیب کا موڈ اب بھی خراب تھا۔

''ارے بابا ایسا نہیں ہے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، مگر آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا میں بہرحال کچھ تو فرق ہے۔'' فرحان نے دلیل سے اپنی بات سمجھائی۔

''شاہ زیب، میرے یار، کہیں تیری طبیعت تو نہیں خراب ہے۔ تنہائی کی وجہ سے نجانے کیا کیا اُلٹا سیدھا سوچتا رہتا ہے۔'' فرحان فکر مندی سے بولا۔

''زیادہ میری دادی اماں نہ بنو، ٹھیک ہوں میں۔'' شاہ زیب اس کی فکر مندی پر چڑ سا گیا تھا۔

ابھی شاہ زیب کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ فرحان چیخ مار کر شاہ زیب سے لپٹ گیا۔

''اُف یہ کیا حرکت ہے فرحان۔'' شاہ زیب اس اچانک حرکت پر واقعی ڈر گیا تھا۔

''وہ اصل میں وہاں...... کھڑکی میں مجھے لگا کوئی مجھ دیکھ رہا ہے اور کوئی مجھے بُلا رہا ہے کہ اے پیارے اور بے حد حسین نوجوان میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی، تم اب تک کہاں تھے۔'' فرحان خوف زدہ نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اچھا! وہاں کوئی روح تو نہیں، بلکہ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی فلمی ہیروئن کھڑی تھی جو تمہارے حسن کے قصیدے بھی پڑھ رہی تھی۔'' خوف کے باوجود شاہ زیب کی ہنسی نکل گئی تھی۔

''اچھا فضول باتیں چھوڑو، بتاؤ تم پھر چلو گے میرے ساتھ عثمان احمد کے گھر؟'' شاہ زیب نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں بھئی جانا ہی پڑے گا۔ اب تمہیں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔'' فرحان نے محبت سے کہا اور یہ حقیقت تھی کہ شاہ زیب اور فرحان میں بے حد محبت تھی۔ الگ عادات و مزاج رکھنے کے باوجود دونوں میں بے حد دوستی تھی۔

☆......☆

اگلے دن چھٹی تھی۔ شاہ زیب نے عثمان احمد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ فرحان کو ساتھ لے کر نکلا تو نجانے کتنی دقتوں سے عثمان کا گھر ملا تھا۔ اصل میں پتا بھی اُدھورا تھا۔ والدہ کا نام بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ آخر کار منزل تک پہنچ ہی گئے تھے۔

مطلوبہ پتے پر پہنچ کر شاہ زیب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ فرحان کو وہیں چھوڑ کر وہ گھر کی جانب بڑھ گیا۔ لکڑی کا بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ دستک دینے پر کوئی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

''میں شاہ زیب ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''کون شاہ زیب؟'' دوسری طرف سے حیرت سے پوچھا گیا تھا۔

''میں عثمان احمد کا دوست ہوں۔'' شاہ زیب کو فوری طور پر یہی سمجھ آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا دروازہ فوراً کھل گیا تھا۔ سامنے ایک بے حد خوب صورت لڑکی کھڑی تھی، جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی، ایسا تقدس کہ شاہ زیب کی نظریں جھک سی گئی تھیں۔

''میں شاہ زیب ہوں اور عثمان کی والدہ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کی حیران نظروں کے جواب میں شاہ زیب جلدی سے بولا۔

"کون ہے منورہ؟" گھر کے اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ لڑکی جواب دیتی، ایک باوقار عورت گھر کے اندر سے آئی تھی۔

"کون ہو تم؟" اُدھیڑ عمر عورت نے شاہ زیب کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی یہ عثمان بھائی کے دوست ہیں۔" منورہ نے شاہ زیب کا تعارف کروایا تھا۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو اور اگر میرے بیٹے نے تم سے کوئی قرض لیا تھا تو اگلے ہفتے آجانا، مل جائیں گے تمہیں تمہارے پیسے۔" عورت کچھ بھی سُنے بغیر اپنی بولتی جارہی تھی۔

"دیکھیے آپ میری بات تو سُن لیں۔" شاہ زیب اس اچانک اُفتاد پر گھبرا اُٹھا تھا۔

"منورہ دروازہ بند کردو۔" وہ عورت شاہ زیب پر سرد نگاہ ڈال کر اندر چلی گئی تھی۔

"آپ چلے جائیں، بھائی کے ذکر پر امی یوں ہی ناراض ہوجاتی ہیں۔" منورہ نے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے وضاحتی انداز میں کہا اور دروازہ بند کردیا تھا۔

"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔" فرحان کی نظر شاہ زیب کی صورت پر پڑی تو اُس کی حس مزاح بھڑک اٹھی تھی۔شاہ زیب گہری سوچ میں غرق تھا۔

ابے کیا ہوگیا ہے؟ یوں منہ کیوں لٹکا رکھا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہاں ہماری شاندار دعوت ہوگی۔ ایک حسینہ دلربا ہماری میزبانی کرے گی، بعد میں خصوصی قہوہ پیش کیا جائے گا۔میں تو ابھی اندر آنے والا تھا، مگر یہاں تو۔" فرحان نان اسٹاپ شروع ہوگیا تھا۔

ایک تو منزل پر پہنچ کر ناکامی اور اوپر سے فرحان کی بے وقت کی راگنی سے شاہ زیب جھنجلا اٹھا تھا۔

"اچھا اب واپس چلو۔عثمان کی والدہ گھر پر نہیں تھیں۔" شاہ زیب نے فرحان کی باتوں سے بچنے کے لیے بہانا تراشا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" فرحان نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگلے چند دن ثانیہ کی شادی کی وجہ سے خاصے مصروف رہے تھے۔ اب جیسے ہی فراغت ملی تھی، شاہ زیب نے عثمان احمد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔وہ جلد از جلد اس مسئلے کو حل کرنا چاہ رہا تھا، مگر اب کی بار شاہ زیب نے فرحان کو ساتھ نہیں لیا تھا۔

☆......☆

"تم پھر آگئے ہو، آخر کیا چاہتے ہو؟" اُسے دیکھتے ہی عثمان کی والدہ کے چہرے پر کرختگی آگئی تھی۔

"دیکھیے خالہ جان، میری بات سُن لیں۔اس کے بعد جو آپ کہیں گی، وہی ہوگا۔" شاہ زیب نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی تھی، مبادا کہ دروازہ دوبارہ نہ بند ہوجائے۔خاتون نے ایک سنجیدہ نظر شاہ زیب کے چہرے پر ڈالی تھی اور بولی۔

"اچھا اندر آجاؤ۔" وہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

شاہ زیب اندر داخل ہوگیا۔چھوٹا ساختہ حال گھر تھا۔دو کمرے اور چھوٹا سا صحن تھا، مگر صفائی ستھرائی سے اہل خانہ کی سلیقہ مندی کا اظہار ہورہا تھا۔منورہ تخت پر بیٹھی سلائی مشین چلا رہی تھی۔شاہ زیب پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔" وہ خاتون کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"کہو کیا بات کرنی ہے؟" وہ اُسے دیکھ رہی تھیں۔

ساری بات سن کر اس خاتون کے چہرے پر تفکر کی لکیر نمایاں تھی۔اس سارے عرصے میں شاہ زیب نے غور کیا تھا کہ اس خاتون نے بھی اپنا داہنا بازو چادر میں چھپا رکھا تھا جس کے بارے میں عثمان نے تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

"آپ ہی بتائیں میں عثمان کو اس کی تکلیف کے بارے میں کیا بتاؤں، جس کے بارے میں خود لاعلم ہوں۔" شاہ زیب بے بسی سے بولا۔

اس دوران منورہ نے اس کے سامنے چائے لاکر رکھی تھی۔خاتون نے اسے چائے پینے کے لیے کہا تھا اور خود نجانے کیا خلاؤں میں تلاش کرنے لگی تھی۔چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی شاہ زیب کے اعصاب پُرسکون ہوگئے تھے۔ایسی لاجواب چائے اس نے آج تک نہیں پی تھی۔کچھ دیر خود میں کھوئے رہنے کے بعد اس عورت نے کہنا شروع کیا۔

"میرا نام زینب ہے۔ کم عمری میں ہی میری شادی ہوگئی تھی۔ مفورہ کے بعد عثمان پیدا ہوا اور پھر ان کے ابا کا انتقال ہوگیا۔ میں کم عمری میں ہی بیوہ بھی ہوگئی تھی۔ اماں ابا یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ بھائی اور بھابی پر بوجھ بننا مجھے گوارا نہ تھا۔ سو قسمت کا لکھا سمجھ کر رو دھو کر بیٹھنے کے بجائے مجھے جینا پڑا۔ اپنے لیے نہیں، بلکہ اپنے دونوں بچوں کی خاطر۔ دن رات کپڑے سیتی اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔ وقت کا کام گزرنا ہے، وہ گزرتا گیا اور بچے بڑے ہوگئے، مگر میری تقدیر میں ابھی اور امتحان باقی تھے۔ بیٹی جتنی سلیقہ شعار اور خدمت گزار تھی، بیٹا اتنا ہی نالائق اور ناہنجار تھا۔ میں بھی کیا کرتی، گھر چلاتی یا بیٹے کی نازبرداریاں کرتی۔ وہ مجھ سے متنفر ہوتا گیا۔ اسے اپنی مجبور اور بے کس ماں کی مجبوریاں نظر نہیں آتی تھیں۔ اسے تو بس ہر حال میں اپنی ضد اور خواہش کا خیال رہتا تھا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا، بہت مارا پیٹا، مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا، سو میں نے اسے کچھ کہنا سمجھانا چھوڑ دیا، مگر اس نے ہمارا پیچھا اب بھی نہ چھوڑا تھا۔ وہ آئے روز پیسوں کے لیے لڑائی جھگڑے کرتا۔ ماں اور بہن کا سہارا تو کیا بنتا بلکہ ہماری زندگیوں کا دشمن بن گیا تھا۔" یہ کہہ کر زینب خاتون رونے لگی تھی۔ شاہ زیب کا حساس دل غم سے بھر گیا تھا اور آنکھیں بھی پُرنم ہوگئی تھیں۔

"بس بیٹا! یوں ہی شب و روز کا ہنگامہ جاری تھا کہ ایک روز وہ حد سے گزر گیا تھا۔ میں نے پائی پائی کر کے کچھ روپے جمع کر کے رکھے تھے کہ مفورہ کی شادی کے کام آئیں گے۔ اس کم بخت کو نجانے کہاں سے خبر ہوگئی، پھر وہ پیسوں کا تقاضا کرنے لگا۔ بہت منع کیا، بہت دہائیاں دیں، مگر وہ نہ مانا، میں بھی ڈٹ گئی کہ آج اس کی ضد ہرگز پوری نہ کروں گی، مگر وہ ہاتھا پائی کرنے لگا۔ مفورہ شدت غم سے رونے لگی تھی، پھر اس نے کہا کہ "امی دے دیں پیسے، مجھے نہیں کرنی شادی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فوراً آگے بڑھی تھی، مگر عثمان کے سر پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ ماں کی التجائیں اور بہن کی آہیں اس پتھر دل پر اثر نہ کر سکیں۔ میں نے آخری بار بھرپور زور لگایا تھا۔ اپنی خون پسینے کی کمائی یوں لٹتے ہوئے دیکھ کر میرا دل کٹ رہا تھا، مگر اس نے مجھے زور کا دھکا دیا اور پیسے لے کر فرار ہوگیا۔

گرنے کی وجہ سے میری بازو میں سخت زخم آیا تھا اور میں درد سے بلبلا اٹھی تھی، مگر اس نے مجھے دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔ عمر بھر کی کمائی تو لٹ ہی گئی تھی، مگر چند گھنٹوں کے بعد بیٹے کی موت کی خبر زندہ در گور کر گئی تھی، لیکن میں ابھی بھی زندہ تھی، گو کہ میرا جوان بیٹا مر گیا تھا۔ میں دکھی تھی، غم زدہ تھی، میری دنیا اندھیری ہوگئی تھی، مگر میں اس ظلم پر اس سے آج بھی ناراض ہوں۔ جوان بہن کو دعاؤں میں رخصت کرنے کے بجائے وہ عمر بھر کا غم دے گیا تھا۔ حادثے کے وقت کسی سنگدل نے اس کی جیب سے وہ رقم نکال لی تھی، جو عثمان مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔

اسی دوران میرے بازو کا زخم خراب ہوتا گیا۔ میں نے معمولی سی مرہم پٹی تو کروالی تھی، مگر زخم خاصا بگڑ گیا تھا۔ اس میں پیپ پڑ گئی تھی۔ علاج بھی کیسے کرواتی۔ پیسے بھی نہ تھے، آخرکار نوبت یہ آگئی کہ مجھے بازو کٹوانا پڑا تھا۔ میں اس دن بہت روئی تھی، اپنی بے بسی اور مجبوری پر۔ میں اب اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتی تھی اور اب میں اس کے لیے جہیز نہیں بنا سکتی تھی کہ اب میں معذور ہوگئی تھی۔ یہ ایک اور تحفہ تھا جو حالات نے مجھے دیا تھا۔

اب مفورہ دن رات کپڑے سیتی ہے اور گھر کے اخراجات پورے کرتی ہے۔ میں بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ بہت صابر اور شاکر لڑکی ہے، مگر ماں ہوں نا، اس لیے بے چین رہتی ہوں اور اسی لیے میں عثمان سے اب تک ناراض ہوں۔ میں اُسے بددعا نہیں دیتی، مگر میرا دل ابھی تک دکھی ہے۔" زینب خاتون اپنی ساری کہانی سنا کر رونے لگی تھیں۔

"امی چپ کر جائیں مت روئیں۔" مفورہ اپنی ماں کو دلاسا دے رہی تھی۔

"خالہ جان! آپ جب تک عثمان کو معاف نہیں کریں گی، وہ یوں ہی عذاب میں رہے گا۔ آپ ماں ہیں۔ آپ تو اولاد کی تکلیف سمجھتی ہوں گی۔ وہ بہت روتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے روتے دیکھا ہے۔ آپ کو جو زخم اس نے دیا تھا۔ وہی زخم اسے بھی تڑپاتا ہے۔" شاہ

زیب درد مندی سے بولا۔

''امی! معاف کردیں بھائی کو۔ میں اس کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی، بھول جائیں سب کچھ، میری قسمت میں یہی تھا۔ آپ میری وجہ سے خود کو اذیت نہ دیں۔'' صفورہ محبت سے ماں کا ہاتھ تھامتی ہوئی بولی۔

شاہ زیب اس حوصلہ مند ماں کی حوصلہ مند بیٹی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ٹھیک ہے! میں نے عثمان احمد کو معاف کیا۔ اے خدا تو بھی میرے بچے کو معاف کردے۔'' زینب خاتون کا دل ماں تاکے غم سے رو پڑا تھا۔

☆......☆

شاہ زیب نے تمام صورت حال سے مولانا صاحب کو آگاہ کردیا تھا۔ انہوں نے تمام بات سن کر شاہ زیب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

''ہاں بیٹا! خدا کی ذات بہت بے نیاز ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔ وہ اتنا غفور الرحیم ہے کہ اپنے بندوں کی تکلیف دور کرنے کے لیے اپنے بندوں کو ہی وسیلہ بناتا ہے، جیسے تمہیں عثمان احمد کی تکلیف دور کرنے کا وسیلہ بنایا۔'' مولانا صاحب شفقت سے بولے۔

''اور ایک بات میری ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں ان مسلمانوں کو بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے جو اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں۔ ان مردوں کی حالت اس بے بس مرغ جیسی ہوتی ہے، جو منڈیر پر کھڑا ہو اور دانہ ڈالنے پر جلدی جلدی چگنے لگ جاتا ہو۔ ہماری فاتحہ بھی ان کے لیے ایسی ہوتی ہے، کیوں کہ وہ اب اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتے، مگر ہم اپنی زندگی کے چند لمحے نکال کر انہیں ضرور یاد کیا کریں، تاکہ وہ عذاب جان سے نجات پاسکیں!'' مولانا صاحب درد مندی کے جذبات سے بولے۔

''بالکل صحیح فرمایا، مولانا صاحب آپ نے، میں ضرور اس بات کا خیال رکھوں گا کہ مردوں کو ایصال ثواب کرتا رہوں۔''

☆......☆

زینب خاتون نے دروازہ کھولا تو سامنے شاہ زیب کو کھڑا پایا تھا۔

''ارے تم! بیٹا آؤ اندر آجاؤ۔'' زینب خاتون کے چہرے پر محبت اور خلوص کے جذبات نمایاں تھے۔

''وہ خالہ جان! میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا آپ کی خیر خیریت دریافت کرتا جاؤں۔'' شاہ زیب نے میز پر کھانے پینے کا سامان رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ مجھے تمہارے آنے سے خوشی ہوئی ہے۔'' زینب خاتون محبت سے بولیں۔

''اچھا خالہ جان، اب مجھے اجازت دیں، موقع ملا تو پھر ضرور آؤں گا۔'' چائے پینے کے بعد شاہ زیب نے جانے کی اجازت مانگی۔

''اچھا بیٹا! جیتے رہو، خوش رہو، صفورہ دروازہ بند کردو۔'' زینب خاتون نے بیٹی کو پکارا۔

''شاہ زیب صاحب! آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' اب صفورہ نے اسے پکارا۔

''جی فرمایئے!'' شاہ زیب نے اس سادہ سی لڑکی پر نظر ڈالی۔

''شاہ زیب صاحب! معذرت کے ساتھ آپ یہاں نہ آیا کریں۔ دنیا والے کیا کہیں گے۔ ہمارے پاس لے دے کر ایک عزت ہی تو بچی ہے۔ اسے رُسوا نہیں ہونے دوں گی۔ آپ کا دل صاف ہے، مگر دنیا کی زبان کون پکڑے گا۔'' صفورہ نے نہایت سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

شاہ زیب یہ بات سن کر خاموشی سے باہر آگیا تھا۔ بات سچ ہی تو تھی۔

☆......☆

''یہ آج تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔'' فرحان اس کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' شاہ زیب کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔'' فرحان گنگنایا۔

''بس ایک بات ہے جو پریشان کررہی ہے۔'' شاہ زیب نے آخر کار فرحان کو بتانے کا

فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟ مجھے بتا!'' فرحان سنجیدگی سے بولا۔

شاہ زیب نے مختصراً مفورہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو اسے بتادی۔

''تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔'' ٹھیک تو کہہ رہی ہے وہ افرحان ساری بات سن کر بولا۔

''یار پریشانی اس بات کی ہے کہ میں انہیں یوں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ بیٹا بھی ان کا فوت ہوگیا ہے۔ یوں اکیلی تنہا، مجھے ایک بے نام سی ہمدردی ہورہی ہے ان سے، میں شاید ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں، ان کے کام آنا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب اُلجھی اُلجھی آواز میں بولتا جارہا تھا۔

''ارے پاگل اس کا ایک ہی حل ہے۔'' فرحان نے اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو اُن کا بیٹا بن جا۔'' فرحان بولا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' شاہ زیب حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہو۔ ابے اُلّو! داماد بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔'' فرحان اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بولا۔

شاہ زیب اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا تھا۔ اس حوالے سے اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ نہ جانے خالہ جان میرے بارے میں کیا سوچیں! سوچیں تھیں کہ پریشان کرتی جارہی تھیں۔

☆......☆

پھر فرحان کے کہنے پر فرحان کی والدہ مفورہ کی امی سے ملیں اور شاہ زیب کے لیے رشتے کی بات کی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہونا تھا۔ جو شخص ان کے اس بیٹے کی تکلیف محسوس کرچکا تھا، جو اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ ان کی بیٹی کا کتنا خیال رکھ سکتا تھا، انہیں اس کا پورا یقین تھا۔

زینب خاتون خدا کی بے حد شکر گزار تھیں کہ اللہ نے ان کی بیٹی کے لیے اس قدر اچھا اور نیک انسان بھیجا تھا۔ پھر چند دنوں میں شاہ زیب کی مفورہ کے ساتھ شادی ہوگئی تھی۔

شاہ زیب کے محبت بھرے اصرار پر زینب خاتون ان دونوں کے ساتھ رہنے لگی تھیں، اس گھر میں جہاں ان کی بیٹی بھی تھی اور داماد کی صورت میں بیٹا بھی۔

بے حد دُکھوں اور تکلیفوں کے بعد قدرت نے ان کی جھولی میں خوشیوں کے پھول ڈال دیے تھے۔ ان کا رواں رواں اپنے پروردگار کا شکر گزار تھا۔

مفورہ کے کہنے پر شاہ زیب نے زینب خاتون کا مکان فروخت کردیا تھا اور اس سے ملنے والی رقم کسی فلاحی ادارے کو دے دی تھی، تاکہ اس کا ثواب عثمان احمد کو ہمیشہ ملتا رہے۔ زندگی بے حد پُرسکون ہوگئی تھی۔ شاہ زیب تو عثمان احمد کی تکلیف دور کرنے نکلا تھا، لیکن قدرت نے اس کی اپنی زندگی بھی سنوار دی تھی۔ اس نے ساری زندگی تنہا گزاری تھی، لیکن اب گھر میں ماں کی صورت میں رحمت بھی موجود تھی اور بے حد نیک اور پاک باز شریک حیات بھی۔

خدا کے کام بے حد نرالے ہیں۔ اس کے بھید وہی جانتا ہے۔ کل تک جس کام کو کرنے پر دل آمادہ نہ تھا۔ جانتا ہی نہیں تھا کہ اس کام کو کروانے میں رب تعالیٰ کی کیسی حکمت پوشیدہ تھی۔

☆......☆

شاہ زیب کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔

اس نے پہلو میں موجود مفورہ پر نگاہ ڈالی تو وہ بے حد گہری نیند سورہی تھی۔ شاہ زیب کا دل بے حد سکون محسوس کررہا تھا۔ کمرے میں بھینی بھینی خوشبو محسوس ہورہی تھی۔ ابھی شاہ زیب نے خواب میں عثمان احمد کو دیکھا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بے حد خوب صورت لباس میں تھا۔ شاہ زیب پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور شاہ زیب سے ہاتھ ملایا تھا، وہی ہاتھ جو اس کا تکلیف میں تھا، مگر اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ شاہ زیب کا بہت شکریہ کررہا تھا۔ اس کی خوشی سے شاہ زیب بھی خوش ہورہا تھا۔

دور کہیں اذان کی آواز سنائی دی تھی۔ فجر کا وقت ہوچکا تھا۔ وہ وضو کرنے چل دیا، تاکہ اس غفور الرحیم، رب العالمین کا شکر ادا کرسکے جو اپنے بندوں کو ان کی سوچ سے بھی بڑھ کر اپنی نعمتیں، رحمتیں اور برکتیں عطا کرتا ہے۔

☆......☆

یقینِ کامل سے پیوستہ، روح بیدار کرنے والی،

مختصر مختصر، مگر پُراثر سچ بیانیاں

☆ اعجازِ دعا۔ مہر پرویز احمد

روضۂ بی بی پاک دامنؒ پر مقبول ہونے والی ایک دعا، ایک سوالی کی زبانی

☆ سبز پیر۔ کنول عمران خان

کراچی سے ایک شہید بزرگ ''سبز پیر'' کی نوازشات

☆ یقینِ کامل۔ تنویر خالد

داتا دربار سے صحتِ کاملہ پانے والے ایک گورنمنٹ ملازم کی بپتا

☆ نُور کا ہالہ۔ ندا ہاشمی

کشمیر سے ایک معجزاتی حقیقت

☆ بھر دے جھولی۔ الماس فاطمہ ارمان

کراچی میں، بابا تاج الدینؒ کے مزار پر ملنے والی ایک قلندر فقیرنی کی کہانی

☆ کایا پلٹ۔ مسز نوید ہاشمی

قبولیت دعا پر کامل یقین دلاتی ایک سچ بیانی، کراچی سے

☆ مرشد کی دعا۔ نسیم سکینہ صدف

مرشد کی دعا سے فیض یاب ہونے والے ایک ڈاکٹر کی کہانی، ڈسکہ، سیالکوٹ سے

اعجازِ دُعا



مہر پرویز احمد

روضۂ بی بی پاک دامن پر مقبول ہونے والی ایک دعا، ایک سوالی کی زبانی

اپنی کہانی سنانے سے پہلے میں اس پاک ہستی کے بارے میں بتانا چاہوں گا جو نہ جانے کتنے دُکھی دلوں کا سہارا ہے۔ ان کا روضۂ مبارک بی بی پاک دامن کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ مزار رقیہ بنت علیؓ کا ہے۔ اس مزار کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اہلِ بیت یعنی نبی کریم ﷺ کے خاندان کی چند خواتین کے مزارات واقع ہیں۔ رقیہ بنت علیؓ ابن ابی طالب چوتھے خلیفہ حضرت علی ابن ابو طالب کی بیٹی ہیں۔ آپ حضرت عباسؓ ابن علیؓ کی سگی بہن ہیں اور حضرت مسلم بن عقیلؓ کی زوجہ ہیں۔ دوسری خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی بہن اور بیٹیاں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خواتین سانحہ کربلا کے بعد یہاں تشریف لائیں۔ بعض علماء کے خیال میں حضرت رقیہ دراصل سید احمد توختہ (بارہویں صدی) کی بیٹی تھیں۔

بی بی پاکدامن کا مزار لاہور گڑھی شاہو اور ریلوے اسٹیشن کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ یہاں پہنچنے کا سب سے آسان راستہ ایمپرس روڈ کی جانب سے ہے جو کہ پولیس لائنز کے بالمقابل ایک چھوٹی سڑک کے بائیں جانب واقع ہے جہاں ہزاروں زائرین آتے ہیں اور اپنی خالی جھولیوں کو مرادوں سے بھر کے لے جاتے ہیں۔

پوری دنیا سے زائرین ہر جمعرات کو دربار پر حاضری دیتے ہیں۔ اس دن دربار میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ عقیدت مندوں کا اک شہر آباد ہوتا ہے۔

میں لاہور سے کافی دور ایک گاؤں میں رہتا ہوں، لیکن روزگار کے سلسلے میں لاہور میں رہتا ہوں۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ محنت مزدوری کرتا ہوں، میرے معیار کا کام روز ہی مجھے مل جاتا ہے۔ اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ گھر بھی پابندی سے پیسے بھیجتا ہوں۔

میں ہر جمعرات کو دربار بی بی پاک دامن پر لازمی جاتا ہوں۔ ہم دیہاتی لوگ عقیدت کے کچھ زیادہ ہی مضبوط ہوتے ہیں۔ اگرچہ عبادت نہ بھی کریں لیکن ہمارا یقین بڑا پکا ہوتا ہے۔ میرا بھی پختہ یقین ہے کہ میری تمام پریشانیوں کو جب بھی دربار پر جاتا ہوں، اللہ تعالیٰ خوشیوں میں بدل دیتا ہے۔

غریب آدمی ہوں، معاشرے میں کوئی خاص مقام نہیں۔ محنت مزدوری کر کے بہن بھائیوں اور والدین کا پیٹ پال رہا ہوں۔ میرے سگے چچا نے دھوکے سے میرے والد صاحب کی زمین بھی اپنے نام کروالی۔ میرے والد صاحب ایک سیدھے سادے آدمی ہیں۔ میرے والدین میرے رشتے کے لیے چچا کے پاس گئے:

لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارے پاس زمین نہیں اور نہ ہی لڑکا کوئی اچھی نوکری کرتا ہے۔ میری بیٹی کو شہزادہ چاہیے جو اس کی تمام خواہشات پوری کر سکے۔“

میری ماں جب بھی لاہور میرے پاس آتیں، میں باقی شہر کی تو سیر نہ کرواتا، لیکن جمعرات کو بی بی پاک دامن دربار پر لازمی لے جاتا۔ وہ دربار کی جالی کے ساتھ لگ کر بڑی دیر تک روتی بھی رہتیں اور دعائیں بھی مانگتی رہتیں۔ ان کو زیادہ پریشانی میری شادی کی تھی۔ میری شادی کے لیے انہوں نے کتنی ہی منتیں مانیں، ان کو یقین تھا کہ ایک دن ضرور اس بی بی پاک دامن کے مقدس روضہ مبارک پر میری منت پوری ہوگی۔

ایک جمعرات کو ہم ماں بیٹا دربار پر گئے۔ میری ماں دربار شریف کی مقدس جالی کو پکڑ کر گریہ زاری کر رہی تھیں کہ میری مراد کب بر آئے گی۔ یقیناً اس دربار سے آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔ آخر میری مشکل کب حل ہوگی۔ میری ماں دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہی ایک عورت بڑی گریہ زاری کے ساتھ روضہ مبارک کی جالی کے ساتھ لگی اپنی دعاؤں کے پوری ہونے کے لیے نوحہ کناں تھی۔ آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے رواں تھی۔ ایک ہی التجا اس کی زبان پر تھی کہ ”یا اللہ! بی بی پاک دامن کے صدقے میری بچی کا گھر بسا دے، اس کا نیک نصیب بنا دے، میرے جیتے جی یہ اپنے گھر کی ہو جائے، پھر میں سکون سے مر سکوں گی۔“

جب وہ عورت دعا سے فارغ ہوئی تو میری ماں اس کے پاس گئی اور اس کی بیٹی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا میرا بھتیجا ایک نالائق، نکما، آوارہ گرد اور نشئی تھا۔ پوری برادری میں کوئی بھی اس کو رشتہ دینے کے لیے تیار نہ تھا، کیوں کہ کوئی بھی والدین جیتے جی اپنی بیٹی کو جہنم میں نہیں دھکیل سکتے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میرا بھائی ہمارے گھر آیا اور اپنی پگ اتار کر میرے خاوند کے پاؤں پر رکھ دی اور مجبور کیا کہ ہم اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیں۔ وہ بولا۔

”میں آپ کی بیٹی کا خیال رکھوں گا اور جیتے جی اس کو کوئی دکھ، تکلیف نہ پہنچنے دوں گا۔“ کافی منت سماجت کرتا رہا۔ آخر مجبور ہو کر ہم نے ہاں کر دی اور یوں میری بیٹی کی شادی اس کے نانجار بیٹے سے ہوگئی۔ باپ تو اسی نشئی کو کچھ دیتا نہیں تھا۔ اس نے شادی کے بعد سب سے پہلے ہمارے دیے زیور بیچے اور اپنا نشہ پورا کیا، پھر گھر کا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ چھ ماہ بعد جب گھر میں کچھ نہ بچا تو میری بیٹی کو بلاوجہ طلاق دے دی۔ ہم پر تو مصیبتوں کا پہاڑ گر پڑا۔ میرا خاوند یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور خالق حقیقی سے جا ملا۔ میں اپنی بیٹی کے لیے سخت پریشان ہوں۔ ایک سال سے میری دہلیز پر بیٹھی ہے۔ غریبوں کا رشتہ تو ویسے ہی کوئی نہیں لیتا کہ وہ جہیز کی لمبی فہرست پر پورا نہیں اتر سکتے اور ایک طلاق یافتہ، یتیم بچی سے شادی کون کرے گا۔ اس دربار پر ایک آس لے کر آئی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس پاک ہستی کے صدقے میری معصوم بیٹی کا مستقبل بنا دے۔ میں مر گئی تو میری بیٹی کا تو کوئی پرسان حال بھی نہیں ہوگا۔“

میری ماں نے تمام تفصیل سن کر اپنے بارے میں سب کچھ بتایا۔ میرا تعارف اس سے کروایا اور اپنی خالی جھولی اس کے آگے پھیلا دی۔

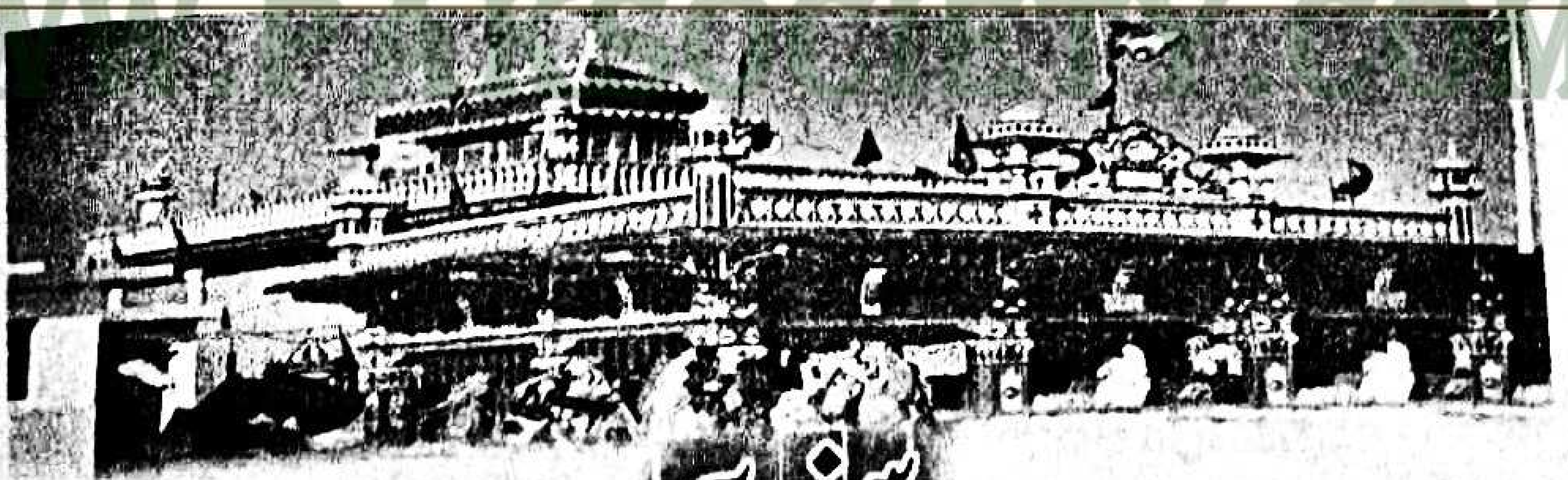
اس کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ تو خوشیوں کے انبار میں گھر گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں سالوں کا سفر لمحوں میں طے ہو جائے گا۔ اس نے فوراً ہاں کر دی اور یوں دربار پر بیٹھے بیٹھے ہماری بات پکی ہوگئی بلکہ یوں کہیں دعائیں قبول ہوگئیں۔

میں نے گاؤں سے والد صاحب کو بلوایا، سادگی سے نکاح ہوا اور فوراً رخصتی بھی ہوگئی، ہم سب لوگ گاؤں واپس آ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور کرم کیا اور گاؤں میں ہی مجھے کاروبار مل گیا۔ آج میرے دو بچے ہیں۔ میں اور میری بیوی بہت خوش ہیں اور ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ میں جب بھی لاہور جاؤں دربار بی بی پاک دامن پر لازمی جاتا ہوں۔

اس مقدس دربار سے پتا نہیں کتنے لوگ اپنی من کی مرادیں پا چکے ہیں۔

☆.....☆



سبز پیرا

کنول عمران خان

کراچی سے ایک شہید بزرگ، سبز پیر کی نوازشات

یہ واقعہ پچیس، چھبیس سال پہلے کا ہے۔ اس وقت میری عمر چھ یا سات سال ہوگی۔ ہم چار بہن بھائی ہیں، جن میں، میں سب سے بڑی ہوں اور اپنی نانی اماں سے بہت زیادہ انسیت بھی مجھے ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں صرف چار سال کی تھی تب سے نانی کے پاس ہی رہتی تھی۔ اسکول بھی اپنی خالہ کے ساتھ جاتی تھی، وہ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ نانا، نانی، خالہ، ماموں میں سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔

میری نانی اماں کا گھر بہت پرانے زمانے کا بنا ہوا تھا۔ صدر دروازہ کھولو تو ساتھ ہی پانچ، چھ سیڑھیاں تھیں اور پھر دو کمرے اور باتھ روم تھا، پھر اوپر والی منزل پر ایک بڑا سا کمرہ اور کچن تھا۔ سب اسی بڑے کمرے میں سوتے تھے۔ پھر اس کے اوپر کھلی چھت تھی اور ایک باتھ روم تھا۔ ہر جمعرات کو میں دیکھتی کہ صدر دروازے کے ساتھ جو سیڑھیاں تھیں ان پر ایک آلہ بنا ہوا تھا۔ یہ پرانے زمانے کے گھروں میں ہوتا تھا جن پر برتن یا دیگر سجاوٹ کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ تو اس آلے پر میری خالہ دودھ کا چھڑکاؤ کرتیں، پھول رکھتیں، اگر بتیاں اور موم بتیاں جلاتیں اور اس دن گھر کی بھی خوب اچھی طرح صفائی کرتیں۔ صفائی تو ویسے بھی نانی اور خالہ کو پسند تھی، ہر وقت گھر صاف ہی رہتا تھا، مگر جمعرات کو خاص اہتمام ہوتا۔ جب میں چھوٹی تھی تو بڑے شوق سے یہ سب دیکھتی تھی، مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تو میرے ذہن میں سوالات اُبھرنے لگے۔ کیا اور کیوں کی بازگشت گونجنے لگی۔ بچپن میں نانی اماں میرے سوالات کو مسکرا کر ٹال جاتی تھیں، مگر جب ذرا بڑا ہوئی تو میں نے ایک دن نانی کو جالیا۔

"اماں بتایئے نا آنٹی کیوں جلاتی ہیں اگر بتیاں؟" تو نانی اماں نے کہا۔

"بیٹا آج میں تمہیں بتا ہی دوں۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو تو ان باتوں کو سمجھ سکتی ہو۔ اصل میں ہمارے گھر میں ایک بہت ہی نیک بزرگ رہتے ہیں اور وہ آج سے نہیں کب سے ہمارے گھر میں ہیں۔ ہمارے اس گھر میں آنے سے پہلے سے، کیوں کہ جن لوگوں سے ہم نے یہ گھر لیا انہوں نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ آپ گھر کو صاف ستھرا رکھنا ہوگا اور ہر جمعرات کو پھول، اگر بتیاں اور موم بتیاں وغیرہ جلانا ہوں گی۔ بس تب سے ہم نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ صفائی تو ویسے بھی ہمارے گھر میں زیادہ تھی، مگر اب اور بھی خیال رکھا جانے لگا۔" نانی اماں بولتی جارہی تھیں اور میں حیرت زدہ انہیں دیکھ رہی تھی، کیوں کہ مجھے آج تک ایسا گمان نہ گزرا تھا کہ یہاں بزرگ ہیں کوئی۔

"مگر اماں میں نے تو آج تک انہیں نہیں دیکھا۔"
میں بے ساختہ بولی۔ تو نانی مسکرا کر گویا ہوئیں۔

"بیٹا وہ ہماری طرح نہیں ہیں، وہ خدا کے بہت نیک بزرگ ہیں، وہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے، بیٹا وہ بہت زیادہ روحانی شخصیت کے مالک ہیں، ان کے چہرے پر نور ہی نور ہے۔ وہ قد آور ہیں اور ہمیشہ ایک لمبے سے گہرے سبز چغے میں ملبوس ہوتے ہیں، اس لیے ان کا نام سبز پیر ہے۔"

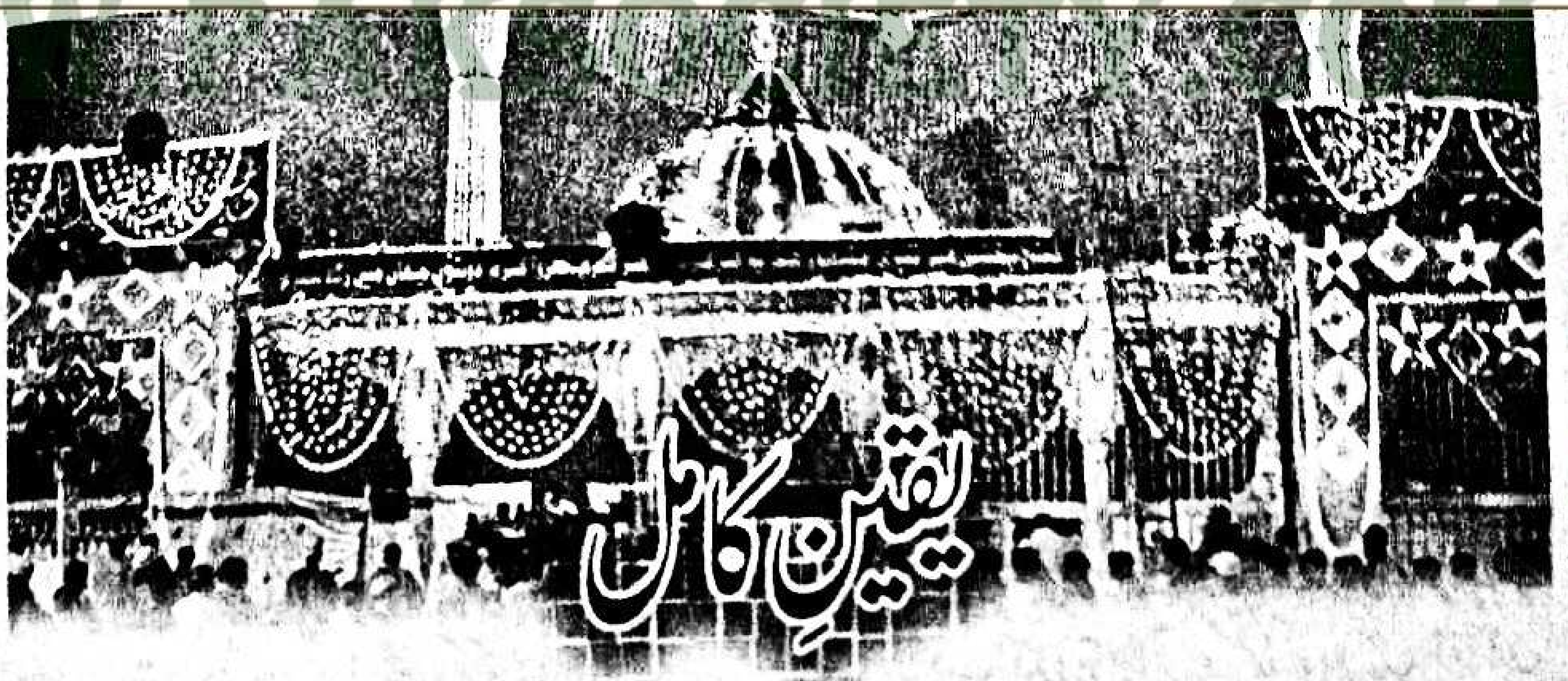
میرے چہرے پر خوف اور دلچسپی دونوں کے تاثرات تھے۔ نانی اماں نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"بیٹا تم ان سے ڈرنا نہیں، وہ نیک بزرگ ہیں۔ تمہیں آج تک ان کی ذات سے کوئی نقصان نہیں ہوا، بلکہ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں، ہمارے حالات پہلے کی نسبت بہت ہی بہتر ہو گئے۔ آج ہمیں یہاں رہتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ ہم ہر طرح سے خوشحال ہیں۔ ہم ان کے آرام کا خیال رکھتے ہیں۔ جہاں ہم اگر بتیاں وغیرہ جلاتے ہیں وہاں ان کا قیام ہے۔ صفائی رکھتے ہیں، اس جگہ کو جمعرات کو مشکبار کرتے ہیں تو وہ بھی ہم سے خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی ہمارے تمام افراد خانہ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اگر کبھی رات میں نیچے کا صدر دروازہ کھلا رہ جاتا ہے تو وہ خود ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دیتے ہیں۔ نانی نے بتایا کہ اگر کوئی ماموں رات کو دیر سے گھر آتے تو ہم لوگ سو جاتے تھے، مگر وہ جاگتے رہتے تھے۔ اپنے بچوں کی طرح سب کا خیال رکھتے تھے۔ جب تک سب گھر نہ آجاتے وہ نہ سوتے۔ میرے بڑے ماموں جن کا اب انتقال ہو گیا ہے۔ (خدا انہیں جنت نصیب کرے، آمین) وہ ان بزرگ سے ڈرتے تھے۔ اماں بتاتی ہیں کہ وہ رات کو دیر سے گھر آتے تھے تو سیڑھیوں سے خود اپنے ساتھ باتیں کرتے آتے تھے، تاکہ انہیں اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ ایک بار نانی اماں کے بھائی اور بھابی ہمارے گھر رکنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ وہ پہلی بار ہماری طرف آئی تھیں، شادی کے بعد۔ اوپر ایک بڑا کمرہ تھا جس میں سب سوتے تھے۔ اس لیے نانی نے انہیں نیچے والا کمرہ دیا۔ رات میں ان کے شوہر باہر گئے۔ انہیں واپسی میں دیر ہوگئی تو بھابی کی آنکھ لگ گئی، مگر غلطی سے ان کے پاؤں اس طرف ہو گئے جہاں ان بزرگ کا قیام تھا، مگر وہ ناواقف تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھیں تو یہ دیکھ کر سخت خوف زدہ ہو گئی کہ ایک اونچے لمبے قد کے نورانی چہرے والے بزرگ جو سر سے پاؤں تک گہرے سبز لمبے چغے میں ملبوس ان کے پاؤں کی طرف کھڑے ہیں۔ انہوں نے نہایت شفقت سے کہا۔ بیٹا اس طرف ہمارا ٹھکانہ ہے۔ پاؤں دوسری طرف کر کے سو جاؤ اور پھر وہ خاموشی سے چلے گئے، مگر بھابی کی تو حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ فوراً اوپر بھاگیں اور آتے ہی نانی کے ساتھ چپک گئیں۔ سب سو رہے تھے، نانی گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ جب انہیں پتا چلا تو وہ مسکرا کر رہ گئیں، ڈرو نہیں بھابی، وہ کچھ نہیں کہتے۔ ہمارا خیال رکھتے ہیں اور اگر ہم سے کوئی بھول ہو جائے تو پیار سے سمجھاتے ہیں، مگر بھابی بہت زیادہ ڈر گئی تھیں، پھر وہ نیچے نہیں گئیں، ہمارے ساتھ ہی سوگئی، تو اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے، جن سے وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے، مگر کبھی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ ہمیشہ ہمیں ان کی ذات سے فائدہ ہی ہوا، کیوں کہ وہ خدا کے نیک بندے تھے۔

پھر میری خالہ کی شادی ہوئی تو کچھ عرصے بعد نانا بھی فوت ہو گئے۔ تو یہ گھر چوں کہ بہت پرانا تھا۔ اس کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں تھیں۔ سب نے کہا کہ کہیں اچانک گر نہ جائے۔ بس اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھر چھوڑ دیا۔ میں بھی اپنی امی کے پاس آکر رہنے لگی۔ خالہ کی شادی کے بعد میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ مگر آپ یقین کریں۔ اس بات کو کافی سال گزر گئے، اس وقت میں 7 سال کی تھی اور آج میری بڑی بیٹی ماشاء اللہ سے آٹھ سال کی ہو گئی ہے۔ وہ گھر آج بھی اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے اور وہ دراڑیں آج بھی موجود ہیں، گرا نہیں۔

سچ ہے جہاں خدا کے نیک بندے رہتے ہوں وہ جگہ، وہ مقامات کیسے گر سکتے ہیں۔ میری نانی اماں کا یہ گھر آج بھی پشاور شہر کے علاقے کوہاٹی گیٹ میں واقع ہے۔ میری شادی کے وقت وہ بزرگ مجھے خواب میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی تھی اور ساتھ ہی کہا تھا کہ اگر کسی بھی قسم کی تکلیف ہو تو بس ان کو یاد کرلوں اور ان کی دعاؤں کے سبب میں اللہ کا شکر ہے کہ ہر قسم کی پریشانی اور دکھ سے محفوظ رہی ہوں۔

☆......☆



یقینِ کامل

تنویر خالد

داتا دربار سے صحتِ کاملہ پانے والے ایک گورنمنٹ ملازم کی بپتا

میں 1973ء میں سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔

سب سے چھوٹا اور امی ابو کا لاڈلا ہونے کی وجہ سے سب ہی بہت پیار کیا کرتے تھے۔ دن یونہی گزرتے گئے اور مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ پڑھنے میں بس گزارا ہی تھا۔ جوں توں کر کے میں نے میٹرک کر لیا۔ آگے پڑھنے سے انکار کرتے ہوئے میں نے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر لی۔ یہ 1991ء کی بات ہے جب میں کام سے واپس آیا تو کمر میں درد ہونے لگا۔

گھر والے اسپتال لے کر گئے اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا جس نے مجھے میڈیسن لکھ کر دے دیں اور پابندی سے دوا لینے کی ہدایت کی۔

انہی دنوں روڈ ایکسیڈنٹ میں ابو کی ڈیتھ ہو گئی، ہم سب پر تو قیامت برپا ہو گئی۔ اُس غم میں، میں اپنا درد بھی بھول گیا تھا۔

وقت گزر جاتا ہے کسی کی خاطر رُکتا نہیں، لہٰذا ہم بھی اپنے کاموں میں معروف ہو گئے۔ آخر کب تک سوگ مناتے، مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا، زندگی کا کاروبار بہر حال جاری رہتا ہے۔

1994ء میں میری شادی میری خالہ زاد کزن سے کر دی گئی اور یوں میں اپنی ازدواجی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ شادی کے تین ماہ بعد لاہور گورنمنٹ فرم میں جاب مل گئی اور یوں میں سیالکوٹ سے لاہور آ گیا۔ لاہور میں کام کرتے ہوئے مجھے تین ماہ ہوئے تھے کہ پھر وہی کمر کا درد شروع ہو گیا اور دن بہ دن درد کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ مجھ سے چلنا پھرنا دُشوار ہو گیا۔

میں لاہور میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ بھی میرے ساتھ فرم میں کام کرتے تھے، جنہیں ہم لوگ حاجی صاحب کرتے تھے۔ دو دن میں کام پر نہیں جا سکا، گھر بھی اطلاع نہیں کی کہ وہ لوگ پریشان ہوں گے۔ دوسرے دن حاجی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ریاست تم کام پر کیوں نہیں آ رہے۔ تو میں نے حاجی صاحب کو سب صورت حال بتا دی۔ حاجی صاحب نے جا کر فرم میں اطلاع دی اور میرے آفس نہ آنے کا سبب بتایا۔ فرم کی طرف سے مجھے اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹرز نے مختلف چیک اپ کیے اور مجھے اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا۔ دو دن کے بعد رپورٹس آئیں۔ ڈاکٹرز نے کہا کہ کوئی زیادہ سیریس مسئلہ نہیں ہے، آپ کچھ دن آرام کریں اور میڈیسن لو۔ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دے کر فرم نے گھر

بھیج دیا۔ میڈیسن لینے کے باوجود درد کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ خیر جیسے تیسے کر کے ایک ہفتہ گھر گزار، اور پھر کام پر واپس آ گیا۔ کام پر جاتا تو تھا مگر درد ویسے کا ویسا ہی رہا.....! اور پھر ریڑھ کی ہڈی باہر کی جانب اُبھرنے لگی۔ اس نئی صورت حال سے میری پریشانی مزید بڑھنے لگی۔ اب تو میں تھوڑا سا بھی چلتا تھا تو سانس پھولنے لگتا تھا۔ کرائے کے مکان سے لے کر فرم تک 1/2 کلو میٹر سفر طے کرتے ہوئے راستے میں 10 سے 12 مرتبہ بیٹھ کر سانس لیتا تھا۔

ڈاکٹروں نے اپنا زور لگا لیا مگر اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دے دیا۔ لوگوں کے کہنے پر دم درود، تعویز دھاگہ بھی کروا لیا، مگر رتی بھر بھی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ پریشان ہو کر میں ایک مہینے کی چھٹی پر گھر چلا گیا۔ وہاں سیالکوٹ میں بھی بہت علاج کروایا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ اب تو کمر بھی جھک گئی تھی اور ریڑھ کی ہڈی واضح نظر آنے لگی تھی۔ میں مہینہ گزار کر واپس لاہور آ گیا، کام پر جاتا تو وہاں فارغ ہی بیٹھا رہتا تھا۔

ایک دن نا جانے دل میں کیا خیال آیا، میں اٹھا اور جمعرات کی شام داتا دربار پر چلا گیا، کچھ دیر وہاں پر بیٹھا رہا پھر مغرب کی نماز ادا کی اور واپس آ گیا۔ اس رات میں لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ دربار پر اتنے لوگ ہیں کیوں اور کس لیے آتے ہیں، انہیں آخر کچھ ملتا ہے تب ہی تو آتے ہیں۔ ڈاکٹرز، حکیم، عامل، باباؤں سب کو آزما کر دیکھ لیا ہے، چلو اب بابا جی کے قدموں میں گر کر دیکھتے ہیں۔

اس دن کے بعد میں ہر جمعرات داتا دربار جانے لگا۔ پہلے پہل تو چلنا دشوار تھا مگر پھر ہر جمعرات قدم خود بہ خود دربار کی طرف اٹھنے لگتے۔ اب راستے میں صرف ایک یا دو بار بیٹھتا تھا، دربار پر جاتا، وہاں نماز پڑھتا اور اللہ سے رو رو کر دعا مانگتا اور اللہ بہت بے نیاز ہے۔

درد اب کم ہونے لگا تھا اور اب میں جب چلتا تھا تو سانس بھی نہیں پھولتا تھا۔ ہر جمعرات دربار پر حاضری دینا میرا معمول بن گیا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ میں جلدی سے صحت یابی کی طرف آنے لگا۔

پھر انہی دنوں میرے گھر اللہ نے ایک بیٹی دی، میں گھر چلا گیا۔ گھر والے بھی سب میری بدلی ہوئی حالت دیکھ کر خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ جب واپس آیا تو پہلے داتا صاحب گیا، وہاں حاضری دی، لنگر کھایا اور اپنے کوارٹر میں گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری حالت میں بہتری آتی گئی اور پھر چار سال اور سات ماہ بعد میں اپنے پاؤں پر بالکل سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔ میں سیدھا دربار پر گیا، وہاں پر لنگر تقسیم کیا اور فیکٹری آ گیا وہاں پر سب دوستوں کو مٹھائی کھلائی۔ میں اپنے رب کا بہت شکر گزار تھا کہ میرے رب نے مجھے اس آزمائش سے نکالا تھا۔ میرا دل ہزار بار اللہ کا مشکور تھا۔

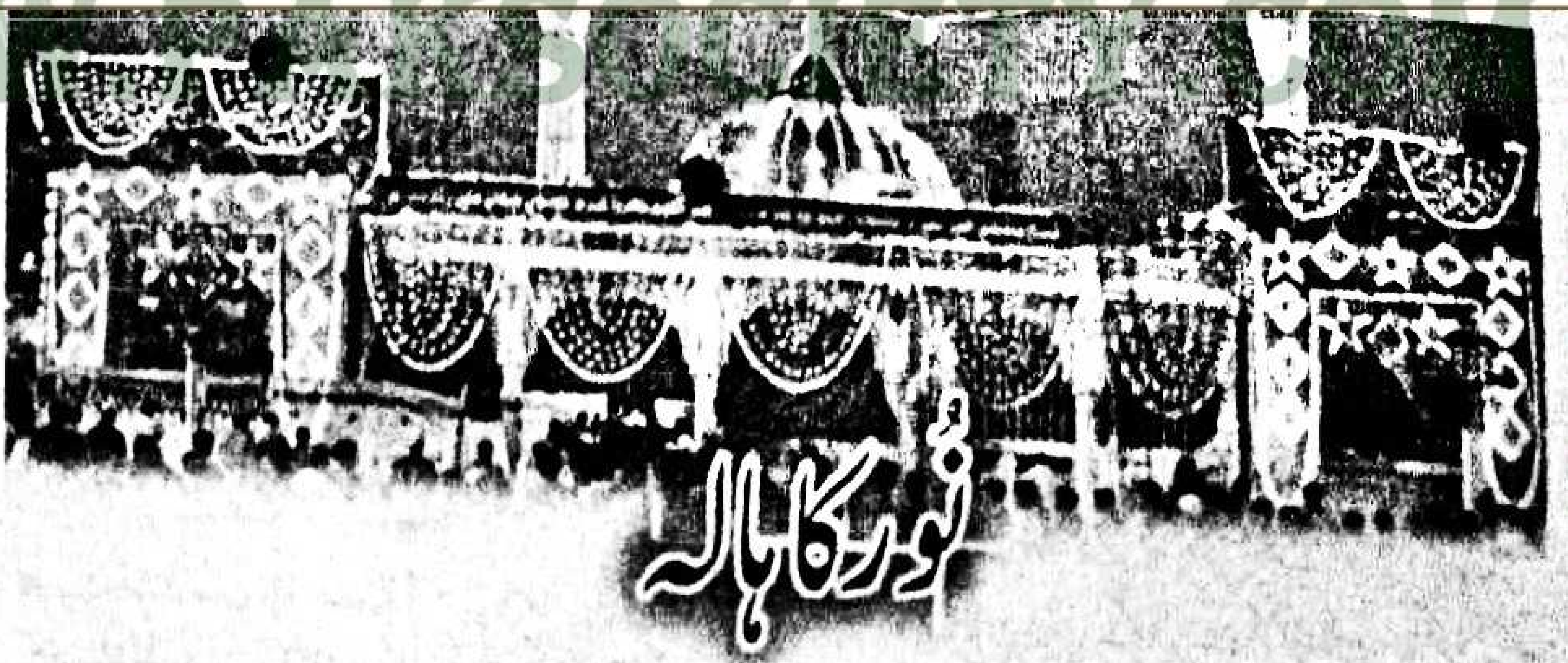
بزرگانِ دین کے در سے انہیں وسیلہ بنا کر اگر اللہ سے کچھ مانگو تو اللہ کبھی آپ کی دعا رد نہیں کرے گا۔ میں آج بھی دربار پر جاتا ہوں اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہوں کہ جسے ڈاکٹر حضرات لاعلاج کہہ رہے تھے، اُس کا علاج اللہ نے اپنے پیارے کے در سے کروایا تھا۔

اللہ اپنے پیاروں، اپنے برگزیدہ بندوں کے در سے بھی دیتا ہے۔ بس آپ کو مانگنے کا طریقہ سلیقہ آنا چاہیے۔

آج میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس بات کو چودہ سال ہو گئے ہیں اور اِن چودہ سالوں میں مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری کمر میں درد ہوا ہو۔

☆......☆





نور کا ہالہ

ندا ہاشمی

کشمیر سے ایک معجزاتی حقیقت جسے کراچی سے راوی نے تحریر کیا

یہ تحریر میری زندگی میں رونما ہونے والی کڑی سچائی ہے۔ بہت ہی انوکھی بات ہے کہ میری خوشیوں سے لبریز، پرسکون زندگی میں ایک ننھے سے فرشتے کی آمد ہوئی۔ وہ کوئی میری اپنی اولاد نہ تھا، بلکہ وہ میرا ایک پڑوسی تھا جو کہ کچھ ہی عرصہ پہلے ہی کشمیر سے یہاں کراچی تعلیم حاصل کرنے اپنے ماں باپ کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا نام "عامر حیدر" ہے۔ جب وہ لوگ ہماری بلڈنگ میں شفٹ ہوئے تھے تو کچھ ہی دنوں بعد اس کی ماں نے مجھ سے اپنے بچوں کو پڑھانے کی درخواست کی اور میں نے گھر والوں کی اجازت سے ان کی اس درخواست کو بہ خوشی قبول کرلیا۔ پہلی ہی مرتبہ عامر نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا اس نے مجھے اس کی ذات کی گہرائیوں میں ڈوبنے اور غور کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ کوئی آٹھ نو سال کا ہی رہا ہوگا اس وقت، مگر اس کے مزاج کی سنجیدگی اور پراسراریت سب ہی کو حیرت زدہ کیے رہتی تھی۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ ہر کام کو پوری ذمے داری اور خوش اسلوبی سے ادا کیا کرتا۔ کبھی کسی کام کے لیے نہ کہنا تو جیسے اس کی توہین ہو۔ بات بھی کبھی ہی کیا کرتا۔ ہنسنے والا نہیں تھا، مگر اتنا سنجیدہ مزاج تھا کہ لوگ اس سے کچھ خوف سا کھاتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا مجھ پر اس کی ذات اور اس کے اس پراسرار مزاج کی حقیقت واضح ہوتی جاتی تھی، ایک دن باتوں ہی باتوں میں اس کی ماں نے گھر میں ہونے والی باتوں کی تفصیلات بتائیں اور اس کے بہت ہی ذاتی معاملات سے باخبر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ کشمیر میں ان کے سسرالی بہت ہی وحشی فطرت کے ہیں، خصوصاً ان کی عورتیں جن میں سے ایک نند اور جیٹھانی بہت ہی ظالم اور بے رحم تھیں۔ نسیمہ (عامر کی والدہ) نے بڑے دُکھ کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ انہوں نے نسیمہ کی معصوم و بے گناہ دو ماہ کی بچی کو دودھ میں زہر ملا کر پلا کر ماردیا۔ ان کی اس خوفناک سازش کا شکار ایک اور معصوم و بے زبان بچی بھی ہوئی جو کہ خود نسیمہ کی نند کی بیٹی تھی، جس نے وہ بچا ہوا دودھ اُٹھا کر پی لیا اور وہ بھی موقع پر ہی جان بحق ہوگئی اور اسی طیش میں آکر نسیمہ کی نند اور جٹھانی نے اس کا اور اس کے بچوں کا جینا حرام کردیا۔

نسیمہ کا شوہر اپنے بیوی بچوں کو لے کر مجبوراً کراچی آکر رہنے لگا۔ عامر اور اس کے گھر والوں پر پے در پے پڑنے والے مصائب نے انہیں گردوپیش سے کچھ بے خبر سا کردیا تھا۔ صرف تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ تھی جو انہیں اس درد سے کچھ دیر کے لیے جدا کردیا کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے، مگر

کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو ہمیشہ کے لیے یکسر تبدیل کر جاتا ہے اور انسان اسی تبدیلی کا عادی سا ہو جاتا ہے، پھر ہوا یوں کہ اچانک کسی وجہ سے عامر کی ماں اور بہن بھائی کو واپس جانا پڑا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ یہاں کی مہنگائی کی وجہ سے واپس کشمیر جانے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ عامر کی ماں نسیمہ، بہن اور بھائی واپس کشمیر لوٹ گئے اور عامر اور اس کے والد کراچی میں رہ گئے۔

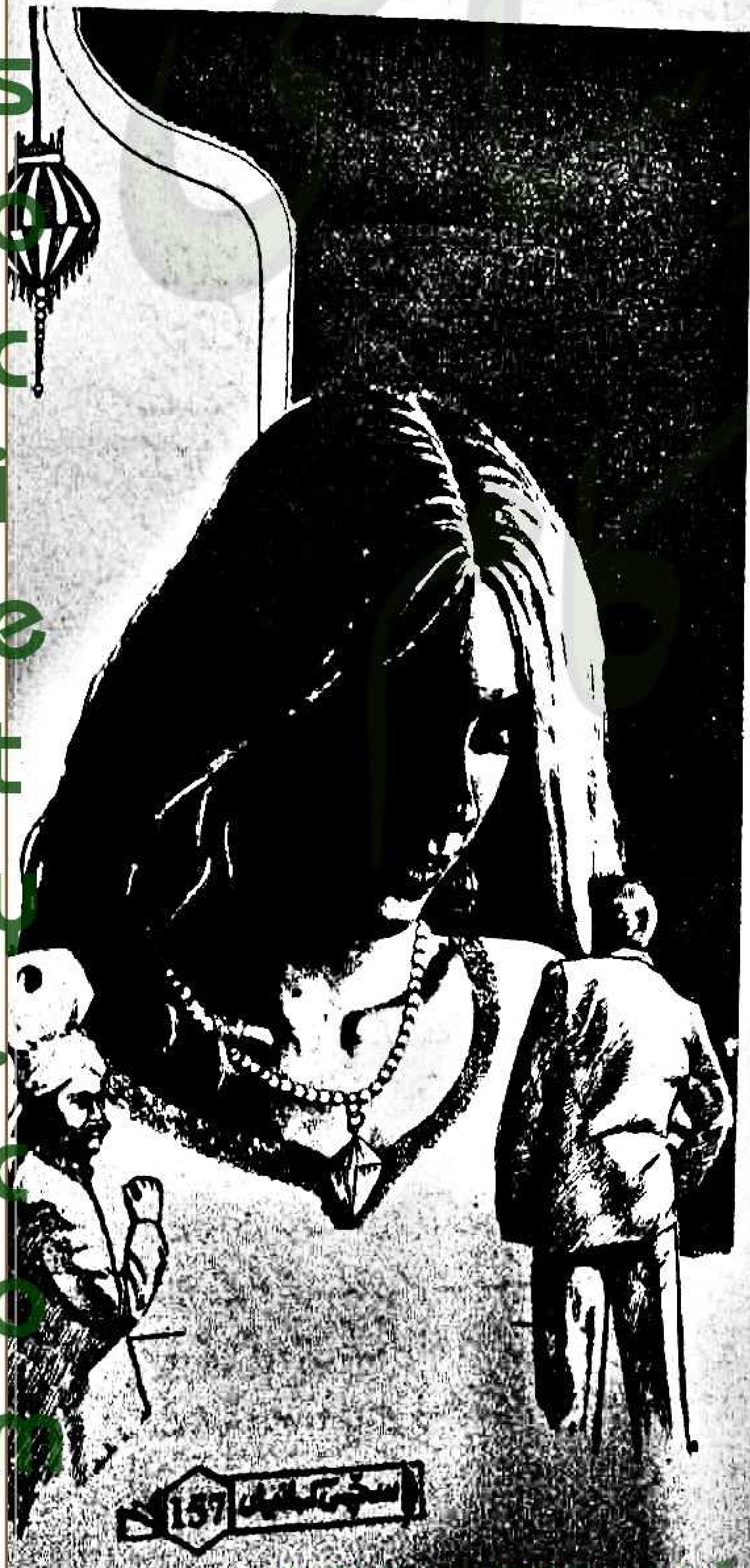
عامر کو پڑھ لکھ کر کسی لائق بننا تھا اور ان کے والد کا معمولی سا کاروبار بھی یہیں تھا، تھوڑا بہت جو بھی ہو وہ اسے پس انداز کر کے اپنے گھر والوں کو بھجوا دیا کرتا۔ اسی بہانے قدرت کا کرم ہوا کہ میرے گھر والوں نے عامر کو مستقل طور پر گود لے لیا اور ہم سب مل کر اس کی تعلیم اور کھانے پینے کا خرچ برداشت کرنے لگے۔

اسکول سے آنے کے بعد سے وہ ہمارے یہاں ہی رہتا اور اکثر رات کو بھی ہمارے یہاں ہی سو جاتا تھا۔ اس کی نظروں کی وہ پراسراریت اب بھی ویسے ہی قائم تھی، میں چوں کہ خود بھی اس وقت اتنی بڑی نہ تھی اور نہ ہی اتنی ہوشیار جو اس راز کو سمجھ پاتی، لیکن قدرت نے مجھے وہ بصیرت بخشی تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہمارے گھر کے حالات وقت کے ساتھ ساتھ ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے والد کا انتقال، معاشی تنگی پھر ماں کی مہلک دمے کی بیماری نے ہم سب کے حوصلے پست کر دیے، کسی بھی طرح سے ہم سب بہن بھائی مل کر گرہستی کی گاڑی کو کھینچ رہے تھے۔ ہم کل پانچ بہن بھائی تھے۔ بہنیں اور ایک بھائی۔ ہم سب ہی میں ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا جذبہ تھا، لیکن قسمت کے آگے سب بے بس و لاچار تھے۔ معاشی تنگی نے سب کو بے حال کر دیا تھا۔ اوپر سے تعلیم کے بھی اخراجات تھے۔ چھوٹی موٹی نوکریوں سے جو کچھ حاصل ہوتا، وہ سب کا سب غربت کی نظر ہو جاتا، کچھ پس انداز کرنے کا موقع ہی نہ ملتا، مگر ہم نے اپنی تعلیم ضرور مکمل کی۔ عامر بھی ہمارے ہی ساتھ رہا اور تعلیم پر توجہ دیتا رہا، حالات کچھ سدھرے تو مجھے عامر کی نظروں کی پراسراریت پھر سے سوچوں کے سمندر میں غرق کرنے لگی۔

میں نے اس کی شخصیت کی پراسراریت اور اس راز کی حقیقت جاننے کے لیے اس پر اور اس کے ارد گرد ہونے والے واقعات پر نظر رکھنا شروع کر دی، اس کے اسکول کے اسٹاف سے میری اچھی بات چیت تھی اور دیگر جاننے والوں سے بھی کافی میل ملاپ تھا۔ گزشتہ کچھ برسوں میں آنے والی غیر متوقع تبدیلیاں اور واقعات و حادثات کی تفصیلات جاننے کے بعد مجھ پر یہ آشکار ہوا کہ ہر بری نیت رکھنے والا شخص اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث لوگ ہی (جو کہ کسی بھی حوالے سے عامر سے منسلک تھے) اچانک کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کرتا اور اتنا بھیانک انداز میں رونما ہوتا کہ لوگ اس کے بارے میں سوچتے سے ہی کانپ اٹھتے تھے، شاید یہی وہ وجہ تھی کہ جس کی وجہ سے عامر پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔

یہ ساری سچائی جاننے کے بعد ہی میں نے عامر سے بات کرنے کی ٹھانی، مگر وہ اتنا کم گو تھا کہ اس سے بات کرنا مجھے اپنی سبکی محسوس ہوتی، مگر میں بھی اپنے



ارادے پر قائم رہی اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

میں خود بھی اس پراسرار سلسلہ کو روکنا نہیں چاہتی تھی اور ایک دن میں نے کھلم کھلا اس بات کا اعتراف عامر سے کچھ یوں کیا۔ "عامر! یہ جو بھی واقعات ہماری تمہاری زندگی میں رونما ہوتے رہے ہیں، میں ان سے بہت خوش ہوں، گوکہ یہ سب کچھ انتہائی بھیانک ہے۔"

عامر نے آخرکار اپنی خاموشی توڑی اور کہا۔ "میں جانتا تھا کہ اس پوری دنیا میں صرف ایک آپ ہی ہیں جو میری اس کیفیت کو صاف دل سے قبول کر سکیں گی۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"یہ حقیقت ہے کہ میرا وجود ان لوگوں کی بربادی اور موت کا باعث ہے جو اللہ تعالیٰ کی حدوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ صحیح اور غلط کے درمیان فرق کو فراموش کر دیتے ہیں۔ میری بہن کی موت اور اس کے قاتلوں کا مکافاتِ عمل اور دیگر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کی سزائیں، گوکہ ان زخموں کو مندمل نہیں کر سکتیں، مگر مجرم کو سزا ملنے سے جیسے برسوں کی جلتی ہوئی آگ یکدم سرد پڑ جاتی ہے۔"

میں نے اس سے اس کی شخصیت کا راز جاننا چاہا تو اس نے کہا۔ "یہ بہت عرصہ پرانی بات ہے، جب میں کشمیر میں رہا کرتا تھا۔ گھر میں غربت کا ڈیرہ تھا، اسی لیے میری ماں کو گزارے کے لیے، ہم بچوں سمیت کھیتوں میں کام کرنا پڑتا۔ "کشمیر" چوں کہ یوں بھی جلتی ہوئی جنت کا نظارہ دیتی تھی اس پر یہ ستم بھی کہ میرے ددھیال والے بھی مجرمانہ فطرت رکھتے تھے۔

ایک دن جب میں کھیتوں میں کام کر رہا تھا تو بوائی کرتے کرتے دھیان ہی نہ رہا کہ میں کھیتوں کے کنارے پر پہنچ گیا ہوں، وہاں سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک گہرا کنواں سا تھا۔ کچا ذہن تھا، میں اپنی جستجو میں اس کنوئیں تک گیا۔ اس کنوئیں کے اندر ایک رسی بھی پڑی تھی، کنوئیں میں پانی نہ تھا مگر وہ تھا بہت گہرا۔ میں اس رسی کے سہارے کنوئیں کے اندر تک اتر گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کنوئیں کے اندر چار راستے جاتے ہیں۔ کنوئیں کے اندر ایک دم سے جیسے کسی کے سسکنے کی سی آواز آ رہی تھی، میں نے اس آواز کا تعاقب کیا، بہت دیر تک چلتے رہنے کے بعد میں اس مقام پر پہنچا، جہاں سے وہ آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ ایک عجیب سا نور کا ہالہ سا تھا جو مجھے کنوئیں کے اس سرے تک لے گیا اور جہاں وہ ہالہ رُکا، میں بھی وہیں رُک گیا اور پھر اس کے بعد میری نظروں نے جو کچھ دیکھا وہ کسی بھیانک کرشمے خواب سے کم نہ تھا۔

ایک عجیب سا خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا، کئی بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد سب ہی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے اعضاء جھلسے ہوئے اور کئی کے اعضاء تو کٹے ہوئے بھی تھے۔

ایسے وقت میں اگر کوئی اور ہوتا تو یا تو وہ خوف سے ہی بے ہوش ہو جاتا یا پھر اُلٹے پیروں واپس پلٹ جاتا، مگر نہ جانے کیا ہوا میں نے وہاں رُک کر انہیں اس ظلم سے نجات دلانے کا سوچا، مگر جوں ہی میں ان کے نزدیک گیا تو وہاں ایک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور اچانک وہ کنواں ایک حسین منظر میں تبدیل ہو گیا۔ اور پھر مجھے اپنے عقب میں سے ایک آواز سنائی دی۔ کوئی بزرگ کہہ رہے تھے کہ "بیٹا سامنے پیالے میں رکھا ہوا وہ پانی پی لو! خدا نے تمہیں اپنے محبوب بندوں میں سے چُن لیا ہے۔"

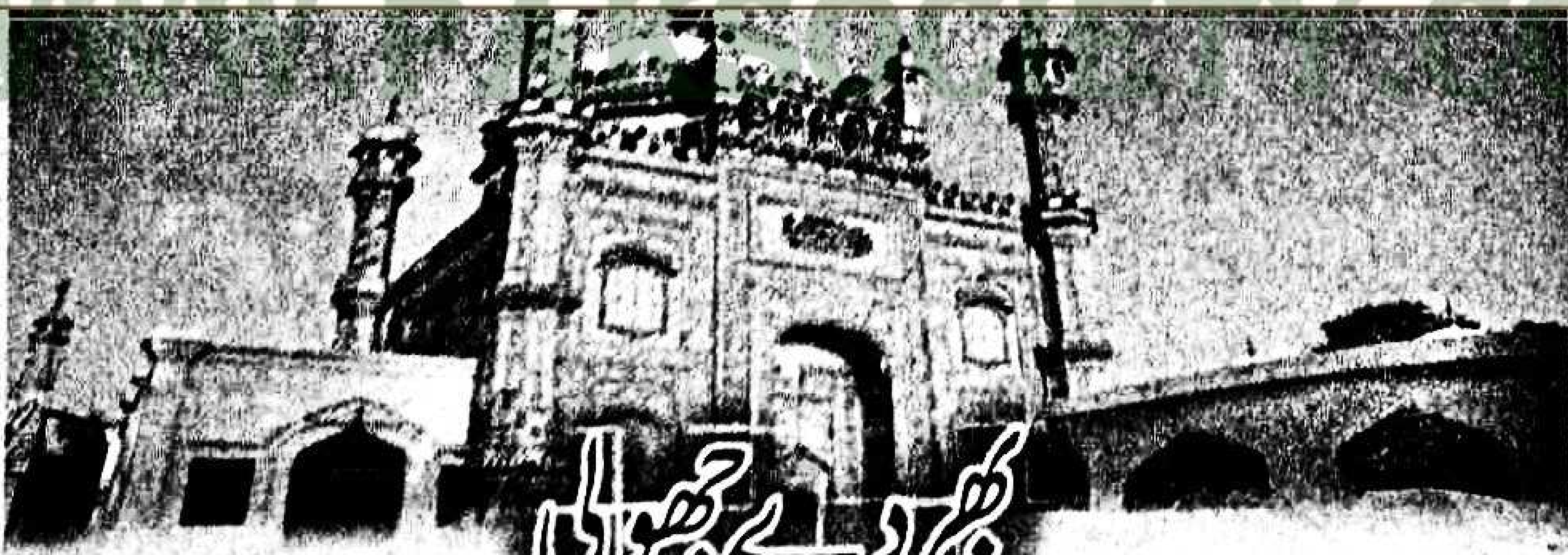
اتنا سننا تھا کہ وہ پانی میں نے پیا اور پھر گہری نیند میں چلا گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنے بستر پر پایا، مجھے جیتا جاگتا دیکھ کر میری ماں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی اور ابو نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

جب میں نے ان سب سے پوچھا کہ مجھے کیا ہوا تھا تو لوگوں نے بتایا کہ رات کے کسی پہر میں انہیں اس جگہ بے ہوش حالت میں ملا جہاں برسوں پہلے بھارتی فوجیوں کا بنایا عقوبت خانہ ہوا کرتا تھا اور وہاں پر بے گناہ کشمیریوں پر بے پناہ، خطرناک، مظالم ڈھائے جاتے تھے۔"

اس واقعے کے بعد یکے بعد دیگرے میرے ساتھ یہ واقعات ہونا شروع ہو گئے۔ جیسے ہی ظالم اور اللہ کا نافرمان ترین بندہ مجھ سے ٹکراتا یا کچھ دن میری سنگت میں رہتا وہ تباہ و برباد ہو جاتا یا اسی طرح کے کسی خوفناک حادثہ کا شکار ہو جاتا تھا۔

کشمیر میں چوں کہ سب لوگ اس پراسرار واقعے سے واقف تھے، اسی لیے مجھے ابا کراچی لے آئے مگر ان نیک بزرگ کی دعا آج بھی میرے ہمراہ بے گناہ لوگوں کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔" اس سارے ماجرے کو سننے کے بعد میں کچھ مطمئن سی ہو گئی ہوں، کیوں کہ اب اس دور میں انصاف ایک معجزہ بن گیا ہے۔ عقل مند لوگ انصاف کرنا ہی نہیں چاہتے، روز بے گناہ مظالم کا شکار ہوتے ہیں، مگر اللہ کی قدرت سے خالی نہیں ہے، وہ کسی نہ کسی روپ میں آ کر گناہ کاروں کو ان کے کیے کی سزا دلاتی رہے گی۔

☆......☆



بھر دے جھولی

الماس فاطمہ ارمان

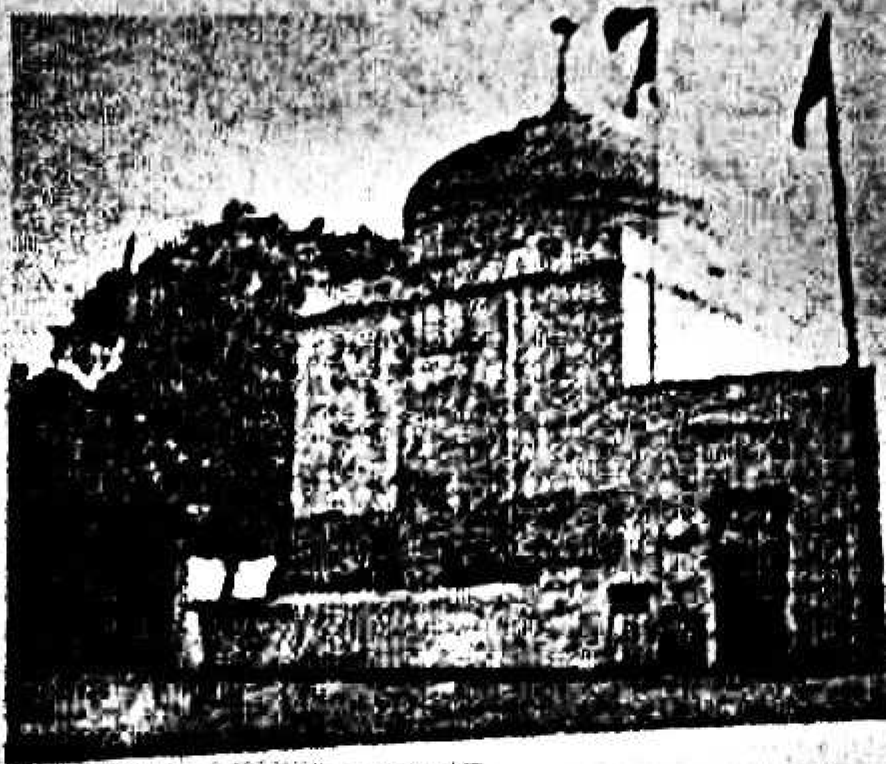
کراچی میں بابا تاج الدینؒ کے مزار پر ملنے والی ایک قلندر فقیرنی کی کہانی




پرانا گولیمار ریلسل اسٹاپ سے اندر جا کر ایک بہت ہی پرانا مزار ہے، جس کا نام بابا تاج الدین اولیاء ہے۔ اس مزار کی روحانیت کے بارے میں اکثر محلے کی خواتین سے میں تعریف سنتی رہتی تھی۔ مجھے بھی اس مزار کی زیارت کرنے کی تمنا ہوئی تو میں نے اپنی دوست سے کہا کہ جمعرات کو میں بھی بابا کے مزار پر جاؤں گی۔ وہاں صبح سے ہی رونق ہوتی ہے اور بابا کے عقیدت مندوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔ میں جمعرات کو اپنی دوست کے ساتھ بابا کے مزار کی زیارت کے لیے چل دی۔ مجھے اسٹاپ سے کافی دور پیدل چلنا پڑا، جگہ جگہ قبرستان اور چھوٹے چھوٹے مزار تھے۔ مجھے قبرستان سے گزر کر جاتے ہوئے عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا، مگر جب میں مزار کے قریب پہنچی تو یقین مانیں، میں اس مزار کی نورانی حقیقت میں کھو گئی۔ مزار اتنے خوب صورت طریقے سے بنایا گیا تھا کہ آنکھیں حیرت زدہ تھیں۔ جہاں پر بابا تاج الدینؒ کا مقبرہ تھا، اس کے ارد گرد دُور دُور تک نُور پھیلا ہوا تھا۔ خواتین کی بڑی تعداد بلند آواز میں کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس ہی لمحے مجھے ایک عورت کی دُکھ بھری آواز سنائی دی جو رو رو کر مزار کی سیڑھیوں پر بیٹھی یہ قوالی گا رہی تھی۔

بھر دو جھولی میری یا محمد ﷺ
لوٹ کر میں نہ جاؤں گی خالی

یقین مانیں اس قوالی میں اتنا درد تھا کہ میں سنتے ہوئے اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے لمبے گھنے بال بکھرے ہوئے تھے، جس سے اُس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا اور وہ زور زور سے زمین پر اپنا سر مار رہی تھی، جس کی وجہ سے




اُس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کے خون سے زمین لال ہو رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ جھومتے ہی جھومتے ایک بلند آواز میں حق علیؓ، دم دم علیؓ کا نعرہ بلند کرتی۔ اس نعرے میں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ میرے حضرت علیؓ سے فریاد کر رہی ہو۔ اُن سے کچھ اپنے درد کا مقصد بیان کر رہی ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ اس کے دل میں بہت درد ہے، جس کو مٹانے کے لیے اللہ کی ان انمول ہستیوں سے وہ فریاد کر رہی ہے، جوان کے وسیلے ہیں۔ اللہ پاک ان کے وسیلے سے ضرور دل کی مراد پوری کرتا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کا درد جاننے کی کوشش کر کے ہی جاؤں گی۔

کافی دیر دھمال ڈالنے کے بعد وہ عورت بے ہوش ہو گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ان کے قریب پہنچ گئی، پھر میں نے پانی کا گلاس ان کے ہاتھ سے لیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اتنے میں وہ بڑی بی ایک پرانا دوپٹا لے آئیں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے لے کر اس کا ایک حصہ جلایا اور خون بہنے والی جگہ پر بھر دیا، تھوڑی دیر بعد خون بہتا بند ہو گیا۔ کچھ دیر میں وہ پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ میں نے اسے اپنی دوست اور بڑی بی کی مدد سے درخت کے نیچے لا کر لٹا دیا، تاکہ وہ ریلیکس ہو جائے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

''شکریہ بہن! آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔ بابا! اللہ کی مدد سے آپ کی ہر مراد پوری کرے۔ کیا آپ مجھے اپنا نام بتائیں گی؟'' میں نے بے اختیار یہ جملہ کہا۔ ''ہاں کیوں نہیں۔ میرا نام سُندس ہے۔'' ''بڑا پیارا نام ہے اور اس نام کی طرح آپ بھی۔'' ''اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات عرض کروں۔''

''ہاں سندس بہن۔ تمہاری فریاد میں اتنا درد ہے کہ مجھے یہاں رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں تم سے بات کرنے کے لیے رُکی ہوں۔ دراصل میں ایک معمولی سی لکھاری ہوں۔ میرا قلم ہر مظلوم عورت کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ سندس کیا تم اپنا درد مجھ سے بیان کرو گی۔''

''ہاں! میں ضرور بتاؤں گی۔ تم ضرور اپنی کتاب میں میری داستان لکھو۔''

''سنو! میں اسی محلے میں پیدا ہوئی۔ ہم یہاں سے تھوڑی دور کچی آبادی میں رہتے تھے۔ میرے ابا ٹھیلے پر بٹ اور اُدھڑی پکا کر بیچتے تھے۔ اس سے گھر کی گزر بسر ہوتی تھی۔ میری اماں بھی میری طرح اچھی شکل و صورت کی تھیں۔ ابا اماں سے بہت محبت کرتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ ابا کو اچانک ٹی بی جیسے موذی مرض نے جکڑ لیا۔ ابا علاج کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی پیٹ پالنے کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔ آخر کار ان کی ہمت دم توڑ گئی اور وہ زندگی سے لڑتے ہوئے موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ ان کے مرنے کے بعد ہم دادی اور چاچا کے پاس گاؤں چلے گئے۔ اماں کی عدت کے بعد دادی نے میری ماں کا نکاح چاچا سے پڑھوا دیا۔ چاچا چھوٹی عمر کا تھا۔ اس کے علاوہ بہت ہی نشے باز تھا اور حد سے زیادہ نشہ کرتا تھا۔ میری ماں نے مجبور ہو کر حالات کے آگے سر جھکا دیا۔ اماں سارا دن شہر جا کر لوگوں کے گھروں میں کام کرتی اور پھر شام کو لوگوں کا بچا کھچا کھانا کھا کر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے۔ اماں کو جو پیسے ملتے تھے، وہ بھی دادی چھین لیتی تھی۔ اس طرح ظلم و ستم سہتے ہوئے میں جوان اور میری ماں وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی۔ چاچا دوسری عورت گھر لے آیا۔ اب تو زندگی اور اجیرن ہو گئی، کچھ وقت کے بعد دادی بھی مر گئی۔ اب گھر پر چاچا اور دوسری بیوی کا راج تھا۔ آخر کار اس نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ میری ماں نے چاچا اور چاچی کی بہت منت سماجت کی کہ میں جوان بچی لے کر کہاں جاؤں گی، مگر ہمیں اس کے منت کے بدلے دھکے ملے۔ آخر کار حالات سے تنگ آ کر میری ماں نے ہمت کی اور گاؤں کے وڈیرے کی اجازت سے اس کے گھر کے پیچھے ایک جھگی ڈال لی۔ اماں نے جھگی تو ڈال لی، مگر وہ میری وجہ سے بہت زیادہ فکر مند رہتی تھی، کیوں کہ اسے علم تھا کہ اس کی بیٹی جوان اور خوب صورت ہے۔ اس لیے اماں نے مجھے باہر نکلنے کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اگر کبھی اماں مجھے اپنے ساتھ لے کر باہر جاتی بھی تو وہ نقاب میں لے جاتی، تاکہ وڈیرے کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ ایک دن صبح سے گھر میں پانی نہیں تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ مٹکے خالی ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں سامنے کنویں سے پانی لے آتی ہوں۔ بھائی چھوٹے تھے اور وہ میری بات بھی نہیں مانتے تھے، اس لیے میں خود ہی پانی لینے چلی گئی۔ دو پھیرے لا کر جب میں تیسرا پھیرا لینے گئی تو پتا نہیں کہاں سے وڈیرا اپنی جیپ میں نمودار ہوا

اور اس نے جیپ لا کر میرے سامنے روک دی۔ میں گھبرا کر جلدی سے جنگل کی طرف بھاگی، مگر اس نے مجھے دیکھ لیا، بس یہیں سے میری زندگی اجیرن بن گئی۔ وڈیرے نے اماں کو اپنی اوطاق میں بلایا اور کہا۔

"رفیہ! تیری بیٹی اتنی حسین ہے کہ ایک نظر میں میرا دل لوٹ کر لے گئی، تُو اپنی بیٹی میرے نکاح میں دے دے۔ میں اسے اپنی رانی بنا کر رکھوں گا۔" میری اماں نے سوچنے کی مہلت مانگی اور گھر آ کر اس نے مجھے بہت مارا کہ تُو باہر کیوں گئی تھی، آخر ماں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "سندس سب سامان سمیٹ، ہم رات کے کسی پہر یہاں سے نکل کر کراچی چلے جائیں گے۔ وہاں میرے، بہت سے عزیز ہیں، کوئی تو سہارا ملے گا۔ یہاں بھی محنت کرتی ہوں، وہاں بھی کرنی ہے، مگر تو اس وڈیرے کے ظلم سے بچ جائے گی۔"

میں نے ماں کے حکم کے مطابق ضرورت کا سامان سمیٹا اور ہم رات کا انتظار کرنے لگے۔ آدھے پہر اماں نے ہم تینوں کو ساتھ لیا، تھوڑا بہت سامان اٹھایا اور ہم بس کے اڈے کے راستے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ وڈیرے کے آدمی جیپ میں ہماری طرف بڑھے، شاید پہلے سے ہی وہ ہمارا پہرہ دے رہے تھے۔ میری اماں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"سندس تُو اس کچے کے راستے بھاگ، میں تجھے اللہ اور پنجتن پاک کے حوالے کرتی ہوں۔ تو بھاگ تجھے جہاں قسمت لے جائے، بس جہاں بھی جا، تو اپنی عزت بچانا، میں ان لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ تیری بہتری اسی میں ہے، قسمت کو منظور ہو گا تو ہم پھر ملیں گے۔ بھاگ میری بچی، اپنی عزت بچا۔" یہ کہہ کر ماں نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں کچے کے راستے اتر گئی۔ پتا نہیں میں کب تک بھاگتی رہی۔ صبح نمودار ہونے لگی تھی۔ مجھے سامنے چند جھونپڑیاں نظر آئیں، میں اسی جانب بڑھنے لگی۔ ایک جھونپڑی کے پاس جا کر رکی تو میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ گلے میں بڑی بڑی مالائیں پہنے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بہت ہی نور تھا۔ میرے قدم خود ہی اندر کی جانب بڑھ گئے۔ میں ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ بزرگ نے نماز ختم کر کے سلام پھیرا اور میری طرف مڑے۔

"کون ہو بیٹی تم۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، پھر میں نے روتے ہوئے تمام حقیقت بیان کی تو انہوں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو بیٹی۔ تم قلندر کے فقیر کے گھر میں آئی ہو۔ تمہارا یہاں کوئی بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔ آج سے تم میری بیٹی ہو، اس طرح میں ان فقیر بابا کے ساتھ رہنے لگی۔ میں نماز کی پابند بن گئی اور میں نے بھی بابا سے کہا کہ میں قلندری اپنانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹا یہ بہت مشکل کام ہے۔"

میں نے ان بزرگ سے کہا۔ "کچھ بھی ہو، میرا مقصد اب قلندری بننا ہے۔" بابا مجھے شہباز قلندر لے گئے۔ چھ مہینے میں نے وہاں شہباز قلندر کی بیعت لی۔ بابا نے اپنی تمام مالائیں اور اپنی تمام خلعتیں مجھے بخش دیں۔ اس طرح میں قلندر کی فقیرنی بن گئی۔ کچھ مہینے پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے، مگر وہ مجھے اس طرح کی زندگی دے گئے، جو میرے لیے مشعلِ راہ ہے، بس جب سے میں قلندروں کی ٹولی میں شامل ہوں، کبھی شہباز قلندرؒ، نورانی بابا، شاہ عتیقؒ اور ہر سال کراچی میں عبداللہ شاہ غازیؒ، تین ہٹی والے بابا اور یہاں بابا تاج الدینؒ بھی سب میرا مرکز ہیں، یہی میری زندگی ہے۔ میں جگہ جگہ فریاد کرتی ہوں۔ میری ایک ہی خواہش ہے کہ اللہ پاک مجھے میری اماں اور بھائیوں سے ملا دے۔ دس سال ہو گئے ہیں مجھے اپنے بھائیوں اور اماں سے بچھڑے ہوئے۔ میرا دل کہتا کہ میری اماں اور بھائی زندہ ہیں۔ پنجتن پاکؑ، حضرت علیؓ، قلندر لالؒ میری ماں، بھائیوں سے مجھے ملا دے، مجھے دنیاوی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ میرا آسرا خدا کے بعد یہ ہستیاں ہیں، جس نے ان ہستیوں کا دامن پکڑ لیا، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور زور زور سے صدا بلند کرنے لگی۔ حسینی لال قلندر، علی دی آل قلندر۔ میرے غم خوار قلندر، حق علی، علی علی، حق علی۔

میں نے سندس سے ہاتھ ملایا۔ میری آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ الٰہی اس کے بچھڑے ہوئے مل جائیں۔

سندس کی ماں نے اپنی بیٹی کو پنجتن پاکؑ اور اللہ کے حوالے کیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ اللہ ضرور اس کی بیٹی کی مدد کرے گا۔ اس طرح جو ہستیاں اللہ کے قریب ہیں، ہمیں اُن کا دل سے احترام کرنا چاہیے۔ ان بزرگ ہستیوں کا واسطہ دے کر اللہ سے مدد کی اُمید رکھنا چاہیے، کیوں کہ یہی وہ وسیلے ہیں، جن کی اللہ پاک سنتا ہے۔ آپ ان کی بارگاہ میں جا کر دل سے کچھ مانگ کر تو دیکھیے۔

☆......☆



کایا پلٹ

مسز نوید ہاشمی

کراچی سے قبولیتِ دعا پر کامل یقین دلاتی ایک کہانی

آج جو یہ کہانی لکھ رہی ہوں، اسے پڑھ کر خدا پر یقین پختہ ہو جائے گا کہ صدقِ دل سے مانگو تو اللہ ہر دعا قبول کرتا ہے۔ میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ بس خدا نے عزت دی ہے، جسے ہم وہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ میرا نام رانی ہے۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے چار بچے، تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

میرا بڑا بیٹا 15 سال، دوسرا 14 سال، بیٹی 13 سال اور چھوٹا بیٹا 12 سال کا ہے۔ ہم زندگی نہیں...... زندگی ہمیں گزار رہی تھی۔ سفید پوش لوگ بس کماتے اور اُڑا دیتے، بچوں کی پڑھائی، دوائی، گھر کا کرایہ، بجلی، گیس کا بل اور گھر کے دیگر خرچے...... بچت کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ میں اسکول میں جاب کرتی تھی۔ میرے دونوں بیٹے بھی پڑھنے کے ساتھ ساتھ ورکشاپ میں کام بھی کرتے تھے پھر بھی بچت ناممکن تھی، مگر میری بیٹی کو پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ ہمارے دن ضرور بدلیں گے۔ ہمارا بھی بنگلہ ہوگا، گاڑی ہوگی، ڈھیر سارا پیسا ہوگا۔ وہ کہتی کہ میں اپنے خدا سے روز دُعا مانگتی ہوں اور خدا میری یہ دعا ضرور قبول کرے گا۔ ہمارا گھرانہ مذہبی تو زیادہ نہ تھا، مگر نماز ہر بچہ پڑھتا تھا۔ اس نماز کے بغیر نہ صبح ہوتی ہماری نہ ہی شام، مگر میری بیٹی ہر نماز کے بعد دل سے یہ دعا ضرور مانگتی کہ اے خدا ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا ہے تو یہ دنیا پوری ضرور دکھا۔ ہمیں اتنا پیسا دے کہ ساری دنیا کی سیر کروں۔ اچھا گھر دے، خوب صورت گاڑی دے، عزت دے۔ ہمیں تو ہی دیتا آیا ہے اور تو ہی دیتا رہے گا۔ اے خدا ہمیں اپنی رحمت سے مایوس مت فرمانا۔ اگر دولت دے تو ہمارے منہ پر شکر کا کلمہ ضرور دینا، تاکہ ہم ہر وقت تیرا شکر ادا کریں۔

اس کی روز روز کی دُعا سن کر اس کے بھائی ہنستے اور کہتے۔ ”دیکھو دُعا مانگ رہی ہے تو شیخ چلی جیسی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ تمہاری شادی ہو جائے کسی امیر گھرانے میں، پھر تمہارے پاس بنگلہ بھی ہو، گاڑی بھی اور تم اپنے شوہر کے ساتھ دنیا کی سیر کرو، مگر ہم ایسے ہی رہیں گے۔ کھایا پیا اور ختم کر دیا۔“ تو وہ فوراً کہتی۔

”نہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اچھا گھر اور اچھی گاڑی ضرور دے گا اور ڈھیر ساری دولت بھی۔“

بھائی کہتے ”ٹھیک ہے پھر ہم کہیں بینک لوٹ لیتے ہیں یا پھر کسی امیر آدمی کو قتل کر دیتے ہیں۔“

تو وہ فوراً کہتی ”اللہ نہ کرے کہ ہم ایسا کریں۔ اللہ ہمیں بُرے کام کرنے سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جائز طریقوں سے، اپنی خوشی سے ہمارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

اس 13 سال کی بچی کی باتیں سن کر میں ماں ہو کر بھی سوچتی کہ میری بیٹی کو اتنا یقین کیسے ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں پیار سے بیٹی سے کہتی۔ "دیکھو ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ جیسے ہیں خدا کا شکر ادا کرو، ایسے خواب مت دیکھو جو پورے نہ ہوں، تو دکھ ہو۔ اپنی آنکھیں کھولو۔ یہ جو دُعا مانگتی ہو، یہ کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ ہمارا تو 60 گز کا اپنا مکان نہیں اور تم بنگلے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ خواب وہ دیکھو جو آسانی سے پورے ہو سکیں۔

تو وہ کہتی۔ "ماما میں تو دُعا مانگ رہی ہوں۔ خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ مانگو اور وہ نہ مانگو۔ میں اپنے اللہ تعالیٰ سے مانگ رہی ہوں کسی اور سے نہیں۔ ہر انسان اپنے دل کی بات جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا، وہ اپنے خدا سے کرتا ہے۔ اگر میں دُعا مانگ رہی ہوں تو مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور قبول کرے گا۔ اگر خدا پر یقین ہو تو ہر کام ہو سکتا ہے۔ جو کوئی نہیں کر سکتا، وہ میرا خدا کر سکتا ہے اور خدا میری یہ دُعا قبول ضرور کرے گا۔" اس کی باتیں سن کر میں لاجواب ہو جاتی۔

☆......☆

ایک روز میں اسکول جانے کے لیے بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی، اُس میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی اور لپک کر میرے پاس آئی اور بولی۔

"حنا میری بیٹی تم زندہ ہو۔"

میں گھبرا گئی، میں نے کہا۔ "نہیں میں حنا نہیں ہوں، میں رانی ہوں۔"

وہ بولی۔ "نہیں نہیں تم میری بیٹی حنا ہو۔ تمہاری یاد میں، میں کتنا روئی ہوں۔ 18 سال سے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ سب کہتے ہیں کہ تم مر گئی ہو، مگر مجھے یقین تھا کہ تم زندہ ہو اور ایک دن ضرور تم مجھ سے ملو گی۔ مجھے میرے خدا پر یقین تھا اور آج دیکھو 18 سال کے بعد تم مجھے مل گئیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھیے آنٹی! آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میری ماں زندہ ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں، میرے چار بچے ہیں۔"

یہ سن کر وہ بُری طرح رونے لگی، "نہیں تم میری بیٹی ہو۔"

"اچھا آپ میرے گھر چلیں، میں آپ کو اپنی ماں سے ملواتی ہوں، مگر میں آپ کی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی، آپ کو پیدل ہی چلنا پڑے گا، میری امی یہاں پاس میں ہی رہتی ہیں۔" وہ خاتون فوراً راضی ہو گئیں۔

☆......☆

میری امی کے پاس آ کر بھی وہ رونے لگیں اور بتانے لگیں کہ یہ میری بیٹی حنا ہے جو پڑھنے جا رہی تھی کہ اس کا جہاز کریش ہو گیا تھا، سنا ہے کہ تمام لوگ مر گئے تھے، مگر مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی نہیں مری ہے، وہ زندہ ہے۔ 18 سال میں نے خدا سے دُعا مانگی ہے۔ مجھے یقین تھا اور دیکھو آج اس نے مجھے میری بیٹی سے ملا دیا۔

میری امی نے ان سے کہا کہ خاتون یہ میری بیٹی ہے۔ میرے سات بچے ہیں۔ سب کا برتھ سرٹیفکیٹ ہے، ہو سکتا ہے میری بیٹی رانی کی شکل آپ کی بیٹی حنا سے ملتی ہو، اس لحاظ سے ماں تو ماں ہی ہوتی ہے چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہو اور میری رانی بھی ایک ماں ہے، اس کے بھی چار بچے ہیں۔" یہ سن کر وہ ایک بار پھر بُری طرح رونے لگی اور کہنے لگی۔

"مجھے معاف کرو وہ تم تو رانی ہو، مگر تم میری بیٹی کی ہم شکل ہو اس لیے اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہیں حنا کہہ دیا کروں۔ مجھے خدا پر یقین تھا کہ وہ مجھے میری بیٹی سے ضرور ملائے گا، دیکھو آج میں اپنی بیٹی کے پاس بیٹھی ہوں۔"

میں نے بھی اس ممتا کی ماری خاتون کو کہہ دیا کہ ہاں جی آپ مجھے حنا کہہ سکتی ہیں، پھر وہ بولیں۔

"حنا تم اپنے بچوں سے نہیں ملواؤ گی۔" ان کی بے چینی اور تڑپ دیکھ کر میری بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "ضرور آنٹی، آپ کو ضرور ملواؤں گی۔" وہ پھر رونے لگی اور کہنے لگی۔

"کیا ایک بیٹی کی دو مائیں نہیں ہو سکتیں، تم مجھے امی نہیں کہہ سکتیں۔"

یہ سن کر میں بے ساختہ اُن سے لپٹ گئی کہ "ہاں آپ بھی میری ماں ہی ہیں۔"

یہ سب دیکھ کر میری ماما بھی رونے لگیں کہ "یہ ان کا اللہ پر یقین ہے، جو سچے دل سے چاہو وہ ضرور ملتا ہے۔"

پھر میں نے اُن کو اپنے بچوں سے ملوایا، وہ بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

دوسرے دن وہ پھر آ گئیں، سب بچوں کے لیے گفٹ لے کر۔

میں نے کہا۔ ''امی یہ کیا؟ یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔

''یہ بتاؤ کیا میں اِن کی نانی نہیں ہوں، اگر نہیں ہوں تو میں یہ گفٹ واپس لے جاتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں آپ ان کی نانی ہیں۔ جب میں نے آپ کو امی کہا ہے تو خدا نے آپ کو خود بہ خود میرے بچوں کی نانی بنا دیا، مگر میرے بچوں کو اتنے مہنگے گفٹ لینے کی عادت نہیں ہے، آپ انہیں میری حیثیت کے مطابق گفٹ دیں۔'' وہ ہنس کر بولیں۔

''میں اپنی حیثیت کے مطابق دے رہی ہوں۔ اب اس بات پر کوئی لڑائی نہیں۔ آخر میں نانی ہوں ان کی۔''

پھر وہ سب بچوں کی مصروفیات کے بارے میں پوچھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''میں تم سب کو اپنے گھر لے کر چل رہی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں امی بچوں کے پیپرز ہو رہے ہیں اور میں بھی اسکول پڑھاتی ہوں، اس لیے پیر سے جمعہ تک مصروف ہوتی ہوں۔ ہفتہ یا اتوار کو فارغ ہوں گی تو ضرور آؤں گی۔''

وہ میرے جواب پر مطمئن ہو کر بولیں کہ چلو ٹھیک ہے، مگر میں تو روز آ سکتی ہوں نا؟ کیوں کہ حنا میں بہت تڑپی ہوں تمہارے بغیر، اب اللہ نے مجھے تمہارے ساتھ ساتھ یہ چاروں بچے بھی گفٹ کیے ہیں تو اب میں اِن سے جدا نہیں رہ سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور امی آپ روز آ سکتی ہیں۔''

دوسرے دن میں نے اپنے اور بچوں کے لیے دال اور چاول بنائے اور تھوڑے سے گوشت کی ان کے لیے کڑاہی بنا دی، عزت بھی تو رکھنی تھی، چھوٹے بچوں سے کہا کہ تم پہلے سے کھانا کھا لو اور بڑے بچوں سے کہا کہ تم دال چاول ہی کھانا اور کہنا کہ یہ میری پسندیدہ ڈش ہے۔ میرے بچے سمجھدار تھے۔ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے سب کھانا کھانے بیٹھے تو سب نے دال چاول لیے، امی نے بھی دال چاول ہی اُٹھائے، میں بے ساختہ بولی۔ ''امی میں نے آپ کے لیے تو چکن کڑاہی بنائی ہے، آپ یہ کھائیے۔'' وہ بولیں۔

''نہیں میں دال چاول ہی کھاؤں گی اور مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے سب کے لیے دال چاول بنائے ہوئے تھے تو میرے لیے چکن کڑاہی کیوں بنائی، میں غیر ہوں اپنا سمجھتیں تو گھر میں جو روز پکتا ہے وہی کھلاتیں، میں تو روز آنے کا کہہ رہی ہوں، لگتا ہے میں روز نہیں آ سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''امی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے آپ معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

پھر وہ جب بھی آئیں، جو پکا کھا لیا۔ ہفتے کے دن صبح صبح آ گئیں کہ چلو اب گھر۔ ہم سب چلنے کو تیار ہو گئے تو اُن کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

☆......☆

جب ہم اُن کے گھر پہنچے تو گھر کیا کوئی محل تھا، اتنا بڑا، خوب صورت، نوکروں کی فوج اور کھانے میں کیا کیا ڈش نہیں بنائی تھی۔ وہ مجھے اور میرے بچوں کو کھلا کھلا کر خوش ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

''امی آپ کے پاس اور کوئی نہیں رہتا'' تو وہ بے ساختہ بولیں۔

''تمہارے غم میں تمہارے والد کا انتقال ہو گیا اور میرے یقین نے مجھے اب تک زندہ رکھا اور تمہارا کوئی بہن بھائی نہیں تھا، تم اکلوتی تھیں، مانا کہ تم میری بیٹی نہیں ہو، مگر میری بیٹی کی شکل صورت کی ہو، آج میری بیٹی اگر زندہ ہوتی تو اس وقت وہ تمہاری طرح ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''کیسے امی جان وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی شکل میں فرق آتا رہتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں آتا ہے، لیکن وہ اگر ہوتی تو بالکل تمہاری جیسی ہوتی۔ اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو آؤ، میں تمہیں حنا کا کمرہ دکھاؤں۔''

جب ہم حنا کے کمرے میں گئے تو حیران رہ گئے کہ میری بچپن سے لے کر آج تک کی تصویر کمرے میں لگی ہوئی تھی، میرے ساتھ ساتھ میرے بچے بھی حیران ہو گئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، تو وہ بولیں۔

''جب سے حنا مجھ سے جدا ہوئی تھی، جب سے لے کر آج تک ہر سال میں مصور سے تصویر بنوائی تھی

کہ میری حتاب کیسی ہوگی اور آج تک کی یہ تصویر ہے۔ اس لیے میں نے جب تم کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دیکھو میرے یقین نے میری بیٹی مجھے واپس کردی۔ بس بیٹی اب اپنی ماں کو چھوڑ کر مت جاؤ کہ یہ سب تمہارا ہے۔ یہ گھر، یہ مال، یہ جائیداد اب میں کتنا عرصہ جیوں گی اب یہ اپنی امانت مجھ سے لے لو، مجھے بھی جینے کا سہارا دے دو۔“

میں نے کہا۔ ”ماں کہ میں آپ کو امی کہتی ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں، آپ کی بیٹی کی شکل جیسی ہوں ضرور، مگر آپ کی سگی بیٹی نہیں ہوں، اگر میں یہ سب لے لوں تو میرا ضمیر مجھے بھی معاف نہیں کرے گا۔ میں آپ کے پاس روز آؤں گی مگر آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی، نہ ہی اس گھر یا جائیداد پر میرا حق ہے۔“ وہ بولی۔

”بیٹا تم مجھے اپنی سگی ماں نہیں سمجھتیں، مگر میں تمہیں سچے دل سے بیٹی سمجھتی ہوں۔ اس لیے میں نہیں چاہتی کہ اتنی دولت ہوتے ہوئے میری بیٹی اور نواسے نواسی ایسی زندگی گزاریں، چلو اگر تمہارا دل نہیں مانتا یہاں رہنے پر تو میں بھی اس محل میں نہیں رہوں گی۔ میں تمہارے ساتھ چل کر تمہارے گھر رہوں گی، جو گھر میں سب کے لیے پکے گا، وہ میرے لیے بھی ہوگا۔ جہاں تم سوؤ گی وہاں میں بھی سو لوں گی، بولو اپنی ماں کو اپنے پاس رکھو گی؟“

میں نے کہا۔ ”ضرور امی آپ ابھی چلیے۔“ وہ فوراً تیار ہوگئیں اور ہمارے ساتھ ہمارے گھر آ گئیں۔

☆......☆

وہ پہلی مرتبہ ہمارے گھر رک رہی تھیں، اس لیے میں بہت پریشان تھی کہ اک عورت اپنے محل کو چھوڑ کر ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری جھونپڑی میں آ گئی ہیں۔ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ ہمارے گھر A.C کا تو تصور بھی محال تھا۔ میں نے ہوادار کمرہ اُن کے لیے سیٹ کر دیا، جہاں پنکھا ہوا تو دے رہا تھا مگر گرم ہوا، اوپر سے بجلی چلی گئی۔ ہم سب گرمی سے زیادہ امی کے لیے پریشان تھے، کیوں کہ امی کا گرمی سے بُرا حال تھا۔ کھڑکی میں سے مچھروں نے بھرمار کر دی، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اس نیک عورت کے لیے، مگر میں بھی مجبور تھی۔ ہم

تو صبر شکر کر کے گزارہ کر ہی رہے تھے، مگر امی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی۔

دو دن کے اندر ہی امی بیمار ہوگئیں، اتنی بیمار کے انہیں اسپتال میں داخل کروانا پڑا مگر جب اسپتال کے بل کے لیے قرض مانگنا پڑا تو امی کو پتا چل گیا کہ ہم بل کی رقم کے لیے پریشان ہیں، شاید یہ ان کی ہم سے بے پناہ محبت تھی جو وہ ہمارے چہرے دیکھ کر سمجھ گئیں۔ کہنے لگیں۔

”بیٹی یہ جو جائیداد ہے تمہاری ہے، اس کے ہوتے ہوئے تم قرض کا سوچ رہی ہو، خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں یہ جائیداد تمہارے نام کر چکی ہوں۔“ یہ سن کر میں رونے لگی۔

وہ بولیں۔ ”ابھی یہاں میرا وکیل آنے والا ہے، تم اپنی یہ جائیداد اپنے پاس رکھو، اب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اس لیے تم میرے ساتھ چل کر رہو۔ اگر تم مجھے جلد مارنا چاہتی ہو تو مجھے اپنے اس جھونپڑی میں لے کر چلو میں جلد ہی تمہاری جان چھوڑ دوں گی، مگر مرتے مرتے دُکھ اس بات کا ہوگا کہ تمہارے ساتھ وقت نہیں گزار سکی۔ جائیداد تو اب تمہاری ہے۔ اگر تم اپنے گھر میں رہنا قبول کرتی ہو تو میں شاید زندگی کے کچھ پل اور تمہارے ساتھ دیکھ لوں، فیصلہ تم کرلو۔“

میں امی کے گلے لگ گئی اور روتے ہوئے بولی۔

”نہیں امی مجھے آپ کی زندگی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہوں گی۔“

☆......☆

آج میں اپنی ماما اور امی دونوں کے ساتھ اس محل نما گھر میں رہ رہی ہوں، خدا پر یقین تھا میری بیٹی کہ اُس کی دعا قبول ہوگی، اس کی یہ دعا قبول ہوگئی، آج ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کے بعد سے خدا پر یقین اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ شکر کی تسبیح ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ میں اور میرے بچے خدا سے اور بھی قریب ہوگئے ہیں۔ نماز اور شکر خدا کا ہر وقت بجا لاتے ہیں کہ اگر خدا پر یقین ہو تو وہ قسمت بھی پلٹ سکتا ہے۔

☆......☆



مُرشد کی دعا

نسیم سکینہ صدف

مرشد کی دعا سے فیض یاب ہونے والے ایک ڈاکٹر کی کہانی، ڈسکہ، سیالکوٹ سے

چاند کی آخری تاریخیں تھیں، گھپ اندھیرا، ہر سُو چھایا ہوا تھا۔ حماد کو پروفیسر دستگیر نے کہا تھا کہ اگر پڑھائی کے سلسلے میں ہیلپ کی ضرورت ہو تو گھر آجایا کرو۔ آج جب وہ موٹی موٹی میڈیکل کی بکس اٹھائے گھر سے باہر آیا تو گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو اس کی ہیڈ لائٹ سارے راستے کو منور کر گئی۔ اُسے بھوک بھی ستا رہی تھی اور خیال بھی آرہا تھا کہ اماں میرے انتظار میں جاگ رہی ہوں گی۔ ان کی نیند روز خراب ہوتی تھی، کیوں کہ اس کی یہ روٹین تھی۔ نو سے بارہ بجے تک وہ پروفیسر کے پاس آتا۔ کئی دفعہ اماں سے کہا کہ آپ سو جایا کریں۔ میں خود کھانا نکال کر کھا لیا کروں گا۔ اس کی بات سن کر وہ ہنس دیتیں اور کہتیں۔ بیٹا یہ تو مجھے زحمت نہیں دیتا بلکہ الٹا ثواب کماتا ہے۔ تیری وجہ سے میں اٹھ کر اپنے پروردگار کے حضور جھک کر تہجد بھی ادا کر لیتی ہوں۔ وہ روزے نماز باقاعدگی سے ادا کرتی تھیں، جبکہ وظائف اور تسبیح بھی کثرت سے کیا کرتی ہیں۔ وہ اکثر اپنے پیر و مرشد کا ذکر انتہائی عقیدت و احترام سے کیا کرتی تھیں۔ اس بارے میں انہوں نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کے پاس ایک شخص انتہائی پریشانی کے عالم میں آیا اور پیر صاحب کو بتایا کہ اس کی سات بیٹیاں ہیں، لیکن تنگ دستی کی وجہ سے وہ ابھی تک کسی کی شادی نہیں کر سکا۔ یہ سن کر پیر صاحب نے کہا کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہ ہوا، تم ناحق پریشان ہو رہے ہو، جاؤ تم اپنی بیٹیوں کی بھی شادی کرواؤ اور دوسروں کی بھی اس سلسلے میں مدد کرو۔ بس اتنا کرنا کہ راستے میں جو چیز تمہیں سب سے پہلے دکھائی دے اسے اپنے گھر لے جانا۔ وہ شخص وہاں سے نکلا تو راستے میں ایک مردہ بلی نظر آئی جس سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا اور اس میں کیڑے کلبلا رہے تھے، لیکن مرشد کا حکم تھا، لہٰذا اس مردہ بلی کو اپنے رومال میں باندھا اور گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر اس نے جب وہ رومال کھولا تو اس میں اسی سائز کا سونے کا ٹکڑا موجود تھا، جس سے نہ صرف اس نے اپنی بیٹیوں کی شادی بھی کی بلکہ کئی دوسرے لوگوں کی بیٹیوں کو بھی ان کے گھر شان و شوکت سے رخصت کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی تمہارے والد صاحب کے انتقال کے بعد بہت پریشان تھی، لیکن جب پیر و مرشد سے ناتا جوڑا تو اللہ نے بڑا فضل کیا اور میری ساری پریشانیاں ان کی دعاؤں کے طفیل دور

ہوگئیں۔ وہ کہتیں تمہارے ساتھ بھی میرے پیرو مرشد کی دعائیں ہیں۔ اللہ تمہیں ہر پریشانی اور مصیبت سے نجات دلائے گا۔

اس روز بھی وہ اپنی ماں اور ان کے پیرو مرشد کے بارے میں سوچتا ہوا قبرستان پہنچ گیا جو ان کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا کہ ہولناک سناٹے میں اچانک دودھیا سفید رنگ کا بکری کا بچہ، مَیں مَیں

کے نیچے اُتار دیا اور گاڑی بھگا دی۔ پیچھے سے ایک آواز آرہی تھی۔ ''حماد...... حماد، ہمیں ساتھ لے جانے والے لوگ ہم سے خوفزدہ ہو کر گاڑی سے اٹھا کے پھینک جاتے ہیں، مگر تم واحد آدمی ہو جس نے بڑے پیار سے نیچے اُتارا ہے۔ تم ان شاء اللہ بہت کامیاب ڈاکٹر بنو گے۔ تمہارے ہاتھ میں بڑی شفا ہو گی۔ یہ ہماری دعا ہے۔''



کرتا قبروں کی اونچ نیچ پہ قلانچیں بھرتا، اسے اپنی سمت آتا نظر آیا۔ حماد نے بائیک کھڑی کر کے چاروں طرف دیکھا کہ یہ بکری کا بچہ اس وقت کہاں سے آسکتا ہے، جبکہ کوئی انسان کا بچہ یہاں پھٹک نہیں سکتا۔ حماد نے اسے اٹھا کے گاڑی کے آگے بٹھایا اور چل پڑا۔ تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ اس کے پیر اتنے لمبے ہو گئے کہ موٹر سائیکل رکنے لگی۔ تب اسے اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی کہ اس بچے کو نہایت پیار سے اٹھا کر زمین پر رکھ دو۔ حماد نے دھڑکتے دل سے گاڑی روکی اور اُسے آرام سے اٹھا

حماد نے گھر آکر یہ واقعہ اپنی ماں کو سنایا۔ تب انہوں نے کہا کہ وہ غیبی آواز یقیناً میرے پیرو مرشد کی ہو گی۔

آج حماد واقعی ایک کامیاب ڈاکٹر ہے۔ اس کے کلینک پر بے انتہا رش رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اتنی شفا ہے، جو بھی مریض آتا ہے وہ شفا پاتا ہے۔ اس کی ماں تو اب اس دنیا میں نہیں رہیں، لیکن پیر صاحب کے معتقدین میں حماد کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔

☆......☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ''ناگن۔'' آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 6

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ مہاراج کو ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ یہ بادشاہت اس کے حصے میں آجائے۔ آخری بلیدان کے لیے جوڑے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ جو عجیب سی نظروں سے صابو کو دیکھ رہے تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آجاتی ہے اور کہتی ہے۔

''ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے

[illegible] مار دوں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔"

شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگ گئی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے تالاب تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ شکنتلا سمجھ جاتی ہے کہ مہاراج اس کے حسن کے جادو کا شکار ہو چکے ہیں وہ ان سے کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی مہارانی بنا لیں۔ اگلے روز دربار میں مہاراج رام ناتھ شکنتلا سے دوسری شادی کا اعلان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج اسی وقت شادی کی رسوم ادا کی جائیں۔ رام ناتھ اور شکنتلا کے سات پھیرے آگ کے گرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ شکنتلا مہارانی ماریہ کی خاص کنیز کوشیلیا کو کنیزوں کی سرداری سے برطرف کر دیتی ہے اور پریہ کو کنیز عالیہ بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف ماریہ سامری جادوگر سے شکنتلا کے متعلق پوچھتی ہے، لیکن سامری جادوگر اسے کہتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے گرو کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ مہارانی اسے جلد از جلد شکنتلا سے نجات دلانے کا کہتی ہے۔ سامری جادوگر ماریہ سے شکنتلا کو شاہی محل سے نکالنے کا وعدہ کرتا ہے۔

سامری جادوگر اپنے گرو شداد جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور "تو سب کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ" سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شکنتلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ زادی کہہ کر مخاطب کرتا ہے شکنتلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شکنتلا کہتی ہے کہ "آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شکنتلا اپنی ملازمہ خاص پریہ کو بھی اپنی سچائی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہوگی۔ پریہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شکنتلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پریہ کا خون کر دے گی، دوسری صورت میں اسے تابانہ کی حکومت میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ پریہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ شکنتلا سامری جادوگر کو یاد کرتی ہے تو سامری جادوگر فوری حاضر ہو جاتا ہے۔ گرو نرائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور کلکتہ میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ اب سامری اور شکنتلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیدان کر کے تیرتھ جاپ نوے دن کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کالی کے چرنوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

کالی کے مندر میں گرو نرائن کی نظر پندرہ سولہ سالہ دوشیزہ پر پڑتی ہے۔ وہ اس لڑکی کے بلیدان کا فیصلہ کرتا ہے اور اونچی جاپ کا منتر الاپنے لگتا ہے۔ منتر مکمل ہوتے ہی وہ سب کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور اسی عالم میں لڑکی کو دبوچ کر خنجر کی مدد سے اس لڑکی کی گردن پر وار کرتا ہے۔ اور اگلے ہی لمحے خون کالی کے چرنوں میں بکھرا ہوا تھا۔ بلیدان کا عمل مکمل کر کے وہ ناگن شکنتلا کو اپنا غلام بنانے کے لیے مندر سے ملحقہ شمشان گھاٹ میں جا پہنچتا ہے اور تیرتھ جاپ شروع کر دیتا ہے۔

سامری، شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ کالی دیوی کے بیروں کے بجائے مہابیر اس کے قبضے میں تھے۔ پریہ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔

شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ حشر کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

"تم سے اگر کوئی ایسے ستانا چاہتا تو کیا تو اُسے معاف کرتی۔ بولو شکنتلا؟" لیکن وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ "تم تو ایک ناگن ہو، ظالم ترین ملکہ اور کالے جادو کی ماہر جادوگرنی۔ جس کے من پر ظلم کے تالے لگے ہوئے ہیں رحم کرنا تم کیا

جانو...... تمہیں تو ہر شب کو خوب صورت مرد اور اس کا خون چاہیے اور بس۔"

"تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" شگفتلا حیرانی سے گویا ہوئی۔

"ہاہاہا۔" حسکران ہنسنے لگا۔ "میں شاہ جنات کا بیٹا ہوں، مجھے کیوں پتا نہ ہوگا؟"

"تم اچھی لگی ہو اس لیے میں نے تمہیں سزا نہ دی، ورنہ میں تمہیں جلا کر بھسم کر سکتا ہوں۔"

شگفتلا ابھی تک سوچ رہی تھی کہ کیسے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ یہ تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک جن تھا اور اس کے سارے بھید بھی جانتا تھا اور اس پر جادو بھی کارگر نہیں تھا، یقیناً اس پر زہر بھی اثر نہیں کرے گا، البتہ...... اس نے سوچا، میں اس کو اچھی لگی ہوں۔ یہ سوچ کر شگفتلا زیر لب مسکرانے لگی۔

حسکران نے اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولا...... "سوچ لی ہے کوئی ترکیب مجھ سے نجات حاصل کرنے کی؟"

"نہیں نہیں حسکران۔" شگفتلا نے مخصوص انداز میں زلفوں کو جھٹکا...... "اب میں تمہیں یہاں سے جانے نہ دوں گی۔ تمہاری شکل میں تو مجھے ایک اچھا ساتھی مل گیا ہے۔ تم جن ہو لیکن منش کی شکل میں گھوم رہے ہو یہ کیا راز ہے؟"

حسکران بھی شگفتلا کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس کا عاشق ہو چکا تھا۔ وہ اس کی سندرتا سے بہت متاثر ہوا تھا، لہٰذا وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور بولا۔ "میں یہاں سے بہت دور جنات کی بستی آتشان کا رہنے والا ہوں۔ میرا باپ لشکران جنات کا بادشاہ ہے اور میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ مجھے شروع ہی سے انسانوں کی بستیوں میں جانے کا شوق ہے۔ اسی شوق کی وجہ سے میں اکثر انسانی شکل میں گھومتا رہتا ہوں۔ مجھے ان کے رہنے سہنے اور جینے کا انداز بہت پسند ہے۔ کافی دنوں سے تمہاری نگری میں گھوم رہا ہوں۔ تمہاری کنیز پریہ کو دیکھا تو مجھے عجیب سا لگا کہ یہ کیسی انسان ہے جو دوسرے انسانوں پر اس قدر ظلم کرتی ہے۔ میں نے اسی وقت اس کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ وہی ملکہ ہے، لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ تو محض شطرنج کا ایک مہرہ ہے، اصل طاقت تمہاری ہے۔ تمہاری آشیرباد پر ہی وہ یہ سب کچھ کرتی ہے، ورنہ وہ تو



ایک عام سی کنیز ہے۔'' شکنتلا اس کی ساری گفتگو کے دوران اس کو مسکراتی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس نے اصولی فیصلہ کر لیا تھا کہ حسکران کو دوست بنا لے گی، کیوں کہ سامری کے بعد یہ بھی ایک نہایت طاقت ور ساتھی ثابت ہوگا جو کہ شکنتلا کے لیے آگے چل کر فائدہ مند ثابت ہوگا۔

''تم انسانی بستیوں کی خاک کیوں چھانتے ہو؟'' شکنتلا نے بات شروع کی۔ ''میرے ساتھ رہو...... میں ایک ناگن ہوں۔ سو سال زندہ رہنے اور سو انسانی جانوں کا خون پینے کے بعد منش کا روپ اختیار کر گئی ہوں۔ اب میں ہر جاندار کی شکل میں آسکتی ہوں۔ اس کے علاوہ کالی دیوی کی تپسیا کر کے جادوگرنی بھی بن چکی ہوں۔ تم میرے ساتھ رہو حسکران میں تمہیں دنیا گھماؤں گی۔ ہم دونوں ساتھی بن جائیں گے۔ میں کالی شکتیوں کی پجارن ہوں۔ تمہارا تعلق کس دھرم سے ہے؟''

''میں......'' حسکران بولا۔ ''ہم آتش پرست ہیں۔ ہمارا تمام قبیلہ آگ کی پوجا کرتا ہے اور شیطانی طاقتوں کا ماننے والا ہے۔''

''رات خاصی ہو چکی ہے، آؤ اب آرام کریں۔'' شکنتلا نے کہا۔ حسکران ہنسنے لگا بولا۔

''نیند ناگن اور جنات دونوں کو نہیں آتی، لیکن ہم اپنی مرضی سے سو سکتے ہیں۔'' دونوں ہنسنے لگے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے اوپر گر گئے۔

☆......☆

اب سامری پریشان ہو چکا تھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے سامری گروزرائن کو منڈل سے باہر نکالنے کی کوشش کر چکا تھا، لیکن اب کے گروزرائن نے جو منڈل کنڈلی بنائی تھی، اسے توڑنا سامری کے بس میں نہیں تھا۔ گروزرائن نے اس مرتبہ اپنا منڈل مندر کی حدود میں بنایا تھا اور کالی کے مندر کی حدود میں کالی کے کسی سیوک کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔

جب سامری کو خبر ہوئی کہ گروزرائن نے پھر جاپ شروع کر دیا ہے تو اس وقت تک خاصا سے برباد ہو چکا تھا۔ سامری اپنے تئیں اس کو نرکھ داصل کر چکا تھا، پھر جب سامری کو یہ پتا چلا کہ جاپ کرتے ہوئے گروزرائن کو خاصا سے بیت چکا ہے، تب وہ فکر مند ہو گیا اور اسے کسی طور نقصان پہنچانے اور جاپ سے باز رکھنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

سامری اس وقت اپنی حویلی کے خاص کمرے جادو نگری میں موجود تھا۔ گروزرائن کا عمل اب خاصا آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی اس کمزوری کا ذکر شکنتلا سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے رات گرو استاد کی بدروح شداد سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆

اگلی صبح حسکران کو پا کر شکنتلا خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ سامری کی شکل میں بہت بڑی شکتی اس کے پاس تھی۔ اب وہ خود بھی جادوگرنی تھی اور مہابیر اس کے قبضے میں تھے۔ اب جنات کا شہزادہ حسکران بھی اس کا عاشق اور ساتھی بن چکا تھا، لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ تابانہ کی سرحدوں کو وسعت دے کر اور ارد گرد کی ریاستوں پر قبضہ کر کے اپنی وسیع تر سلطنت کی بنیاد رکھی جائے۔ اس مقصد کے لیے شکنتلا نے پہلے بلگرام سے مشورہ کیا، پر یہ سے رائے پوچھی اور پھر حسکران کو بتایا تو وہ ہنس دیا اور بولا...... ''شکنتلا میں پہلے ہی ان شاہی کاموں کی جھنجھٹ سے بھاگ کر آیا ہوں...... یہاں بھی وہی سیاپے ہیں......'' لیکن شکنتلا نے اسے زور دے کر راضی کر ہی لیا...... اب شکنتلا کو فکر ہوئی کہ کافی دنوں سے سامری جی غائب ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں سامری کو یاد کیا تو سامری حاضر ہو گیا، آتے ہی بولا۔

''کیا بات ہے شکنتلا کچھ پریشان دکھائی دیتی ہو......؟''

''پریشان ہوں میرے دشمن'' شکنتلا نے سامری کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تمہارے درشن کی پیاسی تھی۔ کہاں غائب ہو جاتے ہو...... خیریت تو ہے؟'' شکنتلا نے زلفوں کو جھٹک کر میٹھی نظروں سے سامری کو دیکھتے ہوئے کہا؟

''خیریت ناپید ہوتی جا رہی ہے شکنتلا۔ ساری دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھنے والی شکنتلا کہیں ایک شخص کی باندی بن کر نہ رہ جائے۔''

''کیا مطلب؟'' شکنتلا حیرانی سے بولی۔
''مطلب یہ میری جان......'' سامری نے اُسے ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے کہا۔
''گرو نرائن پھر تیرتھ جاپ شروع کر چکا ہے، بلکہ اب اسے مکمل ہی کرنے والا ہے۔'' شکنتلا مزید حیران ہوئی اور بولی۔
''گرو نرائن تو مر چکا تھا تو سامری جی آپ کو پتا نہ چلا......؟''
''ہاں پورے جیون میں یہ پہلی غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ آگ کے شعلوں میں گھرا دیکھ کر میں سمجھا کہ گرو نرائن کی ہتھیا ہو چکی ہے، لیکن وہ مردود بچ نکلا اور جب اس نے دوبارہ جاپ شروع کیا تو میں اس کی جانب سے بے فکر ہو چکا تھا اور اب گرو نرائن ہوشیار ہے۔ میں نے اس کو منڈل سے باہر نکالنے کے لیے بڑے کھیل کھیلے، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا، وہ اب خاصا تجربہ کار ہو گیا ہے۔''
''تو منڈل کے اندر سے کھینچ کر اس کمینے کو باہر نکال لو۔'' شکنتلا نے کہا تو سامری ہنسنے لگا اور بولا......'' بھولی روح جب کوئی برہمچاری منڈل کھینچ کر بیٹھ جائے اور جاپ شروع کر دے تو اس وقت منڈل کے اندر قدم رکھنے والا ہر شخص جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ دیوی دیوتا......دھرم کے کاموں میں مداخلت برداشت نہیں کرتے۔''
''کیا اس کو ڈرا دھمکا کر دھوکے سے باہر نہیں نکالا جا سکتا'' ......''ایسا ممکن ہے۔ چاہے بھول کر آئے یا ڈر کر باہر وہ خود ہی آئے گا، لیکن زبردستی اس کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔'' سامری نے منہ لٹکا کر مایوسی سے کہا۔
''پھر خسکران کو دیکھتے ہوئے بولا......''یہ کون ہے؟''
''جنات کے بادشاہ لشکران کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ آتشان کا حکمران ہے۔''
خسکران نے سامری کی طرف ہاتھ بڑھایا......سامری نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پرنام کیا......اور کہا ''میں سامری جادوگر ہوں۔''
''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' خسکران نے مسکرا کر کہا۔
''سامری جی......ایک ترکیب سوجھی ہے۔'' شکنتلا نے اچانک اُچھلتے ہوئے کہا۔
''خسکران کو گرو نرائن کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ یہ تو جن ہے، شاید یہ گرو نرائن کے بچے کو منڈل سے باہر نکال سکے۔''
''ہوں......'' سامری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''مگر اس بارے میں تو خسکران ہی کچھ بتا سکتا ہے۔'' شکنتلا بولی۔
''ممکن ہے، کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' سامری نے رائے دی۔
''کیوں خسکران تیار ہو......؟'' شکنتلا نے خسکران سے پوچھا۔
''بالکل۔'' خسکران نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا تو شکنتلا ہنسنے لگی اور بولی۔ ''ابھی بیٹھ جاؤ، کل رات کو ہم سب چلیں گے، کیوں سامری جی؟'' شکنتلا نے سامری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ٹھیک ہے۔ میں کل شام کو آؤں گا، ہم تینوں ہی چلیں گے اور سوگند ہے کالی دیوی کی اب کی بار اسے منڈل سے باہر نکال کر ہی آؤں گا۔ میں آج رات اپنے گرو کی روح سے مشورہ بھی لوں گا......'' اس کے ساتھ ہی سامری پھک سے غائب ہو گیا۔
''سامری جی ارے بیٹے تو......'' شکنتلا کہتے کہتے اچانک رک گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔
''کیا ہوا ملکہ عالیہ؟'' پریہ نے جو پاس ہی کھڑی تھی، فوراً شکنتلا کو سہارا دیا، لیکن شکنتلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم آہستہ آہستہ پرسکون ہوتی گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سہارے پر تھی۔
''درد کی شدید لہر اُٹھی تھی پریہ......'' شکنتلا تشویش بھرے لہجے میں بولی۔
''ملکہ عالیہ نصیب دشمناں آپ کی طبیعت ناساز تو نہیں؟''

”سامری...... سامری...... سامری......“

”سامری کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔“ سامری دوبارہ کمرے میں ظاہر ہو کر بولا۔

”پیچھے سے آواز کیوں دی شکنتلا؟“ سامری خفگی میں تھا۔

”مجبوری تھی سامری، ورنہ فوراً تمہیں واپس نہ بلاتی۔“

شکنتلا نے اس کو اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا...... اور بولی ”مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی اور کوئی بیماری میرے قریب نہیں آسکتی۔“

”ہوں......“ سامری کسی سوچ میں گم غیر ارادی طور پر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں گروزائن کا جاپ آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے شکنتلا، مزید تاخیر سخت نقصان دہ ہو گی۔“

”حسکران......“ سامری سنجیدہ لہجے میں بولا...... ”ہمیں آج اور ابھی کالی کے مندر میں جانا ہو گا، تاکہ گروزائن سے دو دو ہاتھ کیے جا سکیں۔ اس کا جاپ آخری مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ شکنتلا کے دماغ کو غلام بنانے کے لیے جادوئی لہریں آنا شروع ہو گئی ہیں۔“

”اچھا پریہ تم ذرا محل کے انتظامات سنبھال لو۔“ شکنتلا نے جلدی جلدی دربار کے بارے میں کچھ ہدایات دیں، پھر سامری نے شکنتلا کا ہاتھ پکڑا اور پلک جھپکنے میں وہ شکنتلا سمیت غائب ہو گیا۔ حسکران بھی چند لمحے بعد غائب ہو گیا اور پریہ نے سکون بھری گہری سانس چھوڑی۔

☆......☆

حسکران سامری اور شکنتلا تینوں اس وقت گروزائن کی پشت پر کھڑے تھے۔ گروزائن اپنے جاپ میں مکمل طور پر مگن تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال بے تحاشہ بڑھ چکے تھے۔ جسم پر میل کی تہ جمنا شروع ہو گئی تھی۔

عام آدمی کو وہ منڈل کے اندر نظر بھی نہیں آتا تھا، اسی لیے کبھی کبھار وہاں سے گزرنے والے لوگ بھی اس کو دیکھ نہ پاتے اور یوں وہ سکون سے تیر تھ جاپ میں مصروف تھا، جس نے سامری اور شکنتلا کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ سامری ایک بار پہلے بھی اسے منڈل سے باہر نکالنے میں ناکام ہو چکا تھا اور اب وہ شکنتلا اور حسکران کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ تینوں الگ الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ حسکران نے اپنا انگوٹھا گروزائن کی پشت کی طرف کیا تو اچانک اس سے گہری سبز شعائیں نکل کر گروزائن کی جانب لپکیں...... لیکن حصار سے ٹکرا کر اسی تیزی سے واپس آ گئیں تو حسکران فوراً اپنی جگہ سے غائب ہو گیا، ورنہ اپنی ہی شعاعوں کی زد میں آ جاتا۔ اب شکنتلا نے دل ہی دل میں منتر پڑھ کر مہابیروں کو حکم دیا کہ گروزائن کو منڈل سے باہر نکال پھینکیں تو اچانک منڈل کے گرد خوفناک آوازیں اور مکروہ شکلیں نظر آئیں۔ چاروں طرف سے رونے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ شکنتلا کے مہابیر حصار کے گرد چکر کاٹنا شروع ہو گئے۔ کچھ بیر حصار سے بھی ٹکرائے، مگر ٹکراتے ہی بھسم ہو گئے، جیسے پتنگے شمع سے ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔

گروزائن نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر دیکھا تو تاحدِ نگاہ خوفناک مکروہ اشکال نظر آ رہی تھیں جو لٹو کی مانند حصار کے گرد انتہائی تیز رفتاری سے چکر کاٹ رہی تھیں۔ ان پر نظر جمانا گروزائن کے لیے مشکل ہو گیا۔ اسے خوف آنے لگا...... اس کی نظر گھومنی شروع ہو گئی...... تو اس نے آنکھیں بند کر کے بلند آواز میں جاپ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا کہ یہ مکروہ بلائیں اس پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو کیا حشر ہو گا۔ گروزائن کو پسینے آنے شروع ہو گئے اور زبان بھی لڑکھڑانے لگی۔ شکنتلا نے اپنے مہابیروں کو مزید تیزی سے گھومنے اور چیخیں بلند کرنے کا حکم دیا...... شکنتلا کو ان مہابیروں کے چکر کاٹنے کے باوجود باہر سے گروزائن نظر آ رہا تھا اور اس کی حالت وہ بخوبی دیکھ رہی تھی۔

سامری نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا۔ اس نے منتر پڑھ کر پھونکا تو آسمان کی جانب سے آگ کے بے شمار شعلے عین حصار کی سیدھ میں نیچے آنے لگے، لیکن سامری کو وہ صحیح طریقے سے نظر نہیں آ رہے تھے، لہٰذا وہ حصار کے

بالکل قریب آ کر اوپر دیکھنے لگا۔ شکنتلا بھی سامری کے پیچھے پیچھے تھی۔ اچانک شکنتلا نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے، درد کی شدید لہر سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں اور ایک دم ہی اس کا دماغ اُلٹ گیا اور اس نے سامری کو پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے زوردار دھکا دیا تو سامری اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے سنبھلنے کی بھرپور کوشش کی، تاکہ اس کا وجود گرونرائن کے قائم کردہ حصار کے اندر نہ جانے پائے۔ اس کے باوجود اس کے پاؤں کا ایک پنجہ منڈل کے اندر چلا گیا۔ سامری کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں انگارے بھر گئے ہوں اور آگ لگ گئی ہو...... وہ پشت کے بل زمین پر تیورا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

خسکران اس وقت شکنتلا اور سامری سے کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ منڈل کے قریب ہونے کی وجہ سے شکنتلا گرونرائن کے سحر میں آنے لگی ہے اور سامری بے ہوش ہو گیا ہے۔ شکنتلا کے دماغ میں بھی درد کی ٹیسیں اُٹھنے کے بعد اپنے مہابیروں سے رابطہ ختم ہو گیا، لہٰذا منڈل کے گرد گھن چکر بنے ہوئے تمام مہابیر اور سامری کی آگ غائب ہو گئی۔ اب مطلع صاف تھا۔ شکنتلا ابھی تک اپنا سر پکڑے زمین پر بیٹھی اپنا سر بار بار جھٹک رہی تھی لیکن اب گرونرائن کا جاپ جو اپنے آخری مراحل میں تھا، اس کی لہریں شکنتلا کو اپنی گرفت میں لے چکی تھیں۔ خسکران نے ایک لمحے میں صورتحال کا جائزہ لیا۔ بازی اُلٹ چکی تھی۔ مزید یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور شکنتلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کھینچتے ہوئے زمین پر بے ہوش پڑے سامری کے پاس لے جا کر سامری کا ہاتھ بھی تھاما اور پلک جھپکنے میں دونوں سمیت غائب ہو گیا۔

☆......☆

شکنتلا حواس کی دنیا میں واپس آئی تو اس نے اپنے آپ کو کسی اجنبی مکان میں آرام دہ بستر پر پایا۔ نظریں گھما کر دیکھا تو خسکران اور سامری کھجور کی چھال سے بنی کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ دونوں کے چہرے افسردہ اور منہ لٹکے ہوئے تھے۔

"ہم کہاں ہیں؟" شکنتلا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا...... "گرونرائن کا کیا بنا؟"

"برسوں کی تپسیا اس کے کام آئی شکنتلا......" سامری غمگین لہجے میں بولا۔ "جاپ میں پھل ہونے سے اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔"

"جن کو ہم اپرم پار سمجھتے تھے ہماری وہ شکتیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جاپ منڈل کے قریب ہونے کی وجہ سے تمہارا دماغ الٹ گیا اور تم نے مجھے منڈل کے اندر دھکا دے دیا۔ میں بے ہوش ہو گیا اور میرا جو پاؤں منڈل کے اندر گیا، مجھے اس سے بھی محروم ہونا پڑا۔" سامری نے کہا تو شکنتلا کی نظریں فوراً اس کے پاؤں کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامری کے دائیں ٹخنے پر اسے سفید پٹیاں نظر آئیں، پاؤں غائب تھا، جب کہ سامری کے دائیں ہاتھ میں لاٹھی تھی یقیناً اسی کے سہارے وہ چلتا ہوگا۔

"خسکران اگر وہاں نہ ہوتا تو ہمارے جیون بھی خطرے میں پڑ جاتے۔" سامری نے شکنتلا کو اطلاع دی۔ "یہ ہم دونوں کو لے کر وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا۔" سامری نے خسکران کو ممنونیت سے دیکھتے ہوئے کہا، مگر شکنتلا کی سرشت میں شکرگزاری کا عنصر تھا ہی کہاں۔ وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" وہ اب بالکل ہوش میں تھی اور سارے واقعات اس کے ذہن میں روشن ہو گئے تھے۔

"ہم اس وقت کلکتہ سے سیکڑوں میل دور شہر گزنی پور کے مضافات کی پہاڑی وادی میں ہیں۔"

"اب کیا ہوگا خسکران؟" شکنتلا خسکران کی طرف منہ کر کے سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہم اس وقت کلکتہ سے بہت دور ہیں۔ درمیان میں کئی دریا ہیں اور جادو دریاؤں، سمندروں اور پانیوں کے پار جا کر اثر نہیں کرتا۔ اب جاپ مکمل کرنے کے بعد گرونرائن تمہاری تلاش میں نکلے گا۔ جب تک تم جادوئی لہروں کی حدود میں نہ آ جاؤ، وہ تمہیں اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ تمہاری بہتری صرف اسی میں ہے کہ گرونرائن کی ہوا سے بھی دور رہو۔ جب تک ہم تیرتھ جاپ کا توڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"تاہنہ کا کیا ہوگا۔" شکنتلا نے بے قراری سے پوچھا۔

بالکل قریب آ کر اوپر دیکھنے لگا۔ شکنتلا بھی سامری کے پیچھے پیچھے تھی۔ اچانک شکنتلا نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے، درد کی شدید لہر سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں اور ایک دم ہی اس کا دماغ اُلٹ گیا اور اس نے سامری کو پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے زوردار دھکا دیا تو سامری اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے سنبھلنے کی بھرپور کوشش کی، تاکہ اس کا وجود گرونرائن کے قائم کردہ حصار کے اندر نہ جانے پائے۔ اس کے باوجود اس کے پاؤں کا ایک پنجہ منڈل کے اندر چلا گیا۔ سامری کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں انگارے بھر گئے ہوں اور آگ لگ گئی ہو...... وہ پشت کے بل زمین پر تیورا کر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

خسکران اس وقت شکنتلا اور سامری سے کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ منڈل کے قریب ہونے کی وجہ سے شکنتلا گرونرائن کے سحر میں آنے لگی ہے اور سامری بے ہوش ہو گیا ہے۔ شکنتلا کے دماغ میں بھی درد کی ٹیسیں اُٹھنے کے بعد اپنے مہابیروں سے رابطہ ختم ہو گیا، لہٰذا منڈل کے گرد گھن چکر بنے ہوئے تمام مہابیر اور سامری کی آگ غائب ہو گئی۔ اب مطلع صاف تھا۔ شکنتلا ابھی تک اپنا سر پکڑے زمین پر بیٹھی اپنا سر بار بار جھٹک رہی تھی لیکن اب گرونرائن کا جاپ جو اپنے آخری مراحل میں تھا، اس کی لہریں شکنتلا کو اپنی گرفت میں لے چکی تھیں۔ خسکران نے ایک لمحے میں صورتحال کا جائزہ لیا۔ بازی اُلٹ چکی تھی۔ مزید یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور شکنتلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کھینچتے ہوئے زمین پر بے ہوش پڑے سامری کے پاس لے جا کر سامری کا ہاتھ بھی تھاما اور پلک جھپکنے میں دونوں سمیت غائب ہو گیا۔

☆......☆

شکنتلا حواس کی دنیا میں واپس آئی تو اس نے اپنے آپ کو کسی اجنبی مکان میں آرام دہ بستر پر پایا۔ نظریں گھما کر دیکھا تو خسکران اور سامری کھجور کی چھال سے بنی کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ دونوں کے چہرے افسردہ اور منہ لٹکے ہوئے تھے۔

''ہم کہاں ہیں؟'' شکنتلا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا...... ''گرونرائن کا کیا بنا؟''

''برسوں کی تپسیا اس کے کام آئی شکنتلا......'' سامری غمگین لہجے میں بولا۔ ''جاپ میں پھل ہونے سے اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔''

''جن کو ہم اپرم پار سمجھتے تھے ہماری وہ شکتیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جاپ منڈل کے قریب ہونے کی وجہ سے تمہارا دماغ الٹ گیا اور تم نے مجھے منڈل کے اندر دھکا دے دیا۔ میں بے ہوش ہو گیا اور میرا جو پاؤں منڈل کے اندر گیا، مجھے اس سے بھی محروم ہونا پڑا۔'' سامری نے کہا تو شکنتلا کی نظریں فوراً اس کے پاؤں کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامری کے دائیں ٹخنے پر اسے سفید پٹیاں نظر آئیں، پاؤں غائب تھا، جب کہ سامری کے دائیں ہاتھ میں لاٹھی تھی جالبًا اسی کے سہارے وہ چلتا ہو گا۔

''خسکران اگر وہاں نہ ہوتا تو ہمارے جیون بھی خطرے میں پڑ جاتے۔'' سامری نے شکنتلا کو اطلاع دی۔ ''یہ ہم دونوں کو لے کر وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا۔'' سامری نے خسکران کو ممنونیت سے دیکھتے ہوئے کہا، مگر شکنتلا کی سرشت میں شکر گزاری کا عنصر تھا ہی کہاں۔ وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ اب بالکل ہوش میں تھی اور سارے واقعات اس کے ذہن میں روشن ہو گئے تھے۔

''ہم اس وقت کلکتہ سے سیکڑوں میل دور شہر گزنی پور کے مضافات کی پہاڑی وادی میں ہیں۔''

''اب کیا ہو گا خسکران؟'' شکنتلا خسکران کی طرف منہ کر کے سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہم اس وقت کلکتہ سے بہت دور ہیں۔ درمیان میں کئی دریا ہیں اور جادو دریاؤں، سمندروں اور پانیوں کے پار جا کر اثر نہیں کرتا۔ اب جاپ مکمل کرنے کے بعد گرونرائن تمہاری تلاش میں نکلے گا۔ جب تک تم جادو کی لہروں کی حدود میں نہ آ جاؤ، وہ تمہیں اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ تمہاری بہتری صرف اسی میں ہے کہ گرونرائن کی ہوا سے بھی دور رہو، جب تک ہم تیر تھ جاپ کا توڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''تابانہ کا کیا ہو گا؟'' شکنتلا نے بے قراری سے پوچھا۔

''بھول جاؤ سب راج پاٹ اور شاہانہ زندگی۔ اب کچھ عرصہ روپوشی سے گزارو یا کسی زرخرید باندی کی طرح گروزرائن کی تابع بن جاؤ۔''

''اب تاہانہ کا تخت کون سنبھالے گا؟'' شکنتلا نے فکرمندی سے پوچھا تو حسکران مسکرا کر بولا۔ ''کوئی وارث ضرور ہوتا ہے، تخت خالی رہا نہیں کرتے۔ شکنتلا جی اب اپنا جیون بچایئے، راجد ھانی کو بھول جایئے۔''

''ستیاناس جائے اس حرامی گروزرائن کا۔ اچھی بھلی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا میں نے کیا بگاڑا تھا......؟'' شکنتلا روہانسی ہو کر روایتی عورتوں کی مانند اسے کوسنے لگی۔

''کوئی چنتا نہ کرو شکنتلا، جس دن یہ پدی کا شوربہ منڈل سے باہر آئے گا پھر پوچھوں گا کتنے بیس کا سو ہوتا ہے۔'' سامری کرسی سے اُٹھ کر لاٹھی کے سہارے چلتے ہوئے ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''اسے معلوم نہیں کہ میرا نام سامری جادوگر ہے، میرا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' سامری اس وقت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''سامری بھائی۔'' حسکران نے سامری کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''گروزرائن کی گردن اتنی موٹی نہیں کہ کوئی پھندا اس میں فٹ نہ آئے۔ میرا باپ شاہ جنات لشکران اور میں حسکران...... جب پنجے پنجوں میں آئیں گے تو حسکران اس کی روح خشک کر دے گا......'' دونوں بڈھے دونوں بڑھکوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگے، جبکہ شکنتلا اپنی مسہری پر دونوں گھٹنے سینے سے لگائے، کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے پر رکھے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی، لیکن اس کے دماغ میں گرم آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس کا شیطانی ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

☆......☆

شیطان کے تینوں چیلے سارا دن بیٹھے گروزرائن کی باتیں کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے، بالآخر حسکران اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں اپنی سلطنت میں واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے عقلمندوں سے مشورہ کرتا ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے حسکران ہم تمہارا انتظار کریں گے۔'' سامری نے بغلگیر ہو کر اسے رخصت کرتے ہوئے کہا...... پھر حسکران شکنتلا کی طرف بڑھا اور اس سے بھی گلے مل کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سامری نے شکنتلا سے کہا۔

''آج رات میں پھر اپنے گرو شداد جادوگر کی بدروح سے رابطہ کر کے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا اور تم ہمارے جانے کے بعد اس گھر سے قدم باہر نہ نکالنا۔''

''اس کا مطلب ہے تم بھی جا رہے ہو سامری جی؟'' شکنتلا کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیا بات ہے؟ کیا تمہیں یہاں ڈر لگے گا؟'' سامری حیرانی سے بولا۔

''طنز نہ کریں سامری جی۔ شکنتلا اتنی گئی گزری نہیں کہ اکیلے میں اسے ڈر لگے...... لیکن میں چاہتی تھی کہ آپ بھی یہاں رہیں۔''

''نہیں شکنتلا جی۔ گروزرائن کا بندوبست کرنا بہت ضروری ہے اور اس کام میں مزید تاخیر نقصان دہ ہوگی۔ میں اب چلتا ہوں۔'' سامری نے شکنتلا کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تو چنتا نہ کر سامری کے جیتے جی کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تیری تین آوازوں پر آ جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہی سامری کسی چھلاوے کی مانند غائب ہو گیا۔

سامری کے جاتے ہی شکنتلا نے ایک سرد آہ بھری، پھر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر کھلی زلفوں کو ایک جھٹکے سے بکھیر کر چھوڑ دیا اور دھڑام سے کمرے میں پڑے پلنگ پر دراز ہو گئی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

وہ سوچنے لگی کہ اب سے چند پہر قبل وہ اپنی ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اس کے آگے پیچھے غلام اور باندیاں قطار در قطار تھے اور اب یہاں اسے پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں۔ کتنی جلدی حالات نے پلٹا کھایا تھا۔ جانے اب جیون میں کب ٹھہراؤ آئے گا۔ اگر گروزرائن کے قبضے میں چلی گئی تو کیا ہوگا؟ کیا اس کے ہر حکم کی تعمیل مجھ پر لازم ہوگی اور کیا میں

اس کو انکار نہ کرسکوں گی؟ کیا اس کے سامنے مجھے غلاموں کی طرح کھڑا ہونا پڑے گا؟ کیا میری تمام طاقت اور تمام مہابیر بھی اس کے تابع...... مہابیر کا خیال ذہن میں آتے ہی اس نے سوچا کہ میں نے تو آج تک کسی مہابیر کو طلب ہی نہیں کیا کیوں نہ اس کو آواز دی جائے۔

''ارے کوئی ہے میرا تابع فرمان...... کالی دیوی کے چرنوں میں بلیدان کے بعد میرے حکم کا منتظر۔ کوئی ہے تو میں اسے حاضر ہونے کا حکم دیتی ہوں۔''

گرم ہوا کا تھپیڑا شکنتلا سے ٹکرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تین فٹ قد و قامت کی بونا نما کوئی چیز اچانک ظاہر ہوئی۔ پہلی نظر میں یہ چھوٹے قد کا انسان معلوم ہوا...... لیکن اس کی ایک آنکھ تھی اور اسی ایک آنکھ کے نیچے دو بھدے ہونٹ تھے۔ باقی سارے چہرے پر بال ہی بال تھے۔ کان اور ناک کی جگہ پر بھی بال تھے۔

''کیا حکم ہے مالکن......؟'' منمناتی ہوئی آواز نکلی۔ یہ بونا مخلوق نما آدمی پلنگ کے پائے سے کچھ اونچا تھا...... عام انسانوں کی طرح اس کے دو ہی بازو تھے۔ شکنتلا اسے دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد ہی وہ بونا اس کو پورا نظر آیا تو وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی کہ بونے کی ایک ہی ٹانگ تھی جو دھڑ کے بالکل درمیان سے لگی ہوئی تھی اور پاؤں بھی نہیں تھا۔ ایک لمحے کو اس عجیب الخلقت مخلوق کو دیکھ کر شکنتلا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے پر جب اسے احساس ہوا کہ یہ اس کے حکم کا تابع مہابیر ہے تو...... اس کو کچھ ڈھارس ہوئی۔

''کون ہے تُو؟'' شکنتلا سہمے لہجے میں بولی تو بونا ہنس پڑا۔ اس کے ہنسنے کی آواز ایسی تھی جیسے لوہے یا سلور کی دیگچی میں بہت سے پتھر ڈال کر دیگچی کو ہلایا جائے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔

''تم نے خود ہی بلایا ہے مالکن اور خود ہی پوچھ رہی ہو کہ میں کون ہوں؟''

''اچھا...... تو تم میرے مہابیر ہو۔''

''جی مالکن......''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' شکنتلا نے سوچنے کے انداز میں پوچھا۔

''چنکار......''

''کیا چنکار دکھا سکتے ہو میرے حکم پر؟'' شکنتلا ہولے سے مسکرائی۔

''پہاڑ اُلٹا سکتا ہوں۔'' اس نے منمناتی ہوئی سیٹی نما آواز میں کہا۔

''جہاں حکم کرو وہاں لے جا سکتا ہوں۔ تمہارے حکم پر ہر چیز حاضر اور کسی بھی چیز کو غائب کرسکتا ہوں۔ تمہارے دشمنوں کو ختم کرسکتا ہوں اور ہر وہ کام جو تم کہو مالکن کرسکتا ہوں اور کرنے کا پابند ہوں۔''

''گرونرائن کو قتل کردو......'' شکنتلا خوش ہو کر تیزی سے بولی۔

''میری کھال کے جوتے بنوالو، مگر فی الحال میرے بس میں نہیں مالکن۔ گرونرائن تیرتھ جاپ کر کے منڈل سے باہر آنے والا ہے اب تو...... تُو بھی اس کے حکم کی غلام ہو گی۔ میری کیا اوقات ہے؟'' وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔

''چل دفعان ہو جا...... بدشکل...... بکواس کیے جا رہا ہے۔'' شکنتلا نے کہا تو چنکار یوں اپنی جگہ سے غائب ہوا جیسے واقعی کسی نے چنکار دکھایا ہو۔ چنکار کے جانے کے بعد شکنتلا کا جی بھر آیا۔ اسے اب حالات پلٹنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایسے بھنور میں آ پھنسی تھی جہاں اس کے مہابیر بھی بے بس تھے۔ حکمران اور سامری بھی وہ بے اختیار رونے لگی۔ تکیے پر سر رکھے کتنی دیر اپنی بے بسی کا رونا روتی رہی۔ نہ جانے پھر کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆

پرندوں کے چہچہانے سے شکنتلا کی آنکھ کھل گئی۔

کھڑکیوں اور روشن دانوں سے صبح کی روشنی نور کی شکل میں کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ وہ رات بھر کی نیند کے بعد تر و تازہ ہو چکی تھی۔ اس نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خوشگواریت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔

اچانک ایک خیال شگفتلا کے ذہن میں چھپاکے کی طرح پیدا ہوا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور اس گھر کے ارد گرد کا منظر کیا ہے؟ یہ کس کا گھر ہے؟ کل سارا دن تو انتہائی پراگندہ تھا جس کی بنا پر ایسی باتوں پر دھیان نہ گیا تھا۔ وہ اٹھی اور اپنا بھاری بھرکم لباس گھسیٹتے ہوئے کھڑکی کے پاس آ گئی۔ باہر دور تک ایک دلفریب وادی کا منظر تھا۔ یہ ایک سرسبز وادی تھی۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ دور ایک دریا بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس سے پرے اونچے پہاڑ نظروں کو بھلے محسوس ہو رہے تھے۔ وادی میں ہر طرف رنگ برنگے پھول اور مختلف الاقسام کے پرندے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ دور کہیں کہیں کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔ شگفتلا کھڑکی سے ہٹ کر کمرے کے دروازے سے باہر نکل آئی تو اس نے اپنے آپ کو دائیں سے بائیں جاتے ہوئے کشادہ برآمدے میں پایا۔ برآمدے سے آگے کھلا باغیچہ اور سامنے لوہے کا گواڑ تھا۔ پورے مکان کے گرد دیوار تھی۔ اب اس نے پورے مکان میں گھوم پھر کر دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تین کمروں پر مشتمل مکان ہے۔ جس میں ایک چھوٹا باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ بھی ہے۔ پورے گھر میں نہ تو کوئی ذی روح موجود تھا اور نہ ہی اس کے گھر کے آس پاس قریب میں کوئی دوسرا مکان تھا۔

شگفتلا واپس کمرے میں آ گئی۔ اسے اس وقت شدید بھوک اور پیاس محسوس ہوئی تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور سوچا کل تک میرے آگے پیچھے باندیاں پھلوں کے مشروب اور کھانے کا سامان تیار کر کے رکھتی تھیں اور آج میں ایک طرح سے اس گھر میں قید ہوں۔ سامری نے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔ کیوں نہ چھنکار کو بلاؤں۔ اس نے سوچا اور ذہن میں چھنکار کا نام دہرایا تو فوراً ہی اسے گرم ہوا کا تھپیڑا لگا اور چھنکار اپنے مکروہ وجود کے ساتھ حاضر ہو گیا۔

''کیا حکم ہے مالکن...... تم نے مجھے کیوں یاد کیا؟''

شگفتلا نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بولی...... ''بدشکلے مجھے تم کہتا ہے ادب سے مخاطب کیا کر۔''

''جی بہتر۔'' مالکن چھنکار نے شرمندہ ہو کر نظر جھکا دی۔

''مجھے انسانی خون چاہیے زندہ انسان اور اس کا خون۔'' شگفتلا نے مطالبہ کیا۔

''زندہ انسان تو اس گھر میں بھی موجود ہیں۔ مالکن'' چھنکار نے کہا۔

''کہاں؟'' شگفتلا حیران ہو کر بولی۔

''باہر باغیچے میں سیب کے درخت تلے اس گھر کے مکینوں کو حکمران نے قید کر دیا ہے، حکم کریں تو نکال لاؤں۔''

''ہاں ہاں جلدی کرو مجھے بھی دکھاؤ۔'' شگفتلا نے حکم دیا تو چھنکار ایک ٹانگ پر پھدکتا باہر کی طرف جانے لگا۔ شگفتلا اس کے پیچھے چلنے لگی۔ باغیچے میں سیب کے درخت کے پاس پہنچ کر چھنکار رک گیا اور ایک جگہ کھڑا ہو گیا، پھر زور سے ہوا میں اچھلا اور زمین پر گرا تو ایک دم وہاں سے ساری مٹی ہٹ گئی اور نیچے سلاخوں والا بڑا سا پنجرہ نظر آیا۔ چھنکار نے ایک ہاتھ سے سلاخ پکڑی اور یوں پنجرے کو اوپر اٹھایا جیسے ہلکی پھلکی ٹوکری ہو اور اسے باہر زمین پر رکھ دیا۔ پنجرے میں دو نوجوان لڑکیاں ایک ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان مرد تھا۔ چاروں پہلے ہی سہمے ہوئے تھے۔ چھنکار کی شکل دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گئے۔

''یہ لوگ زمین کے اندر زندہ کیسے تھے؟'' اس نے چھنکار سے سوال کیا؟

''یہ حکمران کا کمال ہوگا۔'' چھنکار بولا۔

''چھنکار پانچ کرسیوں کا بندوبست کرو اور ان سب کو پنجرے سے باہر نکالو اور سنو، ان میں سے کوئی فرار نہ ہونے پائے۔'' شگفتلا نے حکم دیا۔ لمحوں میں پنجرہ غائب اور کرسیاں حاضر ہو گئیں۔

''بیٹھو۔'' شگفتلا چاروں کو حکم دے کر خود بھی بے نیازی سے بیٹھ گئی۔ دونوں لڑکیاں اور مرد صورت حال سمجھنے سے قاصر تھے، تاہم حسین و جمیل شگفتلا کے پراعتماد حکم کو نظر انداز نہ کر سکے اور بلا چوں چراں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''کھانے پینے کا بندوبست کرو چھنکار......''

پلک جھپکنے میں کرسیوں کے درمیان ایک میز پر انواع و اقسام کی سبزیاں روٹیاں اور بھنے ہوئے مرغ مسلم نظر آئے۔ کھانے میں سے ایسے بھاپ نکل رہی تھی جیسے ابھی ابھی چولہے سے اترے ہوں۔

''کھاؤ......!'' شکنتلا نے زلفیں جھٹک کر سب کو حکم دیا اور خود بھی خاموشی سے پیٹ پوجا کرنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے چاروں انسان کھانے لگے اور تھوڑی دیر بعد وہ خاصی رفتار سے کھا رہے تھے۔ گزشتہ دن سے بھوکے تھے۔ کھانے کے بعد سب اپنی جگہوں پر ہی بیٹھے رہے۔ شکنتلا نے باری باری سب کے چہروں کی طرف بغور دیکھنا شروع کیا۔

ادھیڑ عمر شخص پچاس سے اوپر کا معلوم ہوتا تھا اور لڑکا تقریباً بیس بائیس برس کا لگتا تھا۔ لڑکیاں دونوں اٹھارہ انیس کی نوجوان تھیں۔ لباس سے سب متوسط طبقے کے معلوم ہو رہے تھے۔ ایک لڑکی کی شکل لڑکے سے ملتی جلتی تھی، غالباً بہن بھائی تھے۔ دوسری لڑکی لڑکے کی پتنی ہوگی۔ شکنتلا نے اپنے طور پر اندازہ لگایا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' شکنتلا کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ادھیڑ عمر مرد کو اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''بیٹی......'' ادھیڑ عمر نے کہنا شروع کیا۔

''میں اپنے بچوں اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا ہوں۔ کل صبح پتا نہیں کہاں سے ایک آدمی نمودار ہوا اور ہمیں ایک جگہ اکٹھا کر کے کوئی جادو کیا تو ایک پنجرے میں ہم قید ہو گئے اور پھر پنجرہ اس نے سیب کے درخت تلے دفن کر دیا۔ قبر کے اندھیرے سے آج تم نے ہمیں نجات دلائی، ورنہ ہم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔''

''تمہارا کیا نام ہے؟'' شکنتلا نے بوڑھے کو نظر انداز کر کے نوجوان کو اشارہ کیا جو خاصی دیر سے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا، غالباً اس نے اتنی خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

''جی......سلیمان۔'' نوجوان نے جواب دیا تو شکنتلا چونک پڑی......''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ مسلمان ہو۔''

''جی الحمدللہ۔'' ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔ میرا نام اسد اللہ ہے اور یہ سلیمان میرا بیٹا اور یہ کنیز فاطمہ میری بہو اور پھر بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا، یہ میری بیٹی رقیہ ہے۔''

''کیا تم مسلمان نہیں ہو بیٹی؟'' اسد اللہ نے سوال کیا۔

''کیوں......'' شکنتلا تیوریاں چڑھا کر بولی۔ ''کیا دنیا میں زندہ رہنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے؟''

''نہیں بیٹی تم تو بُرا مان گئیں......میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''

''میں ریاست تابانہ کی ملکہ اور زبردست جادوگرنی بھی ہوں اور یہ بدشکل شکنتلا نے چنکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ایک طرف ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ ''میرے قبضے میں وہ غلام ہے جو پہاڑ کو بھی میرے حکم سے ریزہ ریزہ کر سکتا ہے۔''

''بیٹی کفر نہ بولو......اس کائنات کا ہر کام صرف اللہ کے حکم سے ہی ہوتا ہے، ہم تم تو بس اس کی مخلوق ہیں۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو پتا نہیں ہل سکتا۔''

''بکواس بند کر بڈھے......'' شکنتلا نے تڑاخ سے ادھیڑ عمر کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تو سلیمان مشتعل ہو کر تیزی سے شکنتلا کی طرف جھپٹا......لیکن اس سے قبل کہ وہ شکنتلا تک پہنچتا، چنکار نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا اور سلیمان اپنی جگہ پر جم گیا۔

''میں صرف کالی ماتا اور ناگ دیوتا کو مانتی اور جانتی ہوں، جن کے کارن سے شکنتلا بے پناہ طاقتور ہے۔''

''اللہ کے سوا کوئی طاقتور نہیں جادوگرنی! تمہاری سب طاقتیں عارضی اور شان و شوکت دکھاوے کی ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔''

''میں اپنے آپ کو ہی بڑا کہتی ہوں۔'' شکنتلا دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ٹہلتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اپنے سامنے ساری دنیا کے لوگ بونے لگتے ہیں۔''

''بات کردار کی ہوتی ہے شکنتلا ورنہ قد میں تو انسان سے سایہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ جو جتنا اعلیٰ ظرف ہوتا ہے اتنا ہی بڑا ہے۔ تمہیں تو بزرگوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔'' بوڑھے کی بیٹی رقیہ تحمل لیکن تمتماتی ہوئی آواز سے بولی۔

''تمہیں بدتمیزی کا مزا ضرور چکھاؤں گی۔'' شکنتلا پورے جلال سے بولی۔

"چٹکار......"

"جی مالکن......؟"

"ان سب کو میرے کمرے میں بے بس کر کے پہنچادو۔"

"جو حکم مالکن۔"

اور شکنتلا پورے غرور سے کمرے کی طرف چل دی......

☆......☆

گرونرائن بے حد خوش تھا۔ اس نے آج ہی جاپ مکمل کیا تھا۔ جاپ مکمل کرتے ہی اس نے مندر کے احاطے میں واقع تالاب کے اندر اشنان کیا، جی بھر کر نہایا۔ جاپ کے دوران اسے بھوک پیاس کی مطلق حاجت نہ ہوئی تھی۔ یہ کالے علم کا اثر تھا، لیکن عمل مکمل کرتے ہی شدید بھوک و پیاس کا حملہ ہوا۔ اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ جب وہ اشنان سے فارغ ہوا، اس وقت کلکتہ شہر کی تمام خور ونوش کی دکانیں بند تھیں، لیکن بھوک تو بھوک تھی وہ بھی کئی ماہ کی۔ گرونرائن سے برداشت نہیں ہوسکا اور وہ کھانے کی تلاش میں مندر سے باہر آ گیا۔ تمام گلیاں اور بازار ویران تھے۔ وہ ایک طرف چلتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے آبادی ختم ہونے لگی اور اب کچی آبادی جو خستہ مکانوں اور جھونپڑیوں پر مشتمل تھی، شروع ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف سے روشنی کی ہلکی سی لکیر پیدا ہو چکی تھی۔ آبادی کی آخری نکڑ پر ایک چھپر ہوٹل دکھائی دیا جو شاید صبح نزدیک ہونے کی وجہ سے ابھی کھل رہا تھا۔ قریب پہنچا تو نہاری کی خوشبو نتھنوں میں آئی تو گرونرائن بے قابو ہو کر ہوٹل کے باہر رکھی بڑی سی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جھونپڑے کے پچھلی طرف تندوری تھی، کیوں کہ وہیں سے گرونرائن کو تازہ کلچوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

"جی صاحب......!" گندا سا بیرا شانے پر رومال رکھے حاضر ہو گیا۔

"بھوجن لاؤ۔" گرونرائن بے صبری سے بولا۔ "ابھی لایا صاحب۔" بیرا چلا گیا اور تھوڑی دیر میں نہاری سے بھرا پیالہ اور گرما گرم نان اس کے آگے رکھ گیا۔ گرونرائن یہ کھانا منٹوں میں کھا گیا۔ "اور کلچے لا چھوٹے۔" گرونرائن زور سے بولا، تو تھوڑی دیر میں وہ تین چار کلچے اور لے آیا۔ گرونرائن بے حد بھوکا تھا، منٹوں میں نہاری کلچے چٹ کر گیا۔ "او چھوٹے جلدی آ۔ دس بارہ کلچے اور نہاری کا بڑا پیالہ لا۔" بیرے نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا اور چند کلچے اور نہاری اور لے آیا۔ اب اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ہوٹل کے اردگرد ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہوٹل میں بیرے سمیت تین لوگ تھے۔ گاہک صرف گرونرائن ہی تھا۔ تینوں شخص گرونرائن کو بغور دیکھنے لگے جو اب تک کئی افراد کا بھوجن چٹ کر چکا تھا اور اب تک کھائے چلا جا رہا تھا۔

لیکن گرونرائن ان کی توجہ سے قطع نظر ہڑپ ہڑپ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اتنے کھانے کے پیسے کہاں سے دے گا؟ اس کی جیب میں تو پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ چلو جو ہوگا دیکھ لیں گے۔ "لا بھئی لا بھوک بڑے زوروں کی ہے۔" ہوٹل کے ملازم نے مزید دس بارہ کلچے اور نہاری کا پیالہ بھر کر رکھ دیا، لیکن ہوٹل والوں کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ نانبائی...... بیرا اور مالک ایک کونے میں لگ گئے۔

ادھر گرونرائن کا پیٹ بھر چکا تھا، اس نے بڑا سا ڈکار لیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کو ہوٹل کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ اچانک اسے ایک طرف تینوں افراد سرپٹ بھاگتے نظر آئے۔ گرونرائن حیرانی سے انہیں بھاگتا دیکھتا رہا، وہ حیرت زدہ تھا کہ انہیں کیا ہوا، بھاگنا مجھے تھا بھاگ یہ رہے ہیں اور...... پھر اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی کہ ہوٹل والوں نے سمجھا ہوگا کہ منہ اندھیرے یہ کوئی جن بھوت آ گیا ہے۔ گرونرائن ہنسنے لگا۔ "چلو جان چھوٹی۔" اب وہ سوچنے لگا کہ جاپ مکمل ہو گیا ہے، شکنتلا قبضے میں کیوں نہیں آئی؟ جب وہ منڈل کے اندر تھا تو اسے شکنتلا کی خوشبو آنا شروع ہو گئی تھی۔ جب شکنتلا سامری اور حسکران کے ہمراہ جنگ کرنے آئی تھی تو اس وقت اس کی خوشبو شدید تر ہو گئی تھی، لیکن اب گرونرائن کو شکنتلا کی کہیں خوشبو نہ آ رہی تھی۔ وہ چلتا چلتا کالی کے مندر میں واپس آ گیا۔ ایک کمرہ جاپ سے پہلے کا اس کے پاس تھا جس کا کرایہ وہ پیشگی ادا کر چکا تھا۔ اس نے تالا کھولا اور آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ کھانے

کے بعد بڑی زور کی نیند آئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ شکنتلا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور آنے والے وقت کا تصور کر کے خوشی سے نہال ہوئے جا رہا تھا۔ جب شکنتلا اس کے قبضے میں ہوگی۔ روپ بدلنے کی قدرت کی بناء پر اس کے لیے دولت بھی اکٹھی کرے گی اور خوب صورت ناری تو وہ ہے ہی، لہٰذا من کی پیاس بھی بجھائے گی۔"

☆......☆

شکنتلا نے ہر فرد کو علیحدہ علیحدہ چھوٹے پنجروں میں قید کر لیا تھا جس میں وہ نہ لیٹ سکتے تھے اور نہ کھڑے ہو سکتے تھے، بمشکل بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پنجرے الگ الگ کمروں میں چھت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے، البتہ کنیز فاطمہ کو اس نے اپنے پلنگ کے پاس صرف کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا۔ وہ صبح سے کھڑی تھی اب شام ہو چکی تھی۔ اس کی ٹانگیں اب شل ہو چکی تھیں، لیکن خود شکنتلا مزے سے پلنگ پر لیٹی آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ سامری واپس آیا ہے نہ خسکران، رام جانے کہاں مر گئے دونوں۔ ایک دفعہ گردنرائن کا بچہ میرے دانتوں تلے آئے سہی۔ اس کا وہ حشر کروں گی کہ اس کی آتما بھی سکون نہ پائے گی۔

"شکنتلا میری ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں، زمین پر بیٹھ جاؤں؟" کنیز فاطمہ بڑی لجاجت سے بولی۔ شکنتلا نے اسے دیکھا اور پلنگ سے نیچے اُتری۔ خراماں خراماں چلتی اس کے پاس پہنچی اور اس کی چٹیا ہاتھ پر کس کر بولی۔ "اب آرام کو بھول جاؤ جب تک میں یہاں ہوں، تو کھڑی رہے گی۔ میں تم سب کو بھوکا پیاسا ماروں گی۔"

"ہم نے قصور کیا کیا ہے؟ تمہارا کیا بگاڑا ہے ظالم کہ تم نے میرے گھر والوں کو پنجروں میں اور مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔" کنیز فاطمہ درد سے دہری ہوتی ہوئی بول رہی تھی۔

"تمہارا قصور کم ہے کہ تم مجھے اللہ سے ڈراتے ہو، جبکہ میں نے کبھی کسی سے ڈرنا نہیں سیکھا۔" یہ کہہ کر شکنتلا نے زوردار جھٹکے سے چھوڑا تو کنیز فاطمہ کے فرش پر گر گئی۔ شکنتلا نے جوتے کی نوک اس کے منہ پر ماری۔ "کھڑی ہو جا۔ جب تک شکنتلا کا جی چاہے۔" کنیز فاطمہ تکلیف سے سرخ ہو رہی تھی، مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق کھڑی ہوئی لیکن آہستگی سے بولی۔ "شکنتلا ہاتھوں سے ایسی گرہیں لگانی چاہئیں جو بعد میں دانتوں سے نہ کھولنی پڑیں۔"

"چنکار" شکنتلا کڑکی۔

"جی مالکن چنکار حاضر ہو گیا۔"

"ایک موٹا ڈنڈا لاؤ......"

"یہ لیں مالکن۔" چنکار نے ہاتھ بڑھایا تو اس میں بانس کا موٹا ڈنڈا آ گیا۔

شکنتلا نے ڈنڈا پکڑ کے بے دردی سے کنیز فاطمہ کے جسم پر برسانا شروع کر دیا۔ کنیز فاطمہ کی دلخراش چیخوں سے زمین و آسمان کانپنے لگے اور وہ تکلیف سے فرش پر ادھر اُدھر لڑھکنے لگی، لیکن شکنتلا نے ہاتھ تب روکا جب وہ بے ہوش ہو گئی۔ شکنتلا بھی پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔

چنکار اس کو بھی پنجرے میں ڈال دو اور اس نوجوان سلیمان کو یہاں لاؤ۔" یہ کہتے ہی شکنتلا نے پھنکار ماری اور سانپ بن گئی، پھر دوبارہ لوٹ لگائی تو وہ انتہائی باریک لباس کے ساتھ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

"چنکار جاؤ اور میرے بلائے بغیر اندر نہ آنا۔" اسی اثنا میں سلیمان کمرے میں داخل ہوا، کنیز فاطمہ کی چیخ پکار سے وہ پہلے ہی تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ چنکار غائب ہو چکا تھا۔ سلیمان نے شکنتلا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، حالاں کہ اس کی بیوی بھی خوب صورت تھی...... مگر شکنتلا، بھرا بھرا گول مٹول معصوم چہرہ، مسکرانے سے گالوں میں بھنور پڑے ہوئے تھے، بڑی بڑی آنکھیں، جن پر لانبی لانبی پلکوں کا غلاف تھا، انار کی مانند سرخ ہونٹ، کمر تک جھولتی آوارہ زلفیں جیسے ساون کی گھٹائیں، رنگت گلابی، متناسب اٹھان، نازک کمر، خوب صورت بدن، شکنتلا جیسا مجسمہ حسن اس کی نظروں سے آج تک نہ گزرا تھا۔ ایسا حسن کسی عمر رسیدہ عابد کی ریاضت ضائع کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، سلیمان تو ابھی نوجوان تھا۔

"آؤ...... شکنتلا عریاں سڈول بانہیں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ سلیمان پر اس کے حسن کا جادو چل

چکا ہے۔ سلیمان حیران و پریشان اس صورتحال کو ابھی تک سمجھ نہ سکا تھا۔

"کنیز فاطمہ کہاں ہے؟" اس نے جرأت کر کے غیر متوقع سوال کیا۔

"چھوڑو اس کو...... آ میں تمہیں لذت و سرور کے نئے جہانوں کی سیر کراؤں۔" اس نے آگے بڑھ کر بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"نہیں۔" شکنتلا سلیمان نے ایک دم اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں شادی شدہ ہوں...... اور جہاں تم مجھے لے جا رہی ہو۔ یہ گناہ کا راستہ ہے۔" شکنتلا کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہو گئے، لیکن وہ پھر آگے بڑھی اور سلیمان سے لپٹ گئی۔

"ایسا حسن تُو نے کہاں دیکھا ہو گا۔ سلیمان تو خوش نصیب ہے...... کہ تُو...... شکنتلا کو بھا گیا۔"

سلیمان پر وحشت سوار ہو گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے جدا کیا اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا اور چیخا...... "حرافہ میری بیوی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔ وہ کہاں ہے اور تُو نے اس پر کیا ظلم کیا ہے......" پھر اس نے شکنتلا کو خوب صورت بالوں سے پکڑا اور اسے فرش پر گھسیٹنے لگا۔ "میرے باپ کی تُو نے بے عزتی کی...... اور اب مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

شکنتلا کے لیے یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع ثابت ہوا وہ اپنی توہین سے پاگل ہو گئی۔

"چنکار۔" وہ دھاڑی۔

"جی مالکن۔ چنکار حاضر ہے۔"

"اس کمینے کو اُلٹا لٹکا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔" دفعتہً سلیمان کو محسوس ہوا کہ کسی نادیدہ قوت نے اس کی ٹانگوں کو کھینچ کر اوپر کیا ہو۔ اب وہ ہوا میں الٹا لٹکا ہوا تھا۔ شکنتلا نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو اس کے سر کے نیچے شیشے کا بڑا مرتبان آ گیا، چنکار خنجر پیش کرو فوراً ہی چنکار نے ایک تیز دھار خنجر پکڑا دیا...... شکنتلا نے مہارت کے ساتھ خنجر اُلٹے لٹکے سلیمان کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ خون کی تیز دھار مرتبان میں گرنے لگی۔

سلیمان حرکت کرنے سے قاصر تھا البتہ اس کی دلدوز چیخیں خرخراہٹ میں بدل رہی تھیں۔ وہ ذبح شدہ بکرے کی مانند تڑپ رہا تھا، لیکن شکنتلا پر سکون ہو چکی تھی...... اور اپنی کھلی ہوئی زلفوں کو ہاتھوں کی انگلیوں سے سنوار رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بڑے گلاس میں مزے سے خون پی رہی تھی۔ سلیمان کا لاشہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

☆......☆

شکنتلا کا کچھ پتا نہ چل رہا تھا اور نہ ہی خوشبو آ رہی تھی۔ انہی سوچوں میں غرقاب گروزنائن مندر کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک کسی کے کندھے سے اس کا شانہ ٹکرایا۔ گروزنائن نے اوپر دیکھا تو اسے ایک بھاری بھرکم چہرہ دکھائی دیا۔ ایک بھاری تن و توش کا شخص اسے گھور رہا تھا۔ اس نے صرف ایک دھوتی باندھ رکھی تھی، باقی سیاہ جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر کو دھنسی آنکھوں سے دہشت ٹپک رہی تھی۔

"مورکھ......" وہ شخص بولا۔ "اندھا ہے کیا۔ دیکھ کر نہیں چلتا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم کالی ماتا کے استھان کے مہا پنڈت ہیں پرنام کرو ہمیں۔"

اس کی بات سن کر گروزنائن کے ذہن میں بجلی کوندی، یہ مہا پنڈت ضرور میری سہائتا کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر ماتھے کو لگائے اور ڈنڈوت کرنے لگا۔ گروزنائن کے اس عمل سے مہا پنڈت نرم پڑ گئے اور بولے۔

"کہاں سے آیا ہے؟ تجھے پہلے کبھی ادھر نہیں دیکھا۔"

"پنڈت جی میں ہمالیہ کے دامن میں واقع ریاست تاپانہ کا شاہی پجاری اور کالی دیوی کے وہاں کے مندر کا بڑا پجاری بھی ہوں...... پرنتو آپ کے سامنے بالک ہی ہوں۔ آپ کی شہرت اور شکتیوں کی بڑی کیرتن سنی ہے...... میں آپ ہی کے چرنوں کی راکھ چومنے حاضر ہوا تھا۔ بھگوان کی دیا سے آپ کے درشن اچانک ہی ہو گئے...... میں ایک مسئلے [illegible]

یہاں آیا ہوں۔ میری بھاؤنا ہے کہ آپ مجھے تھوڑی دیر کی ملاقات کا شرف بخشیں۔'' گرونرائن نے مناسب موقع جانتے ہوئے بڑی عیاری سے اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہو گیا۔

''آؤ میرے پیچھے۔'' مہا پنڈت یہ کہتے ہوئے واپس مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گرونرائن بھی سر جھکا کر پیچھے چل دیا۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مہا پنڈت بڑے دالان سے گزرتے ہوئے مندر کی پچھلی جانب چل پڑا۔ راستے میں ملنے والے یاتری، سادھو، چیلے، پنڈت...... پجاری غرض یہ کہ ہر شخص اسے جھک کر نمستے کرتا اور مہا پنڈت مٹکے جیسا سر ہلا کر جواب دیتا جاتا۔ کئی لوگ ان کے ساتھ بھی چلنے لگے۔

مندر کی پچھلی طرف کمروں کی لمبی قطاریں تھیں، انہی میں سے ایک کمرے میں گرونرائن بھی مقیم تھا۔ ان کمروں کے درمیان ایک جگہ سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں، شروع میں بڑا دروازہ تھا۔ دروازے پر سرکار کی طرف سے مہیا کردہ پہریدار تھے جنہوں نے مہا پنڈت کو جھک کر پرنام کیا۔ تقریباً تیس سیڑھیاں نیچے اترنے کے بعد ایک کھلا ہال آ گیا جہاں جگہ جگہ پہریدار تلواریں سونتے کھڑے تھے اور جا بجا داسیاں آ جا رہی تھیں۔ ہال کے دائیں بائیں کناروں پر بڑے بڑے خوب صورت کمرے تھے۔ یہ سب پنڈت پجاریوں کے رہنے کے لیے تھے۔ بالکل سامنے درمیان میں سب سے کشادہ اور خوب صورت کمرہ تھا جس کے پاس پہنچ کر مہا پنڈت نے پہلی بار پیچھے مڑ کر گرونرائن کو دیکھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''ان سب کمروں میں پجاری پنڈت ہی رہتے ہیں پرنتو مہا پنڈت لکشم ناتھ کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں جب چاہوں جس کو چاہوں یہاں رہنے دوں یا نکال باہر پھینکوں، پوری ریاست کلکتہ میں میرا ہم پلہ پنڈت کوئی نہیں۔ یہاں چاروں اور میرا ہی سکہ چلتا ہے۔ ریاست کا راجہ پونم بدری بھی میرے مشورے کو اہم جانتا ہے۔'' اپنی باتیں کرتے کرتے لکشم ناتھ گرونرائن کو لیے مرکزی کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کو دیکھ کر گرونرائن مبہوت ہو گیا۔ اندر سے کمرہ آراستہ و پیراستہ تھا۔

''یہاں جوتے اتار دو بالک......'' لکشم ناتھ نے کہا۔ گرونرائن نے فوراً تعمیل کی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں دیوار سے دیوار تک قالین بچھے تھے اور ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔ حسین و جمیل دیوداسیاں موجود تھیں۔ لکشم ناتھ گرونرائن کو لے کر اس سے بھی اگلے کمرے میں چلا گیا۔ اگلے کمرے میں فرش پر گدے لگے تھے۔ لکشم ناتھ ایک گاؤ تکیے کے ساتھ بیٹھ گیا اور گرونرائن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''لکشم ناتھ وہ مہان پنڈت ہے جو کسی کو آسانی سے مل سکتا ہے اور نہ ملاقات کے لیے راضی ہوتا ہے۔ تُو خوش قسمت ہے کہ میں نے تجھے ملنا گوارہ کیا۔ پرنتو اس کا کارن یہ کہ تو ایک ریاست کا شاہی پنڈت ہے اور کالی ماتا کے مندر کا پجاری بھی ہے اور پھر مجھ سے خاص طور پر ملنے آیا ہے۔'' گرونرائن نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا دی، کیوں کہ اسے پتا تھا کہ یہ نہایت مہان پجاری ہے، اس کو جادو گری پر بھی عبور ہو گا...... شکنتلا کو قابو میں آنے کے اتنے فوائد ہیں کہ یہ فوراً مدد پر راضی ہو جائے گا اور اگر راضی نہ بھی ہوا تو بھی یہ گرونرائن کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ساری کہانی سننے کے بعد لکشم ناتھ نے گہری سانس لے کر گاؤ تکیے کے پاس پڑی ڈبیہ نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''اگر میں تمہاری سہائتا کروں جو کہ میں کر سکتا ہوں تو مجھے کیا فائدہ ہو گا، مطلب یہ کہ میں تمہاری مدد کیوں کروں...... شکنتلا تو تمہارے قبضے میں آئے گی لکشم ناتھ کو کیا حاصل ہو گا؟'' لکشم ناتھ مٹکے جیسے سر کو معنی خیز انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''شکنتلا قبضے میں آ جائے تو پنڈت جی ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ہم دونوں مل کر اتنی بڑی شکتی بن جائیں گے کہ کسی کے پاس ہمارا توڑ نہ ہو گا اور ہم دنیا کے امیر ترین لوگ بن سکتے ہیں...... پھر جیون میں عیش ہی عیش ہو گی۔ اس سلسلے میں تو آپ کو مجھ پر وشواس کرنا ہی ہو گا۔''

''ٹھیک ہے گرونرائن۔ پرنتو اگر تم نے مجھے کوئی ناٹک دکھانے یا زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تو یاد رکھ...... لکشم ناتھ اکیلا ہی سیکڑوں پر بھاری ہے، شکنتلا سے جو بھی فائدہ اٹھائیں گے اس میں ہم دونوں ساجھے دار ہوں گے......'' بولا

''منظور، پنڈت جی۔'' گروزائن لکشم ناتھ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''ارے......'' لکشم ناتھ چونک کر بولا۔ ''میں تمہارے لیے جل پانی کرنا تو بھول ہی گیا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دیوار کے ساتھ لگی لکڑی کی ہتھوڑی کو دیوار پر ابھری ہوئی جگہ پر مارا تو دور کہیں جلترنگ بج اٹھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک چاند چہرہ نمودار ہوا، دیوداسی خوب صورت ساڑی میں ملبوس تھی۔

''لکشمی ہمارے مہمان کی خدمت کے لیے کھانے پینے کا سامان لاؤ۔'' دیوداسی جھکی اور واپس چل گئی۔

''سنو گروزائن...... چالیس برس میں نے دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھے رگڑے ہیں اور تپسیاؤں کے کشٹ کاٹے ہیں۔ میرے قبضے میں بیر اور مہابیر موجود ہیں جو کہ شکنتلا کی خبر لائیں گے۔ آج رات تم یہاں آرام کرو۔ تمہیں یہاں پر ہر قسم کا عیش و آرام ملے گا۔

گروزائن کو کسی نے جھنجوڑ کر جگایا تو ایک دم آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو لکشم ناتھ سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''پنڈت جی خیریت؟ ابھی تو میرے خیال میں صبح نہیں ہوئی۔'' گروزائن ابھی تک نیند میں تھا۔

''تو سو رہا ہے اور تیرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ بالک اٹھ کہ خوش نصیبی کا ہما تیرے سر پر بیٹھنے کے لیے بے تاب ہے۔ آنکھیں کھول کہ تیرا دشمن اس سے سو رہا ہے۔ آ میرے ساتھ کہ ''جو سووت ہیں وہ کھووت ہیں۔'' یہ کہتے ہی لکشم ناتھ بڑے کمرے کی طرف چل دیا۔

گروزائن تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔

دوسرے کمرے میں آ کر لکشم ناتھ چٹائی پر بیٹھ گیا اور بولا...... ''گروزائن تیری شکنتلا میرے مہابیر کی اطلاع کے مطابق یہاں سے کئی سو کوس دور مغربی پنجاب کے آخری شہر گزنی پور کے پاس ہے۔ ہم اسی وقت وہاں چلیں گے، کیوں کہ اس وقت سامری جادوگر اس کے پاس موجود نہیں نہ ہی خسکر ان ہے، جو کہ میرے مہابیروں کی اطلاع کے مطابق ایک جن ہے۔''

''لیکن ہم جائیں گے کیسے؟'' گروزائن نے سوال کیا تو لکشم ناتھ نے قہقہہ بلند کیا۔

''مورکھ تو اس وقت لکشم ناتھ کے پاس ہے اور لکشم ناتھ پورے ہندوستان میں سب سے بڑا پنڈت پجاری...... اور برہمچاری ہے...... میرے مہابیر تجھے اور مجھے بغیر کسی دقت کے ابھی اور اسی وقت وہاں پہنچائیں گے۔''

''لیکن چوں کہ شکنتلا خود مہابیروں پر دسترس رکھتی ہے، لہٰذا ہمارے مہابیر ہمیں وہاں پہنچانے کے بعد واپس ہو جائیں گے، تاکہ شکنتلا کے مہابیر سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہو پائے، اس سے کام بگڑ سکتا ہے، جب تک کہ شکنتلا اپنے مہابیر سمیت تمہاری تابع نہ ہو جائے۔''

☆......☆

سلیمان کا سارا خون پینے کے بعد شکنتلا کو سکون آ گیا، اسے اپنے اندر توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے رقیہ اور کنیز فاطمہ کو چمکار کے ذریعے طلب کیا۔ اسد اللہ وہیں پنجرے کے اندر ہی بھوک کے پیاسے درد سے دوہرے ہو رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے تھے۔ انہیں لہولہان بہو اور پھر بیٹے کی دلخراش چیخوں کے بعد احساس ہو چکا تھا کہ وہ طاغوتی طاقتوں کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ اب ان کا بچ جانا معجزہ ہی ہوگا۔ رقیہ اور کنیز فاطمہ جیسے ہی شکنتلا والے کمرے میں داخل ہوئیں، کمرے کے عین درمیان سلیمان کی گلا کٹی لٹکتی لاش دیکھ کر زوردار چیخوں کے ساتھ با آواز بلند بین کرنے لگیں۔ انہیں شکنتلا سے اتنے بڑے ظلم کی توقع نہ تھی۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں، لیکن شکنتلا پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے اپنی خوب صورت زلفوں سے مسکراتے ہوئے کھیلتی رہی۔ رقیہ اور کنیز فاطمہ کی آہ و زاری سے شکنتلا کو احساس طمانیت ہو رہا تھا۔ جب ان کا رونا طویل ہو گیا تو چمکار نے انہیں ڈرا دھمکا کر چپ کروایا۔

''تو نے میرے بھائی کو کیوں مارا؟ ظالم اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟'' رقیہ نے بلکتے ہوئے کہا۔

''اس نے میرے حسن کو ٹھکرایا تھا۔'' شکنتلا پلنگ سے نیچے اتر کے ان کے قریب آ کر بولی۔ ''اور شکنتلا کی حکم عدولی

کی کم از کم سزا موت ہوتی ہے۔"

"لیکن اس کا خون فرش پر کیوں نہیں گرا؟" کنیز فاطمہ حیرانی سے بولی۔

"وہ دیکھو۔" شکنتلا نے بڑے فخر سے کمرے کے کونے میں پڑے مرتبان کی طرف اشارہ کیا جس میں اب بھی کچھ خون موجود تھا۔

"اور یہ دیکھو......" شکنتلا نے خون آلود بڑا گلاس دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا خون اب شکنتلا کے پیٹ میں ہے۔" شکنتلا مسکراتے ہوئے بولی۔ شکنتلا کی بات سن کر رقیہ اور کنیز فاطمہ کے رنگ فق ہو گئے۔

"تو...... تُو...... چڑیل ہے؟" کنیز فاطمہ پھر رونے لگی۔

"میرے خاوند کو کھا گئی تُو چڑیل۔"

"ہائے میرا بھائی...... میرا بھائی......" رقیہ زار و قطار پھر رونے لگی۔

"بند کرواپنے مرثیے...... اب اگر تمہاری آواز نکلی تو اسی خنجر کے ساتھ تمہارے بھی پیٹ پھاڑ دوں گی۔ اٹھو دونوں پلنگ کے دائیں بائیں کھڑی ہو کر میری ٹانگیں اور پاؤں دباتی رہو۔"

"چمکار...... جی مالکن۔"

"ساری رات ان کی نگرانی کرنا۔ جس وقت ان کے ہاتھ رکیں، پوری قوت سے کوڑا ان کے جسم پر پڑنا چاہیے۔" شکنتلا کی ہدایت کے ساتھ ہی چمکار نے سرعت کے ساتھ دو قلابازیاں لگائیں، فوراً ہی چمکار کی شکل کے دو مہابیر نمودار ہوئے، دونوں کے ہاتھ میں لمبے لمبے چمڑے کے کوڑے تھے۔ شڑاپ شڑاپ کی دو آوازیں ابھریں اور رقیہ اور کنیز فاطمہ کے جسم پر خونی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ نرم و نازک لڑکیاں تکلیف اور آنے والے وقت کا تصور کر کے بید مجنوں کی مانند کانپنے لگیں۔ شکنتلا فاتحانہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کل صبح تم میں سے ایک کا خون پی کر ناشتا کروں گی...... اور دن کا بھوجن دوسری کے خون سے کروں گی۔ آج تمہارے جیون کی آخری رات ہے اور ہو گی بھی بڑی تکلیف دہ...... لیکن تمہارے لیے...... میں تو آرام سے سوتی رہوں گی۔"

آنے والے وقت کا سوائے اللہ کے کسی کو کچھ علم نہیں کہ کیا ہو گا، تم تو کل صبح اور دوپہر کی بات کرتی ہو شکنتلا چڑیل۔" کنیز فاطمہ شکنتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"کیا معلوم آنے والی صبح کس کے لیے...... کیا پیام لاتی ہے؟"

"لیکن ایک بات طے شدہ حقیقت ہے کہ......" رقیہ بھی دلیری سے بولی۔

"کانٹے بونے سے پھول نہیں اُگتے...... ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔"

اور سلیمان کی لاش کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔

"خون پھر خون ہے گرتا ہے تو جم جاتا ہے۔ قسم پیدا کرنے والی ذات کی جس کے قبضے میں ہماری، تمہاری اور سب کی جانیں ہیں، تم ہمیں چاہے جو بھی سزا دو لیکن ہم تمہاری ٹانگیں اور پاؤں نہیں دبائیں گی۔" یہ کہتے ہوئے رقیہ پیچھے ہٹی اور ساتھ ہی کنیز فاطمہ نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے ساتھ ہی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں ابھرنے لگیں اور مہابیر مسلسل کوڑے برسانے لگے۔ دونوں لڑکیاں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں...... ان کے اپنے گھر کی زمین ان کا ہی خون چاٹنے لگی......

شکنتلا حقارت سے انہیں دیکھتی رہی...... تھوڑی دیر بعد دونوں بے ہوش ہو چکی تھیں۔ جب یہ ہوش میں آجائیں تو انہیں پھر مارنا...... شکنتلا کے ساتھ زبان درازی اور ان کے مسلمان ہونے کی یہی سزا ہے۔ یہ کہہ کر شکنتلا نے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند کی وادی میں پہنچ چکی تھی۔

☆......☆

رات کے آخری پہر شکنتلا کے سر میں درد کی لہریں اٹھیں۔ درد اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس نے دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لیے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ کی رگوں کو کوئی نادیدہ قوت پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے کھڑے دو انسانوں کو پایا، جن میں سے ایک کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ گرو نرائن تھا...... جو خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

''مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی میری جان......''

''ہائے میرا سر گیا...... ہائے ہائے...... ہائے رام جی ہائے ناگ دیوتا...... میرا سر پھٹ جائے گا...... افوہ...... اُوئی ماں۔''

گرو نرائن اور لکشم ناتھ کمرے کے وسط میں کھڑے سارا ناٹک دیکھ رہے تھے، پھر گرو نرائن کڑک کر بولا۔

''شکنتلا...... آج سے تُو میری غلام ہے۔''

''ہاں...... ہاں میں......'' اس کے سر کا درد فو چکر ہو گیا...... اور اب وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ چتکارا اور دوسرے مہابیر غائب ہیں، رقیہ اور کنیز فاطمہ خون میں لت پت بے ہوش پڑی ہیں۔ گرو نرائن اور دوسرا آدمی صرف ایک دھوتی اور پاؤں میں کھڑاؤں پہنے کھڑے ہیں۔ دونوں کے گنجے سر شمع کی روشنی میں چمک رہے تھے اور دونوں کے جسم پر دھوتی کے سوا کوئی لباس نہ تھا۔

''میرے سر کا درد ٹھیک ہو گیا ہے۔'' وہ اپنے سر کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولی۔

''پرنتو صرف اس سمے تک جب تک تو میری غلام ہونے کے وچن پر قائم ہے۔'' گرو نرائن نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

شکنتلا حاکمانہ زندگی بسر کرنے والی عورت جس کے حکم پر بڑے بڑے سورما تھر تھر کانپتے تھے، گرو نرائن کی یہ بات سن کر اس کی کھوپڑی گھوم گئی اور وہ ایک دم بتھے سے اکھڑ گئی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''شکنتلا اتنی کمزور نہیں گرو نرائن کہ تم جیسے دو ٹکے کے پجاری اس کو غلام بنا سکیں......'' مگر اگلے ہی لمحے اس نے دوبارہ اپنا سر پکڑ لیا۔ درد کی شدید لہریں اس کے سر میں دوبارہ اٹھنے لگیں، ان لہروں کے جھٹکے اب پہلے سے بھی تیز تھے۔ درد کی شدت سے وہ زمین پر گر پڑی اور اپنا سر زمین پر پٹخنے لگی۔ اس نے درد برداشت کرنے کی پوری کوشش کی لیکن بے سود، اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ ساری خود اعتمادی دم توڑ گئی تھی۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیے۔

''مجھے معاف کر دو...... میں تمہاری باندی ہوں، غلام ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس کا درد غائب ہو گیا۔ شکنتلا بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ گرو نرائن کو اب پتا چل گیا کہ جب یہ نافرمانی کی کوشش کرے گی تو اس کی یہی حالت ہو گا۔ یہی کالی ماتا کے شبھ تیرتھ جاپ کا اصل کارنامہ ہے کہ مؤکل عامل کی منشاء سے ہٹ کر کوئی بات کر سکتا ہے نہ سوچ سکتا ہے۔ جاپ کا عمل مؤکل کا ذہن اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

اس سارے عمل کو لکشم ناتھ بھی بغور دیکھ رہا تھا۔ اتنی خوب صورت لڑکی اس نے سارے جیون میں نہ دیکھی تھی...... گول مٹول بھری بھری گلابی رنگت اس کا جی للچانے لگا۔

''لکشم ناتھ...... آپ نے تیرتھ جاپ کا کرشمہ ملاحظہ فرمایا؟ مؤکل عامل کی منشاء سے انحراف کر ہی نہیں سکتا۔'' گرو نرائن پُرجوش تھا۔

''اب کیا خیال ہے؟ رات یہیں بسر کی جائے یا واپس کلکتے چلیں۔''

''اس کو وہیں لے چلتے ہیں تاکہ ساری صورتحال قابو میں آجائے۔'' لکشم ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

''شکنتلا......!'' گرو نرائن کڑک کر بولا۔ ''اپنے مہابیروں کو حکم دو کہ ہم سب کو ریاست کلکتہ کالی ماتا کے استھان کے اندر لکشم ناتھ کے کمرۂ خاص میں لے چلیں۔''

☆......☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ جون میں ملاحظہ کیجیے)

کھٹمل

سرور شاذ

منچن آباد سے جاگیردارانہ نظام کے راز آشکار کرتی، ایک حسینہ کی لرزہ خیز داستانِ الم کا دوسرا اور آخری حصہ





چوہدری طالب کے خاص بندے کی طرف؟ اور وہ بھی اس کنجری کی خاطر؟ چپ ہوجا آگے اور کچھ نہ بھونکنا...... یہاں سے چلے جاؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" شمشیر نے اسے وارننگ دی۔ اس وقت شوکا کھٹمل کے تین بندے اور بھی اسلحہ سمیت آگئے تھے۔ شمشیر کے دوست کارندوں نے بھی اپنی گنوں کی نالیاں ان کی طرف کردی تھیں۔ شمشیر نے ان کو گنیں نیچے کرنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے اپنی گنیں نیچے کرلیں، پھر شمشیر تھوڑی سی گرجدار آواز سے بولا۔

"شوکے! تم مالک کے مہمان ہو۔ اگر تم مہمان نہ ہوتے تو ابھی تک اپنے قدموں پر نہ کھڑے ہوتے۔ آج کے بعد تم رضیہ کو بُری نظر سے نہیں دیکھو گے، کیوں کہ اب رضیہ میری عزت بن چکی ہے۔ میں عنقریب اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ اگر تم نے ضد میں آکر کوئی انتقامی کارروائی کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا، یاد رکھنا میرا نام شمشیر ہے اور مجھے تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔ میں تمہیں اس لیے زندہ چھوڑ رہا ہوں کہ تم میرے مالک کے دوست کے خاص بندے ہو۔"

"اس دوٹکے کی چھوکری کی خاطر تم شمشیرے......" شمشیر کے بولنے سے پہلے میں بول پڑی۔

"اب میں دوٹکے کی چھوکری نہیں۔ میں اب شمشیر کی غیرت اور عزت بن چکی ہوں۔ میرا نام اب رضیہ نہیں رضیہ سلطانہ بن چکا ہے۔ میرے نام کو یاد رکھنا، شوکے۔ میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں تمہارے حرام ماس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے چیلوں اور کتوں کے آگے ڈال دوں گی۔" شوکا کھٹمل میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے ہتک آمیز کلمات سن کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، پھر وہ شمشیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"شمشیرے! میں اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔" شوکا اتنا کہتے ہوئے واپس مڑا اور اپنے بندوں کو لے کر نمبردار خداداد کے ڈیرے سے چلا گیا۔ میں شمشیر کو پیار اور تشکر سے دیکھنے لگی۔ اس نے میری خاطر چوہدری طالب کے خاص بندے سے ٹکر لے لی تھی۔ میری آنکھوں میں انتقام کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ اب اس چنگاری نے شعلہ بننا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ شمشیر سب کو اپنی گن سے بھون دے۔ میں شمشیر کے زورِ بازو سے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انتقام لینے کا وقت قریب آنے والا تھا اور مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار تھا۔

☆......☆

میری وجہ سے شمشیر کی نمبردار خداداد سے بحث و تکرار ہوئی۔ نمبردار خداداد نے زندگی میں پہلی بار شمشیر کے ساتھ اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ شمشیر کی وجہ سے نمبردار خداداد کے چوہدری طالب سے بھی تھوڑے سے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی کشیدگی کی اصل وجہ تو میں تھی۔ اس لیے تو نمبردار

خداداد چاہتا تھا کہ شمشیر مجھے چھوڑ دے۔ وہ میرا خیال دل سے نکال کر پہلے کی طرح اپنے کام سے کام رکھے اور شوکے سے معافی بھی مانگے۔

شمشیر کو یہ سب کہاں گوارا تھا؟ جب نمبردار خداداد اور شمشیر کی آپس میں بحث وتکرار ہوئی تو اس وقت میں بھی شمشیر کے ساتھ ہی تھی۔ نمبردار خداداد نے میری وجہ سے کچھ زیادہ بے ہودہ باتیں نہیں کی تھیں...... لیکن اس نے شمشیر سے جو اشاروں میں باتیں کیں وہ میرے لیے گالیوں سے کم



نہیں تھیں..... مالک ہونے کی بنا پر شمشیر نمبردار خداداد کی تمام بے ہودہ باتوں کو برداشت کر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ نمبردار خداداد نے اسے کافی سمجھایا، لیکن اس کا سمجھانا بے سود رہا۔ شمشیر اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے نمبردار خداداد کو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں رضیہ سے محبت کرتا ہوں اور جلد ہی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے ہماری شادی کو ناپسند کیا یا رضیہ کو مجھ سے چھیننے یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں پہلے اسے پھر خود کو گولی مار لوں گا۔ اب رضیہ میری زندگی ہے اور میں رضیہ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

شمشیر کی جذباتی باتیں سن کر نمبردار خداداد میں بھی لچک پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ شمشیر کو کھونا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ وہ اس کا سب سے وفادار بندہ ہی نہیں، بلکہ اس کا ایک بازو بھی تھا۔ اس نے شمشیر کی ضد کے آگے ایک طرح سے ہار مان لی تھی، پھر اس نے چوہدری طالب سے درخواست کی تھی کہ وہ شوکے کو سمجھائے۔ ایک عام سی لڑکی کی خاطر ان کا آپس میں اس طرح جھگڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ شوکا چھمل اس لڑکی کو اپنی ضد نہ بنائے۔ اس کے لیے ایسی سیکڑوں لڑکیاں مہیا ہو سکتی ہیں۔

چوہدری طالب نے نمبردار خداداد کے ڈیرے پر آ کر شمشیر کو تنبیہ بھی کی تھی اور اسے پیار سے سمجھایا بھی تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ شوکا چھمل بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو یوں ان کی دشمنی کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑ گئی...... لیکن میں کہاں اس آگ کو ٹھنڈا ہونے دے سکتی تھی۔ میں تو شمشیر کے ساتھ ایک آگ کی صورت میں ان کے درمیان موجود تھی، گو کہ ان کے مابین یہ آگ وقتی طور پر ٹھنڈی تو ہو گئی تھی اور وقتی طور پر ہی شمشیر اور شوکے چھمل کی آپس میں صلح بھی ہو گئی تھی، کیوں کہ دھندے کے لیے ان کی آپس میں صلح بے حد ضروری تھی۔

چوہدری طالب کا کالا دھندہ شوکا چھمل کے دم سے تھا اور نمبردار خداداد کی تمام تر اسمگلنگ شمشیر کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ دونوں ہی ان کے خاص بندے تھے اور ان دونوں نے ہی چوہدری طالب اور نمبردار خداداد کو لکھ پتی سے کروڑ پتی بنایا تھا۔ شمشیر نے زندگی میں پہلی بار میری خاطر نمبردار خداداد کے سامنے سر اٹھا کر بات کی تھی، نمبردار خداداد نے جب دیکھا کہ شمشیر بغاوت پر اتر سکتا ہے تو اس نے شمشیر کے ارادوں کے سامنے وقتی طور پر اپنا سر خم کر دیا تھا۔

☆......☆

اب میں ہر وقت شمشیر کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔

جب شمشیر اسمگلنگ کے سلسلے میں انڈیا چلا جاتا تو میں خود کو اس کے کمرے میں بند کر لیتی تھی اور بہت ہی کم اور بڑا دیکھ بھال کر باہر نکلتی تھی۔ میں کمرے میں تنہا بیٹھ کر آنے والے وقت کے لیے منصوبے بنائی رہتی تھی۔ جو اسلحے کی پہچان رہتی تھی، وہ مجھے شمشیر نے کرا دی تھی۔ اب مجھے بندوق اور ریوالور چلانے میں مہارت حاصل ہو چکی تھی۔

مجھے ہر قسم کا اسلحہ چلانے کی ٹریننگ مل چکی تھی۔

شمشیر نے میری ٹریننگ میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ وقت اب قریب آ چکا تھا، جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ میں نے شمشیر کو اپنی ڈھال نہیں بنایا تھا، بلکہ مجھے اس سے محبت ہو چکی تھی اور شمشیر کو مجھ سے۔ ہم ایک دوسرے کو کافی حد تک جان چکے تھے۔

شمشیر نے ابھی تک اپنے بارے میں کوئی خاص نہیں بتایا تھا، حالاں کہ میں اسے جاننا چاہتی تھی۔ میں جب بھی اس سے پوچھتی تو وہ ٹال مٹول کر دیتا تھا۔ اب مجھے اپنا انتقام لینے کا پورا موقع ملنے والا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ بس وہ وقت قریب آ چکا ہے۔ میں اس وقت کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ شمشیر کی رگوں میں میری محبت لہو کی طرح دوڑ رہی تھی۔ وہ اب میری خاطر سب سے ٹکر لے سکتا تھا۔ شمشیر نے اپنے متعلق مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ نمبردار خداداد مجھے کراچی سے یہاں اپنے پاس لایا تو میں اس وقت چھوٹا سا تھا۔ اس نے یہاں مجھے مکمل ٹریننگ دی۔ میں کون ہوں؟ مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے..... بس اپنے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں مجھے پتا نہیں میں کون ہوں؟ میری ماں کون ہے، میرا باپ کون ہے، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ میرا سب کچھ یہ نمبردار خداداد ہے۔ یہی میرا مالک ہے۔ تم مجھ سے بار بار میرے متعلق نہ پوچھا کرو، مجھے اپنے بارے میں کچھ پتا نہیں......" اب میں نے مزید شمشیر سے کچھ پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ اپنے بارے میں یہی کچھ جانتا تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔

مجھے شمشیر کے ساتھ رہتے ہوئے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا، لیکن ابھی تک ہم نے شادی نہیں کی تھی۔

شمشیر مجھ سے جلد شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ شادی کر کے مجھے کراچی لے جانا چاہتا تھا۔ وہ یہاں کی مار دھاڑ والی زندگی سے بہت تنگ آ چکا تھا۔

نمبردار خداداد اور چوہدری طالب جو آئے دن غریبوں کی بیٹیاں اٹھا کر لاتے تھے اور ان کی عزتیں لوٹتے تھے، شاید ان کو دیکھ کر شمشیر میں بغاوت آ گئی تھی۔ کچھ میری باتوں نے اسے نمبردار خداداد اور چوہدری طالب سے بیزار کر دیا تھا، جو مجھ پر ظلم ہوا تھا۔ وہ میں نے اسے کہاں بھولنے دیا تھا۔ میں باتوں ہی باتوں میں ظلم کی وہ تاریخ دہراتی رہتی تھی اور شمشیر کو اپنا انتقام لینے پر اکساتی رہتی تھی۔ میری محبت میں اب شمشیر کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ میں شادی سے پہلے ہر حالت میں اپنا انتقام لینا چاہتی تھی۔ میں موقع کی تلاش میں تھی۔ شمشیر میرے ہاتھ میں تھی، صرف اسے چلانا تھا، باقی کام سب شمشیر نے کرنا تھا۔ اب مجھے صرف ایسے وقت کا انتظار تھا کہ جب شمشیر سب کے سامنے بندوق تان لے اور میری عزت لوٹنے والوں کے سینے چھلنی کر دے۔ میں کسی ایسے وقت کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔

☆......☆

جس طرح میری عزت لوٹ کر سب نے مل کر جشن منایا تھا، اسی طرح اس دن بھی جشن کی خوب تیاری ہو رہی تھی۔ اس دن نجانے کس کی بیٹی ان سب کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے والی تھی۔ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ شام کے وقت خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ ابھی شام نہیں ڈھلی تھی۔ نمبردار خداداد کے ڈیرے پر جشن کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ ڈیرے کو ہر طرح سے صاف ستھرا کر دیا گیا تھا۔ میرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے کہ نجانے کس بدنصیب کی باری ہو گی؟ میں اس دن بھی شمشیر کے ساتھ تھی۔ مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں اور شمشیر باہر صحن میں کرسیوں پر بیٹھے آنے والے مہمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت شمشیر اسلحہ سے لیس تھا...... شاید مہمانوں کی حفاظت کے لیے سب کارندوں کو اسلحہ سے لیس کیا گیا تھا۔ قانون اور سیاست کی نمائندہ ہستیوں کے لیے جشن کا انتظام کیا گیا تھا۔ نمبردار خداداد، چوہدری طالب اور تھانیدار جاوید اقبال تینوں اکٹھے آئے تھے۔ تھانیدار جاوید اقبال نے مجھے شمشیر کے پاس بیٹھا دیکھا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے سرگوشی میں نمبردار خداداد سے پوچھا کہ "یہ کیا ہے؟" نمبردار خداداد نے اسے نجانے کن لفظوں سے سمجھایا۔ تھانیدار جاوید اقبال نے مجھے گھور کر دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے اس نے کہا ہو کہ "خوب ترقی کی ہے۔"

پھر وہ تینوں چلتے ہوئے ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہندو شرما بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ نمبردار خداداد کے تین بندے بھی تھے۔ ان کے کندھوں سے لگی کلاشنکوفیں جھوم رہی تھیں۔ شرما نے بھی جاوید اقبال کی طرح مجھے گھور کر دیکھا۔ جواب میں، میں نے بھی اسے گھور کر دیکھا اور دیکھنے کے بعد میں نے بڑبڑاہٹ میں اسے گندی گالیاں دیں۔ شرما مجھے گھورتا ہوا ہال نما کمرے میں چلا گیا۔ شمشیر نے مجھے بتایا تھا کہ علاقے کا موجودہ ایم پی اے بھی ان کی دعوت میں شریک ہو رہا تھا، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود ہال نما کمرے میں کافی شور شرابہ تھا۔ جام پر جام چڑھائے جا رہے تھے۔ شراب پینے کے بعد وہ تمام لوگ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ شرما جھومتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ باقی تینوں کمرے کے اندر ہی تھے۔ شاید وہ ابھی اور شراب پی رہے تھے۔ شرما لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ہمارے قریب آ گیا۔ وہ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا شرابی لہجے میں بولا۔

"اوئے شمشیرے! اس چھوکری کے کپڑے پھاڑ دے اور اسے ننگا کر کے اندر بھیج دے۔ اسے دیکھ کر تو مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہو رہا۔ وہ سالا شوکا پھل ابھی تک کوئی شکار لے کر نہیں آیا۔ جب تک وہ نہیں آتا تب تک ہم اس سے گزارا کرتے ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت شمشیر چلا اٹھا اور اس نے کندھے سے گن اُتار کر ہاتھ میں کر لی۔

شمشیر نے گن صرف ہاتھ میں لی تھی، ابھی اس نے شرما کی طرف سیدھی نہیں کی تھی۔ شمشیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی گرجدار آواز میں غصہ تھا۔

"میں کہتا ہوں یہاں سے چلا جا...... اگر تو میرے مالک کا دوست نہ ہوتا تو میں اب تک تجھے بھون چکا ہوتا۔ تیرے وجود میں ان گنت سوراخ کر دیتا میں۔"

اس کی بکواس سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ چکے

تھے اور میں رونے لگی تھی۔ شور کی آواز سن کر نمبردار خداداد، چوہدری طالب اور تھانیدار جاوید اقبال بھی کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ نمبردار خداداد نے حالات کی سنگینی کو دیکھا تو شرما کو لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے چوہدری طالب اور تھانیدار جاوید اقبال بھی چلے گئے۔ انہوں نے ہم سے کوئی بات نہ کی تھی۔ مجھے روتا دیکھ کر شمشیر جذباتی ہو گیا اور جذباتی لہجے میں ہی بولا۔

"رو کیوں رہی ہو؟ رضیہ! میں کیا کروں؟ میں مجبور ہوں۔ میں نے مالک خداداد کا نمک کھایا ہے۔ میں بے بس ہوں۔ اگر بے بس نہ ہوتا تو اب تک تمہاری بے عزتی کا بدلہ لے چکا ہوتا، خیر...... ہم جلد ہی کراچی چلے جائیں گے۔ اگر مالک خداداد نے اجازت نہ دی تو ہم یہاں سے فرار ہو کر جائیں گے...... بس اب تم رونا بند کرو۔" میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کے آنسو پونچھے۔

ہم دونوں ابھی تک باہر صحن میں ہی کھڑے تھے۔ شام کے بعد کا سُرمئی اندھیرا نمبردار خداداد کے ڈیرے کے چاروں سُو پھیل چکا تھا۔ ڈیرے کے صحن میں گیس لیمپوں کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیرے کا صحن دن کی طرح اُجلا اور نکھرا نظر آ رہا تھا۔ اس وقت ڈیرے کے باہر ایک جیپ آ کر رُکی اور شوکا کچھل اپنے کارندوں کے ساتھ ڈیرے کے اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے کندھے پر ایک لڑکی اٹھائی ہوئی تھی۔ لڑکی چیخ چلا رہی تھی۔ اس لڑکی کے منہ سے کپڑا نکال دیا گیا تھا۔ شوکا ہمارے قریب سے لڑکی کو لے کر گزرنے لگا تو میری آنکھیں لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر جھپکنا بھول گئیں۔

"نن...... نہیں۔ یہ وہ نہیں، لیکن اس کا چہرہ اور آواز......؟" شوکا کچھل لڑکی کو اٹھائے ہوئے کمرے کے اندر چلا گیا تھا۔ اس کے اندر جاتے ہی کمرے میں ہلچل مچ گئی تھی۔ نعرے لگنے لگے تھے۔ شمشیر نے مجھے سکتے کی حالت میں دیکھا تو اس نے مجھے جھنجھوڑا۔ اس کے یوں جھنجھوڑنے پر جیسے میں ہوش میں آ گئی تھی۔ شمشیر نے مجھ سے پوچھا۔

"اس لڑکی کو دیکھ کر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ لڑکی کون ہے؟"

"شمشیر! خدا کے لیے اس لڑکی کو بچالو۔" "بتاؤ وہ کون ہے؟" "وہ...... وہ......" میری زبان ہکلا رہی تھی۔ "وہ آفتاب کی چھوٹی بہن جمیلہ ہے۔"

"آفتاب کی چھوٹی بہن جمیلہ؟" شمشیر ایک دم بولا۔ "وہی آفتاب جس کے متعلق تم نے مجھے......" میں جلدی سے بولی۔

"ہاں...... ہاں وہی آفتاب۔ خدا کے لیے شمشیر! جمیلہ کی عزت بچالو۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی عزت لٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ شمشیر! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" گن پر شمشیر کے ہاتھوں کی مضبوطی بڑھ گئی۔ شمشیر کے خطرناک ارادوں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اب وقت آ چکا ہے جس وقت کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ اسی وقت جمیلہ پھٹے لباس کے ساتھ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ اس کی سامنے سے قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ اس کے پیچھے وہی چاروں بدمعاش تھے۔ وہی چاروں درندے جنہوں نے کبھی میری عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ جمیلہ بھاگتی ہوئی ڈیرے کی دیوار کے ساتھ چمٹ گئی۔ اب اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ میں اور شمشیر اپنی آنکھوں سے یہ رُوح فرسا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ چاروں خباثت سے مسکراتے ہوئے جمیلہ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک...... تڑ، تڑ، تڑ۔ شمشیر کی کانپتی انگلی نے گن کا ٹریگر دبا دیا تھا۔ ایک دم گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ شمشیر نے ایک زاویے سے گولیاں چلائی تھیں۔ نمبردار خداداد سب سے پیچھے تھا، اس لیے وہ ان گولیوں سے محفوظ رہا تھا...... جس طرح شمشیر نے گن کو زاویے سے چلایا تھا، مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی تھی! شمشیر اپنے مالک نمبردار خداداد کو صاف بچا گیا تھا۔ شاید اس نے نمبردار خداداد کو بچا کر نمک حلالی کی تھی۔ شرما، چوہدری طالب، شوکا کچھل اور تھانیدار جاوید اقبال چاروں زمین پر گر کر تڑپ رہے تھے۔ جس طرح گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی ان میں سے کسی کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ چاروں شمشیر کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے اور ٹیڑھے میڑھے انداز میں ساکت ہوتے جا رہے تھے۔ نمبردار خداداد شمشیر کو اور مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شمشیر نے اس کے چاروں دوستوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ نمبردار اس وقت سخت بدحواسی کی کیفیت میں تھا۔

"آؤ۔" شمشیر نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس نے مجھے بھاگنے کے لیے کہا، کیوں کہ اب یہاں رکنے میں خطرہ تھا۔ اگر نمبردار خداداد کے بقیہ کارندوں کو

صحیح صورتحال کا پتا چلتا تو وہ ہمیں آسانی سے اپنی بندوقوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ بھاگتے وقت میں نے شمشیر کو جمیلہ کی طرف متوجہ کیا۔ شمشیر بھاگتے ہوئے بولا۔

”رضیہ! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ہم اگر جمیلہ کی خاطر یہاں رکے تو چاروں طرف سے گھر جائیں گے۔“ میں نے بھاگتے ہوئے واپس مڑ کر دیکھا تو نمبردار خداداد کے ہاتھ میں نجانے کہاں سے ریوالور آچکا تھا اور اس نے ریوالور کا رُخ ہماری طرف کرنے کی بجائے جمیلہ کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ریوالور سے نکلی گولیاں دیوار سے چمٹی جمیلہ کی پشت میں گھس گئیں اور جمیلہ ریت کی دیوار کی طرح نیچے زمین پر گر پڑی۔ اس وقت تک شمشیر مجھے کھینچ کر ڈیرے کے دروازے سے باہر لا چکا تھا۔ اسی وقت نمبردار خداداد کے ریوالور سے بقیہ گولیاں ڈیرے کے دروازے سے ٹکرائیں۔ اگر دروازے سے گزرنے میں ہمیں چند سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو ہم نمبردار کے ریوالور کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ شمشیر میرا ہاتھ پکڑے باہر کھڑی نمبردار خداداد کی جیپ کی طرف بڑھا۔ اس نے جلدی سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا، مجھے آگے فرنٹ سیٹ پر گرایا اور دوسری طرف آ کر جلدی سے دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ کی اور اسے بڑی مہارت سے گھمایا۔ جیپ کے پہیوں کی آواز جیپ کی آواز سے زیادہ تیز سنائی دی...... اب جیپ مڑ کر ڈیرے سے باہر کی طرف جانے والے رستے پر تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ شمشیر اسے بڑی مہارت سے چلا رہا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سے پتا چل رہا تھا کہ شمشیر جیپ کو کتنی مہارت سے بھگا رہا ہے...... کچے راستے کے بعد اب جیپ ایک پکے روڈ پر آ گئی تھی اور اب اس کی رفتار پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

شمشیر جیپ کو بڑی تیزی سے شہر کی طرف بھگائے لے جا رہا تھا۔ جتنی تیز رفتاری سے جیپ بھاگ رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ ہم بہت جلد شہر پہنچ جائیں گے۔ شہر پہنچنے میں ہمیں کتنا وقت لگا اس کا ہمیں علم نہ ہو سکا تھا۔ شہر بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت سڑکوں پر کافی ٹریفک تھی۔ شمشیر جیپ چلانے کا ماہر تھا۔ وہ اتنی ٹریفک میں بھی جیپ کو تیز رفتاری سے چلا رہا تھا...... جیپ شہر سے گزر کر ایک تھوڑی سی ویران شاہراہ پر آ چکی تھی۔ گاڑیوں کی روشنی سے روڈ کے دائیں بائیں ہر چیز پر نظر پڑ رہی تھی...... یہاں ایک درختوں کے جھنڈ کو دیکھ کر شمشیر نے جیپ روڈ سے نیچے اتار دی۔ وہ جیپ کو جھنڈ کے اندر تک لیتا گیا، پھر جیپ ہچکولے کھاتی ایک درخت سے ٹکرا کر رُک گئی۔ شمشیر نے جلدی سے اس کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں۔ اس نے جیپ کی چابی نکال کر باہر پھینک دی ساتھ ہی اس نے گن بھی اُتار کر پھینک دی تھی، پھر مجھے جیپ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں جیپ سے باہر آ گئے۔ شمشیر نے دوبارہ مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اب ہم روڈ کے اوپر نہیں آئے تھے، بلکہ روڈ کے ساتھ ساتھ ایک کچی پگڈنڈی پر تیز تیز چل رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ ہم بھاگ رہے تھے کہ روڈ پر چلتی گاڑیوں میں سے کوئی ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دُور ایک بلڈنگ نظر آ رہی تھی۔ ہم اس کی طرف تیز تیز قدموں کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ بلڈنگ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس پر کئی لائٹس جل رہی تھیں۔ وہ عمارت ریلوے اسٹیشن کی تھی۔

ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب آ چکے تھے، پھر ہم ریلوے گیٹ سے گزر کر اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے۔ شمشیر پہلے ہی مجھے نقاب کا کہہ چکا تھا۔ اسٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے چادر سے نقاب لگا لیا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اسے پلیٹ فارم پر آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی، کیوں کہ ڈبوں کے دروازوں پر کافی رش تھا۔ کچھ مسافر ابھی تک اُتر رہے تھے۔ شمشیر مجھے پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بٹھا کر اسٹیشن کی بلڈنگ کی طرف تیز قدموں سے چلا گیا۔ اس نے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دو ٹکٹ لے کر آ گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم چلتے ہوئے ایک ڈبے کے دروازے پر آ گئے تھے۔ اس دروازے پر رش کچھ کم تھا۔ ہم دروازے سے ڈبے کے اندر داخل ہو گئے۔ ابھی ڈبے کے اندر مسافر سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہمیں بھی برتھ کے نیچے دو سیٹیں مل گئیں۔ پیچھے سے آنے والے مسافروں نے شمشیر کے ساتھ مجھے دیکھا تو لیڈیز کی وجہ سے انہوں نے ہمیں بیٹھنے کی جگہ دے دی تھی۔ شمشیر نے مجھے کھڑکی کی طرف بٹھایا تھا اور خود میرے ساتھ لگ کر

بیٹھ گیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے پیچھے سے آنے والے مسافروں کا شکریہ ادا کیا اور ان سے توجہ ہٹانے کے لیے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کیا ہوا تھا۔ اس وقت گاڑی سرکنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اب اسٹیشن کافی پیچھے رہ گیا تھا اور گاڑی کی رفتار بھی کافی تیز ہو چکی تھی۔ گاڑی شہر کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ اس وقت تک ہمارے حواس بھی کافی حد تک بہتر ہو چکے تھے۔ ہم آس پاس بیٹھے مسافروں کو دکھانے کے لیے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے...... ہم کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے کہ ہم پیچھے سے فرار ہو کر آ رہے ہیں...... اسی لیے ایک دوسرے سے ہم میاں بیوی کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تین اسٹیشن گزر گئے تھے۔ ان اسٹیشنوں پر گاڑی تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رُکی تھی۔

رات بیتی جا رہی تھی۔ گاڑی کئی اسٹیشنوں کو کراس کر چکی تھی۔ اب مسافر بھی اونگھنے لگے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن ہم آنکھیں بند کر کے ابھی جاگ رہے تھے۔ بھلا ہمیں کہاں نیند آ سکتی تھی۔ جن خونی واقعات سے ہم گزر کر آ رہے تھے، گاڑی میں ہمیں ایک پل نیند نہیں آ سکتی تھی۔

میں جمیلہ کی موت پر بڑی افسردہ تھی اور اپنی نقاب کی چادر سے میں دو تین بار اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ چکی تھی۔ نمبردار خداداد کو ہم سے زیادہ جمیلہ پر غصہ تھا۔ ہمیں گولیاں مارنے کی بجائے اس نے پہلے جمیلہ کو نشانہ بنایا تھا۔ اگر وہ پہلے ہمیں نشانہ بناتا تو ہم اس کے نشانے پر آ بھی سکتے تھے۔ نجانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟

شمشیر نے نمبردار خداداد کو جس طرح سے اپنی گولیوں سے بچایا تھا، مجھے اس کا دُکھ تھا۔ نمبردار کا ان چاروں کے ساتھ ہی خاتمہ ہو جاتا تو سب کی کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ اب نمبردار خداداد زندہ رہ گیا تھا...... اپنے چاروں ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟ میں آنکھیں بند کیے خیال میں نمبردار کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس طرح روتا دیکھ کر میرے دل کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ اس سکون کے باوجود اس کے زندہ بچ جانے پر میرا دل کافی اُداس تھا...... میں تو اس کی لاش کو بھی تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی...... نمبردار خداداد کے زندہ بچ جانے کی وجہ سے میرا انتقام مکمل نہیں ہوا تھا۔ جس طرح شمشیر نے نمبردار کو بچایا تھا، میرا دل کر رہا تھا کہ میں شمشیر سے خوب لڑوں، جھگڑوں، لیکن اس وقت ہم لڑنے جھگڑنے والی پوزیشن میں نہیں تھے۔

گاڑی سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تو گاڑی کی رفتار آہستہ ہو جاتی۔ اس وقت ہم آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر آنے والے شہر کی روشنیوں کو دیکھنے لگتے۔ شمشیر نے مجھے آہستہ آواز میں بتا دیا تھا کہ ہم کراچی جا رہے ہیں اور صبح نو، دس بجے تک ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔ کراچی کے متعلق میں کچھ نہ جانتی تھی، بلکہ میں تو پہلی بار کراچی جا رہی تھی۔ میں تو ریل گاڑی میں بھی پہلی بار بیٹھی تھی۔ پہلے اس کے متعلق اپنی سہیلیوں سے سنتی تھی۔ اب گاڑی جس طرح سرپٹ بھاگی جا رہی تھی، یہ مجھے کافی انوکھا لگ رہا تھا...... ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی کچھ زیادہ دیر رُکی تھی۔ شمشیر نے مجھے بتایا کہ یہ حیدرآباد کا اسٹیشن ہے۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ شمشیر نے مجھ سے کچھ کھانے کا پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے، اب ہم کراچی پہنچ کر ہی کچھ کھائیں گے۔“ ہمارا خوف ابھی تک کم نہیں ہوا تھا...... گاڑی حیدرآباد اسٹیشن پر کچھ زیادہ دیر رُکنے کے بعد پھر چل پڑی تھی۔ اب میں اور شمشیر کھڑکی سے باہر حیدرآباد شہر کو پیچھے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اب گاڑی ایک بڑے پُل سے گزر رہی تھی۔ شمشیر نے مجھے بتایا کہ یہ دریائے سندھ ہے۔ میں حیرت سے اتنے بڑے دریا کو دیکھ رہی تھی۔ پہلے میں نے صرف نہریں ہی دیکھی تھیں...... دریا کے پُل سے گاڑی گزر گئی۔ اب پھر گاڑی کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور پھر اچانک گاڑی کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔

دن کا آغاز ہو چکا تھا اور ڈبے میں باتیں کرنے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں...... تقریباً ہر کوئی جاگ چکا تھا۔ میں اور شمشیر بھی ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ جس طرح ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، لگ رہا تھا کہ خوف کافی حد تک کم ہو گیا ہے...... کراچی نزدیک آتا جا رہا تھا۔ جوں جوں کراچی نزدیک آ رہا تھا، شمشیر کے

چہرے پر رونق آتی جارہی تھی...... میں اس کے چہرے کی رونق کو دیکھ کر اس سے خوب باتیں کررہی تھی...... جو پیچھے ہم چار قتل کرکے آرہے تھے، وہ فراموش تو نہیں ہورہے تھے، لیکن ایک دوسرے کو باتوں میں مصروف کرکے گزرے ہوئے دن کو فراموش کرنے کی کوشش کررہے تھے، جو میری زندگی کا ایک خونی دن تھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی اماں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا...... پہاڑی سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ پہاڑوں کو بھی میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔

کراچی کا مضافاتی علاقہ شروع ہوچکا تھا۔ شمشیر مجھے ہر چیز کے بارے میں بتاتا جارہا تھا۔ میں بھی اس سے ہر چیز کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ شاید میں اپنے ذہن کو گزرے خونی دن سے ہٹانا چاہتی تھی...... میں بڑی دلچسپی سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ کراچی کا آغاز ہوچکا تھا اور گاڑی اب کراچی شہر کی حدود میں داخل ہوچکی تھی۔ اس شہر کی اونچی اونچی بلڈنگیں نظر آنے لگی تھیں۔ شمشیر اپنی شہادت والی انگلی کے اشارے سے کراچی کے علاقے کے بارے میں مجھے بتاتا جارہا تھا۔

گاڑی تھوڑی دیر کے لیے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکنے کے بعد پھر چل پڑی تھی۔ اب اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی۔ اب مسافروں میں بے چینی نظر آرہی تھی۔ شاید ان کی منزل قریب آرہی تھی۔ گاڑی کی رفتار آہستہ ہورہی تھی اور پھر آہستہ ہوتے ہوتے آخر ایک بڑے اسٹیشن پر آکر رُک گئی۔ جہاں گاڑی رُکی تھی وہاں پلیٹ فارم پر کافی رش تھا، شاید یہ کراچی کا بڑا اسٹیشن تھا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی ڈبے سے نیچے اتر آئے تھے۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم بھی اس ہجوم میں شامل ہوگئے تھے...... ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ چلتے ہوئے باہر والے گیٹ پر آگئے۔ اسٹیشن کے اس بڑے گیٹ پر ہمارے ٹکٹ چیک کیے گئے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ہم اسٹیشن سے باہر آگئے۔ باہر قطاروں میں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں...... یہاں سے میں اور شمشیر ایک گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شمشیر نے گاڑی کے ڈرائیور کو کراچی کے کسی علاقے کا نام بتایا تھا اور پھر گاڑی چل پڑی تھی۔ گاڑی اسٹیشن سے نکل کر ایک بڑے روڈ پر آگئی تھی۔ اس روڈ پر گاڑیوں اور بسوں کا کافی رش تھا۔ اتنی گاڑیاں اور بسیں دیکھ کر میں کافی حیرت زدہ تھی، لیکن میں شمشیر پر اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد ایک چھوٹی سڑک پر آچکی تھی، پھر اسی سڑک پر ایک اونچی بلڈنگ کے سامنے گاڑی رُک گئی۔ شمشیر نے مجھے گاڑی سے اُترنے کا کہا تو میں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ شمشیر دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے پاس آیا۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ دیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف آگیا، گاڑی آگے کو چل دی تھی۔

شمشیر مجھے لے کر اس بلڈنگ میں داخل ہوگیا۔ اس کے اندر اور باہر لوگ آجارہے تھے۔ ہم عمارت کے اندر آکر سیڑھیاں چڑھنے لگے اور ہم سیڑھیوں کے ذریعے ہی سے چوتھی منزل پر آگئے۔ چوتھی منزل پر پہنچ کر ایک دروازے کے سامنے شمشیر رُک گیا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازے کا لاک کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور میں شمشیر کے پیچھے اندر کمرے میں داخل ہوگئی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی شمشیر نے دروازہ بند کردیا...... پھر شمشیر مجھے ایک کمرے میں لے کر آیا، پھر اس نے کمرے کی لائٹ جلائی اور مجھے لاکر بیڈ پر بٹھادیا اور خود بھی میرے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہی مجھ سے بولا۔

”حیران ہوکر کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ میرا ذاتی فلیٹ ہے۔ اس فلیٹ کا نمبردار خداداد کو بھی علم نہیں ہے۔ نمبردار اسمگلنگ کا دھندہ کرتا ہے۔ مجھے دھندے کے سلسلے میں اکثر کراچی آنا پڑتا تھا۔ نمبردار مجھ پر بہت اعتماد کرتا تھا اور وہ مجھ سے پیسوں کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں رکھتا تھا۔ ان ہی پیسوں میں سے تھوڑی سی ہیر پھیر کرکے میں نے یہ فلیٹ خرید لیا...... میں نمبردار خداداد کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں آنے کا سوچ چکا تھا، کیوں کہ میں اسمگلنگ کے کام سے اُکتا چکا تھا۔ مجھے اسمگلنگ کا کام پسند نہیں ہے۔ اس میں ہر وقت گولی کا خطرہ رہتا ہے۔ میں نے انڈیا کے کافی پھیرے لگائے ہیں۔ شبرا کی وجہ سے وہاں آنے جانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ میں یہ سب آپ کو اس لیے بتارہا ہوں کہ اب ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والے ہیں...... میں نئی زندگی کا آغاز کرنے سے پہلے تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ آج تو اتنا ہی بہت ہے۔“

دو کمرے اور ایک باورچی خانے پر مشتمل یہ فلیٹ ہمارا ہے۔ کچھ حالات سازگار ہوتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔ ابھی تو ہمارے لیے یہاں بھی بہت خطرہ ہے...... جن کو ہم قتل کر کے آئے ہیں، وہ کافی اثر و رسوخ والے بندے ہیں۔ نمبردار خداداد اپنے اثر و رسوخ سے ہماری تلاش شروع کر چکا ہوگا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بخیر و عافیت اپنے اس فلیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس فلیٹ میں مجھے تو کچھ دن چھپ کر ہی رہنا پڑے گا۔ اس لیے نیچے سے کھانے پینے کی اشیاء تم نے ہی خرید کر لانی ہیں۔ تم کو نقاب میں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو بھیس بدلنا پڑے گا...... "تمہیں بھوک تو لگ رہی ہوگی؟" اب تم اس طرح کرو کہ یہ پیسے لو۔ شمشیر نے جیب سے پیسے نکال کر دیے اور ساتھ مجھے سمجھا دیا کہ کہاں سے کیا لے کر آنا ہے...... "گھبرانا نہیں ہے، کچھ دن تو کھانے پینے کی اشیاء تمہیں ہی لانی ہوں گی...... چند دنوں میں ہی سب راستے جان جاؤ گی...... اور ہاں دیکھو، تم نیچے نقاب لگا کر جانا۔" میں نقاب لگا کر سیڑھیوں کے ذریعے سے نیچے آ گئی۔ فلیٹ کے نیچے کافی دکانیں تھیں۔ میں نے ایک دکان سے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں۔ دکاندار کو ادائیگی کر کے سیڑھیوں کے ذریعے سے فلیٹ میں آ گئی۔ مجھے آنے جانے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ شمشیر نے مجھے کھانے کی تمام اشیاء کے ساتھ دیکھا تو مسکرا دیا، جواب میں...... میں بھی مسکرا دی۔ شمشیر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ سب باورچی خانے میں پہنچاؤ اور جلدی سے کچھ پکا کر لے آؤ...... کافی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ بھوک کے علاوہ تھکن بھی بہت ہے۔" میں تمام خوردنی اشیاء کو لے کر باورچی خانے میں آ گئی اور کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں، میں نے کھانے کا بندوبست کر لیا تھا۔

ایک ٹرے میں کھانے کا سامان رکھ کر کمرے میں آئی تو شمشیر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے کھانے والی ٹرے بیڈ پر اس کے سامنے رکھی اور خود بیڈ کے اوپر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا، پھر کھانے کے بعد شمشیر اٹھ کر سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اس کے مضبوط کردار پر سوچ کر اپنے نصیب پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ جاتے وقت وہ مجھے سونے کا بول گیا تھا۔ میں بھی کھانے کا سامان باورچی خانے میں رکھ کر واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔

☆......☆

کراچی آئے ہمیں دس دن ہو چکے تھے...... ان دس دنوں میں، میں نے ایک بار بھی شمشیر کو فلیٹ سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ شمشیر نے کئی بار باہر جانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن میں نے ہر بار اسے روکا تھا...... نیچے مارکیٹ سے ضروریات زندگی کی تمام اشیاء میں خود ہی خرید کر لا رہی تھی۔ گزرے دس دنوں میں، میں اور شمشیر ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے پیار، محبت کی ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ ہم بیڈ پر ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے رہتے تھے۔ ان دس دنوں میں شمشیر کے ہاتھوں نے صرف میرے ہاتھوں کو پکڑا تھا، وہ بھی اس وقت جب وہ مجھے تسلی دیتا تھا۔ جب وہ کبھی نہ ساتھ چھوڑنے کے لیے مجھ سے وعدہ کرتا تھا، اس وقت وہ میرا دایاں یا بایاں ہاتھ پکڑ لیتا تھا...... اس کے مضبوط ہاتھ میرے نرم ہاتھوں کو دباتے رہتے تھے۔ ہاتھوں کے علاوہ اس نے مجھے اور کہیں سے نہیں پکڑا تھا اور نہ ہی چھوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے پیار ہی پیار تھا۔ ان دنوں شمشیر مجھے بڑا ہی معصوم لگا تھا۔ میں اس کے کردار کی مضبوطی پر حیران تھی۔ ایک جرائم پیشہ انسان فرشتے کا روپ دھار چکا تھا۔ کردار میں تو وہ مجھے پہلے دن سے ہی اچھا لگا تھا، لیکن اب تو اس کی شرافت اور معصومیت والا روپ میرے سامنے تھا...... گزرے دس دنوں میں، میں ہر طرح سے اس کے قریب رہی تھی...... اس نے کسی وقت بھی میرے وجود کو حاصل کرنے کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے پیار ضرور تھا، لیکن کسی قسم کا کوئی سفلی جذبہ نہیں تھا۔ وہ مجھ سے نکاح کرنے کی باتیں ضرور کرتا تھا۔ نکاح کا بندوبست کرنے کے لیے ہی تو وہ فلیٹ سے باہر جانے پر بضد تھا۔ میں ابھی اسے باہر جانے سے روک رہی تھی۔ میرے دل میں ابھی کافی وسوسے تھے۔ میرے دل میں جو اندیشے تھے ان کی وجہ سے میں اسے باہر نہیں جانے دے رہی تھی...... روز اس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے جلدی نکاح کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی باہر جانے کی بات کرتا میرے دل کو کچھ ہونے لگتا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا کہ اگر وہ باہر جائے گا تو کچھ ہو جائے گا۔

میں اب کسی صورت اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆

وہ ہفتے کا دن تھا اور صبح نو بجے کے قریب وہ جاگا تھا۔ جاگنے کے بعد اس نے اپنے تمام کام جلدی جلدی کیے تھے۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر آیا تو کرسی پر میرے سامنے بیٹھتے ہی وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”رضیہ! آج میں نے ہر صورت باہر جانا ہے اور آج تم نے مجھے نہیں روکنا۔ آج میں نے اپنے ایک دوست سے جا کر ملنا ہے۔ اس سے تمہاری اور اپنی شادی کی بات کرنی ہے، بلکہ میں آج ہی شادی کا بندوبست کر کے آؤں گا، کل اتوار ہے نا...... بس کل کا دن ہمارے نکاح کا دن ہوگا۔ کل شام سے پہلے پہلے ہمارا نکاح ہو جائے گا۔ آج جانے سے تم نے مجھے روکنا نہیں ہے۔“ اس کی ضدی باتوں نے میرے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں نے انجانے اندیشوں کی پیش نظر ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس نے جب مجھے ناشتے سے ہاتھ کھینچتے دیکھا تو جلدی جلدی جیسے تیسے ناشتا کیا اور کرسی سے اُٹھ پڑا۔ میں بھی اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔ مجھ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا، پھر میری اپنے آپ ہی سسکیاں نکلنے لگی تھیں...... مجھ سے سسکیاں ضبط نہ ہوئی تھیں اور پھر میں اس کے سینے کی دیوار سے لگ کر رونے لگی تھی۔ اس کی مضبوط بانہوں نے مجھے خود میں چھپا لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے سینے میں چھپائے چپ کرا رہا تھا اور میرے آنسو اس کے سینے میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے اس دن بہت رونا آ رہا تھا۔ اس کے سینے سے دور ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ وقت میں نے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپائے رکھا تھا، پھر اس نے میرا چہرہ اپنے سینے سے ہٹایا اور مجھے خود سے تھوڑا سا دور کیا، پھر اپنے ہاتھوں سے میرے شانے تھام کر بولا۔ ”رضیہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں نکاح کی خاطر ہی فلیٹ سے باہر جا رہا ہوں۔ میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ کل سے ہم دونوں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ کل کا دن ہمارے لیے خوشیوں کا دن ہوگا...... کل ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے، پھر ہم ایک نئی زندگی پر سوچیں گے۔ ہمارے تمام خوابوں کو تعبیر مل جائے گی اور تم ہو کہ مجھے کب سے باہر ہی نہیں جانے دے رہی ہو؟ اب ڈرنا چھوڑ دو، کیوں کہ تم اب شمشیر کی بیوی بننے والی ہو...... کل تک یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اب یہ رونا بند کرو۔ میں جلد ہی تمام بندوبست کر کے واپس آ جاؤں گا...... تم اندر سے دروازہ بند کر لینا......“ اس وقت میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میرا دل اسے روک رہا تھا۔ زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ باہر جاتے ہوئے میں اسے روک نہیں سکی تھی اور وہ فلیٹ کا باہر والا دروازہ کھول کر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ کچھ دیر میں دروازے کے ساتھ لگ کر روتی رہی تھی، پھر میں کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میرے دل کو ایک لمحہ قرار نہیں آ رہا تھا۔ میں روتے ہوئے خدا سے شمشیر کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ شام تک میں بیڈ پر اسی طرح لیٹی رہی تھی۔ شام کے وقت دروازے پر دستک ہوئی تو میں بیڈ سے اٹھ کر فلیٹ کے باہر والے دروازے کے پاس آ گئی۔ باہر سے دستک کے ساتھ ہی شمشیر کی آواز آئی تھی۔ شمشیر نے مجھے پکارا تھا۔ شمشیر کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا تو جلدی سے شمشیر اندر آ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لیا تھا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا، پھر وہ مجھے خود سے جدا کر کے بولا۔

”رضیہ! میں نکاح کا سارا بندوبست کر کے آ گیا ہوں، کل دن کے دو بجے ہمارا نکاح ہو جائے گا...... سارا بندوبست ہو گیا ہے...... میرا دوست افضل سب کچھ کرلے گا۔ دو بجے اسی فلیٹ پر ہمارا نکاح ہوگا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی پر نیچے ڈراپ کر کے گیا ہے...... میں نے اسے اپنا فلیٹ بھی تو دکھانا تھا۔“ اس نے مجھے اپنی کارگزاری بتائی۔

”لیکن شمشیر؟“ میں جملہ پورا نہ کر سکی۔ ”ہاں...... ہاں بولو، بولو۔“

”یہ تمہارا دوست افضل کون ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اب تمام باتیں یہیں کھڑے ہو کر ہی کرنی ہیں۔ چلو اندر کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ میں اور شمشیر کمرے میں آ کر بیڈ پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”ہاں اب پوچھو۔“ شمشیر نے کہا۔

www.paksociety.com

"شمشیر! یہ نمبردار خداداد بڑا ظالم انسان ہے...... تم نے اسے زندہ چھوڑ کر بہت غلط کیا ہے۔ تمہیں دوسروں کے ساتھ اسے بھی مار دینا چاہیے تھے۔" میں نے شمشیر کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"رضیہ! اب اس موضوع کو چھوڑ دو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم نے کل تک اپنے لیے کافی کچھ کرنا ہے۔ میری تو خیر ہے، لیکن تمہیں تو کافی کچھ خریدنا ہے۔ اس لیے اب ایسی بے وقت کی باتوں کو چھوڑو اور اب اپنے لیے تمہیں جو جو خریدنا ہے، مجھے وہ بتاؤ، تاکہ ہم وہ چیزیں خرید سکیں...... اب تو تم مجھے کھانا کھلاؤ، مجھے شدت کی بھوک لگی ہوئی ہے۔" شمشیر نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں نے ابھی کھانا پکایا ہی نہیں...... تمام دن تمہارے لیے اتنی فکرمند رہی ہوں کہ کھانے پکانے کا مجھے ہوش ہی نہیں رہا...... ابھی پکاتی ہوں۔" میں یہ کہہ کر بیڈ سے اٹھی تو شمشیر بولا۔

"ذرا جلدی پکانا...... میں نے تمام دن کچھ نہیں کھایا۔ تمہارے ساتھ کھانے کا عادی جو ہو گیا ہوں۔" میں اسے مسکراتا چھوڑ کر باورچی خانے میں آ گئی۔

کھانا پکاتے وقت انجانے اندیشوں نے مجھے گھیرا ہوا تھا...... ڈر اور خوف کے خیالات نے میرے دل کو جکڑا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ رہے تھے اور اُدھر شمشیر ہر طرح سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میرا دل سوچ سوچ کر ہی ڈوبتا جا رہا تھا......

اس نے اپنے دوست افضل کے بارے میں بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران میں اس سے اس کے دوست افضل کے بارے میں ضرور پوچھوں گی۔ میں کھانا پکانے کے دوران بڑبڑائی تھی، پھر میں کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی تھی۔

☆......☆

اگلے دن شمشیر بھی کچھ جلدی جاگ گیا تھا، حالاں کہ رات کو ہم دیر سے سوئے تھے۔ رات گئے تک آنے والی زندگی کے متعلق منصوبے بناتے رہے تھے۔ شمشیر مجھے رات کے وقت نیچے مارکیٹ لے جانا چاہ رہا تھا، لیکن میں نہیں مانی تھی۔ میں نے نکاح کی تمام خریداری اگلے دن پر رکھ دی تھی...... رات کو دیر سے سونے کے باوجود ہم جلدی جاگ گئے تھے۔ میں شمشیر سے پہلے جاگی تھی، کیوں کہ میں شمشیر کے اُٹھنے سے پہلے ناشتا بنانا چاہتی تھی۔ جب میں ناشتا بنا کر کمرے میں آئی تو شمشیر بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے ناشتے کی ٹرے کے ساتھ کمرے میں آتے دیکھ کر مسکرایا...... میں بھی جواب میں مسکرائی۔ میں نے ناشتے والی ٹرے میز پر رکھی اور شمشیر کو منہ ہاتھ دھونے کے لیے کہا۔ شمشیر بیڈ سے اُٹھ کر باہر منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آ گیا۔ میں تو پہلے ہی کرسی پر بیٹھ چکی تھی، پھر وہ بھی میرے سامنے ہی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا...... ہم دونوں نے ناشتا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ناشتے کے دوران شمشیر بولا۔

"ذرا جلدی جلدی ناشتا کرو، ہم نے بازار خریداری کرنے کے لیے جانا ہے۔" میں بولی۔ "خریداری کرنے میں اکیلی جاؤں گی...... آپ نے فلیٹ سے باہر نہیں نکلنا...... زیادہ خریداری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کا ایک سوٹ ضروری ہے۔ وہ میں اپنی پسند کا خریدوں گی...... وہ سوٹ سرخ رنگ کا ہوگا۔ ہمارے گاؤں میں اُدھر دلہن کا سوٹ سرخ رنگ کا ہی ہوتا ہے۔ سوٹ کے علاوہ کوئی چھوٹی موٹی ضروری خریداری بھی کر لوں گی۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ سِلا سلایا سوٹ مجھے کہاں سے ملے گا؟" میں نے شمشیر کو تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا...... تم اکیلی سے کہاں سب کچھ خریدا جائے گا؟" شمشیر بولا۔

"میں نے جو خریدنا ہوگا، وہ خرید لوں گی، لیکن میں آپ کو فلیٹ سے باہر نہیں نکلنے دوں گی۔ آج ہمارا ملن کا دن ہے...... میں کسی صورت یہ خطرہ نہیں مول لے سکتی...... تم مجھے صرف یہ سمجھا دو کہ کہاں سے کیا لینا ہے۔ بس" میں روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "لیکن رضیہ؟"

"لیکن ویکن کو چھوڑ دو۔ جو میں پوچھ رہی ہوں مجھے وہ بتاؤ...... مجھے سِلا سلایا سوٹ کہاں سے ملے گا۔" میں نے شمشیر سے کہا۔

"سوٹ کے لیے تمہیں روڈ کراس کرنا پڑے گا...... اِدھر آؤ میں تمہیں بتاؤں۔" شمشیر ناشتے کی میز سے ہاتھ کھینچ کر اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر روڈ کی طرف جو دروازہ تھا، اس نے اسے کھولا اس کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس کے سامنے لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔

ن ٹھہرے تھے۔ وہ سب روڈ کراس کرنے والے تھے۔ وہ بھی اسی انتظار میں تھے کہ ٹریفک کم ہو اور وہ سڑک پار کر سکیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑی اپنے فلیٹ کو دیکھ رہی تھی...... میری نظریں فلیٹ کی کھڑکی اور دروازے پر تھیں۔ اس وقت فلیٹ کا دروازہ کھلا اور مجھے شمشیر کی جھلک نظر آئی، پھر یک دم پیچھے سے شمشیر کو کسی نے دھکا دیا اور شمشیر نیچے گرنے لگا۔ میں اسے دیکھ کر چیختی ہوئی روڈ کی طرف بھاگی۔ میری پھٹی ہوئی نظریں شمشیر پر تھیں۔ شمشیر چوتھی منزل سے نیچے فٹ پاتھ پر گرا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھے ایک گاڑی کی زوردار ٹکر ماری اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور مجھے گلوکوز کی ایک بوتل لگی ہوئی تھی۔ میرے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی...... میرے آس پاس اجنبی لوگ اور نرسیں تھیں...... میں ضرور کسی اسپتال میں تھی...... بیڈ کے ساتھ پڑی بنچ پر ایک خوب صورت سی لڑکی بیٹھی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ لڑکی بینچ سے اٹھی اور میرے قریب ہو کر بولی۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا۔ تین دن سے آپ بے ہوش تھیں۔ اب آپ کیسی ہیں؟ بولیں نا!“ میں نے کچھ بولنا چاہا تو مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ میرے سارے وجود میں درد کی لہر سی دوڑ گئی اور پھر جب مجھے وہ منظر یاد آیا تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ لڑکی مجھ پر جھکی میرا حال احوال بار بار پوچھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں میری آنکھوں کے آنسو پونچھنے میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ تو مجھ سے بہت کچھ پوچھے جا رہی تھی، لیکن میں جواب میں بس روئے جا رہی تھی۔ مجھ سے کچھ بولا نہ جا رہا تھا، پھر وہ مجھے روتا ہوا چھوڑ کر وارڈ سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک سفید کوٹ والے مرد اور دو تین نرسوں کے ساتھ واپس میرے پاس آ گئی۔ سفید کوٹ والا مرد ڈاکٹر تھا۔ وہ میری حالت چیک کرنے لگا۔ مجھے ہر طرح سے چیک کرنے کے بعد اس نے ساتھ کھڑی لڑکی کو تسلی بخش جواب دیا۔ اور نرسوں کو کچھ ہدایات دے کر وارڈ سے باہر چلا گیا۔ نرسوں نے مجھے دو تین انجکشن لگائے اور ختم ہوئی بوتل اتار دی اور ساتھ کھڑی لڑکی کو کچھ سمجھانے کے بعد وہ بھی وارڈ سے باہر چلی گئیں۔ اب وہ لڑکی مجھے کچھ مطمئن سی نظر آ رہی تھی اور وہ میری طرف بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر مجھ سے پوچھنے لگی کہ ”آپ کیسی ہیں؟ ان شاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی...... تین دن سے میں آپ کے پاس ہوں اور آپ کی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں کرتی رہی ہوں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا۔ میرا بڑا بھائی سرمد بھی آپ کے لیے بہت پریشان رہا ہے...... میں اب اسے فون کر کے بتاتی ہوں کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے اور آپ کی حالت بھی خطرے سے باہر ہے۔“ وہ باتیں کرتی کرتی بیڈ کے ساتھ پڑے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بیگ سے موبائل نکالا اور پھر موبائل کان سے لگا کر کچھ دیر کے بعد اپنے بھائی سرمد سے باتیں کرنے لگی۔ باتوں کے دوران وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جب وہ مجھے دیکھتی تو اس کے چہرے پر خوشی دیکھی جا سکتی تھی...... مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ کافی خوش تھی۔ اپنے بھائی کو فون کر کے وہ مجھے بتانے لگی۔

”سرمد بھائی کو میں نے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے، وہ تھوڑی دیر تک آ جائیں گے...... وہ آپ کے لیے بہت فکر مند تھے۔ اب آپ ہوش میں آ گئی ہیں تو اسے کچھ سکون ملا ہے، اب آپ نے بالکل پریشان نہیں ہونا ہے اور نہ ہی کچھ سوچنا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ چاہے ابھی ہمیں کچھ نہ بتائیں...... بس آپ نے اب اپنے آپ کو ٹھیک رکھنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ اپ کے جسم پر جتنی چوٹیں ہیں، وہ بھی سب جلد ٹھیک ہو جائیں گی اور آپ اپنے قدموں پر چل سکیں گی۔ آپ کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ سر پر زیادہ چوٹ آنے کی وجہ سے آپ تین دن بے ہوش رہی ہیں۔ اب اللہ کے کرم سے وہ چوٹ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ نے بس کچھ نہیں سوچنا۔ جب آپ ہر طرح سے ٹھیک ہو جائیں گی تو پھر ہم آپ کو اپنے گھر لے جائیں گے۔ وہاں آپ سے سب باتیں ہوں گی...... یہاں اسپتال میں آپ نے بس خود کو ٹھیک رکھنا ہے۔ آپ کو اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا اور نہ ہی پچھلے وقت پر سوچنا ہے۔ گھر چل کر ہم آپ سے سب باتیں کر لیں گے اور ہم اپنے بارے میں بھی آپ کو سب

کچھ بتادیں گے اور آپ سے اپنے بارے میں سب پوچھ لیں گے...... اب آپ نے ذرا بھی پریشان اور اُداس نہیں ہونا ہے۔ میں اور سرمد بھائی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ ہم کون ہیں؟ بس میں آپ کو اتنا بتارہی ہوں کہ ہماری گاڑی سے آپ ٹکرائی تھیں اور ہم آپ کو شدید زخمی حالت میں اٹھا کر اسپتال لائے تھے۔ جب ہم آپ کو اسپتال لائے تو اس وقت آپ کی حالت بہت خراب تھی...... اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی ہے اور آپ ہوش میں آکر مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ابھی آپ کچھ نہ سوچیں۔ آپ کی حالت پر دوبارہ اثر پڑسکتا ہے۔ بس آپ خود کو ٹھیک رکھیں۔ اپنے ذہن میں کوئی ایسی ویسی سوچ نہ رکھیں، جو آپ کی حالت خراب کرے۔ بس آپ صرف ہم پر سوچیں۔ میں نے آپ سے اتنی باتیں کرلیں اور ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔ میرا نام مرینہ ہے اور میں سرمد کی چھوٹی بہن ہوں۔ ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔ ہمارے ماں باپ فوت ہوچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت ہر چیز سے بہت نوازا ہوا ہے۔ بھائی بزنس مین ہیں اور بہت معروف انسان ہیں۔ اتنے معروف انسان ہونے کے باوجود دن میں دو دو، تین تین بار آپ کے لیے اسپتال آتے رہے ہیں اور اب بھی آرہے ہیں۔ جب آپ بے ہوش تھیں تو وہ آپ کے لیے بہت زیادہ فکر مند تھے۔ میں تین دن سے آپ کے پاس ہوں۔ میں بی۔ اے کی طالبہ ہوں اور تین دن سے کالج نہیں گئی ہوں۔ جب آپ مکمل طور پر ٹھیک ہوکر ہمارے گھر جائیں گی تو پھر میں کالج جاؤں گی۔" مرینہ کچھ وقت کے لیے ہی خاموش ہوئی تھی، ورنہ تو مسلسل بولے ہی جارہی تھی اور مجھے اپنے بارے میں سب بتائے جارہی تھی۔ میں اس کے سامنے خاموش پڑی بس اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی میں نے اپنے علاقے میں نہیں دیکھی تھی۔ خوب صورتی کے علاوہ بہت معصوم تھی...... مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھی...... اس کی باتوں نے مجھے کافی حوصلہ دیا تھا۔ اس وقت شمشیر مجھے بہت یاد آرہا تھا، لیکن اب میں کیا کرسکتی تھی؟ وہ تو دنیا میں ہی نہیں رہا تھا۔ اسے ماردیا گیا تھا۔ میرا دل اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا، لیکن وہ اب زندہ نہیں ہوسکتا تھا۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں وہ بھی بہ رہا تھا۔ میرے دل نے مجھے بتادیا تھا کہ اسے نمبردار خداداد کے بندوں نے مار کر اُوپر سے پھینک دیا تھا۔ نمبردار خداداد اُسے اور مجھے کہاں زندہ چھوڑنے والا تھا۔ میں اس لیے بچ گئی تھی کہ میں اس وقت فلیٹ میں موجود نہیں تھی۔ میرے دل نے مجھے جو بتایا وہ سچ تھا۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ شمشیر مجھے چھوڑ کر دنیا سے جاچکا ہے۔ اسے نمبردار نے مروادیا تھا۔ اس نے شمشیر کو مرواکر میرے جینے کا مقصد ہی ختم کردیا تھا، اب میں اکیلی نمبردار خداداد کا کیسے مقابلہ کرسکتی تھی؟ کیسے اس سے بدلہ لے سکتی تھی؟ اس سے تو اچھا تھا کہ میں شمشیر کے ساتھ ہی ماردی جاتی۔ اب پتا نہیں میرے ساتھ اور کیا کیا ہو؟ میں پھر سے رونے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر مرینہ بیچ سے اٹھی اور میری آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگی اور مجھے پیار سے سمجھانے لگی، پھر مجھ سے پیار کے لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے برابر حوصلہ دے رہی تھی۔ پتا نہیں اس کو مجھ سے اتنا لگاؤ کیوں ہوگیا تھا؟ اور وہ کیوں میرا اتنا خیال رکھ رہی تھی؟ میں خاموشی سے روئے جارہے تھی اور وہ پیار سے میرے آنسو پونچھے جارہی تھی اور مجھے پیار سے سمجھا بھی رہی تھی، پھر اس کی باتیں مجھے اچھے لگنے لگیں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہوگئے اور میں گزرے وقت کو فراموش کرنے لگی اور مرینہ پھر سوچنے لگی جو پتا نہیں کون تھی؟ وہ میری اتنی فکر مند کیوں تھی؟ مجھے اس کے خلوص اور پیار نے کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ میں خود کو ٹھیک محسوس کررہی تھی۔ مرینہ میرے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس وقت ایک ستائیس اٹھائیس سال کا خوب صورت مرد بیڈ کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ مرینہ اس کو دیکھ کر بولی۔

"بھائی جان! دیکھیں اب ان کی حالت کتنی ٹھیک ہے...... یہ جلدی ٹھیک ہوجائے گی۔" میری آنکھوں کے سامنے کھڑا خوب صورت مرد مرینہ کا بھائی سرمد تھا۔ سرمد کی آنکھوں میں بھی میرے لیے پیار تھا۔ میں ان دونوں بہن بھائی کے پیار کو دیکھ کر حیران ہورہی تھی، کیوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے صرف میری ہی باتیں کررہے تھے۔

☆......☆

جب میں مکمل طور پر ٹھیک ہوگئی تو سرمد اور مرینہ

www.paksociety.com

اسپتال سے اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے اپنے گھر لے آئے۔ گھر کیا تھا ایک محل تھا۔ اتنا خوب صورت گھر پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا...... میں گھر کے ہر کمرے کو مبہوت ہو کر دیکھ رہی تھی...... میں نے مرینہ کو صرف اپنا نام بتا دیا تھا، لیکن ان سے کوئی بات نہ کی تھی۔ مرینہ نے بھی اسپتال میں مجھ سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ مرینہ نے مجھے گھر کے ایک خوب صورت کمرے میں بیڈ پر لا کر بٹھا دیا تھا...... سرمد ہمیں گھر چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ اب کمرے میں، میں اور مرینہ تھیں۔ مرینہ مجھ سے ذرا دور نہ ہو رہی تھی۔ اسے مجھ سے قدرتی لگاؤ ہو گیا تھا۔ میں کمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔ سامنے ٹیلی ویژن، فریج اور میز اور ان پر خوب صورت گلدان اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ قدرتی مناظر کی تصاویر لگی ہوئی تھیں اور کمرے کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ مرینہ بولی۔

”رضیہ باجی! یہ آپ کا کمرہ ہے۔ اب آپ نے اس کمرے میں رہنا ہے اور اسی میں سونا ہے۔“ میں کچھ سوچ کر بولی۔ ”مرینہ! آپ دونوں بہن بھائی یہ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ میں آپ کی گاڑی سے کیا ٹکرا گئی، آپ تو مجھ پر احسان پر احسان کیے جا رہے ہیں؟ نہ آپ مجھے جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ کیسی ہوں؟ کہاں کی رہنے والی ہوں؟“ مرینہ نے درمیان میں ہی مجھے ٹوک دیا۔ ”باجی! آپ ایسی دکھ دینے والی باتیں نہ کریں...... آپ ہمارے گھر آئی ہیں۔ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ آپ اسی گھر کی فرد ہیں۔ اپنے آپ کو غیر مت سمجھیں...... میں اور میرا بھائی دنیا سے کچھ ہٹ کر ہیں...... آپ کو یہاں کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ اپنے بارے میں جو بتانا چاہیں بتا سکتی ہیں...... آپ جہاں کی بھی ہیں۔ آپ کی جو بھی کہانی ہے۔ ہم نے اس پر نہیں سوچنا۔ ہم نے صرف آپ پر سوچنا ہے۔ آپ ہماری زندگی میں ایک خوشی بن کر آئی ہیں۔ چاہے ایک حادثے کی صورت میں ہی ملی ہیں، لیکن یہ سچ ہے رضیہ باجی! ہمیں آپ اچھی لگی ہیں۔ جیسے ہم دنیا سے ہٹ کر ہیں ویسے ہی آپ بھی کچھ منفرد سی ہیں...... آپ ہمیں ہمارے قبیلے کی لگی ہیں۔ آپ اپنے بارے میں سب بتا دیں۔ بے خوف و خطر ہو کر۔ یہاں آپ ہر طرح سے محفوظ ہیں۔“ اب میرا ان سے کچھ بھی چھپانا بیکار تھا۔

ویسے بھی مجھے مرینہ اور اس کا بھائی سرمد دونوں اچھی سوچ کے لگے تھے۔ وہ ہر طرح سے اچھے تھے۔ اس لیے مجھے ان سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ جتنا انہوں نے مجھے پیار دیا تھا۔ اگر میں ان سے کچھ چھپاتی تو اپنے آپ کو دھوکہ دیتی، پھر میں نے مرینہ کو اپنے بارے میں شروع سے لے کر آخر تک بتا دیا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ جب میں سب بتا چکی اور مرینہ کی طرف دیکھا تو وہ میرے بارے میں سب جان کر رو رہی تھی...... میری آنکھوں میں بھی آنسو آ چکے تھے۔ میں نے مرینہ کے آنسو پونچھے اور مرینہ نے میرے آنسو پونچھے۔ میں سب کچھ بتانے کے بعد اب خاموش تھی۔ مرینہ میرے ساتھ لگ چکی تھی۔ وہ میرے اور قریب آ گئی تھی...... وہ میرے ساتھ لگ کر میرا دکھ بانٹ رہی تھی۔ دکھ بانٹنے کا شاید اسے یہی اچھا طریقہ لگا تھا، پھر وہ مجھے بڑے پیار سے آرام کرنے کا کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اپنے بارے میں سب بتانے کے بعد میں واقعی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی اب مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ میں بیڈ پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔

☆......☆

میں تو سوچ رہی تھی کہ میرے بارے میں مکمل جاننے کے بعد مرینہ اور سرمد مجھ سے دور ہونے کی کوشش کریں گے۔ مجھ سے جان چھڑانا چاہیں گے، لیکن میں غلط سوچ رہی تھی۔ میری تمام سوچیں اور خیال غلط ثابت ہوئے تھے۔ میری آپ بیتی سننے کے بعد تو مرینہ اور سرمد میرے اور بھی قریب آ گئے تھے۔ مرینہ تو ہر وقت میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ کالج سے پڑھ کر آنے کے بعد اسے میرے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ سرمد تو صبح کے وقت اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ گھر میں، میں ہوتی تھی اور دو نوکرانیاں اور دو نوکر ہوتے تھے۔ وہ بھی مجھے اس گھر کا فرد ہی سمجھتے تھے۔ وہ میری بے حد عزت کرتے تھے...... سارے گھر والے مجھ پر فریفتہ تھے۔ میں تو ان کے رویے پر ہر وقت حیرت زدہ تھی۔ مرینہ تو کالج سے آنے کے بعد میرے پاس ہی ہوتی تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں ادھر ادھر نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ مجھ سے ڈھیروں باتیں کرتی تھی...... جب سے میں ان کے گھر آئی تھی، میں کہیں باہر نہیں گئی تھی۔ نہ سرمد اور مرینہ نے مجھے کہیں باہر جانے دیا تھا اور نہ ہی وہ مجھے اپنے ساتھ

کہیں باہر لے گئے تھے۔ وہ احتیاطاً ایسا کر رہے تھے، پھر میرا خود بھی باہر جانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ مرینہ تو ہر وقت میرے ساتھ تھی، وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی...... مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ آخر مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے؟ اس کی محبت تو جو تھی سو تھی، مجھے کئی بار محسوس ہوا کہ سرمد بھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ اب وہ صرف مجھے پسند کر رہا تھا کہ مجھ سے محبت بھی کرنے لگا تھا۔ مجھے ابھی اس کا صحیح اندازہ نہ ہوا تھا...... اب میں تمام گھر میں چل پھر لیتی تھی...... موبائل، ٹیلی ویژن چلا لیتی تھی...... موبائل پر میرا صرف مرینہ سے رابطہ تھا۔ مرینہ نے ہی مجھے موبائل چلانا سکھایا تھا۔

ٹیلی ویژن دیکھ کر میرا دن اچھا گزر جاتا تھا...... اور پھر ایک دن شام کے وقت میں اور مرینہ ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں۔ خبروں والا چینل چل رہا تھا اور اس وقت ٹیلی ویژن پر ایک خبر نے مجھے چونکا کے رکھ دیا۔ میں نے مرینہ کو خبر کی طرف متوجہ کیا۔

"مرینہ! یہ جو ابھی خبر چلی ہے، جس لڑکی نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے، یہ لڑکی مریم ہے، یہ نمبردار خداداد کی اکلوتی بیٹی ہے۔ خبر اس طرح چلی تھی کہ بیٹی نے اپنے باپ کو قتل کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دیا ہے۔ بیٹی نے اپنے باپ کو اس لیے قتل کیا تھا کہ اس کے عیاش دوست شراب کے نشے میں اس کی بیٹی مریم کی عزت سے کھیل گئے تھے۔ اس وقت نمبردار خداداد بھی شراب کے نشے میں دُھت اپنی حویلی میں ہی تھا۔" خبروں کے چینل پر چلنے والی اس خبر نے ایک بار تو مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خبر میرے علاقے کی تھی اور اس درندے نما انسان کی تھی جس کی درندگی کی میں بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ خبر سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ مرینہ نے میرے آنسو پونچھنے چاہے تو میں نے اسے منع کر دیا کہ "ان آنسوؤں کو بہنے دو۔ یہ شکر کے آنسو ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی عدالت سے انصاف دیا ہے۔ یہ اس کے انصاف کو دیکھ کر بہہ رہے ہیں۔ مجھے اللہ کی عدالت سے انصاف مل چکا ہے۔ میں اس رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔" اس وقت مرینہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور میں اللہ تعالیٰ کے انصاف پر سوچنے لگی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مرینہ اپنے بھائی سرمد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی...... مرینہ اور سرمد دونوں کے چہروں پر ایک انجانی خوشی تھی۔ مرینہ تو بے حد خوش نظر آ رہی تھی اور سرمد اپنی خوشی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ دونوں میرے قریب بیڈ پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ سرمد نے اس خبر کے حوالے سے مجھ سے کافی باتیں کیں۔ ان سے باتیں کر کے مجھے کافی اچھا لگ رہا تھا...... کافی دیر باتیں کرنے کے بعد سرمد اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں، میں اور مرینہ تھیں۔ مرینہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اتنی خوش کبھی پہلے نہ تھی، پھر وہ خوشی سے بولی۔

"باجی رضیہ! آج میں آپ کو ایک سچی بات بتا رہی ہوں۔ بھائی سرمد آپ کو بہت پسند کرتے ہیں، بلکہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمدردی والی محبت نہیں ہے، حقیقی والی محبت ہے، جیسے میری محبت ہے...... وہ کافی دن سے مجھ سے کہنا چاہ رہے تھے، لیکن کہہ نہیں سکے تھے۔ آج جب میں نے انہیں اس خبر کے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے کہہ دیا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں اس دن کا انتظار تھا؟ شاید وہ پہلے اس لیے خاموش تھے؟ آپ اب میری بھابی بننے کی تیاری کریں۔ کیا آپ میری بھابی بننے کے لیے تیار ہیں؟"

میری آنکھوں سے تو پہلے ہی نمبردار خداداد کی خبر سن کے تشکر کے آنسو گر رہے تھے اور اب خوشی کے آنسو گر رہے تھے۔ ایک اتنا خوب صورت اور اچھے دل کا انسان مجھ سے محبت کرنے لگا تھا اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا، پھر مرینہ جیسی اچھی اور معصوم لڑکی مجھے اپنی بھابی بنانا چاہتی تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

"بولیں نا! کیا آپ میری بھابی بننے کے لیے تیار ہیں؟" میں نے بھیگی آنکھوں سے مرینہ کی طرف دیکھا اور خوشی سے اپنا سر ہلا دیا۔ میری ہاں کرنے کی دیر تھی کہ مرینہ جلدی سے میرے پاس سے اٹھی اور تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ ضرور اپنے بھائی سرمد کو یہ خبر سنانے گئی تھی۔

میں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بیڈ سے اٹھی، کیوں کہ اپنے رب کی اس نعمت پر میں وضو کر کے شکرانے کے دو نفل ادا کرنا چاہتی تھی۔ میری زندگی میں اس سے بڑی اور کیا خوشی ہو سکتی تھی کہ میں ایک اچھے اور پیار کرنے والے انسان کی دلہن بننے والی تھی۔

☆......☆

www.paksociety.com



ریاض حسین شاہد

چنیوٹ، برنالہ شریف میں واقع حضرت سخی عبداللہ قلندر قادریؒ کی درگاہ شریف کی روحانی بہاریں، ایک سچے عاشقِ حقیقی کے قلم سے

شام لاٹ بستی کی ایک سرد رات، درخت فروری کی دھند میں ڈوبے ہوئے ایک کہر آلود خاموشی ہے، جو بستی کے سنسان گلی کوچوں میں اُتر آئی ہے۔ بجلی سے محروم بستی میں لیمپوں اور چراغوں کی روشنی کہیں کہیں سردی میں ٹھٹھر رہی ہے، کچے سے مکانوں اور جھونپڑیوں کے کواڑ بند ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان گرم لحافوں میں دبکے گہری نیند سو رہے ہیں۔ نمبرداروں کی بڑی سی حویلی اور اونچا چوبارہ، جس کی گلابی سلیں یخ ہو رہی ہیں، مسجد کے ننھے ننھے مینار دھند میں سر نکالے کھڑے ہیں، بستی سے ذرا پرے گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپے قبرستان میں چمگادڑیں اور جگنو جاڑے کی بانہوں میں کہیں خود کو چھپائے ہوئے ہیں۔

آدھی رات گزر گئی ہے، ٹھٹھرتی رات بستی اور اس کے آس پاس کھڑے درختوں اور کھلیانوں کے ہونٹوں پر اپنا برف آلود ہاتھ رکھ کر خواب میں کھو گئی ہے، بستی کے شمال مشرق کونے پر ایک چھوٹے سے گھر میں تین کمرے ہیں، شمالی کمرے میں دیے کی لو مدھم ہو رہی ہے۔ سترہ برس کا ایک نوجوان سکندر علی جس کی خوابیدہ آنکھیں جاگ رہی ہیں، وہ لحاف کے اندر کا ٹکڑی لیے دم بخود بیٹھا ہے۔ اس کے ٹھٹھرتے وجود کو لحاف تپش دے رہا تھا اور اس کے اندر شمو کے عشق کی آتش اُسے دیے کی طرح جلا رہی تھی۔

شمو اسی بستی کے ایک چھوٹے سے زمیندار نور محمد کی اکلوتی بیٹی تھی، دراز قد و قامت اور سوہنے نین نقش کی شمو پر بستی بھر کے لڑکے مرمٹتے تھے۔ سولہ برس کی عمر میں شمو پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔

سکندر پچھلے دو سال سے شمو کی صورت دل میں بسائے اس کی پوجا کر رہا تھا، مگر وہ اسے دیکھنا بھی پسند نا کرتی تھی۔ سکندر کا باپ بستی کے نمبردار کا مزارع تھا، اسکول میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے قطعی نا آشنا، مگر شمو کی چاہت نے اسے سنجیدہ اور غم زدہ بنا دیا تھا۔ بستی میں دو مخالف دھڑے تھے، شمو کا تعلق دوسرے دھڑے سے تھا۔ اس لیے وہ ان کے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا اور شمو کا ان کے گھر آنے کا تو تصور بھی محال تھا۔

شمو کو اس نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا، جب عید کے دن وہ گلابی پیراہن میں ملبوس نمبرداروں کے گھر سویاں دے کر گلی میں اپنے گھر کو واپس پلٹ رہی تھی کہ اچانک سکندر کا اس سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھ کر جھینپ سی گئی اور بوکھلا کر اپنا سر سے ڈھلکتا آنچل

سنبھالنے لگی جو سرک کر پیچھے گردن پر ڈھلک آیا تھا اور اس کے گندھے ہوئے بالوں کی ایک لٹ اس کے رخسار سے ہوتی ہوئی ٹھوڑی سے نیچے تک ڈھلک آئی تھی۔ آنچل سنبھالتے ہوئے اس کی ایک لمحے کو نگاہیں سکندر کے چہرے پر اٹھیں اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دونوں خالی پلیٹیں دھم سے نا صرف نیچے گر گئی تھیں، بلکہ ایک پلیٹ تو پہیے کی طرح گھومتی ہوئی ایک قدم آگے تک چلی گئی تھی، بس اس کی اٹھی ہوئی ایک نگاہ بجلی کی کوند بن کر سکندر کے چہرے پر پڑی اور اسے اندر تک جلا کر خاکستر کر گئی، سکندر نے پلیٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

سکندر سے پلیٹ لیتے ہوئے اس نے جھکی جھکی پلکوں کے جھروکوں سے پھر سکندر کو جھانکا اور اس سے پلیٹ تھام کر ناگن کی طرح آگے نکل گئی۔ سکندر پلٹ کر اسے دیکھتا رہا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی تیزی سے گلی کا موڑ مڑ گئی، سکندر اپنے خالی وجود کو لیے ہونقوں کی طرح اسے تکتا رہ گیا، پھر وہ بھی اس کے تعاقب میں ایسے لپکا، جیسے کچھ پل اور اگر یہاں کھڑا رہا تو اس کی روح پرواز کر جائے گی، پھر جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو اسے ایک ہلکی سی شمو کی جھلک دکھائی دی، کیوں کہ وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بھاگنے کے انداز میں اس کے دروازے تک پہنچا تھا، مگر وہاں دونوں بند کواڑ اپنی پلکیں موندے خاموش کھڑے تھے۔ وہ کچھ لمحے سکتے کی حالت میں کھڑا بند کواڑ کو جھانکتا رہا، پھر شام تک اس نے اس گلی میں اتنے چکر لگا ڈالے کہ جتنے ایک منٹ میں پنکھے کے پر اپنا دائرہ مکمل کرتے ہیں۔

وہ حسین صورت، وہ لمبی جھالروں والی پلکیں، وہ یاقوتی لبوں پر کٹی مسکراہٹ، وہ ٹھوڑی سے لٹکتی زلف اور وہ مخمور شباب میں لپٹا پیکر سکندر کے حواس پر چھا گیا تھا۔ دیدار یار کی طلب اتنا بے تاب کر دیتی کہ وہ رات کو لحاف سے نکل کر محبوب کی گلی میں پہنچ جاتا اور پھر جس روز اس سے ایک جھلک دکھائی دے جاتی، وہ دن اس کے لیے عید کا دن ہوتا۔ اسکول میں جاتا تو خیال یار میں کھویا رہتا۔ اپنی کتاب کے ہر ورق پر کونے میں چھوٹا سا ایک نام لکھ رکھا تھا۔

شمو..... شمو.....

اس گلی میں اس کا روز آنا جانا دیکھنے والوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا تھا، راہ عشق میں رقابت کی آگ نا جلے، مجبوریوں کی دیواریں حائل نا ہوں تو عشق کا پودا پنپ نہیں پاتا، وصل کی طلب نت نئی منصوبہ بندیاں کرتی ہے، محبوب کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لیے نئے سے نیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ عشق جب اندر سما جاتا ہے تو پھر اندر سے ہی وہ سارے سبق پڑھا دیتا ہے، کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مکتب عشق کے سارے دستور ہی نرالے ہوتے ہیں۔

سکندر نے بستی کی ایک عورت سے مدد چاہی اور اسے پیام رساں کے طور پر رضامند کیا۔ اس عورت نے اپنے لیے ایک سوٹ کی فرمائش کی، جو اسے اگلے ہی روز فراہم کر دیا گیا، پھر جب وہ پیغام لے کر پہنچی تو شمو نے نا صرف اسے آوارہ بدچلن کے خطاب سے نوازا اور آئندہ اپنے گھر آنے سے منع کیا، بلکہ سکندر کے نام بھی پیغام میں کہلا بھیجا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے بڑے عاشق بنے پھرتے ہو، مگر میں تمہاری صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی اور یہ جو روز میری گلی میں آتے جاتے ہو نا، مجھے سب پتا ہے، تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تم نے مجھے سلام و پیام بھیجے۔ اب اگر کوئی حرکت کی تو اپنے باپ اور بھائیوں کو بتا دوں گی۔ دیکھنا پھر کیسے تمہارے سر سے عشق کا بھوت اترتا ہے۔ میرا خیال دل سے نکال دو، بس تمہارے لیے ہی بہتر ہے۔

یہ پیغام ملتے ہی سکندر کا دل ٹوٹ گیا، ہنسی اس کے چہرے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی، سرد سی آہیں بھرتا چپ چاپ رہنا اس کی عادت بن گیا، کسی سے دوستی نا رہی، مگر دل کی ہر دھڑکن شمو کے نام پر دھڑکتی رہی۔ پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا، میٹرک کے امتحانات گزر گئے، مگر وہ تو ایک دن بھی کمرہ امتحان میں نا گیا تھا۔

گھر والوں نے اسے زمیندار کے ہاں کام پر لگا دیا۔ وہ دن بھر کھیتوں میں باپ کے ساتھ کام کرتا اور رات کانٹوں کے بستر پر بسر کرتا۔ بشیر اس کی ماسی کا بیٹا تھا، وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ سکندر شمو کے عشق میں پاگل بنا پھرتا ہے، بشیر نے اسے مشورہ دیا کہ کسی روز میرے ساتھ چلو میں تمہیں ایک عامل سے تعویذ لے کر دوں گا،

پھر دیکھنا شمو خود تمہیں ملنے آئے گی۔ سکندر نے فوری اس کی بات پر عمل کیا اور اسے اپنے ساتھ لیے عامل کے پاس پہنچ گیا

عامل نے تعویذ دیا۔ منہ مانگی کر رقم لی اور تین دن کا وقت دے دیا کہ تیسرے دن تجھے اس کی طرف سے پیغام آجائے گا۔ وہ تین دن کیسے کٹے، یہ صرف وہی جانتا تھا، مگر تین دن تو کیا تین ہفتے گزر گئے ادھر سے سکوت مرگ طاری رہا، پھر کئی عاملوں کو آزما ڈالا۔ بے پناہ دولت خرچ کی، مگر سب کچھ بے سود رہا۔

بستی کے قبرستان کے ساتھ بابا ظاہر پیر کا دربار تھا۔ بستی بھر کے لوگ وہاں جاکر سلام کرتے تھے، چادریں اور پھول چڑھاتے تھے، منتیں مانتے تھے، ہر سال جولائی کے مہینے میں اس بزرگ کا عرس منایا جاتا تھا، مگر سکندر ان پیروں، فقیروں اور درباروں سے کوئی دلچسپی نا رکھتا تھا۔ رہی سہی کسر عاملوں نے پوری کردی تھی اور اب اس کا دل تعویذ دھاگوں سے بھی اُچاٹ گیا تھا۔

پھر ایک دن ان کے پڑوس میں ایک پیر صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، بستی بھر کے لوگ اس پیر سے ملنے آئے، بشیر سکندر کو بھی ان کے پاس لے گیا اور اس انداز میں بات کی کہ اس کی منگیتر ہے، مگر وہ اس سے شادی پر رضامند نہیں، یہ اس سے عشق کرتا ہے، اگر وہ اسے نا ملی تو یہ مر جائے گا آپ اس کے لیے دعا کردیں۔ اس بزرگ نے تمام ماجرا سن کر سکندر کو بغور جھانکا اور پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔

"رات کو قبرستان میں جاکر کچھ پڑھائی کرلو گے؟"

"جی ہاں۔" سکندر نے فوری رضامندی سے کہا۔

"دیکھ لو۔ مشکل کام ہے۔ آدھی رات کو قبرستان جانا، وہاں آگ جلا کر گھنٹہ بھر پڑھائی کرنا اور لگاتار سات راتیں جانا، اگر ایک دن بھی ناغہ کردیا تو پھر سے گنتی شروع کرنا پڑے گی۔"

"اگر میرا کام ہو جائے تو یہ کچھ مشکل کام نہیں ہے۔" سکندر نے وثوق سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" پیر صاحب نے اسے پڑھنے کا عمل اور پورا طریقہ سمجھا کر رخصت کردیا، سکندر نے نقدی کی صورت میں اسے نیاز پیش کی، جو قبول کرلی گئی۔

☆......☆

اب آدھی رات کا وقت ہو گیا تھا اور اسے قبرستان جانا تھا، وہ دھیرے سے اٹھا کمرے میں دوسری چارپائی پر اس کا چھوٹا بھائی امیر علی سو رہا تھا اور اس سے اگلی چارپائی پر اس کی بہن حرا نے لے کر نیند کی آغوش میں محو خواب تھی۔ اس نے اپنے سرہانے رکھی ہوئی فلفل سیاہ کی پڑیا، ماچس اور ٹارچ اٹھائی، خود کو کمبل میں چھپایا اور ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کر کے آنگن کے کونے میں اُپلوں کی آگ کا ڈھیر جو دن رات سلگتا رہتا تھا، وہاں چند موٹے موٹے کوئلے کے انگارے دہکائے اور پھر ان جلتے انگاروں کو ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے میں ڈال کر قبرستان کی طرف ہو لیا، ہلکے ہلکے کہر میں ڈوبی گلی میں اس کے قدموں کی چاپ محسوس کی جاسکتی تھی۔ نکڑ پر بھوسے کے ڈھیر میں چھپے ہوئے ایک کتے نے اس کی بو پا کر غراتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا، مگر بھونکنے یا حملہ آور ہونے سے اجتناب کیا۔

قبرستان میں گھنی جھاڑیاں، کیکر اور چند ایک نیم کے گھنے پیڑ تھے۔ وہ دربار والے کونے کی طرف گیا اور ایک کشادہ جگہ کا انتخاب کیا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے اس کا دل دہل سا گیا تھا، مگر شمو کا عشق اس پر غالب ہوا اور وہ خود کو ہر مشکل سے ٹکرانے پر رضامند کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جلتے ہوئے انگاروں پر پھونک مار کر انہیں تیز کیا پھر اس پر ہاتھ تاپے۔ آسمان پر ستارے سفید برتن کی طرح چمک رہے تھے، تمام درختوں پر اوس برس رہی تھی، اس نے دہکتے انگاروں کا برتن نیچے رکھا، فلفل کی پڑیا کھولی، پہلے خود پر دم کر کے خود کو حصار میں لیا، پھر محبوب کے گھر کی طرف رُخ کر کے پڑھائی شروع کی اور آگ کے گرد دائرے میں گھومتے ہوئے عمل پڑھنا شروع کیا، ہر چکر پر فلفل کے دانے پر پھونک مار کر اسے جلتے انگاروں میں ڈال دیتا اور اگلے چکر پہ روانہ ہو جاتا وہ رک رک کر چل رہا تھا، تاکہ ایک چکر میں پورا عمل پڑھ لیا جائے۔

اس عمل میں محبوب کے چہرے کا تصور بھی رکھنا تھا اور تصور میں ہی ہر چکر پر اس کے چہرے پہ پھونک بھی مارنا تھی، کوئی پون گھنٹے میں یہ سارا عمل طے پایا، اس

عرصے میں اوس پڑنے سے انگارے بجھ گئے تھے اور وہ بُری طرح ٹھٹھر گیا تھا۔ بمشکل گھر پہنچ کر اس نے خود کو بستر کی آغوش میں سمیٹا، جانے کب اسے نیند نے آلیا۔

☆......☆

آج اس کے عمل کی چوتھی رات تھی، سرِ شام ہی آسمان گہرے بادلوں سے بھر گیا تھا اور ہلکی ہلکی رم جھم پڑنے لگی تھی، سکندر پریشان تھا کہ اگر رات بھر یہ بوندا باندی کا سلسلہ جاری رہا تو قبرستان جانا مشکل ہو جائے گا، کچھ بھی ہو وہ ناغہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آدھی رات کو جب وہ پہلے سے زیادہ انگارے اور کوئلے لے کر گھر سے نکلا تو گہرے بادل جوں کے توں موجود تھے، مگر بارش نا تھی۔ شمال کی طرف وقفے وقفے سے بجلی کوندتی اور بادل گرجنے کی آواز آتی۔ ہلکی پھلکی بارش سے گلی میں کیچڑ ہو چلا تھا، اور پھسلن ہو رہی تھی، وہ بڑا احتیاط ہو کر چل رہا تھا۔ ابھی وہ قبرستان میں پہنچ کر عمل کی تیاری کر رہا تھا کہ زور سے بادل گرجا اور موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ اس نے بھاگ کر بابا جی کی درگاہ میں پناہ لی۔ دروازہ مقفل نا تھا، صرف زنجیر پڑی تھی، مرقد کے سرہانے طاق میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، سکندر نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور نیچے بچھی صف پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ انگاروں کو پھونک مار کر نئی زندگی دی، پُر ہول سناٹے میں باہر گرتی بوندوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اچانک باہر بجلی زور سے چمکی اور گرجدار آواز نے دربار کے در و دیوار کو لرزا دیا، سکندر بے اختیار مرقد پر سجدہ ریز ہو گیا اور کتنی ہی دیر قبر پر جھکا اسے عقیدت سے بوسے دیتا رہا، پھر وہ شاید رو رہا تھا۔

بابا جی میں بڑا خطا کار ہوں، شمو کے عشق نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ دعا کرو بابا جی بارش رک جائے، دعا کرو بابا جی شمو مجھے مل جائے، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، جانے وہ کیا کچھ بولتا چلا جا رہا تھا، باہر موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی اور ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکے دروازے کو حرکت میں لا رہے تھے۔

تیز بارش کو دیکھ کر سکندر نے فیصلہ کیا کہ اندر رہ کر ہی عمل کو پورا کر لوں، لہٰذا اس نے نئے کوئلے سلگا کر مرقد کے مغربی جانب انگاروں کا برتن رکھا اور عمل شروع کر دیا۔ ہوا کے دباؤ سے دروازہ بجتا رہا۔ بجلی کوندتی رہی، بادل گرجتے رہے، بارش پہلے موسلا دھار برسی، پھر ہلکی رفتار میں برستی رہی۔ سکندر نے سات چکر پورے کر کے عمل کو نمٹا لیا، طاق میں جلتا دیا بس ٹمٹما رہا تھا۔ سردی سے سکندر کے دانت بجنے لگے تھے، اس نے خود کو مکمل کمبل میں چھپایا اور کونے میں دیوار سے ٹیک کر بیٹھا رہا۔ کانگڑی لیے اس نے اپنا چہرہ بھی کمبل میں چھپا لیا تھا، جلد ہی سردی کا اثر کم ہونے لگا۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا، مگر اکا دکا بوندیں اَب بھی برس رہی تھیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دبائے گٹھڑی کی صورت سمٹ کر بیٹھا تھا کہ اسے اونگھ سی آنے لگی، پھر جانے کیا ہوا، وہ خواب تھا یا حقیقت۔ سکندر کیا دیکھتا ہے کہ ایک چٹیل میدان ہے اور وہ اس میدان میں شمو کو آوازیں دیتا ہوا جا رہا ہے، پھر اسے دور ندی کے کنارے شمو نظر آتی ہے اور اسے آواز دے کر اپنے پاس بلاتی ہے، سکندر بھاگ کر اس کے قریب جاتا ہے، کیا دیکھتا ہے کہ شمو نیم برہنہ حالت میں اس کے سامنے پانی میں شرابور کھڑی ہے، جیسے ابھی ندی سے نہا کر نکلی ہو۔ وہ دونوں بانہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھتی ہے، سکندر کو یہ منظر بڑا عجیب سا لگا۔ اسے شمو کی حالت دیکھ کر بڑی شرم سی محسوس ہوئی وہ شمو سے پوچھتا ہے کہ تم یہاں کیسے؟ مگر اس وقت تک وہ اسے بانہوں میں لے چکی ہوتی ہے اور دیوانہ وار اسے چومتی چلی جاتی ہے، پھر آناً فاناً وہ دونوں گناہ کی دلدل میں اُتر جاتے ہیں، گناہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو سکندر کو شمو کے وجود سے ناگوار مہک آنے لگتی ہے، وہ کراہ کر سنبھلتا ہے اور اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ وہ پھر اسے بانہوں میں لینا چاہتی ہے تو سکندر الٹے قدموں بھاگ پڑتا ہے، وہ اس کے تعاقب میں آوازیں دیتی ہوئی بھاگتی ہے، اچانک سکندر کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ منہ کے بل گر جاتا ہے۔ ایسے میں سکندر کا یہ خواب ٹوٹ گیا اور اس نے خود کو منہ کے بل صف پر گرا ہوا پایا ہڑبڑا کر اس نے خود کو سنبھالا، اُف یہ تو خواب تھا۔

وہ خود سے بڑبڑایا، مگر یہ کیا اس کے کپڑے ناپاک ہو چکے تھے۔ شپٹا کر اس نے خود مشاہدہ کیا اور فوری گھر کو چل دیا۔

جانے کیوں اسے اپنے آپ سے بھی نفرت سی ہونے لگی تھی، اس کا شمو سے عشق تو بڑا پوتر اور قابل داد تھا، پھر یہ نفسانی خواہش کہاں سے آٹپکی، جس نے اسے نا صرف ناپاک کیا، بلکہ عشق پارسا کو بھی رسوائی بخشی۔ دن بھر وہ خود کو ملامت کرتا رہا۔ چار راتوں کا عمل پورا ہو چکا تھا، بس تین راتیں باقی تھیں اور وصال یار ہونے کی قوی امید بندھ گئی تھی، پھر یہ کیا ہو گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کا ضمیر اسے جھنجوڑ رہا تھا کہ تو نے اپنی محبت کو داغ دار کر دیا ہے، اللہ کے حضور توبہ کر، بے شک اللہ توبہ کرنے والے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

☆......☆

رات وہ مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گیا تو، نماز سے اسے دلی راحت محسوس ہوئی۔ سجدے میں گر کر اس نے اپنے ناکردہ گناہ کی اللہ سے معافی مانگی اور توبہ استغفار کی تکرار کرتا رہا۔ گھر لوٹتے ہوئے وہ محبوب کی گلی سے گزرتا ہے، مگر آج اس کے دل کی کیفیت اور تھی۔ اس کی نگاہ دربار پر اُٹھتے ہوئے ندامت محسوس کر رہی تھی اور وہ تیزی سے گلی پار کر گیا۔

بستر پر ایک عجیب سی بے چینی اُسے مضطرب کیے رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ گئی، اسی بے خوابی اور بے چینی میں اس کے عمل کی آخری رات کے لمحات بھی آ گئے۔

آج اس کی دھڑکنوں میں ایک عجیب سی ہلچل ہے۔ خیالات میں ہیجان ہے، سوچ اور انجانی سی خوشی کا چڑھاؤ بھی اور مایوسی کا اُتار بھی۔ کبھی ایک قوت غالب آ جاتی ہے کبھی دوسری، وہ عمل پایہ تکمیل تک پہنچا کر گھر کو لوٹتے ہوئے ابھی قبروں کے بیچ میں ہی قدم بڑھا رہا تھا کہ پیچھے سے ایک مردانہ بارعب آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ چاند مغرب کی اوٹ میں مدہم سی روشنی دے رہا تھا۔ چند قدموں تک آس پاس کے منظر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے لرزتے وجود کے ساتھ پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ ایک انسانی ہیولا سا اسے کھڑا دکھائی دیا، جس کی صورت واضح نا تھی اور وہ اس سے مخاطب تھا۔

"سکندر علی کس منزل کی کھوج میں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ شمو تمہاری منزل نہیں، جس شمو کے وجود کو حاصل کرنے کی تم تگ و دو کر رہے ہو، وہ وجود فانی ہے۔ اپنے آس پاس بکھری ان قبروں کو غور سے دیکھو، ان میں کئی شمو جیسی حسین صورتیں سما کر مٹی ہو چکی ہیں، کبھی وہ بھی اپنے محبوب کی جان ہوا کرتی تھیں۔ تمہارے جیسے حسین صورتوں کے عاشق کئی سکندر علی یہاں محو خواب ہیں، لاکھوں ہیریں اور لاکھوں رانجھے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ عشق کی دولت مقدر سے ملا کرتی ہے، مگر اس کی قدر و قیمت کرنا کوئی کوئی جانتا ہے۔ بھنورے کا عشق پھولوں کا رس چوس کر اسے برباد کرتا ہے، پروانے کا عشق اپنی شمع پر خود کو قربان کر دیتا ہے، اس دور کے عاشق سب بھنورے ہیں، آج جس موڑ پر تم کھڑے ہو، یہاں سے تمہاری بربادی کا بھی آغاز ہو سکتا ہے اور تمہاری دنیا اور آخرت سنورنے کا سبب بھی پیدا ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" سکندر نے چونک کر پوچھا۔

"جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ کل تمہارے امتحان کا دن ہے، شمو تم سے ملے گی، بس وہ ایک لمحہ تمہارے امتحان کا پل ہوگا، وصال کا وہ لمحہ جس کا دورانیہ تو لمحے بھر کا ہوگا، مگر اس کا نتیجہ عمر بھر کے لیے ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں بابا جی...... خدا کے لیے مجھے بتاؤ میں اس امتحان میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں۔" سکندر نے بے چینی سے پوچھا۔

"بس خیال رکھنا کہ تمہارا عشق شمو سے رہے اس کے وجود سے نہیں، اگر تم نے اس وجود کو شمو سمجھ لیا تو امتحان میں فیل ہو جاؤ گے، کیوں کہ وہ وجود فانی ہے اور اگر وجود کو نظر انداز کر کے شمو سے ملو گے تو پاس ہو جاؤ گے۔ اگر تم اس امتحان میں پاس ہو گئے تو کل رات اسی وقت یہاں چلے آنا، میں تمہیں یہاں ملوں گا، اگر میں یہاں نا ملوں تو سمجھ لینا کہ تم امتحان میں فیل ہو چکے ہو، تم نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ تم نے اپنے عشق کی توہین کر دی، اسے مٹی میں ملا دیا۔ جاؤ دیکھتے ہیں تمہارا مقدر تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے۔" اس پر اسرار بزرگ نے کہا اور وہ ہیولا جو سکندر سے مخاطب تھا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سکندر ہونقوں کی طرح خالی فضا کو تکتا رہ گیا۔

کل شمو اس سے ملے گی [illegible] نے کہہ دیا تھا۔

جانے کیوں اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ کل شمو اسے ضرور ملے گی۔ ایک عجیب سی خوشی سے اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے سارے وجود کی شریانوں میں کیف و سرور کا رقص سا ہونے لگا تھا۔ رات اسی عالم میں بسر ہو گئی۔ صبح اس نے پھر اللہ کے حضور نماز میں سر جھکایا، خوشی کی اس کیفیت میں کھانے کو بھی دل نا چاہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شمو اسے کہاں ملنے آئے گی۔ ان کے گھر تو وہ آ نہیں سکتی تھی۔ کسی کے گھر، گلی بازار میں ملنا بھی ناممکن تھا، پھر یہ کیوں کر ملن ہوگا۔ ادھر اس دن وڈیرے کی فصل کو پانی دینا تھا۔ دن بھر کی مصروفیات تھیں، اس کا ابو وڈیرے کے ساتھ شہر جا رہا تھا، ورنہ وہ کوئی بہانہ تراش کر اپنے ابو سے کہہ دیتا کہ میں آج کھیت کو پانی دینے نہیں جا سکتا۔ عجیب صورت حال آن پڑی تھی، وہ کیا کرے۔ کہاں شمو کا انتظار کرے، آخر کہاں؟

دیر ہو رہی تھی، مجبوراً اسے کھیت کی طرف جانا پڑا، ارادہ یہ طے کیا کہ سارے کھیت میں پانی کا رستہ بنا دوں گا اور خود گھر آ جاؤں گا۔ شمو کا انتظار کروں گا، پھر اس سے مل کر کام پر چلا جاؤں گا، وہ اس کی گلی سے گزر کر کھیت کی طرف گیا تھا، مگر شمو کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

رات بزرگ سے ہونے والی ملاقات کا ایک ایک لفظ اس کی سماعت میں بازگشت کر رہا تھا کہ کل تمہارے امتحان کا دن ہے۔ بس ایک پل کا کھیل باعث فخر بھی ہو سکتا ہے اور باعث رسوائی بھی۔ وہ اللہ سے دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ مجھے برباد ہونے سے بچا لینا۔

نہر کا پانی جس کھالے میں بہتا ہوا اس کے کھیت میں پہنچ رہا تھا، سکندر اس کھالے پر کسی اٹھائے کھیت کو پانی چھوڑ کر واپس بستی کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اچانک شمو کو کھالے پر دیکھ کر وہ ٹھٹکا گیا، شمو اپنی ایک دوست کے ساتھ کھالے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی، بستی کی عورتیں بہتے نالے پر دیہاتوں میں کپڑے دھویا کرتی ہیں، جیسے ہی سکندر قریب پہنچا تو شمو نے اسے دیکھا اور بے تاب ہو کر اس کی طرف بھاگ کر آ گئی، سکندر حیرت سے بوکھلا سا گیا۔

اسے لگا جیسے کسی غیبی قوت نے شمو کو اٹھا کر یہاں لا پھینکا ہے اور اب اسے میرے قریب لا رہی ہے۔ شمو دیوانہ وار اس کے قریب پہنچی اور دھاڑ مار کر اسے اپنی بانہوں کے شکنجے میں لے لیا اور زور زور سے رو دی۔

”سکندر تم نے مجھے مار دیا۔ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی، خدا کے لیے مجھے چھوڑ نہ دینا۔“ میں مر جاؤں گی سکندر میں مر جاؤں گی۔ وہ دیوانوں کی طرح سکندر کی چھاتی پر سر ٹکرائے جاتی تھی اور نا جانے کیا کیا بولے جاتی تھی، سکندر اس اچانک اور قطعی غیر متوقع صورت حال سے بوکھلا سا گیا تھا پھر وہ لمحہ جب شدت جذبات سے شمو نے سکندر کے چہرے کا بوسہ لیا تو سکندر کے وجود میں چنگاریاں سی سلگ اٹھیں اور قریب تھا کہ وہ بھی شمو کے چھلکتے شباب کے جام کو لبوں سے لگا دیتا۔ اچانک ایک خیال نے اس کے ارادے پر برف کا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے نا صرف اپنے قوی ارادے کی نفی کی، بلکہ شمو کی بانہیں پکڑ کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

”یہ کیا حرکت ہے شمو، مجھے سر عام بدنام کرنا چاہتی ہو، نشہ تو نہیں پی رکھا تم نے، شرم کرو۔“ شمو بھی حیران ہو کر پیچھے ہٹی اور دھم سے نیچے بیٹھ کر پاؤں سمیٹ کر گھٹنوں میں سر دیا اور زار و قطار رونے لگی۔

”عائشہ تم نے دیکھا کہ شمو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ میں تو یہاں سے گزر رہا تھا۔ اب گاؤں میں کوئی بات ہوئی تو تم میری گواہ ہو گی۔ میں نردوش ہوں۔ میرا شمو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ شمو کی دوست عائشہ ہے، جو کپڑے دھوتے ہوئے اس تمام واقعے کی عینی شاہد تھی، سے مخاطب ہو کر بولا۔

اور وہ بھی جو حیران بیٹھی تھی، بس سکندر کی بات کا اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا، بول نا سکی۔ سکندر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ شمو نے سکندر کو جاتے ہوئے دیکھا تو دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگ کھڑی ہوئی۔

”ارے سکندر! مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ نہیں تو پانی میں کود کو خود کو ختم کر لوں گی۔ میں تین راتوں سے سوئی نہیں گی ہوں۔ مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے، تم مجھے نہ ملے تو میں مر جاؤں گی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور میرے ساتھ نکاح کر لو۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔“ وہ چیختے ہوئے بھاگ رہی تھی کہ پگڈنڈی پر پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ گر گئی، عائشہ نے بھاگ کر اسے سنبھالا اور

سکندر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

یہ پل بھر میں کیا ہو گیا تھا، قطعی غیر متوقع، سمجھ سے بالاتر، بھلا شمو جو کل تک سکندر کی صورت سے نفرت کرتی تھی، وہ آج یوں سر عام اس موڑ پر آ پہنچی تھی یہ پیاسی راتوں کے عمل کا نتیجہ تھا یا اس بزرگ کی کوئی کرامت تھی۔ جس نے سکندر سے رات قبرستان میں کہا تھا کہ کل شمو تم سے ملے گی۔ کچھ بھی ہو، یہ سب کچھ غیر یقینی تو تھا، مگر اب اس حقیقت کو خواب بھی تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔

کافی دیر بعد جب سکندر لوٹ کر اپنے کھیت کی طرف آیا تو وہ جگہ سنسان پڑی تھی جہاں کچھ دیر پہلے شمو نالے پر اس سے ملی تھی، وہ کتنی ہی دیر وہاں رُک کر کھڑا رہا، شمو کے بدن کا لمس اور اس کی معطر سانسوں کی تڑپ ابھی تک وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اسے شمو سے ملاقات کی جتنی خوشی ہونی چاہیے تھی، جانے کیوں اس قدر خوشی سے زیادہ پریشانی سی ہو رہی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ سکندر کو اب شمو سے زیادہ اس رات والے بزرگ سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا تھا کہ کب رات ہو اور کب اس بزرگ سے دوبارہ ملاقات ہو۔

☆......☆

پھر رات کو جب وہ بے تابی کے عالم میں قبرستان پہنچا تو بابا ظہیر پیر کی درگاہ میں حاضر ہو کر عقیدت سے مزار کو بوسہ دیا۔ پڑھ کر نیاز پیش کی اور کونے میں کچھ دیر پلکیں موندے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ وہ پوری طرح جاگ رہا تھا اسے لگا جیسے وہ کسی سے ہمکلام ہے، اس کے اندر سے کوئی بول رہا ہے اور وہ اس سے ہمکلام ہے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"سکندر تجھے پتا ہے کہ تو کون ہے۔ جب تو پیدا ہوا تو تیرا کوئی نام نہیں تھا۔ تیرے آنے سے پہلے سکندر کا نام دنیا میں موجود تھا۔ تجھے بھی اس نام سے پکارا جانے لگا اور جب تم شعور میں آئے تو تم یہ سمجھنے لگ گئے کہ میرا نام سکندر ہے، حالاں کہ تو سکندر نہیں، وہ تو کوئی اور ہے اگر تیری بات مان لی جائے تو سکندر ہے، تو ذرا انگلی لگا کر بتا کہ تو کہاں ہے؟ جسم کے جس حصے پر تو انگلی رکھ کر کہے گا تا...... کہ یہ میں ہوں تو اس حصے کا اپنا ایک نام ہوگا۔ سر سے پاؤں تک ہر جز کا اپنا ایک نام، سر، پیشانی، ناک، کان رخسار گلا، کندھے، بازو، چھاتی، پیٹ، پاؤں، غرضیکہ ہر حصے کا اپنا ایک نام ہے، تو پھر سکندر کہاں ہے؟ تمہارا یہ مکمل ڈھانچہ ایک جسم ہے اور اس کے اندر روح ہے۔ بس ان دو چیزوں کے دم سے تو ہے اور ان دونوں چیزوں پر تمہارا کچھ اختیار نہیں، روح تمہاری دسترس میں نہیں ہے، کسی بھی لمحے وہ تمہیں چھوڑ کر جا سکتی ہے اور روح کے بغیر جسم بیکار ہے۔ چلو کچھ دیر کے لیے اگر مان لیا جائے کہ روح تمہارے اختیار میں نہیں، البتہ جسم تمہارا تابع ہے تو ذرا اپنی پلکوں کو حکم لگاؤ کہ تم میری پلکیں ہو اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بس آج پورا دن تم نے جھپکنا نہیں۔ کانوں سے کہہ دو کہ آج کچھ سننا نہیں۔ اپنے دوسرے اعضاء سے کہہ دو کہ آج تم نے حرکت نہیں کرنی۔ بھوک اور پیاس سے کہہ دو کہ تم نے آج مجھے بھوک اور پیاس کا احساس نہیں ہونے دینا۔ کیا وہ تمہاری بات مان لیں گے کبھی بھی نہیں۔ تم اپنے جسم سے اپنی مرضی کا کام تو لے سکتے ہو، لیکن انہیں ان کے عمل سے روک نہیں سکتے تو پھر جسم بھی تمہارا تابع نہیں، روح تمہارے بس میں نہیں، تو پھر تم ہی بتاؤ کہ یہ جو تم ہو "تو تم کیا ہو۔" جو کچھ تم خود کو سمجھتے ہو تم یہ ہرگز نہیں ہو۔ تم تو کوئی اور ہو یا پھر تم میں کوئی اور ہے تمہارا یہ سارا جسم تو مٹی سے بنا ہے اور مٹی میں ہی مل جائے گا۔ یہ بات تو خود بھی جانتا ہے، پھر سمجھتا کیوں نہیں؟

ذرا سوچو، غور کرو کہ تو خود کو سکندر سمجھتا ہے کہ میں سکندر ہوں، حالاں کہ تیرے آنے سے پہلے بھی سکندر کا نام تھا اور تیرے چلے جانے کے بعد بھی یہ نام جوں کا توں رہے گا، لاکھوں کروڑوں تیرے جیسے انسان سکندر کے نام سے زندگی بسر کر کے چلے جائیں گے...... مگر سکندر کا نام باقی رہے گا۔ اسی طرح ہر انسان کا ایک نام ہے۔ انسان چلے جاتے ہیں، مگر نام باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کائنات میں موجود ہر جاندار اور ہر بے جان چیز کا ایک نام ہے۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات میں شمار ہونے والی ہر چیز اپنا ایک وجود بھی رکھتی ہے۔ اپنا ایک رنگ بھی رکھتی ہے اور اپنا ایک نام بھی رکھتی ہے ذرا سے تنکے کا ایک وجود بھی ہے ایک رنگ بھی ہے اور ایک

نام بھی ہے۔ معرضِ وجود میں آنے والی ہر چیز کا ایک نام ہے، ہر چیز ایک مدت کے بعد مٹ جاتی ہے، مگر نام اور رنگ باقی رہتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارے نام، یہ سارے رنگ اس بے رنگ کے ہیں۔ یہ سارے نام اس ذات کے ہیں جس کو کسی نام کے بغیر بھی پکارا جاسکتا ہے، لکھا جاسکتا ہے کہ ہم کس کی بات کررہے ہیں، لہٰذا تم سکندر نہیں ہو۔ کسی اور کی طلب اور کھوج میں زندگی برباد نا کرو، خود کو تلاش کرو، زندگی کے اس میلے میں تم کھو گئے ہو، اپنا آپ کو کھو بیٹھے ہو اور شمو کو تلاش کرتے پھرتے ہو، اس کو پانے کے لیے ریاضتیں اور جدوجہد میں مست ہوکر رہ گئے ہو۔ بخدا ایسا ہرگز نا کرو، جس دن تم نے خود کو پالیا، اس دن تمہیں کسی شمو کی جستجو نہیں رہے گی۔“

”مگر میں خود کو کہاں ڈھونڈوں؟ سکندر اسی طرح مراقبے میں خود سے ہمکلام ہونے والے سے پوچھ رہا تھا۔

”اگر میں تجھ سے کہوں کہ یہ جو میری ہتھیلی پر ننھا سا بیج رکھا ہے، اس بیج کے اندر ایک بہت بڑا تناور درخت ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے کہ اس بیج کے اندر اس درخت کی جڑیں بھی ہیں، تنا اور شاخیں بھی ہیں، کانٹے بھی ہیں، پھول بھی اور پھل بھی، سب کچھ اس بیج کے اندر ہے۔ نہیں مانوگے نا، بات ہے بھی نا ماننے والی، بھلا بیج میں درخت کیونکر سما سکتا ہے، لیکن ذرا اس بیج کو زمین کے اندر دبا کر دیکھو۔ بیج سے درخت کیسے بنتا ہے۔ بیج سے کونپل پھوٹے گی، کونپل، تنا بنے گی اور پھر درخت بن جائے گا، اب اگر یہ دیکھنا ہو کہ کیا یہ درخت اس بیج سے نکلا ہے تو ثبوت حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس پیڑ پر جو پھل پک کر تیار ہوگا اس پھل کو پھاڑ کر دیکھیں وہ بیج اپنے جیسے بے شمار بیجوں کے ساتھ موجود ہوگا اور اس بات کی گواہی دے رہا ہوگا کہ اوّل میں بھی میں تھا، اب آخر میں بھی میں ہوں، بیج میرا ظاہر تھا، جو پیڑ اُگا، وہ میرا باطن تھا تو جو کچھ بیج کے اندر تھا، اسے کھوجنے کے لیے بیج کو اپنا آپ مٹانا پڑا۔ اُسے خاک میں مل جانا پڑا۔ جب خاک میں مل گیا تو اس نے اپنے آپ کو کھوج لیا، اپنی حقیقت کو پالیا۔ اسی طرح تمہیں اپنی کھوج کا پتا لگانا ہے۔ عشق اس منزل کی راہ ہے اور اس راہ پر گامزن آپ کو کوئی مردِ حق کرے گا، جس کی تلاش میں تمہیں کہیں جانا ہوگا۔ شوق اور لگن سے تلاش کروگے تو جلدی مل جائے گا۔ بے اعتنائی برتوگے تو حسرتوں کے لق ودق صحرا میں بھٹک جاؤ گے۔

پھر شاید وہ غنودگی میں چلا گیا تھا، نیند کا جھٹکا سا لگا تو اُس نے آنکھیں کھول کر خود کو سنبھالا۔ اپنے چارسو کا جائزہ لیا، خاموش سرخ ریشمی چادریں لپٹی ہوئی بابا جی کی قبر مبارک اور اس کے سوا وہاں گہرا سناٹا تھا۔ اُسے تو بابا جی سے ملنا تھا، پھر کہاں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ تیزی سے درگاہ شریف سے باہر قبروں کی طرف بڑھا۔ کافی دیر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، اچانک ایک پکی قبر کے اونچے کتبے کے عقب سے اسے وہی مانوس سی آواز سنائی دی۔ سکندر ادھر متوجہ ہوا۔ کتبے کی اوٹ لیے وہ ہیولا کھڑا اس سے مخاطب تھا۔

”شاباش! تم امتحان میں پورے اترے، اگر شمو کے اظہار کا جواب تم بھی جذبات سے دیتے تو ناکام رہتے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ تم پر جاگتی آنکھوں انکشافات ہونے لگے ہیں۔ حقیقت آشنائی کے راز و رموز کا در تم پر وا ہونے لگا ہے، عشق مجازی کی تمہاری منزل گزر چکی۔ اب اگر یہاں ٹھہر گئے تو کہیں کے نہیں رہوگے۔ اگر عشق حقیقی کی ناؤ پر قدم رکھ دوگے تو دو جہانوں کا سفر طے کر کے مقام محمود کی محفل میں جا اُترو گے۔“

”تو پھر میں اب کیا کروں بابا؟“ سکندر نے بے تابی سے پوچھا۔

”تمہارا نصیبہ حضرت سخی عبداللہ قلندر قادریؒ کی درگاہ کے سجادہ نشین حضرت نبی احمد ناز کے پاس ہے۔ دریا کا سفر کرو۔ ساندر بار کی سرزمین پر چنیوٹ کے نواح میں برنالہ شریف کا مقام ہے۔ جتنی عاجزی اور فقیرانہ حالت میں جاؤ گے، اتنے ہی فیض یاب ہوکر لوٹو گے۔“

اس کے بعد سکندر گھر کی طرف بڑھ گیا اور گھر تک آتے آتے فیصلہ کرلیا کہ وہ جلد ہی قلندر کے آستانے پر جائے گا۔

اس کے اندر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ کہاں اس کی ہر دھڑکن میں شمو شمو ہی کی پکارا کرتی تھی اور اب شمو کا تصور بھی آتا تو اس کی دھڑکنوں میں کوئی لرزش نا ہوتی۔





سلطان صلاح الدین ایوبی

2 اکتوبر 1187ء وہ تاریخی دن تھا جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے 90 برس کے بعد بیت المقدس کو مکمل طور عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کروالیا۔ 1095ء سے 1099ء کے دوران جو پہلی صلیبی مہم بھیجی گئی تھی اس کے دوران فلسطین کا کچھ حصہ مسلمانوں سے چھن گیا تھا۔ جس میں بیت المقدس بھی شامل تھا۔ بارہویں صدی کے وسط میں مسلمان سرداروں عماد الدین زنگی اور نورالدین زنگی نے بیت المقدس کو آزاد کروانے کی جدوجہد شروع کی مگر یہ دونوں اس جدوجہد کے دوران ہی وفات پاگئے۔ نورالدین زنگی کی وفات کے بعد بادشاہت اس کے سپہ سالار صلاح الدین ایوبی کے حوالے ہوئی۔ اس نے پوری تیاری کے ساتھ فلسطین پر حملہ کیا اور ستمبر 1187ء میں بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا۔ 2 اکتوبر 1187ء کو اس شہر پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

شام کو اس عورت نے آکر بتایا جس کے ہاتھ سکندر نے شمو کو پیغام بھیجا تھا، کہ شمو تو تمہارے عشق میں پاگل ہورہی ہے، کل سے۔ اس نے گھر والوں کو صاف کہہ دیا ہے کہ شادی کروں گی تو سکندر سے نہیں تو زہر کھا کر مرجاؤں گی، اس کے باپ اور بھائیوں نے اسے آج بہت پیٹا ہے۔ اور سختی سے منع کردیا ہے کہ تم گھر سے اب باہر نہیں جاسکتیں اور آج اس کے باپ نور محمد نے اپنے بھائی سے کہا ہے کہ آج رات آکر میری بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کی نا صرف منگنی کرجاؤ، بلکہ شادی کی تاریخ بھی طے کرجاؤ، لہٰذا آج شمو کی منگنی اور شادی کے دن طے ہورہے ہیں۔"

سکندر یہ بات سن کر چونک گیا۔ اس عورت نے حیرت سے پوچھا کہ کل تک وہ تم سے نفرت کرتی تھی، آج وہ تمہاری دیوانی ہورہی ہے، کیا جادو چلادیا ہے تم نے اس پر کہ وہ اتنی مار کھا کر بھی سب کو برملا کہہ رہی ہے کہ میں سکندر کی نا ہوئی تو پھر کسی اور کی بھی نا ہوں گی۔

"اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔" یکا یک سکندر بول پڑا۔

"ہاں سکندر! اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں، لگتا ہے وہ کچھ کرکے رہے گی۔" عورت تو یہ باتیں بتا کر چلی گئی، مگر سکندر کو ایک نئے بھنور کی گرداب میں چھوڑ گئی۔

سکندر جب وہ تمہاری خاطر اتنا ظلم سہ رہی ہے۔ تمہارے عشق نے اسے دیوانہ کردیا ہے تو اب اسے نظر انداز کردینا تو پھر تمہارے بھی عشق کی توہین ہے۔ اچانک یہ بات اس کے اندر سے ابھری تھی۔ کوئی غیبی قوت اس کے اندر چھپی بیٹھی تھی۔ جب سکندر نے اس کی آواز پر کان دھرا، تو وہ غیبی قوت اس پر حاوی ہونے لگی۔

"ہاں ہاں سکندر، شمو کو نظر انداز کرنا یہ انسانیت نہیں ہے۔ کل تک تم اس کی خاطر ناچتے تھے نا مرتے تھے۔ اس کو پانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرڈالا تم نے اور پھر سات راتوں کا عمل جو معجزانہ طور پر کامیاب رہا، اب اسے اپنی طرف متوجہ کرکے اس سے آنکھ چرانا بزدلانہ حرکت ہے۔ بس ایک بار تم اس سے مل لو۔ کیا ہوجائے گا، اس عورت کے ہاتھ اسے پیغام بھیجو اور ملنے کی جگہ مقرر کرلو، تم جہاں کہو گے وہ تمہیں وہاں ملنے آئے گی۔ تم کن افسانوی خیالوں کے پیچھے لگ گئے، یہ بزرگ لوگوں کی باتیں ہیں، ابھی تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم گھربار چھوڑ کر درباروں پر جاؤ اور پیروں فقیروں کے ملنگ بن کر ناچتے پھرو۔ یہ سب تمہارے بس کا روگ نہیں، ذرا سوچو ماں باپ کے بڑے بیٹے ہو۔ کل کو ساری ذمے داری تمہارے سر پر پڑے گی، پھر کیا کرو گے۔ شادی کرو، بچے ہوجائیں گے بس نماز پڑھو! یہی دین کافی ہے۔ اب کوئی نیا دین سیکھنے جاؤ گے تم وہاں۔ چھوڑو یہ سب فضول ہے، بس شمو سے ایک بار مل لو، پھر جو بھی مناسب سمجھ کر لینا، سکندر نے اپنے اندر کی آواز کو بغور سنا اور اقرار میں

سر ہلایا کہ بات تو یہ بھی ٹھیک ہے، ایک بار شمو سے مل لینے میں مضائقہ ہی کیا ہے، پھر کسی دن برنالہ شریف بھی چلے جائیں گے۔

انسان کے اندر دو طاقتیں ہیں، شیطان اور خدا، دونوں انسان کے اندر رہتے ہیں کبھی ایک طاقت اس پر غالب آ جاتی ہے تو کبھی دوسری قوت اسے اپنا فیصلہ منوانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اَب اس پیغام رساں عورت کے آنے سے پہلے تک سکندر خدا کی بات مان رہا تھا، مگر جب عورت نے شیطان کا روپ دھار کر اسے جھنجوڑا تو شیطان کی قوت نے انگڑائی لے لی اور سکندر کو پل بھر میں بے بس کر کے اپنے فیصلے پر رضامند کر لیا۔ ہر انسان کے اندر یہ دو قوتیں ایک دوسری سے برسرِ پیکار ہیں اور انسان ان کے ہاتھوں کھلونا بن کر زندگی گزار رہا ہے۔ اس بات کی سوچ آ جائے تو زندگی آسان ہو جائے۔ اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے، بس رہبر مل جائے تو فہم و ادراک کے سارے دَر وا ہو جایا کرتے ہیں، مگر کوئی اس طرف متوجہ بھی ہو، کوئی اس بات کو سمجھے تب نا۔

سکندر نے پیغام رساں عورت کو پھر سے کچھ لالچ دے کر شمو کے ہاں بھیجا کہ کسی طرح ایک بار مجھ سے ملو۔ پیغام رساں نے اگلے گھنٹے میں ہی آ کر سکندر کو ملنے کی نوید دی کہ رات کے آخری پہر میں بستی کے شمالی کونے پر کھڑے گھنے شہتوت کے درخت کے نیچے چلے آنا۔ شمو بھی وہاں پہنچ جائے گی۔ وہ تمہارا پیغام سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ ضرور آئے گی۔“

پھر رات بھر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی، کچھ دیر کے لیے وہ سوچتا رہا کہ مجھے شمو سے نہیں ملنا چاہیے۔ جو لطف و سرور قبرستان میں ملنے والے بابا جی کی باتوں میں ملا ہے وہ شمو سے گلے مل کر بھی نہیں مل سکا۔ وہ غیر محرم ہے اور کسی غیر محرم عورت سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نا ہمارا مذہب دیتا ہے اور نا ہی معاشرہ۔ یہ ہر طرح سے ایک رسوا کن بات ہے، مگر اسی لمحے اس خیال کا سر کچل کر دوسرا خیال دماغ میں بجلی بن کر کوندا ”اب خود اسے آنے کی دعوت دی ہے۔ تو اب وہاں نا جانا وعدہ خلافی ہے اور ہمارا مذہب وعدہ خلافی کی بھی تو اجازت نہیں دیتا۔ بس اس سے دور رہ کر بات کر لینا۔ اسے سمجھا دینا کہ جہاں تمہارے ماں باپ چاہتے ہیں وہاں شادی کر لو، کیوں کہ ہمارا ملن نہیں ہو سکتا۔ بس دو چار باتیں کر لینے سے کیا ہو جائے گا۔

سکندر نے اپنے خیال کی ہاں میں ہاں ملائی اور مغرب کی اذان پر خود کو کمبل میں چھپائے حویلی سے باہر آیا اور سنسان سی گلی میں گھنے شہتوت کی جانب بے آواز قدموں سے چل دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن آج عجیب انداز میں دھڑک رہی ہے۔ نرم سی ہوا سے شہتوت کے پتے لرز رہے تھے اور وہ گلی میں دُور تک نگاہیں جمائے شمو کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ گلی میں نمودار ہوئی، اس کی بغل میں پوٹلی تھی اور وہ بڑی سی پھولدار چادر اوڑھے، سر جھکائے تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سکندر کی چھٹی حس نے دھڑک کر اسے کسی آنے والے خطرے کا سگنل دیا۔ وہ آتے ہی دیوانہ وار اپنی پوٹلی نیچے پھینک کر سکندر سے چمٹ گئی اور چھم چھم رو دی۔

”میں گھر سے فرار ہو کر آ رہی ہوں سکندر۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے کر نکل چلو۔ دیر نا کرو، صبح کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ رات میری منگنی بھی ہو چکی ہے اور پندرہ دن بعد میری رخصتی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی ہے۔ خدا کے واسطے انکار نا کرنا سکندر نہیں تو میں جیتے جی مر جاؤں گی، یہ دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔“ وہ اس کے قدموں میں جھکی تو سکندر نے اس کے دونوں بازو تھام کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

”پاگل نا بنو شمو۔ ہم فرار نہیں ہو سکتے۔ ہم کہاں جائیں گے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ سکندر کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”میں سب کچھ ساتھ لے آئی ہوں، نقدی بھی اور اپنا زیور بھی، میں بھوکی پیاسی تمہارے ساتھ رو لوں گی۔ اب واپس جانا میرے لیے مشکل ہے۔“

سکندر کے من میں ایک جنگ ہو رہی تھی، ایک قوت اسے ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی تو دوسری قوت اسے وفا نبھانے، اس پر ترس کھانے اور اس کی بات مان لینے پہ زور دے رہی تھی۔ بالآخر دوسری

طاقت غالب رہی اور نا چاہتے ہوئے بھی سکندر نے شمو کی بات مان لی اور وہ دونوں فصلوں کے بیچ جانے والی پگڈنڈی پر تیزی سے انجانی منزل کی جانب چل دیے۔ عشق اندھا ہوتا ہے بے خوف کر دیتا ہے۔ انسان کو اور بے بس کر کے اپنی ضد منوا لیتا ہے، ضدی بچے کی طرح وہ چپ چاپ سہمے ہوئے تیز تیز رواں دواں تھے۔ شمو پیچھے پلٹ پلٹ کر بھی دیکھتی جاتی اور سکندر کے تعاقب میں آگے بھی بڑھتی جاتی۔

جب سورج طلوع ہوا تو وہ شہر کے اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے، مگر گاڑی کے آنے کا وقت دس بجے کا تھا۔ وہ قصور جانا چاہتے تھے۔ دس بجے تک کا وقت گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات بھی نا کر پا رہے تھے۔ دونوں کے دل و دماغ میں ایک جنگ چل رہی تھی۔ شمو تو کسی غیبی قوت کی زد میں کسی مشین کی طرح حرکت کر رہی تھی، جبکہ سکندر کا ضمیر اسے ملامت کیے دے رہا تھا، پھر بھی کوئی قوت تھی جو اسے ضمیر کے خلاف چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ شمو سے نظریں چرا رہا تھا، وہ اندر سے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں مستقبل کی پلاننگ نہیں ہو رہی تھی، بلکہ وہ واپس لوٹنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

''کچھ کھاؤ گی۔'' اس نے شمو سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے ہولے سے انکار میں سر ہلایا، پھر سکندر سے کہا۔

''تم کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرا زور زور سے رونے کو دل چاہ رہا ہے۔ گھٹن ہو رہی ہے مجھے۔ لگتا ہے جیسے میرا اندر کٹ رہا ہے۔'' اس نے اپنا سر سکندر کے کندھے پر رکھا اور زور سے سُوں کر کے ناک کھینچی۔ دوپٹے کا نقاب چہرے سے ڈھلک گیا تھا اور پلکوں سے شبنمی قطرات گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

''میرا ابھی آگے جانے کو دل نہیں مان رہا۔ پتا نہیں کیوں میں نے تیری بات مان لی اور اتنا بڑا قدم اُٹھا لیا۔ میں تو کہتا ہوں اب بھی واپس لوٹ چلیں۔ تمہاری گمشدگی پر تیرے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر کیا گزر رہی ہو گی، ذرا دیر میں گاؤں بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ بن کر پھیل جائے گی، پورے خاندان کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔''

''میں تم سے عشق ضرور کرتا ہوں شمو، لیکن ایسا میں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ جس میں ہماری رسوائی ہو، زمانہ ہم پر انگلیاں اٹھائے، ہماری وجہ سے ہمارے والدین سر اُٹھا کر کسی سے بات بھی نا کر سکیں۔ بہت برا کیا ہے، ہم نے شمو۔ بہت ہی بُرا...... اب بھی وقت ہے تم اپنے کسی عزیز کے گھر چلی جاؤ، وہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔ کچھ بات رہ جائے گی، اگر ہم آگے نکل گئے تو زندگی بھر کے لیے ہماری واپسی کا راستہ بند ہو جائے گا۔'' سکندر ضمیر کی آواز کو باغی طاقت پر حاوی کر کے بول رہا تھا۔ شمو کے اندر بھی ضمیر نے کروٹ لی اور دوسری جذبات کی قوت کو پچھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سکندر، مگر میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی، اگر ہم واپس لوٹ گئے تو ہم ایک دوسرے سے جدا کر دیے جائیں گے۔ نا جانے میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔ نہیں نہیں...... میں واپس نہیں جاؤں گی۔ خدا کے لیے ایسا سوچو بھی نا۔ اتنا بڑا جہان ہے، کہیں تو ہمیں سر چھپانے کو جگہ مل ہی جائے گی۔'' شمو کے وجود پر جذباتی باغی قوت نے غلبہ پایا اور ضمیر کی طاقت کہیں نیچے دب گئی۔ سکندر کا من بھی انجانی سی قوتوں کی زد میں زیر و زبر ہو رہا تھا۔ گاڑی آنے میں ابھی دو گھنٹے پڑے تھے۔ لمبے سے پلیٹ فارم پر ایک پیڑ کے نیچے پتھر کے لمبے سے بنچ پر وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ آس پاس کوئی نا تھا۔ سارا پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا۔ نیم کے سوکھے پتے چار سُو بکھرے تھے۔ شمو نے اپنی پوٹلی سے کچھ روپے نکال کر سکندر کو دیے اور کہا کہ جاؤ کچھ کھانے کو لے آؤ۔ پریشان نا ہو۔ اللہ ہمارے لیے بہتر کرے گا، واپسی کا خیال دل سے نکال دو۔ اب ہمارا مرنا جینا ایک ساتھ ہو گا۔''

لگتا تھا کہ شمو کا ضمیر ہار گیا ہے اور دوسری قوت نے اس پر فتح پا کر اسے پھر سے بے خوف کر دیا ہے۔ سکندر ابھی گومگو کی حالت میں تھا۔ اس کی توجہ ضمیر کی

طرف زیادہ تھی، مگر پھر بھی وہ دوسری قوت کے زیر اثر تھا اور نا چاہتے ہوئے بھی وہ جذباتی اقدام کی پیروی کرنے پر مجبور تھا۔ وہ سارے وجود میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اسٹیشن کے عقب میں ایک دکان سے وہ چند چیزیں کھانے کی خرید کر لایا۔ کیک، ڈبل روٹی اور پیالوں میں چائے۔ جوان دونوں نے مل کر خالی پیٹ کی نذر کیے، ایسے میں پلیٹ فارم پر اور مسافر بھی جمع ہونے لگے۔ اور پھر اچانک شمو کی یہ دیکھ کر چیخ نکل گئی کہ اس کا ماموں فیض محمد اور اس کی ممانی عائشہ ٹکٹ گھر سے پلیٹ فارم کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیے، جو تنگن پور جا رہے تھے۔

''سکندر، وہ میرے ماموں آ گئے۔'' سکندر نے چونک کر پیچھے جھانکا تو اس کی روح بھی جیسے جسم سے پرواز کر گئی، تب تک شمو چادر سے چہرہ چھپائے پوٹلی بغل میں لیے پلیٹ فارم کے اونچے چبوترے سے مخالف سمت کود پڑی اور جیسے بھاگ پڑی۔ سکندر بھی اس کے تعاقب میں پلیٹ فارم سے کودا اور شمو سے ذرا فاصلے پر بھاگنے کے انداز میں سامنے ایک نئی تعمیر ہونے والی کوٹھی کی طرف بڑھا، پھر دونوں اس عمارت کی اوٹ میں آ ٹھہرے۔ دونوں کے سانس پھول رہے تھے اور آنکھیں خوف زدہ تھیں۔

''اب کیا ہوگا سکندر، اُس گاڑی پر سفر کرنا تو خطرناک ہوگا۔ اگر ماموں کی نظر ہم پر پڑ جاتی، تو یہاں ہی قیامت آ جاتی۔''

''اب ہم واپس جائیں گے۔'' سکندر نے اپنا فیصلہ سنا کر شمو کو چکرا دیا۔

''کیا؟ یہ نہیں ہو سکتا، میرے ابو اور میرے بھائی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ نہیں سکندر میں واپس نہیں جا سکتی۔ خدا کے واسطے مجھ پر ایسا ظلم نا کرو سکندر۔'' وہ ہاتھ باندھ کر سکندر کو واسطے ڈال رہی تھی، مگر سکندر کے قدم گلی میں آگے بڑھ چکے تھے۔ شمو بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''مجھے بتاؤ تو سہی سکندر اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''سنو شمو۔ اب ہم بستی دلاور جائیں گے جہاں تمہارا ننھیال ہے۔ تم اپنے ننھیال جا کر یہ بات کہو گی کہ رات میری منگنی ارشد سے طے پائی ہے جو مجھے منظور نہیں، اس لیے میں صبح اذان کے وقت گھر سے فرار ہو کر یہاں آ گئی۔''

''اس سے کیا ہوگا، تم کہاں جاؤ گے۔'' شمو چکرا کر پوچھتی ہے۔

''میرا اور تمہارا سنجوگ نہیں ہو سکتا۔ ہم پہلے ہی دو مخالف دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں، تیرے گھر والے کبھی بھی مجھے قبول نہیں کریں گے، اگر ہم اپنی من مانی کرتے ہوئے نکاح کر لیتے ہیں تو بھی عمر بھر کے لیے اس بستی میں میرے گھر والوں کا رہنا ناممکن ہو جائے گا اور دشمنی کی یہ آگ دو گھرانوں کو برباد کر دے گی۔ اس لیے خدا کے لیے شمو ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا ہوگا۔'' یہ سکندر کہہ رہا تھا۔

''تو تم مجھے چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ تم تو میرے بڑے چاہنے والے تھے، دن رات میری گلیوں میں گھوما کرتے تھے، مجھے پانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ میری محبت میں پاگل ہو رہے تھے، ہر حال میں مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے اور اب جو میں تمہاری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکی ہوں، تو مجھے راہ میں چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ بہت ظلم کر رہے ہو سکندر تم میرے ساتھ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے خود غرض اور بے وفا شخص نکلو گے۔ میں تمہارے عشق میں اندھی ہو کر گھر سے نکلی ہوں اور تم مجھے دھکا دے کر پرے پھینک رہے ہو۔ میں مجبور اور بے بس ہوں۔ عورت ذات ہوں، تمہارے اعتماد پر یہ قدم اُٹھایا اور تم میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو۔''

وہ احتجاج کر رہی تھی اور اس کا احتجاج سکندر کے ضمیر پر ہتھوڑے برسا رہا تھا اب جو آواز اس کے اندر سے اُٹھ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ اگر تم نے شمو کے ساتھ یہ سلوک کرنا تھا تو اسے پیغام بھیج کر ملنے کی خواہش ہی کیوں کی تھی۔ تم نے عمل کر کے اسے اپنا دیوانہ کیوں بنایا اور اب جب سب تمہاری خواہش کے مطابق ہو چلا ہے تو اب اس سے کنارہ کشی کیوں اختیار کر رہے ہو۔ شمو نردوش ہے، سب تمہارا کیا دھرا ہے، اب اس بیچاری کو کس آزمائش میں ڈال رہے ہو۔ تم مجرم ہو اس کے، وہ اپنے ضمیر کی آواز پر تلملا اُٹھا۔

"اُف خدایا اب میں کیا کروں۔ بے شک یہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔ صبح جب یہ گھر سے نکل کر آئی تھی۔ تو اس وقت اسے واپس گھر بھیج دینا چاہیے تھا۔ اب اسے گھر سے نکلے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں، اب یہ واپس جائے گی تو کیا کہے گی کہ میں زیور کپڑے اور نقدی لے کر کہاں گئی تھی۔ اتنی دیر کس کے ساتھ وقت گزارا اور اب واپس کیسے آ گئی، ان سوالوں کا وہ کیا جواب دے گی۔" اسے شمو کی حالت پر بہت ترس آنے لگا تھا۔ اس نے پلٹ کر شمو کا چہرہ دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ تب تک وہ شہر کی آبادی سے باہر کچی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ شمو اسے اپنی طرف متوجہ پا کر رحم طلب اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پلٹ کر اس کے شانے تھام کر اس نے اپنائیت کا اظہار کیا۔

"گھر سے نکل کر ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم ہی کہو ہم کیا کریں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" سکندر نے بے بسی ظاہر کی، شمو نے اس کا نرم لہجہ دیکھ کر وہی بات کہی کہ ہم واپس نا جائیں، ہم کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر نکاح کریں اور کچھ عرصہ باہر ہی گزاریں، پھر جو بھی صورت حال ہو گی دیکھا جائے گا۔" موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک اچھا فیصلہ تھا، مگر آگے چل کر اس کے نتائج کیا برآمد ہوں گے۔ سکندر کو یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ میری گمشدگی اور شمو کا فرار سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گا۔ تو میرے گھر والوں کے ساتھ شمو کے وارث کیا سلوک کریں گے۔ کچھ بھی کیس بنا کر میرے والدین اور بھائیوں کو جیل کچہری میں گھسیٹا جائے گا۔ نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے جرموں کی سزا میرے گھر والوں کو بھگتنا پڑے۔ سکندر سر جھٹکتے ہوئے خود سے الجھ رہا تھا۔ سوال بھی اس کے اندر سے ابھر رہے تھے خدشات بھی، مگر ان سوالوں کا جواب دینے اور فیصلہ کرنے والی قوت ابھی خاموش تھی۔ بس من کے کسی کونے کھدرے سے ایک مدہم سی آواز اُبھر رہی تھی۔

"سکندر تم بھٹک چکے ہو۔ سیدھی راہ پر آنے کے لیے تمہیں پھر سے راہ متعین کرنا پڑے گی۔" اس آواز پر اسے ندامت کا احساس ہونے لگتا۔ تو وہ فوری دوسری آواز پر متوجہ ہو گیا، جو اسے مزید بربادی کے رستے پر لے جانا چاہتی تھی اور یہ بات سچ ہے کہ عورت کے پاس سب سے بڑا ہتھیار اس کے آنسو ہیں، جس سے وہ اپنی ہر بات منوا سکتی ہے اور عورت کا عشق جواں مردوں سے پل بھر میں جواں مردی چھین لیتا ہے۔ سکندر کو اس وقت عورت کے آنسو بھی گھیر رہے تھے اور عورت کا عشق بھی اسے بہکا رہا تھا۔ وہ ایک اَن دیکھی صلیب پر لٹک رہا تھا۔ وہ واپسی گاؤں کا سفر بھی طے کر رہے تھے۔ اور اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی۔

سامنے درختوں کے جھنڈ میں کسی بزرگ کا مزار دکھائی دے رہا تھا۔ سکندر کی نگاہ ادھر اُٹھی۔ تو اس کی رفتار میں تیزی آ گئی، شمو بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ گھنے پیڑوں کے بیچ اونچے ٹیلے پر دربار سجا تھا۔ چند لوگ درختوں کے نیچے چارپائیاں ڈالے محو گفتگو تھے۔ دستی ہینڈ پمپ موجود تھا جہاں سے سکندر اور شمو وضو بنانے لگے اور درگاہ بابا حیدر پر حاضری دینے لگے، سکندر کو مزار سے وہی مہک آنے لگی، جیسی اسے اپنی بستی کے قبرستان والے بزرگ ظاہر پیر کی درگاہ سے آتی تھی۔ اس نے مرقد کو جھک کر بوسہ دیا، پھر سرہانے بیٹھ کچھ پڑھ کر نیاز پیش کی۔ شمو درگاہ کی چوکھٹ کے ساتھ لگ کر چپکے چپکے روتی بھی جا رہی تھی اور دعائیں بھی مانگتی جا رہی تھی، ایسے میں دو اور دیہاتی عورتیں وہاں آ کر حاضری دینے لگیں اور شمو سے پوچھا کہ تو کون ہے۔ بڑی دُکھی معلوم ہوتی ہے۔ شمو ان کو ہمدرد سمجھ کر اور زور سے رونے لگی۔ سکندر کو اس کی یہ بات کچھ ناگوار سی گزری، مگر وہ پلکیں موندے مراقبے میں بیٹھ رہا، مانوس سی خوشبو اس کے دماغ کو معطر کرنے لگی ہے اور اس کے اندر چھپی باقی قوتیں کہیں دم توڑ گئیں اور اب حق سے آشنا کروانے والی صدا اس کے اندر سے اُبھرنے لگی تھی جو اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

"گلابوں سے جھولی بھر کر کیچڑ میں اتر گئے ہو۔ صندل کی خوشبو کا تار کول کے دھوئیں سے سودا کر لیا۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ اللہ سے مدد مانگو، صرف مدد

مانگنے کا ارادہ کرو۔ زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ دعائیں سننے والی اور مرادیں دینے والی ذات تم سے دور نہیں رہتی، بلکہ تمھاری سانسوں سے بھی تمہارے قریب ہے، بس تم ادھر دھیان تو کرو۔ تم ایک ہاتھ ادھر بڑھاؤ گے تو وہ سات ہاتھ بڑھائے گا۔" سکندر کی روحانی قوت اسے اپنی جانب متوجہ کررہی تھی اور یہ صاحب مزار کی کرامت سے ممکن ہوتا ہے۔ جب کوئی ان درگاہوں درباروں مزاروں پر خلوص دل سے حاضری دیتا ہے تو اسے روحانی فیض سے نوازا جاتا ہے۔ اگر اسے محض ایک قبر سمجھ کر جاؤ گے تو کچھ حاصل نا ہوگا۔

سکندر ارادے کی زبان سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا تو اس کی بے قرار روح کو قرار آ گیا۔ دل جس اذیت سے دوچار تھا، لمحے بھر میں مطمئن سا ہو گیا ایک روحانی تسکین اس کے روم روم میں سما گئی۔ اس نے بشاش ہو کر پلکیں کھولیں تو شمو اسے اٹھ جانے کا اشارہ کررہی تھی۔ وہاں موجود دوسری دیہاتی عورتیں ذرا فاصلے پر کھڑی شمو کی طرف متوجہ تھیں، جیسے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی منتظر کھڑی ہوں۔ سکندر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر جیسے پوچھا، ہاں یہ کون ہیں؟ شمو نے کھڑے کھڑے ایک طرف کونے میں جا کر سکندر کو بتایا کہ یہ عورتیں ہماری قریبی بستی کی ہیں، میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ میں گھر سے فرار ہو کر آئی ہوں اور اب گھر جانا چاہتی ہوں۔ ہاں سکندر اس دربار پر آ کر میرے اندر کی کیفیت بدل کر رہ گئی ہے۔ بہت روئی ہوں میں، تو جیسے مجھے جیسے ہوش آ گیا ہے کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ بہت بڑی غلطی کی جو گھر سے بھاگ نکلی۔ مجھ پر کسی نے کچھ کر دیا تھا۔ اب اس کلام کا اثر اترا ہے تو مجھے تو اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا ہے۔ اب میں گھر جاؤں گی اور سب سے معافی مانگ لوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے معاف کردیں گے۔ میں تمہارا نام نہیں آنے دوں گی۔ اپنے سر الزام لوں گی، بس اب تم جاؤ۔ اس سے پہلے میں نے جو سلوک تمہارے ساتھ کیا، میں اس پر شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اب تم جاؤ وہ عورتیں تمہارا انتظار کررہی ہیں۔"

شمو نے مضبوط لہجے میں بات کی تو سکندر حیرت زدہ رہ گیا، پھر وہ ان عورتوں کے ساتھ اپنی بستی کی طرف چل دی اور سکندر اس مزار کے چبوترے پر کھڑا اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اسے نظر آتی رہی، پھر وہ کہیں چھپ گئی۔ سکندر ایک بار پھر دربار کے اندر پہنچا پھر سے اس بزرگ ہستی کے قدموں کا بوسہ لیا اور کونے میں مراقبہ اختیار کیا۔

ان عورتوں نے شمو کی زبانی ساری صورت حال جان کر اس سے وعدہ کیا کہ ہم تیرے گھر والوں کو مطمئن کریں گی، تم بے فکر رہو، سکندر کا کہیں نام نہیں آئے گا اور پھر وہی ہوا کہ ان عورتوں کی زبانی یہ بات جان کر کہ میں ارشد سے شادی پر خوش نہیں ہوں میں سکندر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ جب آپ لوگوں نے رات میری منگنی کر دی تو میں نے سکندر کی طرف پیغام بھیجا کہ تم کل درگاہ باب حیدر پر آ جانا میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ میرا اس کے ساتھ کوئی معاشقہ نہیں چل رہا تھا اور نہ ہی میں اس سے کبھی ملی تھی، بس ایک رات خواب میں ملی تھی اور اسی وجہ سے میں اس کو اپنانا چاہتی تھی، مگر جب میں وہاں پہنچی تو کچھ دیر بعد سکندر بھی وہاں آ گیا۔ میں نے اسے مجبور کیا کہ تم مجھے لے چلو، ہم عدالت میں نکاح کرلیں گے۔ میرے پاس زیور اور روپے بھی ہیں، مگر وہ نہ مانا کہ بی بی میں یہ رسوا کن قدم نہیں اٹھا سکتا۔ آپ نے مجھے سب کے سامنے رسوا کیا اور اب خود ہی اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔ خدا کے واسطے آپ واپس چلی جائیں اور ماں باپ کی عزت برباد نہ کریں۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر انکاری رہا اور فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اب میں پریشان تھی کہ میں کہاں جاؤں، پھر یہ دونوں وہاں دربار پر آ گئیں اور مجھے دلاسا دے کر یہاں چھوڑنے آ گئیں۔ اگر یہ نہ ملتیں تو میں خودکشی کر لیتی۔"

شمو نے سب برملا کہہ دیا۔ سب اس کی جان کے دشمن بن رہے تھے کہ ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سارے زمانے میں ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ہم نے صبح سے ہر جگہ تمہاری اور سکندر کی تلاش کی ہے، وہ بھی صبح سے غائب ہے اور ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔ تم گھر سے نکلیں تو نکلیں کیسے؟"

بڑی مشکل سے اس کے بھائیوں کو ٹھنڈا کیا گیا۔

شمو کی اس حرکت نے اس کے منگیتر ارشد کو اتنی ذہنی کوفت دی کہ اس نے یہ منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ میں شمو سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ ساری بستی میں شمو کے فرار ہونے اور واپس لوٹ آنے کا قصہ زبان زد عام رہا۔ سکندر کو بھی بستی بھر کے لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بمشکل اس نے اپنے گھر والوں کو پھر سے اپنے اعتماد میں لیا۔

☆......☆

اس کی روح بے چین تھی۔ وہ ہر رات قبرستان جاتا، مگر اب اسے وہ روحانی بزرگ کا سایا دکھائی نا پڑتا۔ وہ بابا ظاہر پیر کی درگاہ پر حاضری دیتا۔ کتنی دیر مراقبے میں آنکھیں موندے درگاہ کے اندر موجود رہتا، مگر اس کا اپنے اندر سے جو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ رسے بحال نہ ہو پا رہا تھا اور یہی بات اس کے دل کا قرار چھین رہی تھی۔ شمو کی محبت اس کے دل سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس کے تصور میں بسی ہوئی شمو کی یاد سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ ادھر شمو بھی جب پورا دن سکندر کی رفاقت میں گزار کر گھر پلٹ آئی تھی۔ تب سے سکندر کی ہی ہو کر رہ گئی تھی، مگر زمانے میں جو اس کی رسوائی ہوئی تھی اور گھر میں جو ناروا سلوک اس کے ساتھ برتا جا رہا تھا، وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ والدین اور اس کے بہن بھائی سبھی اس سے بات کرنا بھی گوارہ نا کرتے، سب نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور طنز بھری گفتگو سے اس کی دل آزاری کرتے۔

ارشد سے شادی کی ضد نے دونوں گھرانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔ گھر کی فضا بوجھل ہو کر رہ گئی تھی۔ شمو سکندر کی یاد میں کھوئی رہتی۔ اس نے کئی بار پیغام بھیجے کہ سکندر کسی طرح مجھ سے ملو، میں بہت پریشان ہوں، مگر سکندر جو پہلے ہی اس کی وجہ سے زمانے بھر میں رسوا ہو چکا تھا، اس سے ملنے سے انکاری رہا۔ اس کے اندر کی بےچینیاں بڑھتی چلی گئیں اور پھر ایک دن وہ راہ حق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

☆......☆

دور دراز کا سفر طے کر کے حضرت علامہ اقبال کے پیر و مرشد حضرت سخی عبداللہ قلندر قادری کے دربار پر پہنچا اور حضرت نبی احمد ناز کے قدموں میں دوزانو جا گرا۔ قلندر کی نگاہ نے جھانک لیا کہ راہ حق کا مسافر ہے، زخم عشق کی ٹیسیں کھا کر آیا ہے۔ بڑی شفقت سے پاس بٹھایا۔ سکندر کا دل موم ہو رہا تھا اور بے اختیار اشک بہے جا رہے تھے۔ قلندر پاک نے دلاسا دے کر ساری بپتا سنی پھر، اسے دربار پر حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس نے عصر مغرب عشاء کی نمازیں مسجد میں ہی ادا کیں۔ دربار میں کتنی دیر پڑا گڑگڑاتا رہا۔ عشاء کے بعد چند مریدین کے ساتھ محفل قلندر میں سر کو جھکائے بیٹھا رہا۔ آپ اپنے مریدین سے بالعموم اور سکندر سے بالخصوص فرما رہے تھے۔

جس کا مرشد نہ ہو اس کا مرشد شیطان ہوتا ہے اور وہ کبھی قربِ الٰہی نہیں پا سکتا۔ اسم اللہ ذات کے در سے طالب مولا ایک ہی جست میں لاہوت لا مکاں تک رسائی پا جاتا ہے اور دیدارِ الٰہی سے مشرف دائمی اور حضوریٔ محمدی ﷺ سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اسمِ ذات مومنوں کا ایسا دوست ہے جو انہیں بشریت کے اندھیروں سے نکال کر انوارِ الٰہی سے روشناس کرواتا ہے۔

چھاچھ کے برتن میں دودھ ڈالنے سے پہلے برتن کو اچھی طرح صاف نا کیا جائے تو دودھ اس میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ انسان کا من بھی برتن جیسا ہوتا ہے۔ اگر اس میں نفسانی خواہشات بغض، تکبر، ہوس پرستی، لالچ، کینہ اور ریاکاری کا میل کچیل بھرا ہو تو اس میں اسمِ ذات کی شناسائی کا نور نہیں بھر کایا جا سکتا۔ جب تک آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بندہ اپنی طرف انگلی کا اشارہ کر کے یہ کہتا ہے کہ یہ "میں" ہوں، جب تک اس کا آئینے میں جھانکتا عکس بھی اپنی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کہے گا کہ یہ تم نہیں ہو، یہ تو میں ہوں اور جب تم اپنے عکس کی طرف انگلی کر کے کہو گے کہ میں کچھ بھی نہیں سب کچھ تم ہو، تب وہ بھی آپ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہہ دے گا کہ نہیں سب کچھ تم ہو۔ جہاں تم اپنی نفی کرو گے وہاں وہ تم کو اپنا ملے گا۔ جب تک تم خود کو سب کچھ سمجھتے رہو گے، تب تک محروم و نامراد رہو گے۔

راز در موز کی برکھا برس رہی تھی، جو سکندر کے دل و دماغ کی بنجر زمین میں جذب ہوتے چلی جاتی تھی۔

آلائشوں سے بھرا اس کا من کھرچ کر صاف ہو رہا تھا، پھر جب شب کے آخری پہر میں اس نے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر لا اللہ الہٰ اللہ کی دل پر ضربیں لگائیں، اللہ ھو کی پکار کو اپنے بدن کی پور پور سے پہچانا، تو اس کی کیفیت وجدانی ہونے لگی۔ وہ سب کچھ بھول بیٹھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے، یہاں کب تک رہے گا۔ والدین، بہن بھائی، بلکہ شمو کی یاد بھی اللہ ھو کی باز گشت میں کہیں دم توڑ گئی۔

تین راتیں گزر گئیں، دربار، مسجد اور حجرۂ مرشد میں اس کے شب و روز گزر رہے تھے۔ قلندر کا فیض اس پر دن رات برس رہا تھا، پھر وہ ایک یادگار لمحہ بھی آیا، جو سکندر کو مقدر کا سکندر بنا رہا تھا۔

مرشد نے شب کے پچھلے پہر اسے اپنے حجرے میں طلب کیا اور اسے اپنی بیعت میں دے کر محمد ﷺ کی غلامی میں داخل کر دیا۔ سکندر کا چہرہ اشکوں سے لبریز تھا اور یہ اشک عقیدت سے اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ اس کی نگاہیں مرشد کے نورانی چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور پورے وجود میں اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس کے من کی اجاڑ زمین کو ہر آلائش سے پاک کرتے ہوئے اس میں حق آشنائی کا بیج بو دیا گیا تھا۔ اب یہ اس پر منحصر کرتا تھا کہ وہ کتنی تیزی سے اس بیج سے پھوٹنے والی کونپل کو پنپنے میں محنت کر سکتا تھا۔ اسے کسی مشکل وظیفے یا چلے میں نہیں ڈالا گیا تھا، بس چند باتوں پر عمل کیے جانے کی تاکید کی گئی تھی۔ نماز شریف کی اولین شرط ہے۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ جس نے مسلمان ہو کو ساری زندگی عبادت و ریاضت میں بسر کر دی اور حق سے آشنا نا ہوا، وہ فاسق ہوا اور جس نے شریعت کو چھوڑ کر حق آشنائی کی راہ پکڑی، وہ کافر ہوا۔ شریعت اور طریقت کو ایک ساتھ لے کر چلنے والا مومن کہلاتا ہے، قرآن پاک کو سمجھ کے ساتھ پڑھنا شریعت ہے۔ دعا پڑھنا اور بات ہے دعا مانگنا اور بات ہے، شریعت کے بھی پانچ ارکان ہیں، کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکواۃ، طریقت کے بھی یہی پانچ ارکان ہیں، بس ادائیگی میں فرق ہے۔ سکندر کو نماز کی پابندی، نگاہ اور زبان کی حفاظت کرنا روزے کی طرح توحید میں ارض و سماں کو غیرت کی نگاہ سے نا دیکھنے کا سبق ملا۔ کائنات کی ہر چیز اپنا ایک وجود بھی رکھتی ہے۔ ایک رنگ بھی رکھتی ہے اور اپنی شناخت کے لیے اپنا ایک نام بھی رکھتی ہے۔ ہر چیز کا اپنا ایک نام ہے اور ہر چیز کی اپنی ایک صفت ہے، کانٹے کی صفت چبھنا ہے۔ بچھو کی صفت کا نام ڈنک مارنا ہے اور چاقو چھری کی کاٹنا، جبکہ خوشبو دینا پھول کی فطرت اور صفت ہے۔

☆......☆

سکندر کے شب و روز مرشد کی صحبت میں بسر ہو رہے تھے۔ اسے گھر جانے کی اجازت تو مل چکی تھی، مگر مرشد سے دوری کا تصوّر ہی سکندر کی جان لے رہا تھا۔ وہ اپنے سیدی کے قدموں سے دُور جانے کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہتا تھا، اس کی روح تسکین پا چکی تھی اور اس کا نفس مطمئنہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے تین ماہ کا عرصہ گزر گیا، تب حکم ہوا کہ اپنے گھر جاؤ، حقوق اللہ سے حقوق العباد کو بھی نبھانے کی ذمے داری پوری کرو۔ اپنا ظاہر دنیا میں شامل رکھو، مگر اپنا باطن خیالِ یار کے لیے وقف کر دو۔

مرشد سے دوری اسے قبول نا ہو رہی تھی، مگر اطاعت بندگی کا تقاضا تھا کہ مرشد کے حکم کی تعمیل میں انکار کا لفظ تک نا آئے، پھر بھی وہ تین بار گلی میں جا کر لوٹ آتا، پھر رخصت لے کر جاتا پھر لوٹ آتا، جب تیسری بار ایسا ہوا تو پوچھا گیا۔

”کیا بات ہے سکندر۔ تم پھر لوٹ آتے ہو؟“

”جی حضور! جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

”تم اپنے دل کی خواہش چھوڑ دو۔ دل ایک دن خود بخود تمہاری ماننے لگے گا۔“ ارشاد سنا تو ہاتھ باندھ کر دروازے تک الٹے قدموں گیا اور پھر گلی میں آگے بڑھتے ہوئے دربار کے اونچے گنبد کو بھی دیکھتا گیا، آنسو بھی بہاتا گیا اور پھر پُرنم چہرہ لیے گھر کی طرف چل دیا۔

☆......☆

شام گئے اپنی بستی پہنچا تو پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔ باریش نورانی چہرہ، سر پہ دستار، جھکی گردن، بزم گفتار، نگاہوں میں حیا اور باتوں میں خوشبو، ماں باپ بھی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تین ماہ کی پُر اسرار گمشدگی نے گھر والوں کا چین چاہ کیے رکھا تھا۔ ماں کے قدموں کو چوما،

کیوں کہ وہ یہ راز بھی جان چکا تھا کہ جو ماں کے قدم چومتے ہیں تو لوگ ان کے ہاتھ چومتے ہیں۔ اماں نے اس ناحق جدائی کا سبب پوچھا...... تو کہہ دیا، کہ ماں جی میں نے اس راہ کو پالیا ہے، جو زندگی اور موت دینے والے کی پہچان کا باعث بنتا ہے، حق شناسائی عطا کرتا ہے۔ زندگی کا مفہوم بتاتا ہے۔ تعلیم زندگی گزارنے کا فن سکھاتی ہے، زندگی کی حقیقت نہیں بتاتی اور علم زندگی کی حقیقت آشکار کرتا ہے، جس سے زندگی اطمینان سے گزاری جاسکتی ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں آپ لوگوں سے دُور نہیں ہوں، بس آپ میرے لیے دُعا کرتے رہا کریں کہ میں ہدایت پانے والوں کی صف میں شمار ہونے لگوں۔ مجھے اپنی ذمے داریوں کا بھی احساس ہے کہ بڑا ہونے کے ناتے باپ کے کندھوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لوں۔ بہن بھائیوں کے گھر آباد کروں اور روزمرہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے باپ کی جگہ نمبرداروں کی زمینوں پر کام کروں۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ بہتر ہوجائے گا۔"

ماں اور باپ بیٹے کی بات پر خوش ہوگئے اور دعاؤں سے نوازنے لگے، پھر اسے بتایا گیا کہ شمو تمہارے عشق میں دیوانگی کی حالت کو پہنچ چکی ہے۔ تمہاری گمشدگی نے اسے بیمار کردیا ہے۔ بین کرکے روتی ہے اور ننگے پاؤں گلی میں آجاتی ہے۔ اس کے بھائیوں نے اسے اتنا زدوکوب کیا کہ اس کی کلائی توڑ دی، ٹانگیں زخمی کردیں، چہرے پر تھپڑوں کے نشان پڑگئے، مگر وہ کہتی ہے، مجھے جان سے تو تم ختم کرسکتے ہو، مگر میرے دل سے سکندر کی محبت نہیں نکال سکتے اور نا ہی سکندر کے بغیر مجھے کوئی اپنا سکتا ہے۔ بس وہی میری تقدیر کا مالک ہے، وہ لوٹ آئے گا۔ مجھے اس کا انتظار ہے، وہ ضرور آئے گا۔

سکندر کے گھر والے اس وجہ سے بھی پریشان تھے کہ سکندر لوٹ آیا تو شمو کے بھائی اسے جان سے ماردیں گے اور ہوسکتا ہے وہ اسے ختم کرچکے ہیں، جو وہ پُراسرار طور پر غائب ہے۔ شمو نے بھی اپنے بھائیوں سے کہہ رکھا ہے کہ اگر سکندر واپس نا آیا تو وہ ان پر سکندر کے قتل کا کیس کرے گی۔ اس کے بھائی بھی پریشان تھے۔ بستی کے لوگ بھی انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ جب سکندر لوٹ آیا تو شمو کے گھر والوں کو بھی اطمینان ملا، مگر وہ اس کے آنے سے پریشان بھی تھے کہ اب نا جانے شمو کیا فیصلہ کرتی ہے۔ سکندر تو آچکا، مگر سکندر تو اب وہ نوجوان لڑکا رہا ہی نہیں تھا۔ تین ماہ میں ہی اس کی چال ڈھال، گفتگو اور انداز زندگی ہی بدل چکا تھا۔ وہ پورے کا پورا مذہبی رنگ میں ڈھل گیا تھا۔ بستی بھر کے لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ یہ تو وہ سکندر رہی نہیں ہے۔ کوئی درویش چلا آیا ہے سکندر کے روپ میں۔ مسجد میں پانچ وقت کی باجماعت نماز، سحری کو اٹھ کر ذکر واذکار میں مشغول ہوجاتا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے میں مگن رہتا، کم کھاتا، کم سوتا اور کم بولنا اس کا طرز زندگی بن چکا تھا۔

شمو کو سکندر کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ ملنے کو بے تاب ہوگئی، مگر اس کے بھائیوں نے صاف کہہ دیا کہ اب اگر تو نے سکندر سے ملنے کی کوشش کی یا اس کا ذکر بھی گھر میں کیا تو ہم تیرا ویسے ہی قصہ پاک کردیں گے، مگر وہ کیا جانتے تھے کہ عشق کا تو مقدر ہی آگ کے دریا عبور کرنا ہے۔ رسموں، رواجوں کی دیواروں کو پھلانگنا اور دیدار یار میں گردن کٹا دینا ہے۔ شمو نے کئی بار سکندر کو پیغام بھیجے کہ مجھے ایک بار ضرور ملو، مگر سکندر نے ہر بار اس کی خواہش کو نظر انداز کیے رکھا۔ شمو کا نام ایک یاد کے طور پر اس کے شعور میں ضرور موجود تھا، مگر اس یاد میں جنوں کا جذبہ سرد پڑا ہوا تھا، جبکہ شمو کے من میں چنگاری دہک رہی تھی جو پل پل اسے سلگا رہی تھی۔ وہ تپش عشق میں جل رہی تھی، مگر سماج اس کی راہ میں حائل تھا اور اس کا صنم پتھر کا بُت بن کر رہ گیا تھا جو کسی بات کا جواب بھی نا دے رہا تھا۔ کل تک وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لیے اس کی گلیوں میں چکر لگاتا رہتا تھا اور شمو اس سے دور بھاگتی تھی۔ اب وہ اس کی طرف بڑھ رہی ہے تو اب سکندر نے اسے کمر دکھادی ہے۔ عشق مجازی کو عشق حقیقی سے شکوہ کیا ہے، بس یہی کہ تو میرے صنم کو جب اپنا بنالیتا ہے تو وہ مجھے فراموش کردیتا ہے، حالاں کہ اسے تم سے ملانے والا میں عشق مجازی ہی تو ہوں۔ عشق کا پہلا زینہ جسے طے کرنے والے لاکھوں عاشق مجاز کی حرمت کو پامال کرکے نیچے گر جاتے ہیں، کچھ اس زینے کو منزل سمجھ کر زندگی یہاں ہی گزار دیتے

ہیں اور چند خوش نصیب مجاز کا زینہ تیزی سے پھلانگ کر حقیقی راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے مقدر پر ناز کرتے ہیں، کیوں کہ وہ حق آشنائی کی منزل کو پا لیتے ہیں۔

☆......☆

اس روز شمو نے طے کر رکھا تھا کہ کل ہر صورت میں سکندر سے ملوں گی۔ ملاقات نا ہو سکی تو اس کی صورت ضرور دیکھوں گی۔ رات بھر وہ منصوبے بناتی رہی اور ادھر سکندر اپنے صنم کی یاد میں بے قرار ہو کر طے کر چکا تھا کہ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے دربار پر حاضری کے لیے بٹالہ شریف روانہ ہو جاؤں گا اور پھر صبح مؤذن کی اذان پر سکندر نے رختِ سفر باندھا اور سوئے منزل رواں ہوا اور ادھر شمو اپنے منصوبے کے مطابق مؤذن کی آواز اللہ اکبر سنتے ہی اپنے کوٹھے کی چھت پر گئی۔ پڑوس میں اس کی عزیز ترین دوست دیبا رہتی تھی۔ وہ اپنی چھت سے ان کی چھت سے ہو کر ان کے آنگن میں جا اتری اور اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر کے بڑی سی چادر اوڑھے گلی میں اتر کر سکندر کے گھر ہو لی۔ اب ایک طرف مجاز اپنے صنم کے وصال کی طلب لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے گلی میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف عشق حقیقی کی آگ دل میں روشن کیے اپنے محبوب مرشد سے ملنے کے لیے سکندر گھر سے برآمد ہو رہا تھا۔ اچانک دونوں روبرو آ گئے۔ وہ دیوانہ وار سکندر کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"سکندر خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دو، کہ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو۔ میں تمہارے بن نہیں جی سکتی یا تو مجھے اپنا لو یا پھر آج میرا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے نجات حاصل کر لو۔" وہ چلانے کے انداز میں اس سے فریاد کر رہی تھی۔

"شمو! خدا کے لیے مجھے اور رُسوا نا کرو۔ جہاں تمہارے ماں باپ چاہتے ہیں وہاں اپنا گھر بسا لو۔ میں تو اپنا آپ بھی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔ آج پھر اپنی تلاش میں جا رہا ہوں، جانے کب لوٹ کر آؤں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ مجھے چھوڑ کے نا جاؤ سکندر، نا جاؤ، میں مر جاؤں گی۔"

وہ سکندر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ آتش عشق دونوں جانب شعلوں میں بدل رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی طلب میں اندھے ہو رہے تھے، بالآخر شمو کا اصرار حد سے بڑھا تو اس نے قسم کھالی کہ میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے، خواہ سارا زمانہ میری راہ میں آ جائے، میں اس سے ٹکرا جاؤں گی نا مجھے کسی رسوائی کا ڈر ہے اور نا موت کا خوف۔"

سکندر کی راہ میں حائل ہو جانے والی شمو دیوانگی کی حالت کو پہنچ رہی تھی۔ کسی لمحے، کسی کی بھی گلی میں آمد ہو سکتی تھی اور اس کے بھیانک نتائج نکل سکتے تھے۔ دونوں پر اپنا اپنا عشق غالب تھا۔ ایک باطل قوت کی کوشش تھی کہ دونوں رسوا ہوں۔ دوسری طرف حق تعالیٰ کی غیبی قوت کام کر رہی تھی، جو غالب آئی، کیوں کہ اس لمحے سکندر نے اپنے مرشد کو تصور میں لا کر اپنے اللہ سے مدد مانگی تھی۔ کچھ پتا ہی نا چلا، سکندر کسی چھلاوے کی طرح شمو کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ حیرت سے چکرا کر رہ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلی میں چار سُو دیکھتی رہ گئی۔ سکندر کا دور دور تک نشان نظر نا آ رہا تھا۔ حسرت و یاس اور ہجر و فراق کا مجسمہ بنی شمو بوجھل قدموں سے واپس گھر لوٹ رہی تھی۔

☆......☆

سکندر مرشد کے قدموں میں جا کر گرا تو ارشاد ہوا کہ باطل قوتیں ہمیشہ حق کی راہ میں رخنہ انداز ہوتی رہی ہیں۔ یہ جنگ حق و باطل کی ہے اور فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے، کیوں کہ باطل تو ہے ہی مٹ جانے والا...... آج تمہیں بھی اس جنگ سے ہمکنار ہونا پڑا ہے نا۔ باطل نے عورت کا روپ دھار کر تمہارے ارادے کو متزلزل کرنے کی کوشش کی، مگر تمہارے عشق کی لگن اس پر غالب آ گئی اور تم صاف نکل گئے۔ مرشد نے فرمایا تو سکندر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ تو پہلے سے ہی حیران رہ گیا تھا کہ جب شمو اسے گھیر کر کھڑی تھی اور وہ اس کی گرفت سے نکل نہیں پا رہا تھا کہ اچانک ہی وہ اپنی گلی سے شہر کی گلی میں آگے بڑھ رہا تھا اور پھر ذرا دیر بعد بس میں سوار ہو کر محوِ سفر ہو گیا تھا۔ یہ آناً فاناً سب کیسے ہو گیا تھا اور اب اسے بتایا جا رہا تھا کہ آج تم کس مشکل سے نکل کر آئے ہو۔ وہ اپنے حق تعالیٰ کے اسم اور نگاہوں کے سامنے

مسمی کا یہ چشم دید واقعہ جو کسی کرامت سے کم نا تھا، دیکھ کر اپنے سیدی پر قربان ہوا جارہا تھا۔ چہرہ اشکوں سے تر تھا اور سارے بدن میں کپکپی لرزاں تھی، سر پر مرشد کا دست شفقت سایہ فگن تھا۔

''تم کامیاب رہے سکندر! خود کو سنبھالو اور اپنے آقا کے حضور سجدہ کرو جس نے تمہیں سنبھالا دیا۔ بے شک جو اس مالک کی طرف ایک قدم اٹھاتا ہے وہ ذات اس کی طرف ستر قدم بڑھا دیتی ہے۔ جس نے راہ حق پر قدم جمالیا، پھر اسے آگے بڑھنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اب تم راہ سلوک کے ایک سالک ہو۔ بس تم سب سے بیگانے ہو جاؤ، پھر تم حق سے یگانہ ہو جاؤ گے۔''

اور سکندر سب سے بیگانہ ہو کر دربار کی چوکھٹ پر پڑا رہا۔ صبح و شام مرشد کی صحبت اس کے من کو منور کرتی رہی۔ وہ پل پل نور کی تجلیوں سے فیض یاب ہوتا رہا۔ چالیس راتوں کا سفر طے پا گیا۔ نا کھانے کا ہوش نا پینے کی طلب نا آس پاس کی خبر، بس چہرۂ محبوب کو تکتے رہنے میں شب و روز بیت گئے۔ مرشد کچھ مریدین کے اصرار پر پندرہ دن کے لیے کراچی جارہے تھے۔ سکندر کو اجازت دی گئی کہ گھر چلے جاؤ اور جیسے بھی حالات ہوں، ان سے فرار حاصل نہیں کرنا۔ سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے قبول کرنا ہے۔ ہر بات میں اس ذات کی حکمت مخفی ہوئی ہے، جس کو ہم انسان سمجھ نہیں پاتے۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہو اور تب تک ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک ہم اللہ کی ذات کو دل سے نا مان لیں۔ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن پر اپنی اچھی اور بُری تقدیر پر اور مرنے کے بعد زندہ کیا جانے پر یقین نا کریں۔ مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ حکم الٰہی کو مان لیتا ہے اور اسی مالک کی رضا پر شاکر رہتا ہے۔

☆......☆

علم و حکمت کے یہ نایاب گوہر سمیٹ کر سکندر نے واپسی کا سفر باندھا۔ دیار جو اس کا صنم کدہ بھی تھا، سے رخصتی کے وقت اس کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ دربار سے گلی تک ننگے پاؤں الٹے قدموں ہاتھ باندھے سر جھکائے، پرنم چہرہ لیے پہنچا۔ حسرت سے الوداعی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ تو ایک شاہین دربار کا طواف کرتے ہوئے کسی دور افق کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ وہ اسے اس وقت تک جھانکتا رہا۔ جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ بستی شام لاٹ کی مسجد میں مغرب کی اذان ہونے جارہی تھی۔ سکندر علی کے بڑھتے قدم لمحہ بہ لمحہ بستی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ حمید اللہ سکندر کا ماموں زاد بھائی سب سے پہلے اسے گلی کے آغاز پر ہی مل گیا۔ سکندر کو اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔

آؤ سکندر بھائی، کہاں چلے گئے تھے یار، پُراسرار طور پر غائب ہو جاتے ہو۔ سب گھر والوں کو پریشان کر دیتے ہو اور جانتے ہو، تمہاری محبت میں شمو پاگل ہو چکی ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہے۔ اس کے بھائیوں نے اسے مارا پیٹا بھی بہت ہے۔ دماغ میں ڈنڈے کی چوٹ لگی اور وہ حواس کھو بیٹھی۔ وہ گلیوں بازاروں میں نکل بھاگتی۔ اسے زنجیروں سے گھر باندھا گیا اور آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ صبح مردہ حالت میں پائی گئی۔ لگتا ہے اسے بھائیوں نے ہی مار ڈالا ہے، کیوں کہ وہ پاگل ہو کر بھی سکندر کا نام نہیں بھولی تھی۔'' حمید اللہ بتا رہا تھا اور سکندر ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔

پھر سکندر کے قدم گھر جانے کی بجائے قبرستان کی طرف اٹھنے لگے۔ حمید بھی اس کے تعاقب میں تھا، پھر حمید اللہ ہی سب کو بتا رہا تھا کہ سکندر نے قبرستان پہنچ کر دربار ظاہر پیر پر حاضری دی۔ مجھ سے صرف شمو کی قبر کا پوچھا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ دربار کے انتہائی قریب تازہ قبر شمو ہی کی ہے۔ دربار سے نکل کر وہ سیدھا شمو کی قبر پر آیا۔ جھک کر اس کی ڈھیری کا بوسہ لیا اور پھر ایک ہی بات کی تکرار کرتا ہوا قبرستان سے باہر بھاگ پڑا۔

''تیرے عشق کو سلام شمو تیری عقیدت تیری محبت کو سلام۔ تُو ہوش و حواس کھو کر بھی سکندر کو نا بھلا سکی اور میں ہوش و حواس میں رہ کر بھی اس کو بھلا بیٹھا جو سکندر بھی ہے، شمو بھی ہے، عشق بھی ہے اور معراج عشق بھی۔''

اس کے بعد سکندر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

☆......☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات توکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

□ ن۔ش۔ٹیکسلا

o محترم بابا جی! اُمید ہے کہ آپ ضرور میرے مسئلے کا کوئی حل نکالیں گے۔ عمر 43 سال ہے۔ آج سے 10 سال پہلے میں نے اپنی 2 فرینڈز کے ساتھ اسکول میں پارٹنر شپ کرلی۔ وہ دونوں بی۔اے، بی۔ایڈ اور میں پرائمری تک پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم پیسا لگاؤ محنت ہم دونوں کریں گی اور منافع تینوں میں تقسیم ہو جائے گا، لہٰذا میں نے اپنی تمام جمع پونجی لگادی اور کچھ پیسے گھر والوں سے بھی لے لیے۔ اس کے باوجود اسکول کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے، جبکہ آمدنی کوئی نہیں تھی۔ جب بھی فرینڈز سے بات کرتی، یہی جواب ملتا کہ پہلے سال چھٹی، دوسرے ہٹی، تیسرے سال کھٹی۔ ابھی پیسا لگاؤ پھر کچھ ملے گا۔ پیسے کو پیسا کماتا ہے اور اس کام میں تو پیسا ہی پیسا ہے۔ میں ان کی باتوں میں آتی چلی گئی اور سود پر قرض لے لیا۔ ایک سال تک قسط ادا نہ کرسکی اور میرے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ تو بُری طرح پھنس چکی ہے۔ اسکول کا سامان سیل کر کے رقم بانٹ لی کہ ہم دونوں نے محنت کی ہے، لہٰذا یہ ہمارا حق ہے۔ تم جانو تمہارا قرض، 15 لاکھ روپے اسکول پر خرچ کردیے، 7 لاکھ روپے سود کا قرض چڑھ گیا۔ میری بیوقوفی کہ میں نے ان پر اندھا اعتماد کیا۔ میرے پاس کوئی ثبوت، کوئی گواہ نہیں۔ جب بھی میں نے ان سے کہا کہ معاہدہ کرلیتے ہیں۔ جواب ملا کہ کرلیں گے اتنی جلدی کیا ہے۔ والدین بیمار ہیں، وہ میری مدد نہیں کرسکتے۔ بھائی ہے تو وہ قتل کرنے پر تلا ہوا ہے، گھر بدر ہو چکی ہوں۔ رشتے دار اور ملنے جلنے والے دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگ نہ لے۔ 3 گھروں میں کام کرتی ہوں۔ 6000 روپے ملتے ہیں جو سود کی آدھی قسط کٹ جاتی ہے۔ ساری زندگی لگی رہوں تو یہ قرض ادا نہیں کرسکتی۔ بہت سارے عاملوں کے پاس گئی ہوں جنہوں نے مجھے برباد کردیا لیکن کام نہیں کیا۔ زندگی سے تنگ آچکی ہوں، آپ سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ مجھے یا تو قرض سے نجات دے یا پھر موت یا مجھے ہی اتنی ہمت دے کہ میں گلے میں پھندا ڈال لوں یا پھر غیب سے میری مدد کردے اور اس ذلت اور بدنامی والی زندگی سے نجات دے۔ میں اب تھک چکی ہوں۔ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں اور بہت ساری بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونیا و آخرت کی بھلائیاں عطا فرمائے۔ (آمین) آپ کو پڑھنے میں مشکل پیش آئے گی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

☆ بیٹی تم نے بھروسا کیا اور دوستوں نے اس بھروسے کو توڑ دیا۔ اسی لیے حکم ہے کہ ہر معاملے میں تحریری ثبوت رکھنا چاہیے اور خاص کر جہاں معاملہ پیسے کا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اتنی سمجھ دار ہو کہ حرام موت کے بارے میں سوچو گی بھی نہیں۔ بے شک یہ مشکل وقت ہے، مگر یقین رکھو گزر جائے گا۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے، نماز کی پابندی رکھو اور سورۂ توبہ کی آخری آیت بکثرت پڑھو۔ اللہ غیب سے مدد فرمائے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ راحت۔سرگودھا

o میرا نام راحت ہے۔ میں سرگودھا میں رہتی ہوں۔ میری امی کا نام غلام عائشہ ہے، میں ایک دُکھی لڑکی ہوں۔ میں بچپن میں نفسیاتی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پانچ جماعتوں کے آگے نہ پڑھ سکی، لیکن بفضلِ خدا اب ٹھیک ہوں۔ میری عمر اب 18 سال ہے۔ 15 سال کی عمر میں میرا نکاح ہوا جو ایک سال بعد ختم ہوگیا۔ میرے بھائی لوگوں نے ان کو گالیاں دے کر دباؤ ڈال کر طلاق لے لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بھائی کہتے تھے کہ ابھی شادی نہیں ہوئی صرف نکاح ہے، وہ کیوں ہمارے گھر آتا ہے۔ وہ پیار کرتا تھا، جان دیتا تھا مجھ پر اور میں بھی پیار کرتی تھی، ہوں اور رہوں گی۔ اس لڑکے کا نام اکرم ہے۔ اس کی امی کا نام مہتاب ہے۔ میری ابھی بھی بات ہوتی ہے اکرم سے۔ میں سچی محبت کرتی ہوں اس لڑکے کے بعد بھی میری شادی ہوئی، وہاں سے بھی طلاق ہوگئی، وہ شراب پیتا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں اکرم کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں، لیکن اس کی ایک جگہ منگنی ہوگئی ہے۔ وہ توڑ بھی سکتا ہے لیکن اس کے ابو وہاں شادی چاہتے ہیں۔ وہ ابو کی وجہ سے نہیں توڑ رہا اور میں اس کی محبت میں پاگل ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ

سکتی۔ میری جہاں بھی شادی ہو، میں وہاں دل نہیں لگا سکتی۔ پلیز کوئی ایسا تعویز دیں کہ میری اس لڑکے سے شادی ہو جائے۔ پلیز پلیز پلیز میرے جذبات کو سمجھیں۔ آپ کے نزدیک شاید میری بے وقوفی ہو، لیکن میں ان انسانوں میں نہیں جو ٹائم پاس ہوتے ہیں۔ میری زندگی میں ایک تھا، ایک ہے اور یہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کا واسطہ مجھ پر رحم کریں۔ ایسا نہ ہو اس کی شادی ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو کب کی کر چکی ہوتی، کیوں کہ جسے میرے پیار کو میرے گھر والوں نے دور کیا، حالاں کہ وہ شوہر بھی تھا میرا، وہ میں جانتی ہوں یا خدا جانتا ہے کہ میں روز جیتی ہوں، روز مرتی ہوں۔ اس کی یاد میں رو رو کر نظر دور کی مکمل ختم ہے اور کانوں کی سماعت بہت متاثر ہے۔ میں نے لاہور سے 74 ہزار کے آلے لگوائے ہیں۔ اگر آلے اتار دوں تو مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ ابھی عمر پڑی ہے، میرا کیا بنے گا۔ پلیز نظر کا اور کان کی سماعت کا بھی کوئی حل بتائیں اور تعویز بھی دیں۔ جس عمر میں لڑکیاں کالج جاتی ہیں، مجھے 2 بار طلاق ہوئی اور پیار کی خاطر تڑپ رہی ہوں۔

☆ بیٹی راحت! تمہارے بڑوں نے واقعی میں زیادتی کی۔ نکاح کے بعد وہ شخص تمہارا شوہر تھا، اگر بھائیوں کو اس کا آنا جانا پسند نہیں تھا تو تمہاری رخصتی کر دیتے۔ طلاق مذاق نہیں ہے۔ بہرحال تم تعویز منگوانا چاہتی ہو۔ اس کے لیے کچھ کوائف کی ضرورت ہوگی۔ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تا کہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

□ عالیہ بخاری۔ کراچی

☆ بیٹی عالیہ! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا ہے...... پہلے مسئلے کے لیے بہتر ہوگا۔ سچی کہانیاں کے دفتر سے دوا منگوالو...... طریقہ استعمال دوا کے ساتھ ہوگا۔ ان شاء اللہ چند دن میں چہرہ بالکل صاف ہو جائے گا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی نماز عشاء کے بعد 3 تسبیح یا شکور کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ مثبت تبدیلی دیکھو گی۔ ان شاء اللہ۔

□ بیٹی۔ نوشہرو فیروز

☆ بیٹی! تمہارا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ شراب اسی لیے حرام ہے کہ شراب پینے والا اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویز منگوالو۔ تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے لے سکتی ہو۔

□ صائمہ۔ کراچی

☆ بیٹی صائمہ! تمہارا مسئلہ شادی نہیں وزن کی زیادتی ہے۔ وزن کم ہوگا تو رشتہ لانے والے رشتہ بھی کریں گے۔ بہرحال سچی کہانیاں کے دفتر سے دوا حاصل کرلو۔ ان شاء اللہ 15 دن میں فرق محسوس کرو گی۔

□ مہوش اعجاز۔ ملائیشیا

○ بابا جی، السلام علیکم۔ میں اپنی زندگی سے بےزار ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے اس قدر خوش تھی کہ ملک سے باہر جا رہی ہوں۔ ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملے گی، مگر شوہر بہت خشک مزاج ہیں۔ ہم زیادہ تر گھر میں رہتے ہیں۔ اگر میں کوئی شکوہ شکایت کروں تو ان کا مزاج خراب ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں میکے میں جا کر کچھ عرصہ رہ لو، جب دل خوش ہو جائے تو آجانا۔ امی حیات نہیں، ابو نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میرا میکے میں کوئی اپنا نہیں۔ کبھی کہتے ہیں پڑھ لو، یہ سوچ کر گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میں نے تو اپنے ملک میں ہی میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ زندگی کی ناکامی اور شادی کے ٹوٹنے سے ڈرتی ہوں، اس لیے صبر کر رہی ہوں۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے میں پہلے کی طرح شوخ طبیعت نہیں رہی۔ بابا جی! خدارا کچھ ایسا کریں کہ میری بے کلی کو سکون ہو جائے۔

☆ بیٹی! وجہ خواہ کوئی بھی ہو، یہ اچھی بات ہے کہ تم صبر کر رہی ہو۔ صبر کرنے پر مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تو ایک مثبت رویہ ہے۔ صبر کا مطلب ہے منفی ردعمل سے رکنا اور بے سوچے سمجھے اقدامات کرنے سے خود کو روکنا، خاص طور پر جذبات میں آ کر فیصلہ نہ کرنا بلکہ سوچ سمجھ کر شعوری صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے وقتی مایوسی اور ناامیدی کو برداشت کر کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کام کرتے جانا۔ شوہر کی طرف سے پڑھنے کا مشورہ بہت

بہترین ہے۔اس سلسلے میں وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔
شوخ طبع لوگوں میں دوسروں کو خوش رکھنے کی بے شمار صلاحیتیں ہوتی ہیں۔تم بھی اپنی کسی امتیازی خصوصیت سے کام لو اور گھر کی بے زار اور بور فضا کو خوشگوار صورتحال میں بدل دو۔بعض اوقات صرف مسکراہٹ اور ہمدردی کے چند الفاظ ازدواجی زندگی کو پرکشش بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ بیٹی،نماز کی پابندی کرو۔یا سلام کی تسبیح ہر نماز عصر کے بعد معمول بنالو۔

□ شیر عالم۔لاہور

٥ پیارے بابا جی! بہت اہم مسئلے کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہوں۔میں بہن بھائیوں میں چھوٹا ہوں۔چند ماہ قبل شادی ہوئی ہے،سب نے مل کر امی اور ابو کو میرے پاس رہنے پر مجبور کردیا ہے، حالاں کہ وہ دوسرے بیٹوں کے پاس بھی رہنا چاہتے ہیں۔ابو کو تو اب بہت سے نام اور راستے یاد بھی نہیں، البتہ امی بہت بہتر ہیں، میں چاہتا ہوں امی میرے ساتھ رہیں اور ابو کو بڑے بھائی دیکھیں مگر یہاں بھی میرے لیے مسئلہ ہے کہ امی کہتی ہیں ابو کے کام دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔میری بیوی کا کہنا ہے کہ اگر ابو کی ذہنی حالت ٹھیک ہوجائے گی تو وہ دوسری جگہ رہنے میں مشکل محسوس نہ کریں گے۔بہت ہی دشوار وقت گزار رہا ہوں۔بھائیوں کی اجنبیت،خود غرضی اور اپنے مسائل میں الجھ کر شادی کی خوشی بھی بھول گیا۔اب تو یوں لگتا ہے کہ میں بھی نفسیاتی مریض بن رہا ہوں۔کچھ کریں پلیز بابا جی!

☆ بیٹے شیر عالم! والدین بوڑھے ہوجاتے ہیں تو بچے ان کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے پریشان ہوتے ہیں۔جس طرح تمہارے بھائیوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا اور اب تم بھی مسائل محسوس کررہے ہو۔والدین تمہارے ساتھ رہ رہے ہیں تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔دنیا اور آخرت سنوارنے کا بہترین موقع مل رہا ہے۔والد کی ذہنی حالت میں بہتری ممکن ہے،اس کے لیے تمہیں انہیں وقت دینا ہوگا۔ان کے ساتھ بیٹھو،ان سے باتیں کرو،ان کو اپنے ساتھ گھر سے باہر لے کر جاؤ۔جس طرح انہوں نے بچپن میں تمہیں سنبھالا آج وقت ہے کہ ان کا خیال رکھا جائے جو لوگ والدین کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو قدم قدم پر خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔باقی پابندی سے نماز ادا کرو اور الصبور کا ورد نماز مغرب کے بعد تین ہزار بار کرو۔خدا راحت دے گا۔

□ اسامہ خان۔کوٹلی

٥ بابا جی! السلام علیکم۔اچھے پرچے کرنے کے باوجود میرا رول نمبر اخبار میں نہیں آیا، جان بوجھ کر فیل کردیا گیا۔میٹرک کے بعد آگے پڑھنے کے کتنے خواب دیکھے تھے،سب بکھر گئے۔خاندان میں جتنے لڑکوں نے امتحان دیا تھا وہ سب ہی اچھے گریڈ میں پاس ہوئے ہیں یا ہوسکتا ہے کہ جھوٹ بول رہے ہوں۔ابو کہتے ہیں اب کوئی کام سیکھو۔میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔اب دل اس قدر ٹوٹا ہے لگتا ہے کبھی بھی پاس نہیں ہوسکتا۔دوبارہ میٹرک کے پرچے دینے سے میں احساس کمتری کا شکار ہوجاؤں گا۔بابا جی! پلیز کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں کامیاب ہوجاؤں۔

☆ بیٹے! محنت کرنے کے بعد دوبارہ امتحان سے تم پاس ہوجاؤ گے اور احساس کمتری ختم ہوجائیگا جبکہ میٹرک پاس نہ کرنے پر ساری عمر فیل ہونے کا احساس رہے گا۔مان لو کہ جان بوجھ کر کسی نے فیل نہیں کیا۔یہ ناکامی عارضی ہے اس کو مستقل نہ بناؤ۔ناکامی کا اعتراف ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔حوصلہ نہ ہارو۔کام سیکھنے میں بھی برائی نہیں لیکن میٹرک پاس کرنا ضروری ہے۔باقی نماز پنجگانہ کو عادل بناؤ اور "یا حیی یا قیوم" ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ لیا کرو۔

□ زرتاش۔دھنی سیداں

٥ پیارے بابا جی! میں اپنے بہت اہم مسئلے کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہوں۔بابا جی! میں ایک بینک میں جاب کررہی تھی، وہاں دو لڑکے ایسے تھے جو مجھے اکثر پریشان کرتے۔کچھ بڑی عمر کے لوگ تھے وہ بھی غیر ضروری باتیں کرنا چاہتے۔میں نے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا۔مجھے امید تھی منیجر مجھے روک لیں گے کیوں کہ وہ میرے کام کی تعریف کرتے تھے مگر ایسا نہ ہوا۔میرے جانے سے پہلے ایک لڑکی آگئی۔گھر آکر مجھے بہت رونا آیا اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی امی کو ساتھ لے کر

بینک جاؤں اور منیجر سے ملوں، ان کو بتاؤں کہ میں کس قدر ضرورت مند ہوں۔ باباجی! خدا کے لیے ان کے دل میں رحم ڈالنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں اور کوئی تعویز ہو تو میرے لیے عنایت کیجیے۔

☆ استعفیٰ دینے سے پہلے دوسری ملازمت تلاش کرلی جاتی تو بہتر تھا۔ آئندہ کبھی بھی جذبات میں آکر استعفیٰ نہ دو، بلکہ درپیش مسائل مثبت انداز میں حل کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی شخص غیر ضروری باتیں نہیں کرسکتا اگر تم نہ چاہو۔ گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو سادگی اختیار کرتے ہوئے خود کو مضبوط بنانا چاہیے اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے باہر کے مسائل کا خود مقابلہ کریں۔ اس کے علاوہ کبھی خود کو مجبور نہ سمجھو اور نہ ہی کسی سے اپنی مجبوری یا پریشانی کا ذکر کرو۔ اب دوسری ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ نماز کی پابندی کرو اور الفتاح کی تسبیح ہر نماز کے بعد جاری رکھو۔ سابقہ تجربہ، اعتماد اور جستجو سے پہلے سے زیادہ بہتر ل سکتی ہے۔ یقین کرو بیٹی ہر پریشانی عارضی ہوتی ہے۔

□ راحیلہ اصغر۔ اسلام آباد

o بابا صاحب! میں اکثر آپ سے اپنے مسئلوں کے سلسلے میں رابطے میں رہتی ہوں۔ دو ماہ قبل میرا بیٹا اور بہو اسٹوڈنٹ ویزے پر کینیڈا گئے حالانکہ بیٹے نے یہاں نوکری کے لیے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی تھک ہار کر دونوں میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ بہت کوشش کے باوجود اب تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں ملی۔ بہت پریشانی ہے۔ آپ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ بتادیں تاکہ بچے مشکل سے نکل آئیں۔

☆ عزیزہ راحیلہ! اللہ تمہارے بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۂ کہف پڑھو اور دُعا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر جمعرات کو کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کردیا کرو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ ا۔ب۔ چکلالہ

o باباجی! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں اپنا اصل نام شائع نہیں کرواسکتی کیونکہ آپ کا کالم میرے سسرال میں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے مگر باباجی! افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل میں بہت تضاد ہے۔ مجھے یہی بہتر لگا کہ میں آپ سے ان کی شکایت کروں۔ بیٹیوں کے لیے اصول الگ ہیں اور میں بہو ہوں تو میرے لیے ہر چیز بالکل جدا۔ میری ساس آپ سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتیں۔ میری شادی بھی آپ سے استخارہ نکلوانے کے بعد ہوئی۔ رشتہ کرنا ہو یا کاروبار، گھر بدلنا ہو یا کوئی بھی کام وہ آپ کو خط لکھتی ہیں اور آپ جو کہتے ہیں، وہ کرتی ہیں۔ آپ کے جواب پڑھ کر مجھے بھی ہمت ہوئی کہ آپ سے بات کروں۔ باباجی! میری ساس مجھے بہت پریشان کرتی ہیں۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں مگر ان کو بھی میرے ساتھ زیادتی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ باباجی! پلیز، آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کا ایک جملہ میری زندگی بدل دے گا۔ میرے والد حیات نہیں۔ میں آپ کو اپنا باپ سمجھ کر درخواست کررہی ہوں اس بھروسے کے ساتھ کہ آپ میرا پردہ رکھیں گے۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہارا تفصیلی خط شائع کرنا ممکن نہیں مگر کچھ حصہ شائع کررہا ہوں۔ بیٹی......! میں جو کچھ بھی بتاتا ہوں، وہ کلام الٰہی کے توسط سے بتاتا ہوں۔ ہم دینِ اسلام کے ماننے والے کبھی کسی پر ظلم نہیں کرسکتے، خود تو تکلیف سہ سکتے ہیں مگر کسی اور انسان کو زبان سے بھی دکھ نہیں دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے رابطے میں رہنے والے اپنے گھر میں موجود ایک یتیم بچی کو دکھ دے رہے ہیں جو ان کے گھر کی عزت ہے۔ بیٹی......! تم پریشان مت ہو۔ مجھے خط لکھ کر تم نے بہت اچھا کیا۔ اطمینان رکھو یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی اور آئندہ آنے والے دنوں میں تمہاری ساس اور دیگر افراد کو اپنی کوتاہیوں کا بھی احساس ہوجائے گا۔ تم نماز پابندی سے پڑھو اور یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ کی تسبیح بہت پڑھا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ نور فاطمہ۔ چیچہ وطنی

o باباجی! میرے میاں ایک ادارے میں معمولی سی نوکری کرتے ہیں۔ تنخواہ بہت کم ہے۔ بچوں کا

ساتھ ہے۔ مہنگائی نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ پارٹ ٹائم جاب کے بعد بھی مہینے کی 15 تاریخ تک ایک ایک روپیا خرچ ہو جاتا ہے پھر ادھار لینا پڑتا ہے۔ باباجی! ہمارے جاننے والے بھی ہمارے جیسے ہی ہیں، لہٰذا مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ روز روز کی پریشانی نے مجھے حد سے زیادہ چڑچڑا بنا دیا ہے اور میرے شوہر بے تحاشہ کام کرنے کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ باباجی! میں بے صبری نہیں مگر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی' کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ بچے بھی سہمے سہمے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں خود کو اتنا بے بس محسوس کرتی ہوں کہ رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ بتایئے' کیا کروں؟

☆ بیٹی نور! اللہ تمہیں ہمت دے۔ تم نے جو کچھ لکھا' وہ سب درست ہے۔ انسان کی زندگی انسان نے ہی تنگ کردی ہے۔ بیٹی! اللہ سے ہمت اور صبر مانگو۔ یہ وہ دولت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں۔ بہت پیسا' بہت آسائشیں رکھ کر بھی لوگ بے سکون ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کھاتے ہیں تو دوسرے وقت کی خبر نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا بندوبست کرتا ہے، لہٰذا معاملات اللہ کے سپرد کرو۔ نماز ادا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔

○ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ○

□ صفیہ نصیر۔ کھاریاں

○ باباجان! کچھ عرصہ قبل کسی نے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' دیا جس میں' میں نے آپ کا سلسلہ دیکھا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ اب تک کئی وظائف سے فائدہ اٹھا چکی ہوں۔ آج اپنا ایک بہت اہم مسئلہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کررہی ہوں۔ بس آپ میرا مسئلہ حل کردیں۔ آپ جو کہیں گے' میں وہ کروں گی بلکہ ہر ماہ آپ کے ادارے کے لیے خطیر رقم بھی ارسال کروں گی۔ باباجی! مجھے ایک شخص سے شدید محبت ہوگئی ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ باباجی! مجھے بچوں سے کوئی پریشانی نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ باباجی! وہ بہت مجبور ہے' اس کی بیوی بہت لڑاکا ہے اس لیے وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ بس باباجان! میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا جلالی عمل کریں کہ وہ صرف میرا ہوجائے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

☆ بیٹی صفیہ! جو شخص اپنی بیوی اور بچوں کا نہ ہوا' وہ تمہارا کیا ہوگا؟ یہ مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اکثر دوستوں میں بیٹھ کر بیویوں کی برائی کرتے ہیں۔ اکثر شوہر ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ کسی کا گھر تباہ کرکے اپنا گھر بسانے کی کوشش مت کرو۔ بہت دکھ اٹھاؤ گی۔ تم مجھ سے مدد مانگ رہی ہو اسی لیے یہ نصیحت کررہا ہوں۔ تمہیں ایسے لوگ بہت مل جائیں گے جو تمہاری مدد کا وعدہ کریں گے' ''محبوب تمہارے قدموں میں۔'' کی یقین دہانی کرائیں گے مگر بیٹی! یہ سب غلط اور اپنے آپ کو دھوکا دینے والی باتیں ہیں۔ یاد رکھو' کر برا' ہو برا' کر بھلا' ہو بھلا' بس اگر یہ بات سمجھ گئیں تو زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ نماز پابندی سے پڑھو اور ہر نماز کے بعد ایک بار سورۃ التوبہ ضرور پڑھو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ بشریٰ ناز۔ کراچی

○ باباجی! میں BSc کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے تک سب ٹھیک تھا مگر اب مجھے پڑھنے میں بہت دشواری ہورہی ہے۔ جو یاد کرتی ہوں' بھول جاتی ہوں۔ ذہن ہر وقت سویا سویا سا رہتا ہے۔ کسی کام میں دلچسپی نہیں۔ ٹی وی بھی اگر دیکھنے بیٹھوں تو چینل بدلتی رہتی ہوں۔ باباجی! میری ان عادتوں کو اب سب محسوس کرنے لگے ہیں۔ بھائی تو اکثر سب کے سامنے کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا دماغ کہاں رہتا ہے؟ سچ' بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ پلیز' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی بشریٰ......! تم بہت اچھی بچی ہو۔ بہتر ہوگا

دل میں جو بات ہے' وہ ماں سے کہہ ڈالو۔ کچھ مت چھپاؤ۔ ہوسکتا ہے جس بات کو تم بہت بڑا سمجھ رہی ہو' وہ اتنی بڑی نہ ہو۔ اچھی لڑکیاں اپنے والدین سے کچھ نہیں چھپاتیں۔ چلتے پھرتے یَا بَصِیرُ کا ورد کیا کرو اور اطمینان رکھو سب ٹھیک ہے۔

□ ناظم سلطان۔ سلانوالی

○ باباجی! میں بہت پریشانی کے عالم میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ہماری آبائی زمین ٹوبہ میں ہے۔ میں نے اپنی تعلیم کی وجہ سے کبھی اس طرف توجہ نہ دی۔ 4 مہینے قبل والد صاحب کے انتقال کے بعد جب کھاتے دیکھے تو پتا چلا کہ زمین تو کوڑیوں کے مول گروی رکھی ہوئی ہے۔ باباجی! والد صاحب کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل گھر میں ضرور ذکر کرتے تھے اور ہمارے مالی حالات بھی اچھے ہیں، لہٰذا زمین گروی رکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے یہ ساری کارستانی اپنے منشی کی لگتی ہے۔ زمین جن لوگوں کے پاس گروی ہے' وہ علاقے کے بدمعاش ہیں۔ میں کسی صورت ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اب تو کیس عدالت میں چلا گیا ہے۔ باباجی! بتایئے' میں اپنی تعلیم دیکھوں یا ماں بہنوں کو سنبھالوں؟ میں گھر میں واحد مرد ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں' اپنا حق چھوڑنا بھی غلط ہے۔ لڑتا ہوں تو پیسا اور وقت سب کا ضیاع ہوگا پھر فیصلے بھی کہاں میرٹ پر ہوتے ہیں؟ آپ مجھے مشورہ دیں' میں کیا کروں؟ والدہ اور بہنیں کہتی ہیں کہ زمین سے دستبردار ہوجاؤں۔

☆ بیٹے ناظم! اپنی والدہ کا کہا مان لو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو۔ ظالم کی زندگی بہت لمبی نہیں ہوتی' وہ تو ہم لوگ کیونکہ بے صبرے ہیں اس لیے جلد تھک جاتے ہیں۔ نماز پابندی سی ادا کیا کرو۔ مناسب ہوگا' اپنی زمین' جائیداد بیچ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ اسلام آباد منتقل ہوجاؤ۔ بہت خوش رہو گے۔ جب جب یاد آئے' آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ رائمہ مجید۔ ٹنڈو آدم

○ باباجان! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتی ہوں۔ اللہ نے بہت کچھ عطا کیا۔ جتنا بھی شکر ادا کروں' کم ہے۔ بس ایک پریشانی ہے دکھ ہے' میرا سب سے چھوٹا بیٹا ماشاء اللہ' 23 سال کا ہے' اس سال MBA مکمل کیا ہے مگر بہت غیر ذمے دار ہے۔ نہ تو نوکری کرنا چاہتا ہے اور نہ باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ دو ہی شوق ہیں' ساری رات فلمیں دیکھنا یا پھر موبائل پر باتیں کرنا۔ ڈانٹ ڈپٹ کرو تو اٹھ کر کمپیوٹر پر بیٹھ جاتا ہے۔ باباجان! ہم لوگ ساری زندگی تو اس کے نخرے اٹھانے کے لیے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ بچیاں اپنے گھروں میں مگن ہیں۔ بڑا بیٹا ماشاء اللہ' ڈاکٹر ہے' بس یہی کچھ نہیں کرتا۔ محبت سے بھی سمجھایا اور سختی کرکے بھی دیکھ لیا' کچھ اثر نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اس پر کوئی آسیب ہے اسی لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ باباجی! اللہ کے واسطے' میری مدد کریں۔ شاید آپ کو میرا مسئلہ اتنا بڑا نہ لگے مگر میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ صورت حال ہے۔

☆ بیٹی رائمہ! سب سے پہلے بیٹے پر سے حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر ماہ نکالا کرو۔ مناسب ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوالو۔ لڑکے بہت جلدی بدنظر کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اصل میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ اللہ کی راہ میں دینے سے بہت کتراتے ہیں۔ جانتے بوجھتے ٹھگوں' جعلی پیروں فقیروں کو تو دیتے ہیں مگر جہاں اصل میں دینا چاہیے' وہاں نہیں دیتے۔ اللہ نے اتنی سمجھ ہر شخص کو عطا کی ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرسکے۔ لفاظی کرنے والوں کے پاس عورتوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتی ہیں کہ اس عمل سے وہ گناہ کی مرتکب ہورہی ہیں' نامحرم کے سامنے بیٹھ کر اپنی بہت ذاتی باتیں بتانا سخت معیوب ہے۔ بہرحال اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ خیرات کیا کرو بلائیں ٹلیں گی۔

□ ازلہ نواز۔ دبئی

○ باباجی! میرا مسئلہ بہت شدید ہے' اتنا شدید کہ میں الفاظ میں سمجھا بھی نہ پاؤں۔ میری شادی کو 12 سال ہوچکے ہیں۔ شادی کے پہلے سال میں امید سے ہوئی مگر

پھر میرا حمل ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد آج تک مجھے یہ نعمت نصیب نہیں ہوئی۔ باباجی! اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ میرے شوہر اور سسرال والے بھی بہت اچھے ہیں مگر میں اپنے دکھ کے ساتھ ساتھ ان کا دکھ بھی محسوس کر سکتی ہوں۔ بے شک وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر مجھے اندازہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صاحبِ اولاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ باباجی! پچھلے سال میں پاکستان آئی تھی۔ میرا میکہ پنڈی میں ہے۔ پنڈی سے آگے ایک صاحب بیٹھتے ہیں جو اپنے آپ کو اللہ والا کہتے ہیں مگر باباجی! میرا دل نہیں مانا، وہ شخص کیسے اللہ والا ہو سکتا ہے جو نامحرم عورتوں سے ملے اور ان سے بہت ذاتی سوال کرے؟ بس اسی لیے میں ملے بغیر چلی آئی پھر مجھے کسی نے آپ کا بتایا کہ آپ بنا ملے مسئلے سنتے ہیں۔ مجھے اور میرے شوہر کو یہ بات بہت اچھی لگی۔ باباجی! لوگ اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں مگر اس کی اصل روح سے ناواقف ہیں۔ یہ میری بہت خوش قسمتی ہوگی۔ اگر آپ اللہ کی مرضی سے میرا مسئلہ حل کر دیں۔

☆ بیٹی انزلہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا، یقیناً تمہاری تربیت مکمل اسلامی خطوط پر ہوئی ہے اس لیے تمہیں محرم اور نامحرم کا فرق پتا ہے۔ بیٹی! تم مجھے مکمل تفصیل سے خط لکھو جس میں تمہارا، تمہارے شوہر کا مکمل نام درج ہو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں۔ طریقۂ کار جوابی خط میں سمجھا دوں گا۔ خوش رہو۔

□ فرزانہ۔ پشاور

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا نام فرزانہ ہے۔ میرے شوہر کا نام عبدالرشید ہے۔ میرا شوہر لکڑی کا کام کرتا ہے۔ کبھی اس کا کام ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا، بہت مشکل سے گزارہ ہو رہا ہے۔ اکثر فاقے کے دن گزارنے پڑتے ہیں۔ میرا بڑا بیٹا جس کی عمر بیس سال ہے الیکٹریکل کا ڈپلوما کر رہا ہے لیکن وہ پڑھتا بالکل بھی نہیں ہے، سارا دن گھر پہ بیٹھا رہتا ہے، لڑتا رہتا ہے اور کئی دن تک بولنا چھوڑ دیتا ہے والدین کی عزت نہیں کرتا اور کسی کام کا کہیں تو لڑتا ہے۔ ماشاءاللہ سے جوان ہے، اگر کرنا چاہے تو ہر کام کر سکتا ہے۔ میں بہت مصیبت میں گرفتار ہوں، پلیز آپ کوئی ایسی چیز دیں جس سے اس کے دل پر اثر پڑے اور کام کرے اور اس کو نوکری مل جائے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار آپ سے وظائف منگوائے تھے اب ایک بار پھر مشکل سے دوچار ہو کر خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں جس سے اس کے دل پر اثر پڑے اور کام کرے۔ میں پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی ہوں، اس کے علاوہ میں تہجد، چاشت، اشراق کے نوافل بھی پڑھتی ہوں۔ باباجی! میں بہت مشکل میں خط لکھ رہی ہوں۔ میرا ایک اور مسئلہ بھی ہے، وہ یہ کہ...... میری بیٹی جس کی عمر تقریباً 17 سال ہے، اس کی نظر کمزور ہے، اس کو 2 نمبر کا چشمہ لگا ہوا ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں تاکہ چشمہ اتر جائے اور نظر تیز ہو جائے۔ باباجی! آپ میرے اس خط کا جواب مئی کے شمارے میں ضرور دیجیے گا۔ رسالہ بار بار نہیں لے سکتی، میری بہت بڑی مجبوری ہے۔ آپ نے جو بادام کا سُرمہ کسی شمارے میں بتایا ہے کہ اس سے نظر تیز ہوتی ہے، اگر آپ کی اجازت ہو تو وہ ہم بنائیں؟ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ہمارے لیے دُعا ضرور کرنا۔

☆ بیٹی فرزانہ! خوش رہو۔ شوہر اور بیٹے دونوں پر ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دَم کرو۔ بیٹی کو سونف بہت کھلایا کرو۔ بادام کا سُرمہ حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بادام کو جب جلاؤ تو اس کے اوپر چمچہ الٹا کر پکڑ لو جو دھواں نکلے گا، وہ چمچے سے چپک جائے گا اور وہی اصل سُرمہ ہوگا۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد یَارَزَّاقُ کا بہت ورد کیا کرو۔

□ عرشیہ حسین۔ حیدرآباد

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! بعد عرض ہے کہ میرا نام شبانہ بیگم ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تقریباً 15 سال پہلے بخار ہوا تھا، قریبی کلینک سے دوا لے کر کھالی۔ بخار تو اتر گیا مگر میری چھوٹی آنت میں تیزابیت ہو گئی جس کی وجہ سے رات کو منہ میں بدبودار پانی جمع ہو جاتا تھا۔ صبح سب سے پہلے منہ کی صفائی کرنی پڑتی تھی، ہزاروں جگہ علاج کروایا مگر کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ رات بھر میں منہ میں پانی کیسے جمع ہو جاتا ہے اور یہ پانی آتا کہاں سے ہے؟ کیا منہ کے غدودوں سے

خارج ہوتا ہے؟15 سال تک مختلف ڈاکٹروں سے علاج کر کے بھی نتیجہ صفر ہی رہا۔ اب ایک ہومیو پیتھک لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ شبانہ! آپ کی چھوٹی آنت میں تیزابیت ہے۔ جس کی وجہ سے منہ میں بدبودار پانی جمع ہوجاتا ہے' یہ پانی علاج کرنے سے کم تو ہوجائے گا مگر مکمل ختم نہیں ہوگا پھر باباجی! میں نے اُس لیڈی ڈاکٹر کے علاوہ بھی دیگر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا' سب نے یہ ہی کہا کہ ہاں' پانی کی مقدار کم تو ہوجائے گی مگر مکمل ختم نہیں ہوگی۔ باباجی! اگر صرف تیزابیت کا ہی مسئلہ ہوتا تو میں برداشت کرلیتی مگر باباجی! اس تیزابیت کی وجہ سے مجھے پورے سال نزلہ رہتا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نزلے کا تعلق تیزابیت سے ہے' جب تیزابیت ختم ہوجائے گی تو نزلہ خود بخود ختم ہوجائے گا۔ باباجی! میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں تو نزلے کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے' کبھی کبھی تو نماز کی نیت باندھتے ہی نزلہ ٹپکنا شروع ہوجاتا ہے اور باباجی! تیزابیت کی وجہ سے آنکھوں کے کناروں پر سفید سفید کھرا بھی جمع ہوجاتا ہے۔ آنکھ کا آنسو جلن والا ہوتا ہے اس لیے باباجی! میں چاہتی ہوں کہ تیزابیت ہی ختم ہوجائے تاکہ پھر باقی مسئلے بھی ٹھیک ہوجائیں گے۔ باباجی! کیا آپ کے پاس اس کا حل ہے کہ میری تیزابیت مکمل ختم ہوجائے تاکہ میں بھی سکون سے نماز ادا کرسکوں کیونکہ نزلے کی وجہ سے یہ دل چاہتا ہے کہ نماز نہ ادا کروں بلکہ سو جاؤں۔ باباجی! جواب جلد دیجیے گا' میں انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی عرشیہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل گرم پانی میں نمک ملا کر بھاپ لے لیا کرو پھر کان اور سر ململ کے کپڑے سے لپیٹ کر سو جاؤ۔ نہار منہ ایک کیلے کو درمیان سے کاٹ کر اس پر اسپغول چھڑکو اور بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ 21 روز کرو۔ جس قدر ممکن ہو یانا لک کا ورد کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ نعیم اللہ۔ ہری پور

o باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اب سول انجینئر میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں' میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تھا اور میرا ایک پیپر کمپارٹ ہوگیا۔ میں نے بہت محنت کی تھی۔ میرے دوسرے بھائیوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پڑھا ہے اور صرف مجھے تعلیم کے لیے وقف کیا ہے۔ انہوں نے مجھ پر بہت اعتبار کیا ہے کہ ہمارا بھائی پڑھ لکھ کر انجینئر بنے۔ اس بار جب میرا پیپر کمپارٹ ہوگیا تو سب بھائیوں نے مجھے اتنا ڈانٹا کہ میرا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ اب مجھے پھر ڈر لگ رہا ہے کہ میرا پیپر پھر رہ نہ جائے۔ مجھے کوئی ایسا حل بتایئے کہ میں کامیابی حاصل کروں۔ انجینئرنگ مکمل کرتے ہی مجھے کوئی اچھی جاب مل جائے۔

☆ بیٹے نعیم......! اللہ تمہیں کامیابی دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد 700 بار پڑھو رَبِّ زِدنی عِلما پھر دعا کرو۔ خوب محنت کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کامیابی ملے گی۔ وِرد نتیجہ آنے تک جاری رکھنا ہوگا۔

□ سویرا جہاں۔ امریکہ

o باباجی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں اس وقت بہت کڑے وقت سے گزر رہی ہوں۔ میری بیٹی جس کی عمر 26 سال ہے' گھر چھوڑ کر اپنے دوست کے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی ہے۔ باباجی! میرے 3 بچے ہیں۔ اس غیر اسلامی ملک میں رہتے ہوئے بھی میں نے اپنے بچوں کو دین کی پوری تعلیم دی۔ کچھ عرصہ قبل ہمیں انگریز لڑکے سے اس کی دوستی کا پتا چلا۔ پیار' محبت' سختی' ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا۔ اس کی خاطر اس نے اپنی بچپن کی منگنی بھی توڑ دی۔ باباجی! میں تو اولاد سے بھی گئی اور خاندان سے بھی۔ اب ہم لوگ یہ تو بتا نہیں سکتے کہ وہ کس کے ساتھ رہتی ہے اور منگنی بھی اسی نے توڑی ہے۔ خاندان والے سمجھتے ہیں کہ اس منگنی کے ٹوٹنے میں میرے شوہر کا ہاتھ ہے کیونکہ لڑکا میری بہن کا بیٹا تھا۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ برائے مہربانی کوئی حل تجویز کریں۔

☆ بیٹی سویرا! اس مشکل وقت میں اللہ سے مدد مانگو۔ بے شک اولاد بہت بڑی آزمائش ہے۔ جس مشکل سے تم گزر رہی ہو' اکثر والدین گزر رہے ہیں یا گزر رہے ہیں جو وطن سے دور ہیں' وہاں کے معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے بچوں کو غیر اسلامی رہن سہن سے بچانا

بہت مشکل ہے۔ بہر حال تم نے اپنا فرض پورا کیا' بچی کو دین و دنیا دونوں کی تعلیم دی۔ اگر وہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہے تو تم سوائے دُعا کے کچھ نہیں کر سکتیں۔ میں تعویذ کا مشورہ دوں گا' جلد از جلد منگوالو اور باقی بچوں پر مکمل توجہ دو۔ ان پر ان حالات کا اچھا اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ بیٹی سے رویہ نرم ہی رکھو کیونکہ سختی کا کوئی فائدہ نہیں یہ تم بھی جانتی ہو۔ تم جس ملک میں ہو وہاں قانون بھی ایسے بچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ بہر حال بیٹی! اللہ سے مدد مانگتی رہو وہ ضرور کرم فرمائے گا۔

☐ اویس خان۔ کراچی

o بابا جی! السلام علیکم! میں نہم جماعت کا طالب علم ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔ نماز میں بھی۔ میری لکھائی بھی اچھی نہیں۔ آپ ایسا وظیفہ بتائیں کہ ہر کام ہو جائے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے نمبر دسویں جماعت میں 620 سے اوپر آئیں۔ یہ میری ماں کی بھی خواہش ہے اور میری بھی۔ آپ اس کے حل کے لیے بھی وظیفہ بتائیں۔

☆ بیٹے اویس! جو کام بھی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ کرو گے اس میں کامیابی نصیب ہوگی۔ ابھی تم بہت کم عمر ہو۔ اگر تعلیم پر توجہ نہیں دو گے تو مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ نماز کی پابندی کرو اور نمازِ مغرب کے بعد 7 بار سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو۔ خوشخط تحریر کے لیے تختی پر لکھا کرو۔ محنت کرنے والوں کو ہی کامیابی ملتی ہے۔ کوئی بھی وظیفہ کرنے کی بجائے دل لگا کر تعلیم حاصل کرو۔

☐ تو قیر فاطمہ، لاہور۔

☆ بیٹی توقیر! تمہارا خط شائع کرنا تمہارے مفاد میں نہیں حالانکہ تم نے یہ نہیں لکھا کہ خط شائع نہیں کیا جائے مگر مناسب یہی ہے کہ صرف حل شائع کر دیا جائے۔ بیٹی! کوئی کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کر سکتا' جب تک وہ شخص خود نہ چاہے۔ بڑوں کی عزت الگ چیز ہے اور اپنا حق حاصل کرنا بالکل جدا چیز ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 99 مرتبہ یَا فَاطِرُ کا ورد کر کے اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ مجھے دو ماہ بعد پھر مطلع کرو۔

☆......☆



ایک آزاد نظم

کس کو حال سناؤں جی آ دل کے زخم دکھاؤں جی آ
دیکھ دیکھ کر ملک کی حالت
اِک پل چین نہ پاؤں جی آ
پہروں بیٹھ کے میں سوچوں تدبیریں لڑاؤں جی آ
دہشت گردی سے کیسے پاکستان بچاؤں جی آ
مومن ہی مومن کا دشمن کچھ سمجھ نہ پاؤں جی آ
روزانہ گرتی ہیں لاشیں
کب تک اَشک بہاؤں جی آ
ڈر اور خوف کے سائے میں
کیسے عید مناؤں جی آ
جس کو دیکھو وہی منافق کس سے راز کہوں جی آ
حق کی بات کروں چاہے اپنا سر کٹاؤں جی آ
ہونے کو لبریز پیمانہ صبر نہ اَب کر پاؤں جی آ
دہشت گردوں کا انجام
عبرت ناک بناؤں جی آ
اور اِن ڈرون طیاروں کے
پرخچے اُڑاؤں جی آ
جو ہے پاک وطن کا دشمن اُس کو مار بھگاؤں جی آ
دھرتی ماں کے سینے پر
اَمن کے پھول کھلاؤں جی آ
جھوم جھوم کے ناچوں میں
وطن کا سہرا گاؤں جی آ
شاعر: عبدالعزیز جی آ۔ چکوال

عشق

عشق کا ظرف بھی کتنا اعلیٰ ہوتا ہے
یہ کم ظرف کو بھی ظرف اعلیٰ بنا دیتا ہے
لگا ہے روگ جسے بھی اس بیماری کا
ملتی نہیں اسے دوا دواخانوں میں
لگاتا پھرتا ہے صدا بنجر مکانوں میں
ہے کوئی بندۂ خدا اس ویرانے میں
جو میرے عشق کا درد گھٹا دے
مرہم لگا دے، وصل کرا دے بیابانوں میں
اے عشق تجھے سلام تو رُلاتا ہے، ہنساتا ہے
بھوک مٹا دیتا ہے اس مفلسی کے زمانے میں
شاعرہ: زرینہ جونیجو☆بورڑی، خیرپور ناتھن شاہ

"مزدورڈے"

بہت تنگ مزدوروں کی زندگی ہے
بےشک! بے رنگ مزدوروں کی زندگی ہے
مفلسی سے لڑتے رہتے ہیں ہر روز
نئی جنگ مزدوروں کی زندگی ہے
فاقوں سے تنگ آ کر پوشاک بیچ دی
روٹی کو ترستی مزدوروں کی زندگی ہے
نوابوں کی راتیں شرابوں اور شبابوں میں گزرتی ہیں
دَر دَر کی ٹھوکریں مزدوروں کی زندگی ہے
تاریخ گواہ ہے تمہاری شہادتوں کی، اے مزدورو!
کربلا کا منظر! مزدوروں کی زندگی ہے
تمہیں قوم کا ہر فرد سلام کرتا ہے
انیل! دُکھ درد کے سوا، کیا مزدوروں کی زندگی ہے
شاعر: انیل حسین قربان پٹھان☆سندھ یونیورسٹی جامشورو

قسمت کا ستارہ

ستارہ ہماری قسمت کا اس سے ملا ہی نہیں
وہ کیسے ہوتے ہمارے ایسا کبھی ہوا ہی نہیں
ہم نے اپنی ہر خوشی دوسروں میں بانٹ دی



کسی نے ہمیں کیا دیا یہ کبھی سوچا ہی نہیں
باتوں باتوں میں دوستی اس قدر ہے بڑھ گئی
بھول کیسے جاؤں تمہیں، کبھی سوچا ہی نہیں
ہر کوئی میری چاہت کو مذاق سمجھتا رہا
دل میں ہے درد کتنا، کبھی سوچا ہی نہیں
شاعر: شیخ معظم الٰہی☆ لاہور

چوڑی کا ٹکڑا

اندھیرے تھے راستے کوئی جگنو کوئی دیا نہیں ملا
کہ تیرے بعد جاناں کوئی تجھ سا نہیں ملا
کل شب ہوا پھر وہ ماتم بپا دل میں
جب ڈائری میں تیری چوڑی کا ٹکڑا نہیں ملا
سر ٹکراتی رہی کل شہر کی گلیوں میں ہوا
اُسے دیوانہ کوئی پاگل میرے جیسا نہیں ملا
میں غریب شہر کے اس بچے جیسا ہوں شاہد
جسے پڑھنے کا شوق تو تھا مگر بستہ نہیں ملا
شاعر: شاہد فراز☆ حیدرآباد

غزل

بعد مدت کے تُو نظر آیا
دیر سے ہی سہی مگر آیا
ہم چلے آگ کے شراروں پر
پھر کہیں جاکے تیرا گھر آیا
اِک سفر تو ابھی گزارا تھا
پاؤں میں پھر نیا سفر آیا
ماں کو دیکھوں تو ایسا لگتا ہے
جیسے چھاؤں بھرا شجر آیا
عشق میں کیفیت عجیب رہی
تُو مجھے ہر جگہ نظر آیا
شاعر: ریحان آفاق، حیدرآباد

اجنبی

عجب ستم تھا
وہ اک مقتول، جس کے سینے میں
آخری سانس رو رہی تھی
ابھی ابھی زندہ دلی سے زخموں پہ ہنس رہا تھا
وہ اپنے قاتل سے وقت رخصت جو کہہ رہا تھا
وہ حرف سارے ہی معتبر تھے
پھر اچانک ہی تیز جھونکا ہوا کا گزرا
تو اس کے قاتل، لہو کی ندیاں بہا رہے تھے
عجب سماں تھا
کہ پل میں سب کچھ بکھر گیا
وہ اجنبی تھا، جو مر گیا تھا!
شاعر: ملک عاشق حسین ساجد☆ ہیڈ بکائنی۔ مظفر گڑھ

محبت

یہ جو درد میں نے سنبھالے ہیں
یہ جو میرے پیروں میں چھالے ہیں
یہ محبتوں کی ہیں نوازشیں
میرے سُکھ کے، دُکھ کے حوالے ہیں
خفا مجھ سے ہے تقدیر بھی
جبھی خالی ہاتھوں کے پیالے ہیں
یہ لکیریں کہتی ہیں ہاتھ کی
یہ کھیل کتنے نرالے ہیں
شاعرہ: ارم خان☆ ڈی جی خان

غزل

بے چین نظاروں نے تجھے یاد کیا ہے
آ چاند ستاروں نے تجھے یاد کیا ہے
ہر پھول کے چہرے پہ اُداسی کا سماں ہے
افسردہ بہاروں نے تجھے یاد کیا ہے
برسوں سے تری دید کی پیاسی ہیں نگاہیں
آ ہجر کے ماروں نے تجھے یاد کیا ہے
بیمارِ محبت کے لبوں پر ہے ترا نام
آ ڈوبتی سانسوں نے تجھے یاد کیا ہے
پھر روشنی مانگی ہے مرے شہر نے تجھ سے
آ بجھتے چراغوں نے تجھے یاد کیا ہے
آ شہرِ محبت کو بسانے کے لیے آ
ٹوٹے ہوئے خوابوں نے تجھے یاد کیا ہے
شاعر: حکیم خان حکیم☆ کامل پور موسیٰ۔ حضرو، اٹک

اپنی دھرتی

اپنی دھرتی ، اپنی محبت، اپنا ہی نوالہ
کیوں دیکھیں ہم غیر کی جانب رب ہے اپنا پالنے والا
روکھی سوکھی کھاؤ تم اور یہ کہو کہ قرض اتارو
اپنی ٹیبل پر بیٹھ کر کھاؤ اصلی گھی کا تر نوالہ
نئی حکومت، نیا سسٹم، نیا چہرہ لائیں گے
گیارہ مئی کا سورج لایا پر کھا انساں دیکھا بھالا
اچھے اعمال پر ملتا ہے سچا حاکم بغیر صداقت
ورنہ سر پر آ بیٹھتا ہے دھوبی، موچی اور گوالہ
جس کو چاہے شاہ بنادیں، جس کو چاہیں گور دکھادیں
شاعرہ: مومنہ بتول ☆ کراچی

آنکھیں چغلی کرتی ہیں

میں جب بھی کچھ چھپانا چاہوں......
اپنا درد چھپانا چاہوں
یہ میری کب سنتی ہیں
پل بھر میں یہ بھرتی ہیں
آنکھیں چغلی کرتی ہیں
شاعرہ: ثانیہ ثانی ☆ سیالکوٹ

گیت غزل

سُر میں سُر تال پروے ذرا تال گوریے
مفت میں دیکھا جو تم نہ پال گوریے
وقت ظالم بڑا ہے گُر دے گا......
دیکھ اسے نہ پَر تو نکال گوریے
آگ دشمن کے خیموں میں لگ جائے گی
دیکھ کر سوہنی سی تری چال گوریے
حکم دے تو سمندر میں جا کودوں گا
بات ٹالوں میری کیا مجال گوریے
جس گھڑی حسن ڈھل جائے گا دیکھنا
کوئی پوچھے گا ترا نہ حال گوریے
تجھ پہ نظر کرم گر خدا کی رہی!!
کرنہ پائے کوئی بانکا بھی بال گوریے
اک کھلونے کی سی شہزادی ہستی تری
ہو محافظ نہ قدرت کی ڈھال گوریے
شاعر: دستگیر شہزاد۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

دل کا نگر

میرا ہر سخن، میرا خواب ہے
میرا خواب ہی تو اساس ہے، مرے پیار کی!!
میرے خواب مجھ سے خریدنا، تیری بھول ہے
یہی خواب میرے وجود کا ہے شہود، جب
کوئی اپنی ہستی کو بیچ دے کسی دام پر ممکن نہیں
یہ سخن کسی کی عطا سے ہیں
میرے خواب دان ہیں، پیار کا
میرا ہر نفس کوئی یاد ہے
اسی یاد سے، آباد ہے دل کا نگر
شاعر: چوہدری قمر جہاں ☆ علی پور۔ملتان

ڈر لگتا ہے

آج کے حالات سے ڈر لگتا ہے
بگڑی ہوئی ہر بات سے ڈر لگتا ہے
یوں تو دن میں بھی بہت کچھ ہے ہوتا
ہاں مگر بڑھتی ہوئی رات سے ڈر لگتا ہے
ہوگیا خون کا پیاسا انساں
اجنبی ہستی ہر اک ذات سے ڈر لگتا ہے
ایک پل میں ہی بدل جاتا ہے موسم کیسے
اب تو آتی ہوئی برسات سے ڈر لگتا ہے
کوئی برداشت کسی کو نہیں کرتا ہے یہاں
ہم کو تو شکوے شکایات سے ڈر لگتا ہے
لوگ تو پڑھتے ہی نہیں اب تو مہر
لوگ جاہل ہیں، خرابات سے ڈر لگتا ہے
شاعرہ: مہر تسیم۔گلبرگ۔لاہور

میں اور وہ

یونہی دوریوں میں گزر گئی
کبھی وہ جدا کبھی میں جدا

ان ہی چاہتوں کے موڑ پر
کبھی وہ رُکا کبھی میں رُکا
وہی راستے وہی منزلیں
نہ اسے خبر نہ مجھے پتا
اپنی اپنی اَنا کی آگ میں
کبھی وہ جلا کبھی میں جلا
پھر یہ کیسا انصاف ہے
نہ مجھے وہ ملا نہ میں اسے ملا

شاعر: ایم اشفاق بٹ ☆ لالہ موسیٰ

غزل

تمہاری یاد کا سر پہ یہ آنچل کیوں نہیں رہتا
بہت ہی دیر تک آنکھوں میں بادل کیوں نہیں رہتا
میں ہنستی ہوں تو میری آنکھ سے آنسو چھلکتے ہیں
میری آنکھوں کی جھیلوں میں یہ کاجل کیوں نہیں رہتا
میرے ویران کوچے میں ٹھہرتا ہی نہیں لیکن
وہ میرے پاس بھی آکر مسلسل کیوں نہیں رہتا
وہ میری زندگانی کا اثاثہ بن گیا پھر بھی
وہ میری زندگانی میں مکمل کیوں نہیں رہتا
بہت دن سے میں تمثیلہ اُسی کو یاد کرتی ہوں
میری ویران گلیوں میں وہ پاگل کیوں نہیں رہتا

شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ، سیالکوٹ

محبت

مرے تم دل میں رہتے ہو
میری سانسوں میں بستے ہو
اگر میں دور ہوں تم سے
تو بس جاناں سمجھ لینا
بہت مجبور ہوں دل سے
وگرنہ! دل تو یہ چاہے
رہوں ہر پل میں سنگ تیرے
کبھی دوری نہیں آئے
کوئی مجبوری نہ آئے
مگر جاناں!!!
محبت امتحاں بھی ہے
سمجھ لو یہ محبت ہے

شاعر: غلام رسول گل ☆ جیکب آباد

وہ......!

اے کاش کسی مسکراتی شام
ساحل کے کنارے پر
وہ آئے......
اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہے
تم میرے ہو! صرف میرے؟

شاعر: مور شاہد حسین ☆ حب چوکی

غزل

کسی راہ گزر سے ہٹ کر کبھی آ سکو تو آؤ
کبھی ہم کو آزماؤ، کبھی خود کو آزماؤ
ہے کڑی رہِ محبت کہیں پڑ نہ جائیں چھالے
کہیں رہ گزر نہ بدلو کہیں لوٹ ہی نہ جاؤ
میری انجمن میں آکے کبھی بیٹھ کر تو دیکھو
کہ یہاں سکوں ملے گا مگر کاش تم جو آؤ
میرے دل کے آئینے میں کبھی جھانک کر بھی دیکھا
ایک تم ہی جلوہ گر ہو مجھے دیکھنے تو آؤ

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی ☆ لاہور

تجھ سے جُڑی ہے جان میری

تمہیں خبر بھی کہاں ہے اب ہماری
برباد ہو چلی ہے عمر اب کے ساری
رفتہ رفتہ دُکھوں سے دوستی کر لی
جلنا بھی اچھا لگا، تکلیف لگی پیاری
جب اپنا کہا تھا مجھے اس نے لگا کے گلے
وہ لمحہ بس گیا مجھ میں وہ رات نہیں گزری
تجھ سے جدا ہے شاید نصیب میرا
تیری جان سے لگی ہے جان میری

شاعرہ: ثمر احمد ☆ بفرزون۔ کراچی

ایک شعر

رہا محبت ادا ہونے کو ہے
کہ اب وہ مجھ سے جدا ہونے

شاعر: مرزا یاسر بیگ

ملکھنی



ارشد علی ارشد

ابوظہبی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم، اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 13

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے، ملکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:
محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی ملکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ ملکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ ملکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، ملکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ ملکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن ملکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر ملکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہو گا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے ملکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں ملکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ ملکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم ملکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو ملکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ملکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ملکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں ملکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ ملکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا

ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی اور بلاول ابوظہبی سے پاکستان آنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ ایئرپورٹ پر مکھنی کو زلزلے کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چیز بری طرح ڈول رہی ہے لیکن وہ سب کچھ بلاول کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں۔ نیچے قراقرم کی پہاڑیاں ہیں۔ مکھنی اپنی ماورائی قوتوں کے ذریعے ہوائی جہاز سے قراقرم کی پہاڑیوں پر اتر گئی۔ وہ گھوم پھر کے واپس آ جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوران میں سیلاب آتا ہے اور تباہی مچاتا گزر جاتا ہے۔ مکھنی کا گھر بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ مکھنی کو بلاول کی فکر ہے۔

یہ ماضی کی بات ہے۔ مکھنی پھر حال میں لوٹ آتی ہے۔ مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔

ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلاول نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔“ مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ امی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

”میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟“ یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیزہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھڑائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے نہ جانے یہ کون سی دنیا کا خوب صورت کمرا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مکھنی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام امن چند ودتانی بتاتا ہے۔ وہ مکھنی سے کہتا ہے کہ اس کا نام مہک ہے اور آج اس نے پورے تیرہ ماہ اور دس دنوں بعد مکمل ہوش و حواس میں بات کی ہے۔ اس سے پہلے وہ استعارات میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ امن اسے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چند من میں ہے۔ مکھنی امن سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ امن سوال سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تایا اور بابا نے بتانے سے منع کیا ہے۔ امن مکھنی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی آمد کا ذکر بابا سے نہ کرے۔

مکھنی امن کے بابا سے کہتی ہے کہ ”میں اس تین کنال کے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں، تاکہ دیکھ سکوں باہر کی دنیا کیسی ہے، سفید یا سیاہ۔“ امن کے بابا یہ سن کر حیران ہوتے ہیں۔ مکھنی کہتی ہے کہ ”میں انسان ہوں، مجھے تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ میرے سامنے یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جیسے تم لوگ مسلمان نہیں بت پرست ہو۔“ پھر مکھنی ان سے پوچھتی ہے کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ بدھ مت کون ہیں، کیا ہیں؟ پھر وہ دیوار کو پردۂ اسکرین میں تبدیل کرتی ہے جس پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ اسکرین پر ایک گول مٹول بچہ نظر آ رہا تھا۔ مکھنی بتاتی ہے کہ اس بچے کا نام گوتم ہے۔ تب وہ لوگوں کو گوتم سے بدھ تک کا سفر اسکرین پر دکھاتی ہے۔ مکھنی ان لوگوں کا ہاتھ جوڑ کر اس کے احترام میں کھڑا ہونا، اس کو حد سے زیادہ عزت دینا، دیکھ کر سوچتی ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی گوتم بدھ کی طرح اس کی پوجا نہ شروع کر دیں۔ تب مکھنی کی ملاقات نرملا سے ہوتی ہے جو عزیز الرحمٰن سے محبت کرتی ہے اور دونوں کورٹ میرج کرنا چاہتے ہیں۔ مکھنی ان دونوں سے کہتی ہے کہ وہ گھر والوں سے اس سلسلے میں بات کرے گی۔ وہ سوچتی ہے کہ اس گھر کا کوئی فرد مجھے میری اصلیت نہیں بتا رہا لہٰذا اس کے لیے مجھے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے۔

امن کراچی سے واپس آتا ہے اور آتے ہی مکھنی کے کمرے میں حاضری دیتا ہے۔ وہ حسب معمول ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرتا ہے اور دل ہی دل میں کچھ پڑھتا ہے۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ میرے روبرو ہاتھ کیوں جوڑے جاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے کیا پڑھا جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے امن کے بے حد نزدیک ہو جاتی ہے اور سونگھتی ہے۔ امن اس

کے رونے سے گھبرا جاتا ہے اور بے اختیار اس کے آنسو صاف کرنے لگتا ہے۔ تب مکھنی کہتی ہے۔ دیکھو امن اس بات کا یقین کرلو کہ میں بھی ایک معمولی سی عام سی لڑکی ہوں۔ آج تم نے مجھے چھو کر بھی دیکھ لیا۔ دیکھو نا ہاتھ اسی طرح صحیح سلامت ہے۔ نہ جلا نہ کٹا نہ معذور ہوا۔ مکھنی امن کو کہتی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر وہ بور ہو گئی ہے۔ تب وہ دونوں لنچ کے لیے شہر کی جانب چل نکلتے ہیں لنچ سے فارغ ہو کر وہ ایک پارک میں بیٹھ جاتے ہیں۔ امن مکھنی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریا راوی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی اس طرح پنجاب کے دریا راوی سے ملنے والی اجنبی لڑکی مہک کے نام سے سندھ کے ضلع گھوٹکی کے مضافاتی گاؤں چندن پور میں پہنچ گئی۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ دریا میں گرنے سے پہلے کی زندگی کے بارے میں آپ کو کچھ پتا ہے۔ امن بتاتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے اذہان و قلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہو کر اس کے روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنی نے کہنا شروع کیا۔ آج میں بدعقیدہ لوگوں کے دماغ کھول کر رہوں گی، دنیا کے سارے عقیدے توحید پر بنی ہیں۔ ہر مذہب کی تعریف کی جاسکتی ہے لیکن ہندومت کی نہیں کی جاسکتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں بیل، کچھوا، پیپل تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔

مکھنی کہتی ہے کہ میں نے ہندو مذہب کے بارے میں بتا دیا ہے اب کچھ اسلام کے بارے میں بھی عرض کروں، لہٰذا خاموشی سے میری بات سنی جائے۔ مکھنی کی لب و لہجے کا ان پر خاص اثر ہوا اور وہ لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

(اور اب آگے پڑھیے)

اسلام کا معنی ہے اطاعت و فرماں برداری، ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا۔ جو شخص خود کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عبادت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرے، کیوں کہ ہندوؤں کی طرح یہاں بے شمار دیوتا اور خداؤں کا تصور نہیں۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر مذہب ہے کہ ہم دنیا کے تمام مذاہب پر تقابلی نظر ڈالتے ہیں، تو ان میں اسلامی تعلیمات کو کسی نہ کسی صورت کارفرما پاتے ہیں لیکن چوں کہ دیگر تمام مذاہب میں شرک و بدعات ہیں، اس لیے



انہیں اسلام نہیں کہا جاسکتا۔ اسلام کے پانچ اصول ہیں۔

خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان۔ اسی طرح پانچ ارکان اسلام ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا دلی اقرار و تصدیق، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا معبود نہ سمجھا جائے۔ نماز کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ نفس کو مار کر رمضان المبارک کے روزے رکھے جائیں۔ اپنے مال سے زکواۃ کی صورت غریب و مساکین کا حصہ ادا کیا جائے اور صاحب حیثیت ہو تو بیت اللہ شریف میں حج کیا جائے۔

اسلام کو مکمل کرنے والی الہامی کتاب قرآن مجید ہے۔ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول، نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر وحی کے ذریعے اتاری، قرآن مجید کا نام خود اس کتاب میں وحی کی صورت آیا ہے۔ قرآن اس کتاب کو کہتے ہیں جو تمام علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قرآن کے بارے میں فرمایا۔ ''ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے۔''

''اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا۔ قرآن مجید میں تمام کتب کے علوم سمو دیے گئے ہیں۔''

''تمام بکھری ہوئی انسانیت کو ایک مقام پر جمع کرنے والا ہے۔''

قرآن مجید دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس بات کی تصدیق غیر مسلم منکرین اور مبصرین نے بھی دی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا میں اس بات کا واضح اقرار کیا گیا ہے۔ ''قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔''

قرآن مجید ایسی کتاب ہے، جس کی تشریح کے لیے ہزارہا کتب لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ تفاسیر ایسی بھی ہیں جن کی سو سے زیادہ جلدیں ہیں۔ قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو ازل سے اب تک اپنی اصل حالت میں جوں کی توں موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، جبکہ دیگر تمام مذاہب کی کتابوں میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

اب آخری بات! اب جو میں آپ لوگوں کو بتانے جا رہی ہوں۔ یہ انتہائی اہم اور قابل غور بات ہے۔ چار وید ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ جسے آکاشی یعنی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے، حالاں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں، کیوں کہ قرآن مجید مسلمانوں کی کتاب حضرت محمد ﷺ پر اُتاری گئی، عیسائیوں کی کتاب انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، یہودیوں کی توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اُتاری گئی، مگر یہ وید کس پر اُتاری گئی، ہندوؤں کی کتاب نہ بتا سکی، نہ کوئی پنڈت اس بات کی تصدیق کر سکا، مگر ہندوؤں کی اتھروید میں کیا لکھا ہے؟ سنو اور غور کرو۔

''کوئی پنڈت اس وقت تک نہیں مرتا، جب تک کہ وہ اپنے بیٹے کو ان کہی نہ کہہ دے۔ اپنے بیٹے کو کلمہ نہ پڑھا دے، اے میرے بیٹے مرنے سے پہلے لاالہ الااللہ پڑھ لینا تیرے سارے پاپ ختم ہو جائیں گے۔

اسی طرح یجروید میں لکھا ہے۔

''اے لوگو! محمد ﷺ نامی آدمی دھرتی پر آئے گا، وہ اندھیرے کو ناش (ختم) کرے گا۔''

اس کائنات میں بھی اصل اندھیرا ہے۔ اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے روشنی چاہیے۔ اس اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورج کا نظام بنایا۔ ایک اندھیرا دل کا ہوتا ہے۔ اگر دل اندھیرے میں ڈوب جائے تو اسے دن کی روشنی روشن نہیں کر سکتی۔ دل کے اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے حضرت محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔ انہوں نے آکر نہ صرف دل کے اندھیرے کو روشنی میں بدلا بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا۔ قوموں، سماج، معاشرے اور کائنات سے برائیوں کو ختم کیا۔ اب رگ وید کی بات بتاتی سناتی ہوں۔ ہندوؤں کے چار ویدوں سے ایک رگ وید بھی ہے۔ اس میں آتا ہے جس میں ''ممرت رن'' (آگہی) کا لفظ 31 بار آتا ہے۔ یہ ورد جہاں مکمل ہوتا ہے۔ اس سے آگے لکھا ہے، ''اے میرے ماننے والو! آخری کتاب جو نبی لے کر آئے گا، اس نبی کی کتاب میں ایک منتر 31 بار لکھا ہوا ہوگا۔ جب 31 بار

کوئی منتر لکھا ہوا ملے تو سمجھ لینا وہی آخری دھرم ہے۔ وہ سچا دھرم اور آخری راستہ ہے۔ آپ لوگ رگ وید پڑھو، پھر قرآن پاک کی سورۃ رحمٰن دیکھو، اس میں 31 بار ایک منتر ملے گا۔

ترجمہ: ”تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

رگ وید نے گواہی دے دی۔ قرآن آخری اور سچی کتاب ہے۔ اتھر وید نے اقرار کرلیا۔

یجر وید نے بتادیا۔ اندھیرے کو ناش کرنے والا نبی محمد ﷺ آئے گا، میں کہہ کر چپ کر ہوگئی۔

آخری بات کرتی ہوں، مجھے معلوم ہے آپ لوگ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہو اور مجھے بھی بھگوان کا اوتار سمجھ کر پوجتے ہو، حالاں کہ میں اقرار کرتی ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ جو کچھ میری لاعلمی میں میرے ساتھ ہوا، اس کی میں اپنے رب سے معافی کی طلب گار ہوں، مگر آئندہ سے کوئی ایسا کام نہیں ہوگا۔ آپ لوگوں کی لائبریری سے میں نے مہا بھارت بھی پڑھی، رامائن اور بھگوت گیتا پڑھی، اسی میں قرآن مجید کو بھی پایا، اب آپ لوگ ان کتابوں کا موازنہ کرلینا، میں چند دنوں بعد آپ لوگوں سے ملوں گی، اسلام کی دعوت لے کر......اب آپ تمام لوگوں کو مسلمان ہونا ہے۔“

میرے آخری الفاظ نے وہاں ہلچل مچادی تھی۔ امن کے چہرے پر غم و فکر کی لہریں تھیں، جبکہ دیگر افراد کے چہروں پر غصہ اور نفرت تھی، شاید ان کے دلوں میں میرا بت پاش پاش ہوگیا تھا، میں لمحوں میں آسمان سے گر کر زمین کی پستی میں آ گئی تھی۔ میں خدا سے انسان ہوگئی تھی، چوں کہ میں نے لکڑیوں کے خشک ڈھیر میں آگ کی تیلی پھینک دی تھی، اس لیے ان کا جلنا لازمی تھا۔ میں انہیں اس آگ میں جلتا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

وہ رات اور اگلے دن کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ دوسرے دن عصر کے وقت امن میرے کمرے میں داخل ہوا، اسے دیکھ کر میں نے کہا۔

”آؤ امن۔ مجھے یقین تھا، میرے پاس صرف تمہی آؤ گے“ یہ کہتے ہوئے میں نے امن کو دیکھا اس کی سانس میں تیزی بھی تھی۔ مجھے لگا وہ عجلت میں تیز قدموں سے بھاگ کر آیا ہے، میں اس کا سبب پوچھنے ہی والی تھی کہ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”مہک! آج شام اندھیرا پھیلتے ہی آپ کو یہ گھر چھوڑنا ہے۔“

”گھر چھوڑنا ہے۔ یوں اچانک؟“ امن کی بات اور انداز و اطوار نے مجھے شدید جھٹکا دیا۔ ”مگر کیوں امن؟“

”مہک! آپ کی کل والی باتوں سے حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ رات بھر گھر میں عجیب طرح کی ہلچل مچی رہی، تمام گھر والے سر جوڑ کر بیٹھے تو اس بار سارے ووٹ آپ کے خلاف چلے گئے۔“

”کیا مطلب امن! کھل کر بتایئے، کیا ماجرا ہے؟“

”مہک! تایا اور چھوٹے چچا نے آپ کی پچھلی باتوں سے بھی اہم نکتے نکالے ہیں، پھر نرملا کا معاملہ اور کل کا واقعہ، زنجیر کی ساری کڑیاں ملا کر وہ لوگ ڈیڈی کو باور کروانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ آپ ازل سے ایک مسلمان لڑکی تھیں، اس لیے۔“ امن کہتے کہتے رک گیا۔

”آگے بولو امن!“

”وہ آپ کو مارنے کے درپے ہوگئے ہیں۔“ امن کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جس لڑکی کو وہ بھگوان کا اوتار سمجھ کر اس کی پرارتھنا کرتے رہے، اس کی بندگی کرتے رہے، اب اسی لڑکی کو قتل کریں گے۔“

”مہک! آپ سمجھنے کی کوشش کریں، تب کی بات اور تھی اور اب کی بات اور ہے۔“

”میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں امن، جس دھرم میں بھگوانوں کی تعداد ہزاروں میں ہو، اس دھرم میں کسی کو بھگوان بنادینا اور پھر اسے اس منصب سے ہٹادینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔“

”مہک، آپ کچھ بھی کہیے......میں۔“

”مجھے بات پوری کرنے دو امن، میں جب تک تمہارے گھر والوں کو ان کے ماڈی فائدے کی باتیں بتاتی رہی،

بھگوان کے منصب پر فائز رہی، اب ان کی منشا کے خلاف حق اور سچ بات کہی تو میں واجب القتل ہو گئی۔"

"میں جانتا ہوں مہک۔ یہ ٹھیک نہیں ہے، مگر میں نے کہا نا کہ گھر کے سارے افراد آپ کے خلاف ہیں، میری کوئی نہیں سنتا۔ لے دے کر ایک نرملا ہے، جس کے دل میں آپ کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔"

"اور آپ کے دل میں امن؟" میرے اس سوال پر امن چپ ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"امن! آپ مجھے یہ قتل کی اطلاع کیوں دینے چلے آئے ہیں، کیا آپ گھر والوں کا ساتھ نہیں دیں گے، مسلمان ہونے کی دعوت تو میں نے آپ کو بھی دی تھی، کیا آپ مجھ پر خنجر کا وار نہیں کریں گے۔"

"مہک!" امن میرا نام لے کر خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی، کمرے کے اندر بھی سناٹے تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے امن کہیں دور چلا گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کے گہرے بادل چھا گئے تھے، بہت سے لمحات خاموشی کی نذر ہو گئے، میں امن کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ انتہائی سنجیدگی میں بولا۔

"میری بات کو چھوڑو مہک، بلکہ یہاں سے جانے کا سوچو۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کی، خود کو نارمل کیا اور پوچھا۔

"امن شام کے اندھیرے میں، میں جاؤں گی کہاں؟ یہ تمام علاقہ اور علاقے کے مکین میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ دو دن پہلے انکل فہیم لاہور سے لوٹے ہیں، وہ کل آپ کے پاس یہاں آنے والے تھے، وہ مسلمان بھی ہیں اور آپ کے احسان مند بھی ہیں۔ میں فون کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہوں، فی الحال آپ ان کے پاس چلی جائیں۔"

"میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی امن۔"

"مہک، سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"کیا سمجھنے کی کوشش کروں، کل تک آپ لوگ میرے احسان مند تھے تو میں بھگوان تھی، آج انکل فہیم احسان مند ہیں تو ان کے لیے خدا بن جاؤں۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ کل مجھے قتل کرنے کے لیے بے چین نہیں ہوں گے۔"

"مہک! وہ مسلمان ہیں، وہ ایسا بھی نہیں کریں گے۔"

"مسلمان ہیں امن، مگر اس نے بھی تو آپ کے بھگوان سے ہی مدد چاہی تھی، میرے پاس آیا تھا، اللہ سے کیوں رجوع نہ کیا۔"

"مہک یہ سوال آپ خود انکل فہیم سے پوچھ لینا، آپ کا جانا بے حد ضروری ہے۔"

"میں مرنے سے نہیں ڈرتی امن، ویسے بھی میرا آگے پیچھے ہے ہی کون جو میری لاش پر روئے گا۔"

شاید میرے لہجے میں دکھ کا عنصر غالب تھا، امن کو چپ لگ گئی۔ کمرے میں ایک بار پھر سناٹا گیا۔ اب کی بار امن بولا تو اس کے لہجے میں کرب انگیزی کی انتہا تھی۔

"کاش امیں آپ کو آپ کے گھر والوں کے بارے میں کچھ بتا سکتا، مگر جتنا میں بتا چکا ہوں افسوس کہ اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو پھر مرنے دو مجھے امن۔ ہاں ایک مہربانی کرنا، مجھے جلانا مت قبر میں دفن کر دینا۔"

"نن...... نہیں مہک۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" امن آگے بڑھا۔ میرے قریب ہوا، بہت قریب۔

"مہک تمہارے بدلے میں مر جاؤں گا، مگر ایسا کبھی ہونے نہیں دوں گا کہ کوئی تمہیں گزند پہنچائے۔" اس بار نہ صرف امن نے آپ کا تکلف چھوڑ دیا تھا، بلکہ بے اختیار میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"کیوں؟ آپ کیوں ایسا ہونے نہیں دیں گے، آپ میرے کیا لگتے ہیں۔" میرے سوال پر امن نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے، چل کر دائیں جانب کی کھڑکی کے پاس گیا۔ میں نے اسے پشت سے دیکھا، وہ کھڑکی کے اس پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا کچھ نہیں لگتا مہک، مگر......" چند لمحے کی خاموشی پھر تاسف بھری آواز...... "مگر آپ میری بہت کچھ لگتی ہیں۔" وہ ایک بار پھر آپ پر اتر آیا تھا، شاید سوچ نے جذبات کی جگہ دھر لی تھی۔ میں تھوڑا سا امن کے نزدیک ہو کر بولی۔

"میں جاننا چاہتی ہوں۔ امن میں آپ کی کیا لگتی ہوں۔" میرے اس سوال پر وہ جارحانہ انداز میں پلٹا اور غصے میں بولا۔ میں ہر بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں، میں نہیں بتا سکتا کہ آپ میری کیا لگتی ہو۔" وہ صرف ایک لمحہ رُکا پھر ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ "آپ کو انکل فہیم کے گھر چلنا ہے بس، اس سے آگے میں کچھ نہیں سنوں گا۔"

میں اس سے دو تین منٹ کے فاصلے پر تھی، دھیرے قدموں سے چل کر اس کے قریب ہو گئی۔ اس کے اور میرے قدم میں آٹھ دس انچ کا فرق تھا، میں نے نظریں اُٹھا کر اس کے سفید مگر جذبات سے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اضطراری حالت میں اس کے ہاتھ باہم پیوست ہو رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ امن۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ میں دنیا میں اکیلی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے ڈانٹ کر اور اپنا حکم جتا کر مجھے بتا دیا کہ میرا بھی کوئی ہے۔" فرط جذبات میں میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے گالوں پر انگلیوں کے لمس کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا امن میرے آنسو انگلیوں کی پوروں سے صاف کر رہا ہے۔

"اگر یہ بات ہے مہک، تو پلیز میری بات مان لو۔"

"ٹھیک ہے، مگر ایک شرط پر۔"

"کون سی شرط؟"

"آج کے بعد جب بھی ملیں گے، آپ مجھے تم کہہ کر پکارو گے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ایک شرط پر۔" امن نے بالکل میرے لہجے میں میرے الفاظ کو دہرایا۔

"بولیے۔"

"تم بھی مجھے تم کہہ کر پکارو گی۔"

"بہت مشکل ہے، مگر کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں، پکا۔"

"ٹھیک ہے امن، مجھے یہ گھر کب چھوڑنا ہوگا۔"

"شام سات بجے کے قریب، تب اندھیرا اتنا گہرا بھی نہیں ہوتا۔ میں تمام گھر والوں کو تمہارے ہی معاملے کے بہانے ایک جگہ جمع کر لوں گا، تب تم عقبی دروازے سے نکل جانا۔" امن نے کہتے ہوئے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "اس پر میں نے ہاتھ سے انکل فہیم کے گھر تک کا نقشہ بنا دیا ہے۔ ان کا گھر اتنا دور نہیں ہے، تم نشان زدہ راستے پر چل کر بیس منٹ تک وہاں پہنچ جاؤ گی۔" میں نے امن کے ہاتھ سے نقشہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"امن! وہ ڈائری پڑھی تھی۔"

"ابھی پڑھ رہا ہوں۔" میں نے پلکیں اُٹھا کر پوچھا۔

"کیا ہم پھر کبھی ملیں گے۔" میرا سوال گہری خاموشی کی نذر ہو گیا۔ میں منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گہری سانس بھری، پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں مہک کاتب تقدیر جانے، ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اچھا سنو۔ میں انکل فہیم کو اچھی طرح سمجھا دوں گا، تمہیں یہاں نہ پا کر میرے گھر والے تمہاری تلاش میں نکلے تو وہاں تک ضرور جائیں گے، مگر انکل فہیم انہیں تسلی دے سکتے ہیں۔" میں نے محسوس کیا امن نے یہ تفصیل محض موضوع بدلنے کے لیے بتائی ہے۔

کہتے ہوئے امن خارجی دروازے کی طرف بڑھا، میں اسے پشت سے دیکھ رہی تھی، دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر وہ رکا۔ میری نگاہیں مسلسل اسی پر مرکوز تھی، امن رُکا ہوا تھا۔ میں اس کے بولنے کی توقع کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹا اور بولا۔ "مہک! میں نے بیس بائیس مہینے تمہیں بھگوان سمجھ کر پوجا، اب جب کہ انسان سمجھا اور مان لیا ہے تو ایک گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔

"گستاخی۔" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "میں بھی نہیں۔" میری باتوں کے دوران امن چل کر میرے پاس آچکا تھا، میری توقع کے برعکس وہ میرے انتہائی نزدیک کھڑا تھا، اس کے جسم سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو میری سانسوں میں تحلیل ہونے لگی، امن انتہائی دکھی لہجے میں بولا۔

"مہک! تمہارا سوال کیا ہم پھر ملیں گے۔ میرے دل پر ایٹم بم کی طرح پھوٹا" اور میرا جواب۔ کاتب تقدیر جانے......

یہ بھی ایسا تیز دھار خنجر تھا جس نے میرا دل چیر کر رکھ دیا ہے، اس لیے...... امن لحظہ بھر رکا، جیسے سانس لے رہا ہو، سانس لینے کے دوران اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے، میرے ہاتھ امن کے ہاتھوں میں آئے تو اس کی سانس تیز ہونے لگی، مجھے کمرے کی فضا میں ایک انوکھی چیز ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہوئی، جیسے کمرا ایک خوب صورت پھولوں سے لدا ہوا چمن ہے، چمن میں بہت ساری حسین و جمیل پریاں ہیں۔ ہر پری ایک پینگ پر بیٹھی ہے اور تیز جھولا لیتی ہے۔ جھولے سے اس کی لمبی گھنی سیاہ زلفیں ہوا میں لہراتی ہیں۔ لمبا دوپٹا اس کے پیچھے لپکتا ہے، پری لمبی پینگ لے کر فضا سے زمین کی طرف لوٹتی ہے، شادمانیوں کے دیے روشن ہیں، میں وہی پری ہوں جسے امن کے ہاتھوں نے جھولا دیا۔ فضا سے واپس پلٹی تو اس کے ہاتھوں نے پکڑ لیا، امن کہہ رہا تھا۔

"اُس عظیم لڑکی کے نام جو جھوٹے بھگوان سے انسان بننے کے ارتقائی عمل سے گزری تو میری دنیا روشن کر دی۔"

امن نے میرے ہاتھوں پر اپنے خوب صورت لب رکھ دیے۔ منع کرنے کی جرأت میرے اندر مفقود ہو گئی، بس مجھے یوں لگا جیسے وقت رک گیا ہے۔ ہم اس دھرتی سے اُٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ جہاں پیار ہی پیار ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، امن کے لب اور میرے ہاتھ۔ یہ حالت یہ کیفیت کب تلک رہی مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔

جب ہوش آیا تو کمرہ خالی تھا۔ ہاں البتہ امن کی خوشبو کا احساس ہنوز قائم تھا۔ امن کا یہ ایک اور بہت بڑا احسان تھا، اس نے آج پہلی بار مجھے احساس دلایا کہ میں ایک لڑکی ہوں، ورنہ اس سے پہلے میری تمام حس دم توڑ چکی تھی، امن کے لبوں نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا۔ میں نے اس جگہ کو چوما جہاں امن کے لب لگے تھے۔ میں نے ہاتھوں کو چومتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "امن تیرا شکریہ۔"

امن کا بتایا ہوا وقت قریب آ گیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں خود بخود تیز ہونے لگیں، جس گھر میں مجھے خداؤں جیسی بلندی، مرتبہ اور عزت ملی، اسی گھر سے مجھے جان بچا کر بھاگنا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے سجے سجائے کمرے پر ڈالی۔ سیاہ چادر اٹھائی جسے اوڑھ کے مجھے بھاگنا تھا۔ امن نے کہا تھا۔ شام سات بجے میں تمام گھر والوں کو جمع کر لوں گا تب تم نے عقبی دروازے سے نکل جانا ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ چپکے سے عقبی دروازے سے نکل کر باہر آ گئی جو نقشہ مجھے امن نے دیا تھا، وہ انتہائی مختصر اور سادہ سا تھا جو با آسانی میرے ذہن میں فٹ ہو گیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ با آسانی انکل فہیم تک پہنچ جاؤں گی، مگر یہ میری خام خیالی تھی، میں ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ پیچھے سے مجھے شور سنائی دیا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ کوئی شخص میری طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ دھیان دیا تو پتا چلا بھاگنے والا امن ہے اور مجھے بھاگ جانے کی تلقین کر رہا ہے۔ "مہک...... جلدی بھاگو...... وہ لوگ آ رہے ہیں...... انہیں پتا چل گیا ہے، ان کی نیت ٹھیک نہیں، یہ تمہیں قتل کر دیں گے۔" امن کے عقب میں مجھے کچھ مزید لوگ نظر آئے۔

"یہ منظر، یہ الفاظ......" میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ مجھے جھٹکے لگنے لگے، مگر میں نے بھاگنا شروع کر دیا، اس دوران یادوں کے دریچے کھلنے لگے، یہ منظر میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، یہ الفاظ یا ان سے ملتے جلتے الفاظ بھی سنے ہیں۔ مگر کہاں......؟ دوڑتے بھاگتے سوال ذہن کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگا۔ کہاں دیکھا ہے ایسا منظر...... کسی فلم میں...... نہیں نہیں...... اپنے جواب کو ذہن نے خود ہی رد کر دیا۔ میری سانس پھول گئی تھی، پیٹ میں ایک گولہ سا اُٹھنے لگا۔ پھیپھڑے پھٹنے کے قریب چلے گئے، مگر مجھے بھاگنا تھا۔ موت پیچھے لگی ہو تو انسان پوری طاقت سے بھاگتا ہے۔ زندگی بہت پیاری ہوتی ہے نا...... عقب سے پھر آوازیں آنے لگیں۔ "مہک ان کے ہاتھ نہ آنا۔ بھاگ جاؤ۔" میں نے مڑ کر دیکھا...... اس بار زمین میں روشن سا گھما کا ہوا میں گرتے گرتے بچی...... مجھے یاد آیا...... بالکل وہی ہے، اسی طرح ہوا تھا

ایسے ہی میرے پیچھے لوگوں کا ایک لشکر بھاگ رہا تھا۔ مجھے قتل کرنے کے لیے بہت سے لوگ بھاگے تھے اور کوئی ہاتھ لہرا لہرا کر مجھے بھاگنے کی تنبیہ کر رہا تھا۔ مہک بھاگ جاؤ...... نہیں مہک نام نہیں تھا۔ کوئی اور تھا...... کیا نام تھا...... ذہن کی سوئی اٹک گئی...... سوچیں دراز ہونے لگیں، مگر نام یاد نہ آیا۔ میں جھنجلا اٹھی، بھاڑ میں جائے نام...... اگلے مناظر یاد آنے لگے۔ آنے والے نے مجھے بھاگنے پر اکسایا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے تہیہ کیا تھا۔ میں انہیں اتنا بھگاؤں گی کہ ان کی سانس پھول جائے گی، دل اندر سے کے مارے گا، بلکہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا، جب مرنے لگیں گے تو میرے سامنے گڑ گڑائیں گے۔ اس بھاگ دوڑ میں ایک نوجوان لڑکا گرا تھا۔ وہ پھوں پھوں کر رہا تھا۔ اوندھے منہ گرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ ریت میں دب گیا تھا۔ وہ زور کی سانس لیتا تو ریت اڑ کر اس کے کانوں اور ناک میں گھسنے لگی، آنکھوں سے پانی اور ناک سے ناک بہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب، اذیت اور شرمندگی کے سارے آثار مجمد تھے۔ میں اس کے پاس انتہائی سکون سے بیٹھی اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے قریب لے گئی اور سورۃ بقرۃ کی یہ آیت پڑھی۔

"ترجمہ: جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کے، جب بھی وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں اس لیے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے۔"

اس کا نام...... میرا دماغ پکار اٹھا، سوئی پھر اٹک گئی، میرا پارہ بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اچانک دل پکار اٹھا، اس کا نام جنید تھا۔ ہاں بالکل۔ میں خوشی سے جھوم اٹھی، میرا دل چاہا دل کو چوم لوں۔

واقعی اس کا نام جنید تھا۔ میں نے جب اس کو قرآن مجید سنایا تھا تو اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرنے کو کہا تھا۔ "مہک...... مہک...... یہ آوازیں مجھے عقب سے سنائی دی تھی، یہ آواز امن کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ نہ آنا ان کے سروں پر خون سوار ہے، یہ سب پاگل ہو گئے ہیں۔"

میں نے رفتار میں اضافہ کر دیا، پہلا واقعہ بھی ساتھ چل رہا تھا، جنید سے گفتگو کے بعد میں پھر بھاگی تھی اور پھر ایک پل آیا تھا۔ میں رکی تو میری جانب ایک نوکدار نیزہ بڑھا تھا۔ نیزہ میری آنکھوں میں لگا تھا اور میں کسی گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ ہوش آیا تو امن کے گھر میں تھی، اوہ میرے خدا...... کیا اب پھر سے ویسا ہی کچھ ہونے والا ہے، کیا میں ایک اور تیر کھاؤں گی، پھر سے بے ہوش ہو جاؤں گی، اس بار نجانے کہاں آنکھ کھلے، میں یہی کچھ سوچتی ہوئی بھاگتی جا رہی تھی کہ اچانک میرے سامنے نجانے کہاں سے گاڑی آ گئی۔ میں اپنی رفتار پر قابو نہ پا سکی۔ گاڑی نے بریک پکڑے مگر رک نہ سکی نتیجتاً میں گاڑی سے ٹکرا گئی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس بحال نہ رکھ سکی۔ میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆

میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو میرے دل کو جھٹکا لگا۔ بلاشبہ وہ بے حد خوب صورت تھی، بلکہ خوب صورتی کا خوب صورت مرقع تھی۔ اس کے تن پر میلے کچیلے کپڑے ہی حسن کی چکا چوند روشنی کو متاثر نہ کر سکے۔ میلے کپڑوں میں اس کا چہرہ گھرے سیاہ بادلوں میں ابھرنے والے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میری فطرت میں نزاکت تھی، خوب صورتی میری کمزوری تھی۔ میں اس پارک میں فطرت کی خوب صورتی سے محظوظ ہونے کے لیے جایا کرتا تھا۔ میں وہاں پھولوں، کلیوں، پودوں اور تتلیوں کا نظارہ کرنے آیا تھا، مگر میری آنکھوں نے چلتی پھرتی پری دیکھ لی تھی۔ میرا دل پہلی ہی نظر میں اس نے مٹھی میں بھر لیا۔ میں کئی لمحے محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے بھی غزالی آنکھیں میرے چہرے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مجھے اور میں اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر دیکھتے رہے۔ ہماری محویت ایک آواز نے توڑی۔ اس کے ہمراہ ایک دوسری لڑکی بھی تھی، حلیے میں یکساں مگر حسن میں متضاد۔ جیسے میری آنکھوں نے دیکھا وہ حسن میں یکتا تھی۔ بے مثل اور بے نظیر...... پہلی بار مجھے پتا چلا، جس طرح خوشبو چھپائے نہیں چھپتی اسی طرح حسن بھی چھپائے نہیں چھپتا۔ حسن ظاہر ہو کر رہتا ہے، چاہے اس پر میل کچیل کا لبادہ ہی اوڑھ لیا جائے۔ ایک بار حسن کے پیکر کو دیکھ لو تو نظروں کا

مطالبہ زور پکڑ گیا۔ بار بار دیکھنا ہے، مگر وہ جا چکی تھی اگلے دن میں پھر اسی پارک میں اسی جگہ اسی وقت موجود تھا۔ آنکھوں میں امید کے دیے روشن تھے، دل کو دیدار حسن کا یقین تھا۔ ساری بات یقین کی ہوتی ہے، دل کو جس بات کا یقین ہو وہ ہو ہی جاتی ہے، حسن کا چلتا پھرتا مجسمہ اسی ٹائم جلوہ افروز ہوا، حالت اور محافظ کل والے ہی تھے۔ چمن میں بہاریں رقص کرنے لگیں، پھول کھلکھلانے لگے، ہوائیں چلنے لگیں۔ بے قرار نگاہیں ایک بار پھر لازوال حسن میں کھب گئی، اس بار نگاہیں ایسی گم ہوئیں کہ حسن کے آر پار ہی کہیں رہ گئیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے دل میں جلنے والی آگ نے اس کے دل میں بھی گرم حرارت پہنچادی تھی۔ وہ بھی جلنے لگی تھی جب آگ دونوں طرف یکساں جلی تو بات ہوئی، بات سے ملاقات اور ملاقات سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ میں نے اسے جھونپڑی سے نکال کر اپنے محل میں لانے کا سوچ لیا تھا۔ وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی تھی، ہیرے کا پتھر لوہار کی بھٹی میں جل رہا تھا۔ اسے سُنار کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کئی عہد و پیمان کیے۔ ایک دن اسے گھر بلا کر پورا گھر دکھایا۔ اپنا بیڈ روم دکھایا کہ اس میں تمہاری کمی ہے، اس دن میں گھر میں اکیلا تھا، کہتے ہیں جب نوجوان لڑکی اور لڑکا اکیلے ہوں تو ان کے بیچ میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ بس ہمیں بھی سمجھ نہیں آئی۔ پیار پیار میں وہ ہو گیا جس کا میں نے قطعی سوچا نہیں تھا۔ امیر سے ایک دن وہ کہنے لگی۔

”میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی، اس بات کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ شادی پر زور دینے لگی مگر میرا دل رضامند نہ ہوا۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جو شادی سے پہلے ماں بننے والی ہو۔ چاہے وہ میرے ہی بچے کی ماں بننے والی تھی، مگر میں خود کو آمادہ نہ کرسکا، میں اس سے جان چھڑانے لگا۔ کئی بار اسے ابارشن کرانے کا کہا مگر وہ نہ مانی۔ میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا اور اپنی دنیا میں مگن ہو گیا۔ وہ بھی بہت عرصہ ہوا مجھے نہیں ملی، میں سمجھا کہ شاید آزاد ہو گیا ہوں۔ اس وقت ہمارا بزنس عروج پر تھا، میں بزنس ٹور پر چائنا اور ہانگ کانگ جانے لگا۔ وہ میرے ذہن سے محو ہو گئی، میں اسے یکسر بھول چکا تھا، مگر وہ پھر سے میرے سامنے آ گئی، اس کے ساتھ چار سالہ بچی تھی، اس نے کہا یہ ہماری بچی ہے، اپنی بچی پر رحم کھاؤ۔ میں پریشان ہو گیا، اس وقت میری شادی کی تیاریاں شروع تھیں، اس موقع پر اس کی آمد میری پریشانیوں میں بے حد اضافہ کر گئی۔ جس کا اظہار میں نے اپنے دوست نصیر احمد سے کیا تو وہ بولا۔ ”فکر مت کرو، میں اس کا ایسا بندوبست کروں گا کہ تمام عمر تمہیں اپنی شکل نہ دکھائے گی۔“ نصیر احمد کے ساتھ مل کر میں نے اسے بچی سمیت چند غیر قانونی عناصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کے بعد واقعی وہ مجھے کبھی نظر نہ آئی، میں نے شادی کرلی، مگر شادی ہوتے ہی میرے بزنس میں زوال اُتر آیا، میرا آئے دن نقصان ہونے لگا۔ وسیع و عریض بزنس سکڑنے لگا۔ جب یہ تناسب بہت بڑھ گیا تو ڈیڈی نے مجھے تنہا بلا کر کہا اولاد مرد کی قسمت میں اور پیسا عورت کی قسمت میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے تمہاری بیوی کی قسمت میں دولت نہیں...... اس سے پہلے کہ اس کا مقدر ہمیں فٹ پاتھ پر لا کھڑا کرے اس سے جان چھڑاؤ...... ڈیڈی کی بات میرے دل کو لگی تو میں نے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کرلی، بزنس میں ٹھہراؤ آ گیا، میں اپنی سابقہ ڈگر پر چل پڑا، مگر ایک اور عذاب میرا منتظر تھا۔ مجھے اولاد نرینہ نصیب ہوئی، مگر دو ماہ بعد میرا لخت جگر ہمیں تڑپتا سسکتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا۔ چند ماہ تک میں اپنی بیوی اور دل کو تسلی دینے میں کامیاب ہوا۔ ایک سال بعد اُمید کی ایک اور کرن نظر آئی، آنگن میں کھلنے والے نئے پھول کی خوشبو سے پرانے زخم بھی ڈھل جائیں گے۔ لائبہ بھی خوش تھی، ورنہ وہ پہلے بچے کی موت کے بعد ہنسنا بھول گئی تھی، دن قریب آتے گئے اور ہم اس کی خوشیوں میں مگن تیاریاں کرتے رہے، مگر آسمان والا ہماری تیاریوں پر مسکرا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے میرے کیے کی سزا اتنی بھیانک ملے گی۔ اس بار میرے آنگن میں بچی کی شکل میں پھول کھلا، مگر وہ دیر پا مسکرا نہ سکا، صرف ایک ہفتے بعد یہ خوشی بھی ہم سے چھن گئی۔ مالی نقصان رُکا تو جانی نقصان شروع ہو گیا، یہ نقصان پچھلے نقصان سے کئی گنا ہوا تھا۔ ہم نے منت منوتی شروع کردی، کوئی خانقاہ، کوئی مزار نہیں چھوڑا۔ کوئی زندہ یا مردہ پیر ایسا نہیں جس کی خدمت میں حاضری نہ دی ہو۔ چڑھاوے بھی چڑھائے اور دیگیں بھی پکائیں، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کوئی اضافہ نہ ہوا۔ لائبہ نے مجھے چار اولادیں دیں مگر ایک بھی نمو نہ پا سکی۔ حالات نے مجھے اس قدر بدحواس کر دیا کہ اس بار لائبہ کے نام طلاق کا قرعہ فال نکلا۔ لائبہ کے بعد

ثمینہ اور پھر اقرا سے شادیاں رچائیں، مگر یکے بعد دیگرے میری سات اولادیں اللہ کو پیاری ہوتی گئیں، میرے اندر اور باہر کے حالات دگرگوں ہوتے گئے، میں نے لائبہ، ثمینہ اور اقرا سب کو طلاقوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس دوران مجھے ایک بزرگ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''جب ایمان خطرے میں ہو تو ہجرت فرض ہو جاتی ہے، تیرے حالات تجھے کس نہج پر لے جائیں، پتا نہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ شہر چھوڑ کر کسی دوسری بستی جا کر ٹھہرو۔ سکونت کے لیے شہر کی بجائے گاؤں کا انتخاب کرنا۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' اس طرح میں لاہور چھوڑ کر سندھ کے ضلع گھوٹکی میں چلا آیا۔ یہاں اپنا مکمل سیٹ اپ بنایا، اس سیٹ اپ میں دو تین سال بیت گئے۔ تین سالوں بعد میں نے پھر سے شادی کا سوچا، اس بار میری زندگی میں گھوٹکی کے امیر گھرانے کی لڑکی مسرت داخل ہوئی۔ اس شادی کا نتیجہ بھی صفر نکلا۔ مجھے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ زندگی جست پہ جست لیتی رہی۔ شباب کے دن ڈھلنے لگے، رگوں میں دوڑنے والے خون کی حرارتیں ماند پڑنے لگیں، اولاد کی خواہش دل میں زور پکڑتی گئی، مگر میں مقدر کو جیت نہ کر سکا۔ پچاس سال کی عمر کو پہنچا تو میں نے ہار مان لی۔ مسرت ابھی جوان تھی، اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہو گی، اس لیے میں نے اس سے فراخ دلی سے کہا۔

''مسرت! میں نے اولاد کی خاطر بہت جتن کیے، مگر میرے مقدر میں زندہ اولاد نہیں لکھی۔ تم ابھی جوان ہو، تمہاری بھی بہت سی خواہشات ہوں گی، میں تمہارے ارمانوں کا مزید گلہ گھونٹ نہیں سکتا۔ اس لیے تم کہیں اور شادی کرنا چاہو تو میں تمہیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں، میری کشتی میں تو ویسے بھی سوراخ ہے، مجھے تو ڈوبنا ہی ہے، ساتھ میں تمہیں کیوں لے ڈوبوں۔''

مسرت میرے قریب آ کر بولی۔

''آپ کو سر کا تاج مانا ہے، سر سے تاج اتر جائے تو بندہ بے آبرو ہو کر آسمان سے زمین پر گر جاتا ہے۔ میں اس بلندی پر بہت خوش ہوں جو آپ کی نسبت سے مجھے ملی ہے۔ مقدر میں اولاد کی خوشی ہوئی تو مل جائے گی، ورنہ دنیا میں بہت سے ایسے جوڑے ہیں جن کے اولاد نہیں۔''

حسرت نے مجھے خرید لیا تھا، مگر اولاد کی خواہش نہ وہ دل سے نکال پائی نہ میں۔

قدم چند کے ساتھ میرا کاروباری تعلق تھا۔ ہم بہت اچھے دوست بھی تھے۔ تقریباً دو سال پہلے وہ لوگ لاہور گئے تھے۔ واپس آنے کے دو ماہ بعد جب ہم ملے تو قدم چند نے مجھے مشورہ دیا کہ کوئی بچہ گود لے لو۔ میں ابھی کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ راز دارانہ لہجے میں بولا۔

''فہیم کل شام میرے گھر آنا۔ تمہیں بھگوان سے ملواؤں گا۔ اس سے مشورہ مانگنا، مجھے امید ہے تمہاری ساری پریشانی رفع ہو جائے گی۔'' قدم چند کی بات مجھے دلی طور پر بے حد بری لگی، میں چاہنے کے باوجود چہرے کے بل نہ چھپا سکا۔ جنہیں دیکھ کر قدم فوراً بولا۔

''فہیم! لاہور سے ہم ایک لڑکی ساتھ لائے ہیں وہ بظاہر عام سی لڑکی ہے، مگر در حقیقت بھگوان کا اوتار ہے، جو کہتی ہے ہو کر رہتا ہے، بس اس کا کہا کہنا ضروری ہے۔''

قدم چند کی بات میں سمجھ نہیں پایا۔ میں حیران بھی تھا، قدم لاہور سے آئے تمہیں دو ماہ ہو چکے ہیں، اس دوران میں کئی بار تمہارے گھر گیا۔ مجھے تو کوئی لڑکی نظر نہیں آئی، قدم چند مسکرا کر بولا۔

''پاگل ایسی انمول اور نایاب ہیرے بندہ مخفی رکھتا ہے۔ ہم نے آج تک خاندان کے کسی فرد کو اس کی ہوا لگنے نہیں دی۔''

قدم چند کی باتوں نے مجھے پُر تجسس کر دیا۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر لڑکی سے ملا۔ وہ واقعی مافوق الفطرت قوتوں کی مالک تھی۔ عجیب و غریب استعاروں میں باتیں کرتی تھی، اس نے مجھے لاہور بھیجا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی لاہور چلا گیا۔ مبادا وہاں مجھے کچھ سمجھ آ جائے، مگر میں مایوس لوٹ آیا، لیکن دوسری بار اس نے کمال حیرانگی سے سپاٹ دیوار کو

روشن کر دیا۔ اسکرین پر مجھے قبرستان نظر آیا، جسے دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میرے ذہن میں ایک نام ضربیں لگانے لگا۔ وہ نام خانہ بدوشوں کی لڑکی جمیلہ کا تھا، جسے میں نے چاہا تھا، مگر اسے اپنا نہ سکا، مجھے لاہور میں ہی پتا چل گیا تھا، جمیلہ نے ٹرین کے ساتھ ٹکرا کر خودکشی کر لی تھی، میں بھاگم بھاگ لاہور پہنچا۔ خانہ بدوشوں کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا، میں خانہ بدوشوں کی ساری بستیاں کھنگالنے لگا۔ مجھے جمیلہ کی سہیلی سکینہ کی تلاش تھی۔

اس تلاش میں مجھے دو ماہ بیت گئے، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری سکینہ کو ڈھونڈ کر دم لیا، سکینہ بوڑھی ہو چکی تھی مگر مجھے پہچان لیا۔ اسی نے جمیلہ کی قبر تک میری رسائی کی اور یہ دل سوز خبر بھی سنائی کہ میری بیٹی عظمٰی لاہور کی مشہور نائیکہ میڈم خانم کے کوٹھے پر مجرا کرتی ہے۔ اس وقت وجدان کے دروازے مجھ پر وا ہو گئے۔ میری سات فوت شدہ اولادوں کی شکلیں میری سامنے شکوہ کناں ہو گئیں۔ اس کے معصوم چہروں پر میرے لیے سوال تھا۔

''پاپا! آپ اپنی بیٹی اپنے خون کو بھلا بیٹھے تھے۔ کیا عظمٰی کی رگوں میں آپ کا خون محو گردش نہیں۔ آپ اور آپ کی محبت جمیلہ کے مابین عظمٰی کا کیا قصور ہے۔'' میں سمجھ گیا مجھے میرے کیے کی سزا ملی ہے اور اب شاید یہ سزا بھی پوری ہو چکی ہے، میں اس خبر پر لرزاں براندم ہو گیا۔ میرے دل نے اسی وقت فیصلہ کیا۔ چاہے مجھے جھونپڑی میں رہنا پڑے، فروٹ کی ریڑھی لگانا پڑے، میں سب کچھ کر گزروں گا۔ مگر اپنی بیٹی عظمٰی کو خانم کے کوٹھے سے آزاد کراؤں گا۔ اسے اپنے پاس اپنی محبت اور شفقت کے سائے میں رکھوں گا۔ اس کے سارے قرض اتار دوں گا۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ عظمٰی کو دولت میں تول کر لانا پڑا تو لاؤں گا، ترازو کے ایک پلڑے میں عظمٰی کو رکھوں گا اور دوسرے پلڑے میں نوٹوں کے انبار لگاؤں گا، میں نے پہلے جمیلہ کی قبر پر جا کر معافی مانگی، مٹی ڈالی اس کی ڈھلوانیں درست کیں، پانی کا چھڑکاؤ کیا اور چونا ڈالا، پھر آنسوؤں کی قطار میں جمیلہ سے معافی مانگی۔

اس کے حق میں دعائے مغفرت کی اور اپنی آنکھوں سے آنسو بہا کر دل کو ہلکا کرتا رہا۔ جب دل ہلکا ہوا تو ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے اندر لپکا۔ میرا دوست نصیر احمد، دو نمبر دھندے میں نامور شخصیت تھا۔ گئے وقتوں میں اس نے جمیلہ سے جان چھڑانے میں میری مدد کی تھی۔ آج پھر وہی کام آئے گا، اب تو وہ زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا، میں نے اس سے رابطہ کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

''لگتا ہے مسلمان ہو گئے ہو۔''

جو بھی سمجھ نصیر..... مگر خدا کے لیے میری بیٹی کو اس چنگل سے نکالو۔ جتنی دولت لگتی ہے، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ خانم کو منہ مانگی رقم دے دو۔''

''ارے میرے دوست! اگر یوں نصیر احمد چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے روپے دینے لگے تو جرم کی دنیا میں اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔''

فکر مت کرو۔ جہاں بھی ٹھہرے ہو، دودھ اُبالو، ٹھنڈا کرو اور پی کر سو جاؤ۔ چند دنوں میں تمہاری بیٹی تمہارے پاس ہو گی۔'' نصیر نے جو کہا چار دنوں میں سچ کر دکھایا۔ چوتھے دن میرا خون میری بیٹی عظمٰی میرے سامنے تھی۔ جس طرح میں نے جمیلہ کی قبر سے لپٹ کر آنسوؤں کی قطار میں معافی مانگی تھی۔ اسی طرح میں عظمٰی کے قدموں میں گر گیا، مگر میری بیٹی عظمت کا پیکر ہے، فوراً مجھے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا، اس لمحے ہم باپ بیٹی نے خوب آنسو بہایا۔ جب دل کا غبار اترا تو عظمٰی خوشی سے شرمسار لہجے میں بولی۔ اکیس سالوں بعد آنسو بہائے ہیں، آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں، میں نے نصیر احمد کا شکریہ ادا کیا اور عظمٰی کو لے کر واپس اپنے گھر چلا آیا۔ آپ کے پاس جانے کی تیاری تھی کہ امن نے فون پر ناقابل یقین روداد سنائی۔

انکل آپ تو ماشاء اللہ مسلمان ہیں، پھر آپ کیسے مجھے بھگوان سمجھ کر میرے چرنوں میں چلے آئے تھے، میرے سوال پر انکل نعیم کا چہرہ ہلدی ہو گیا۔ وہ خوف سے بولا۔

''خدا نہ کرے بیٹی کہ میں ایسا مشرکانہ عمل رکھوں، یا سوچوں بھی..... جب میری اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو میں نے بہت

سی مشرکانہ حرکتیں کی تھیں، مگر جس بزرگ نے مجھے شہر چھوڑنے کی تلقین کی تھی، اسی نے مجھے توحید کا درس بھی دیا تھا۔ میں آپ کو بھگوان کا اوتار سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ کی ولیہ سمجھ کر گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنے پیارے نبیوں کو معجزات عطا کیے ہیں تو بہت سی کرامات اولیائے کرام کو بھی بخشی ہیں۔"

"بالکل انکل۔ مشکلات ومصائب میں، حالات کی گردشوں میں لینے اور دینے کے تمام معاملات میں صرف اللہ کو پکارنا چاہیے اور وہ مہربان رب خود قرآن میں اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ سے فرما رہا ہے۔

"میرے بندوں کو بتا دیجیے میرے محبوب اگر تم بہت گنہگار ہو تو تمہاری خطائیں اور گناہ میری رحمت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی۔"

"انکل آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں یہاں آپ کے گھر تک کیسے پہنچی۔"

"بیٹی مہک! میں امن کے بتائے ہوئے وقت پر خود ہی گاڑی لے کر اس طرف دھیمی رفتار سے چل پڑا جس طرف سے آپ کو آنا تھا، گو کہ میں انتہائی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا، مگر آپ یک دم ہی گاڑی کے سامنے آ گئیں، رفتار انتہائی آہستہ تھی اس لیے میں نے فوراً بریک پکڑ لیے، آپ گاڑی سے ٹکرائیں ضرور، مگر کسی بھی چوٹ سے محفوظ رہی ہیں۔ ہاں البتہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو بے ہوش پایا، شاید یہ بے ہوشی اندرونی خوف اور ذہنی صدمے کے دباؤ کی وجہ سے تھی۔"

"مہک بیٹی۔ میری بیٹی عظمیٰ اور بیوی مسرت سے ملو گی۔"

"بالکل انکل۔"

"آؤ۔ وہ اپنی ماں کے پاس ہی بیٹھی ہے، جب سے آئی ہے ماں نے اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی خود سے دور نہیں کیا۔" چلتے ہوئے انکل فہیم تفصیل بتا رہے تھے۔ ان کے ہر لفظ میں خوشی کی جھلک تھی، مجھے نہیں معلوم تھا میں جس کمرے میں جا رہی ہوں، وہاں میری دنیا بدلنے والی ہے، کمرے میں انکل فہیم پہلے داخل ہوئے، میں بے اختیار دہلیز پر رک گئی دروازہ نیم وا تھا۔ اندر کا منظر نظروں سے اوجھل تھا۔

"مہک بیٹی۔ اندر آؤ نا۔" انکل کی آواز پر میں اندر داخل ہوئی۔

"بیٹی مہک یہ ہے میری جان میری پیاری بیٹی عظمیٰ۔" اور...... شاید انکل نے مزید بھی کچھ کہا تھا۔ آواز میری سماعت سے ٹکرائی ضرور مگر میں الفاظ کا مفہوم سمجھ نہیں سکی۔ عظمیٰ اور میں ایک دوسرے کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی۔ میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ فہیم انکل کی گم شدہ بیٹی عظمیٰ کی شکل مجھے انتہائی جانی پہچانی لگی، جیسے کوئی نام دل و دماغ پر گھوم رہا ہو، مگر زبان پر نہ آ رہا ہو۔ ویسے یہ خوب صورت شکل میرے دل و دماغ پر لہرانے لگی مگر میں اسے پہچان نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے، کہاں...... زمین میں ہلچل مچ اٹھی۔ پتا نہیں، دیکھا ضرور ہے مگر یاد نہیں آ رہا، یہ ساری سوچیں اور باتیں محض چند سیکنڈوں میں وارد ہوئی تھیں ادھر عظمیٰ مجھ سے زیادہ حیران تھی، اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت کا سمندر موجزن نظر آیا۔ حیرت کے جھٹکے سے کچھ سنبھلی تو عظمیٰ نے میری جانب دوڑ لگا دی۔

"ملکھنی......" وہ ملکھنی کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی، میں اس کی بانہوں میں حیرت کی مورتی بن کر ساکت و جامد کھڑی تھی۔ میری سماعت سے اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ملکھنی...... ملکھنی...... ملکھنی...... الفاظ کی بازگشت میرے کانوں سے ہوتی دماغ میں برسنے لگی، جبکہ عظمیٰ شدت جذبات میں مجھے چوم رہی تھی، اس کی حالت اس بے قرار ماں جیسی تھی جس کا جوان بیٹے کی جدائی کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جدائی کی ماری ہوئی ماں جس بے قراری اور ممتا کے جذبات سے بچھڑے ہوئے بچے کو چومتی چاٹتی اور لپٹتی ہے، عظمیٰ کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہ مجھے چومتی رہی، مجھ سے لپٹتی رہی پھر جدا ہو کر دونوں بازوؤں سے دبوچ کر بولی۔

"ملکھنی! پہچانا نہیں مجھے؟ ارے میں انم ہوں۔ وہی انم جسے تم نے خانم کے کوٹھے سے نکالنا چاہا تھا۔ بے وفا اتنی جلدی بھول گئی ہو۔"

ملکھنی...... انم...... دونوں نام میرے ذہن کی دیواروں سے ٹکرانے لگے، ٹھاہ...... ٹھاہ...... ٹھاہ...... میرے ذہن پر برسنے لگتے میری دنیا تہ و بالا ہونے لگی۔ دماغ گول پھرکی کی طرح چکرانے لگا۔ انم...... یا عظمیٰ...... کی شکل ذہنی کے کسی

دھند لکے میں ڈوب اور ابھر رہی تھی۔ ملکھنی ...... میں نے زیرِ لب دہرایا...... مجھے اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ عظمٰی کی حیرت دُگنی ہو گئی، میرا اس طرح بے حس و حرکت بن جانا اس کی توقع سے ہٹ کر تھا۔

"بیٹی عظمٰی تم اسے جانتی ہو۔" یہ آواز انکل فہیم کی تھی۔

"جی ہاں پاپا۔ بہت اچھی طرح سے، یہ ملکھنی ہے، میرداد نگر کے رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی۔"

میرداد نگر اور رحیم اللہ ترکھان کے نام پر میرے ذہن میں زوردار دھماکہ ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے دماغ کی شریانیں پھٹ گئی ہیں۔ اذیت کا شدید ترین احساس میری رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ یہ تکلیف اور اذیت ناقابلِ برداشت تھی، جس کی تاب نہ لا کر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ شاید میں بے ہوش نہیں ہوئی صرف سکتے میں چلی گئی، کیوں کہ عظمٰی انکل فہیم اور ان کی بیوی کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں، ان کے دھندلے چہرے میرے سامنے گھوم رہے تھے، مگر یہ احساس بھی تھوڑی ہی دیر تھا، کچھ دیر بعد سارے احساسات مٹ گئے۔

جب حواس بحال ہوئے تو مکمل ہوئے، ذہن میں جمی ساری کائی مکمل طور سے دھل گئی، تاریک سائے چھٹ گئے، روداد زندگی لمحہ بہ لمحہ میرے سامنے روشن ہو گئی۔ مجھے ذات کی آگہی مل گئی، میں جان گئی کہ میں کون ہوں ...... میں میرداد نگر کے باسی رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی ملکھنی ہوں۔ میرا باپ رحیم اللہ ترکھان غیرت مند شخص تھا۔ میرے جیل جانے کے بعد لوگوں کا سامنا نہ کر پایا اور ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ کر چلا گیا۔ ابا کی موت کا خیال آیا تو درد سے میری چیخیں نکل گئیں ابا دنیا سے رخصت ہوا تو ایسی غضب ناک ہوا چلی کہ ہمارا سکھ چین خس و خاشاک کی طرح تتر بتر ہو گیا۔ میرداد نگر کے اب کیا حالات ہوں گے، یہ سوچ تیر بن کر میرے دل میں اُترنے لگی۔ سکھاں میری معصوم بہن کا کیا بنا ہوگا۔ ظالم چوہدری نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ امی، بھائی، پھوپھو میرے بعد کن مشکلات کی اسیر رہی ہوں گی، میری گم شدگی کا کیا اثر رہا ہوگا۔ امی زندہ بھی تھی یا وہ بھی میرے غم میں ابا کے نقشِ قدم پر چل کر ابدی نیند سو گئی۔ میں مکمل حواس میں لوٹی تو سوچوں کی یلغار زخم پہ زخم دینے لگی۔ دو سال بیت گئے ہیں۔ ملکھنی ...... تجھے گھر سے غائب ہوئے، دو سال گزر گئے۔ جب جوان بیٹی دو سالوں کا طویل عرصہ گھر سے غائب رہے تو گھر والے زندہ لاشوں میں بدل جاتے ہیں۔ زندہ تو ہوتے ہیں، مگر مردوں کی طرح۔ اس بدتر زندگی نے گھر والوں کو کون سی کون سی آزمائشوں سے گزارا ہوگا۔ چوہدری راحیل تیرا ستیا ناس...... اپنی ایک نفسی خواہش کے لیے تُو نے کتنوں کو زندہ در گور کر دیا...... میں نے بڑبڑا کر کہا۔ اب تو میرے سامنے آئے تو تیرا دل نکال لوں۔ خون سے لتھڑے دل کو مٹھی سے نچوڑوں اور اس کے قطرے تیرے حلق میں انڈیل دوں۔

مجھے اب سب کچھ یاد آ گیا۔ میری ماں کا نام خورشید ہے۔ میں مظہر، اظہر اور سکھاں کی بہن ہوں۔ میرے گھر میں پھوپھو بھی ہے اور بھابی رانی بھی...... ماضی کا منظر بہ منظر میرے ذہن کی زمین پر پورے حالات و افکار کے ساتھ اُترنے لگا۔ بچپن سے لے کر لڑکپن اور لڑکپن سے لے کر جوانی تک کے سارے حالات و واقعات میری نگاہوں میں گھوم گئے، میرداد نگر سے لاہور کے قحبہ خانے تک پھر وہاں سے راوی کے پل تک، جہاں میں نے چھلانگ لگائی تھی، پھر میں نے ایک دوسری دنیا میں قدم رکھا تھا، اس دنیا میں، میں شادی شدہ تھی، میرے شوہر کا نام بلاول تھا۔ ہمارا ایک بیٹا معاویہ تھا، میری خواہش تھی کہ معاویہ کو نشانِ حیدر ملے۔ وہ بڑا آدمی بنے۔ اپنے ملک کی خدمت کرے اور شہادت کے مرتبے پر فائز ہو۔ بلاول معاویہ، میرے لیے ہنوز ایک معما تھے۔ اس دنیا سے نکلی تو امن کے غیر مسلم گھر میں خود کو پایا۔ امن کی خوب صورت شبیہ نرملا، پارو کی شکلیں، قدم چند، کمل چند، سب کچھ ذہن نشین تھا۔ مقدر کے ان عجیب و غریب، مافوق الفہم اور پُراسرار بھرے واقعات پر میں ششدر تھی۔ انم کی موت نے مجھے میرا ماضی یاد دلا دیا، خصوصاً میں نے خود کو پہچان لیا۔ میں ملکھنی ہوں، جسے اپنے اسلاف سے عشق ہے۔ جو ادب کی دلدادہ ہے، جس کی رگ و پے میں تاریخ گندھی ہوئی ہے۔ جس کی طبیعت نے عجیب فطرت پائی ہے، جو بات سے بات نکال لیتی ہے جو زندگی کو سمجھنے کے لیے کتابوں کا بوجھ کندھوں پر نہیں اٹھاتی۔ ہاں میں خود کو بہت اچھی طرح سے پہچان گئی ہوں، اللہ کے بعد یہ احسان کرنے والی ہستی کا نام انم ہے، میں اس کے پاؤں دھو کر بھی پیوں تو بھی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ میں نے اس بات کا اظہار انم سے کیا تو وہ

میرے گالوں کو محبت سے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''مکھنی! تم جیسی لڑکی پہ احسان ہو تو اس کا بدلہ خود رب کی ذات چُکا دیتی ہے، تم نے میرے احسان کا بدلہ احسان کرنے سے پہلے چُکا دیا ہے۔''

''وہ کیسے انم! میں سمجھی نہیں۔'' میری بات سن کر انم نے ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ تاسف سے بولی۔

''دوسروں کو فلسفیانہ انداز میں سمجھانے والی ذہین و فہیم مکھنی بھی میری بات کو نہ سمجھ پائی۔''

''میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔'' مجھ سے کم تُو بھی نہیں ہے انم۔''

''پگلی مجھے میرا باپ ملا، عزت و توقیر ملی۔ غموں اور دُکھوں سے نجات پائی، ماں باپ کی محبت اور محبت ملی تو اس کا سبب بھی خدا تعالیٰ نے مکھنی کو بنایا۔ پاپا تیرے پاس نہ جاتے تو شاید کبھی مجھ تک نہ پہنچ پاتے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس کبھی نہ ہوتا۔ مکھنی احسان مند تو میں ہوں، بے شک تُو ترکھان کی بیٹی مگر اللہ تعالیٰ نے تجھ سے وہ کام لیے ہیں جو ایک ولیہ سے لیا کرتا ہے۔'' انم کی بات سے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔

''انم پتا ہے۔ جب ہم دلاور بھائی کے ساتھ خانم کے کوٹھے سے بھاگی تو گاڑی میں، میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی۔ یا اللہ میرا بھرم رکھنا، میں انم کو ساتھ بھگا تو لائی اب عزت اور لاج رکھنا۔ انم دیکھو نا میرے سوہنے رب نے کس طرح میری عزت رکھی۔ اب تو طوائف نہیں بلکہ سندھ کے مشہور بزنس مین فہیم الدین کی بیٹی عظمیٰ ہے، جسے ہر کوئی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔''

''تو سچ کہتی ہے مکھنی۔ میں تو سوچتی ہوں۔ اللہ میرے پاپا کو پنجاب سے اٹھا کر سندھ میں لایا ہی میری خاطر ہے، تاکہ جب میں انہیں ملوں تو لاہور سے کوسوں دور رہوں۔ جہاں کوئی شخص انم کو نہ جانتا ہو۔ جہاں میں عظمیٰ بن کر عزت کی زندگی بسر کر سکوں۔''

''انم! ایک بات پوچھوں۔''

''پوچھو۔''

''کیا اب بھی نماز نہیں پڑھتی ہو۔'' انم نے دراز پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا، ایسا ہی سوال میں نے میڈم خانم کے کوٹھے پر پوچھا تھا۔

تب انم نے جواب دیا۔ ''نماز صرف زمین پر ماتھا رگڑنے کا نام نہیں، لوگ نماز رسموں کی طرح ادا کرتے ہیں۔ طوائفوں کو رسموں کا پتا نہیں ہوتا۔'' انم کہنے لگی۔

''ایسے سوال پوچھ کر مجھے شرمندہ نہ کرو مکھنی۔'' میں اس کہاوت کو بہت اچھی طرح سے سمجھ گئی ہوں، اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ میں اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے زمین پر جبیں گھسا بھی دوں تو شکر ادا نہیں کر سکتی۔''

''انم یاد ہے۔ میں نے تمہیں ایک بات بتائی تھی۔''

''کونسی بات۔''

''زندگی میں کوشش کرنا جب بھی موقع ملے۔ قرآن مجید کو باترجمہ پڑھنا، خود پر فخر کرو گی۔''

''ہاں مکھنی یاد ہے۔ میں نے حیرت سے کہا تھا ایک طوائف خود پر فخر کرے گی، تب تم نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ حقیقی معبود ہے۔ کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔ مکھنی تمہاری تمام باتوں میں رتی برابر جھوٹ یا شک نہیں۔''

''تو پھر انم...... میری بات پر عمل کرو گی نا۔''

''ضرور کروں گی مکھنی۔ نماز بھی باقاعدہ ادا کروں گی اور قرآن مجید کو باترجمہ سیکھوں گی۔''

''خوش رہو انم۔'' میں نے سچے دل سے اسے دعا دی، پھر پوچھا۔

''پگلی تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم پھر سے میڈم خانم کے کوٹھے پر کیسے جا پہنچی۔''

''مکھنی! راوی کے پل پر ہم پر فائرنگ کھولنے والے میڈم خانم کے پالتو کتے تھے۔ تم نے مجھے دریا میں چھلانگ

لگانے کا کہہ کر دوڑ لگا دی، مجھے بھی اس سے بہتر کوئی صورت دکھائی نہ دی، کیوں کہ آگے پیچھے موت تھی۔ دلاور ہماری حفاظت کرتے ہوئے موت کی آغوش میں چلا گیا تھا، ہم دو ہی لڑکیاں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ میں نے تمہاری رہبری میں دوڑ لگائی تھی، مگر شومئی قسمت پل کی جالی کے عین قریب ایک گولی دندناتی ہوئی آئی اور میرے کندھے میں اُتر گئی، مجھے یوں لگا جیسے جلتے کوئلے میرے اندر بھر گئے ہیں۔ میں اذیت ناک چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گئی، ہوش آیا تو میڈم خانم کی غضبناک نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں، میں اپنی سابقہ جگہ واپس پہنچ گئی۔ اگر میڈم خانم کے بندوں نے تمہیں دریا میں چھلانگ لگاتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا، تو یقیناً مجھے تشدد کا سامنا کرنا پڑتا۔"

چند دنوں میں میری بے تابی عروج پر جا پہنچی، میں میر داد نگر جانے کے لیے بے تاب و بے قرار تھی، مگر میرے میزبانوں کا خیال تھا۔ مجھے چند دن مزید یہاں رکنا چاہیے۔ انکل نے مجھے بتایا۔

"قدم چند آیا تھا میرے گھر۔ دبے الفاظ میں تمہارے بارے میں پوچھا بھی تھا، میں نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی مگر کھل طور پر کھلا نہیں۔ قائم میں جانتا ہوں وہ بالا ہی بالا پوری سرگرمی کے ساتھ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"وہ کس حیثیت سے مجھے تلاش رہے ہیں انکل۔"

یہ بھید ابھی کھلا نہیں، کل میرے آفس امن کا فون بھی آیا تھا۔"

"امن کا فون۔" میں نے چونک کر پوچھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔

"امن کا کہنا ہے، انتہائی احتیاط برتی جائے، اس کا تایا اور چھوٹا بھائی تمہاری تلاش میں بہت پر جوش ہیں۔ میر چند کے تعلقات اوپر تک ہیں، اس نے اپنے دوست ڈی ایس پی جلال الدین کو بھی نجی طور پر مدد کی درخواست کی ہے۔" تفصیل بتاتے ہوئے انکل نعیم نے کہا۔ "ملکمنی! امن تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

امن کے نام پر میرے دل میں نہ معلوم سی اُداسی دوڑ گئی، میں اس اُداسی کا منبع سمجھنے سے قاصر ہوں۔

"نہیں انکل! میں اس گھر کے کسی بھی فرد سے اب نہیں ملوں گی۔"

"ملکمنی بیٹی امن دوسرے لوگوں سے مختلف لڑکا ہے اور پھر دیکھا جائے تو تمہاری جان بچانے میں امن نے اہم کردار ادا کیا ہے۔" یہ بات کہنے والی انم کی ممی تھی۔ میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، میری ران پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"میرے خیال میں تمہیں امن سے مل لینا چاہیے۔"

میں امن کی احسان مند ہوں آنٹی اور احسان کا بدلہ چکانے کا ظرف بھی رکھتی ہوں، مگر فی الحال میں ذہنی طور سے بے حد اپ سیٹ ہوں۔ میرے دماغ میں ہر وقت گھر والوں کی یادیں گھومتی ہیں، آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ میں کس قدر عذاب سے گزر رہی ہوں۔" میری بات سن کر انم نے جواباً کہا۔

"ملکمنی گھر والوں کے ہجر کا عذاب جس قدر میں نے جھیلا ہے شاید ہی کوئی جھیل پائے۔" انم کے لہجے میں اُداسی اور دُکھ تھا۔ میں تمہاری تکلیف، دُکھ درد اور پریشان کیفیت خوب اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہوں۔ مگر میرا ابھی خیال ہے کہ امن سے مل لینا چاہیے۔

"انم پتا نہیں کیوں مجھے امن سے ملنے میں خوف محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے اگلی بات انم سے اس کے والدین کی موجودگی کے سبب نہیں کی۔ مجھے امن سے ملنے کا مشورہ آج پندرہ دنوں بعد دیا جا رہا ہے جبکہ میں جس دن سے جدا ہوئی ہوں، میرا دل اس سے ملاقات کا تقاضا کر رہا ہے، جس طرح دل امن کی طرف بار بار لوٹتا ہے۔ مجھے امن سے ملنے پر اُکساتا ہے۔ میں دل کے اندازِ تکلم پر خوف زدہ ہوں۔ دل کا لقائیہ ملاقات پر کچھ خوف نہیں، مگر اس کی کیفیت پر ڈر لگ رہا ہے میں امن اور اس کے گھر والوں کو بھول جانا چاہتی ہوں، اگر اب امن سے ملی تو شاید ایسا نہ کر پاؤں۔

انم نے دوسری دفعہ بھی یہی ذکر چھیڑ دیا۔ چوں کہ اس کے کمرے میں ہمارے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا، اس لیے میں نے اسے اپنے خوف کی وجہ بتا دی، جسے سن کر وہ خوشی سے بولی۔

"ملکمنی! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تمہاری باتوں میں پیار کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے تو امن سے پیار کر

بیٹھی ہے۔" انم کی بات سن کر میں زیر لب مسکرا دی۔
"نہیں اے پگلی۔ مکھنی آج کے کسی مرد سے پیار نہیں کر سکتی۔"
"کیوں۔ کیا مکھنی گوشت پوست کی لڑکی نہیں؟ اس کے سینے میں دل نہیں دھڑکتا۔ دل میں جذبات واحساسات نہیں پنپتے۔ مکھنی پیار والی حسین نہیں دکھتی یا پھر مکھنی انسان نہیں واقعی کسی بھگوان کا اوتار ہے۔" انم نے عجیب باتیں کہہ ڈالیں۔
"انم! مکھنی انسان بھی ہے اور جذبات واحساسات سے مزین دل بھی رکھتی ہے، مگر انم مکھنی کو جن سے پیار کرنا تھا کر لیا، یہ والا پیار جو کہ تم کہہ رہی ہو، میرے دل میں کبھی سما نہیں سکتا۔"
"تم نے کس سے پیار کیا ہے مکھنی۔"
"بھول گئی ہو نا۔ تمہیں بتایا بھی تھا، محمد بن قاسمؒ، سلطان محمود غزنویؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، ٹیپو سلطانؒ، امام ابو حنیفہؒ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت حمزہؓ کتنے نام گنواؤں انم۔ مجھے ان سب سے عشق ہے۔ ایسی ہستیوں سے عشق کرنے کے بعد امن جیسے شخص کے ساتھ پیار کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔"
"مکھنی ایک بات تو بتاؤ۔"
"کیا۔"
"سوچ کر جواب دینا۔" میں نے انم کو دیکھا۔ آج میں کسی پروفیسر سے کم نہیں لگ رہی تھی۔
"تم نے اتنے سارے نام لیے ہیں اور ان سے عشق کا دعویٰ بھی کیا ہے، میں نے امن کا نام لیا تو کیا پیار کی گنجائش۔ اس کی وجہ......؟"
"ظاہر ہے انم، ایسی عظیم ہستیوں سے عشق کیا جاتا ہے، پیار نہیں۔"
"اس کا مطلب ہے عشق اور پیار میں فرق ہوتا ہے۔"
"کہنا کیا چاہتی ہو۔"
"یہی کہ جن ہستیوں سے تمہیں عشق ہے، ان کے عشق کے بعد واقعی کسی سے عشق کی گنجائش نہیں رہتی، مگر پیار کی گنجائش رہتی ہے مکھنی۔ تو مان یا نہ مان تجھے امن سے پیار ہو گیا ہے۔ میں بھانت بھانت کے انسانوں سے ملی ہوں۔ دل کی بات میں زبان سے نکلتی ہے تو چہرے کے تاثرات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔" انم نے عجیب موازنہ کیا تھا اوپر سے قیاس بھی غضب کا تھا۔ میں چپ رہ گئی تو وہ بولی
خاموشی اقرار کی علامت سمجھی جاتی ہے، مکھنی میں سمجھ لوں کہ میرا اندازہ درست ہے۔
"پتا نہیں انم۔ تم خود سوچو کیا میرے حالات مجھے ایسی باتوں کے سوچنے کا وقت دے سکتے ہیں۔ میں جن حالات کا شکار ہوں۔ انم وہاں سوچ بھی نہیں سکتی۔"
"مکھنی پیار بااختیار جذبے کا نام نہیں ہے۔ حالات موزوں ہوں تو ٹھیک ہے، مگر حالات مشکلات کا شکار ہوں تو کل پرسوں سوچیں گے، مکھنی یہ تو بے اختیار جذبہ ہے، حالات وواقعات سے مُبرا دل میں سما جاتا ہے چپکے سے ہی کسی داخل ہو جاتا ہے۔ ہاں سر تب اٹھاتا ہے جب حالات کا رُخ بدل جائے۔"
"انم آج مجھے بے حد خوشی ہے، تمہیں یوں باتیں کرتے دیکھ کر احساس ہو رہا ہے تم کتنی فصیح و بلیغ سوچ رکھتی ہو۔" انم میری بات پر مسکرا دی۔ وہ ہنستی ہے تو اس کا حسن مزید نکھر جاتا ہے۔
"مکھنی! ذہن میں اب بھی تاریخ کے ادوار جگمگاتے ہیں یا پھر بھول گئی ہو......؟"
"بھولی ضرور ہوں انم مگر مکمل نہیں، موضوع کے اعتبار سے تاریخ خود بخود ذہن میں چلتی رہتی ہے۔"
"میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"
"پوچھ۔"
"امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"سبحان اللہ انم! مجھے تیرے اندر ایک نئی پکار سنائی دے رہی ہے۔"

"ملکمنی! اللہ نے بھی تو مجھے انم سے عظمیٰ بنا دیا ہے، پھر میرا بھی فرض بنتا ہے کہ عظمیٰ بن کر دکھاؤں۔"

"اسی لیے شاید تم نے سوال بھی امام اعظمؒ کے بارے میں پوچھا ہے۔"

"مجھے جو کچھ یاد ہے، وہ تمہیں بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ کا اصل نام نعمان ہے، باپ کا نام ثابتؒ، دادا کا نام زوطی۔ آپ کے دادا زوطی کابل سے آئے تھے۔

"میں سمجھی نہیں۔ کابل سے کہاں آئے تھے۔"

"عراق۔ یعنی عرب میں داخل ہوئے تو اسلام قبول کیا۔ حضرت علیؓ نے زوطی اور ان کے بیٹے ثابتؒ یعنی امام ابو حنیفہؒ کے والد گرامی کو دعائے خیر دی تھی۔"

"ملکمنی اگر امام صاحب کے دادا کابل سے عرب گئے تھے تو پھر امام صاحب کو عجمی کہا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک سوچا ہے انم۔ مولانا شبلی نے اپنی ایک کتاب میں امام صاحب کو عجمی النسل ہی لکھا ہے۔"

"اچھا آگے بتاؤ۔"

"جب حجاج بن یوسف عراق کے حکمران تھے، تب مذہبی تصادم عروج پر تھے۔ وہی دور امام ابو حنیفہؒ کے بچپن کا تھا۔ کچھ عرصے تک تقدیر نے اسلام کو حجاج کی طرح سخت گیر اور سفاک قسم کے حکمران دیے، جیسے عبدالمالک اور ولید وغیرہ۔"

"ملکمنی ان کے پورے نام کیا تھے۔ یا کوئی حدود اربعہ۔"

"نہیں انم۔ ناموں کے علاوہ مجھے فی الحال کچھ معلوم نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"تمہارے اس سوال سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اب زندگی نے وفا کی تو ان صاحبان کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آگے بتاؤ۔" میں انم کی دلچسپی پر بے حد خوش ہو رہی تھی، اس کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سب جاننے کے لیے بہت بے چین ہے اور میرے خیال میں اچھے طالب علم کی یہی نشانی ہے۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی، اس دور میں کسی بھی شخص کے لیے کچھ حاصل کرنا، مذہبی اعتبار سے کچھ سیکھنا بہت مشکل تھا۔ ازاں بعد جب سلیمان اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے حکمران آئے تو مذہبی علوم کی طرف بھرپور توجہ دی گئی۔ اس دور میں امام ابو حنیفہؒ کوفہ میں سکونت رکھتے اور ایک طرح کا ریشمی کپڑا بنا کر تجارت کرتے تھے۔ کوفے میں ہی حضرت حمادؒ درس دیا کرتے تھے، امام صاحب نے ان کے درسوں میں شرکت شروع کر دی۔ ان کے درس میں اس وقت بڑے بڑے جید علمائے کرام، فقہاء و محدثین اور متقین و زاہدین شرکت کیا کرتے تھے۔

"اوہ" انم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ملکمنی اس دور میں ضروری مسائل کے بارے میں معلومات انتہائی مشکل ہوگا۔ زندگی کے تمام مسائل تو ہمیں احادیث مبارکہ اور قرآن پاک کے اندر ہی ملتے ہیں۔"

"تمہاری بات درست ہے انم۔ اس لیے امام ابو حنیفہؒ نے علم، کلام اور فقہ کی طرف توجہ دی، کیوں کہ وہ دور انتہائی پُرآشوب تھا۔ روایت میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گئے تھے کہ حدیث شریف، مفہوم اور تعبیر کا درست تعین دشوار ہو گیا تھا۔ اس کے حصول کے لیے متعدد طریقوں سے گزرنا پڑتا تھا۔"

"یہ کون سا دور تھا ملکمنی۔ امام صاحب کی پیدائش و وفات کی تاریخ کا کچھ پتا ہے۔"

"امام صاحب کی پیدائش 699ء میں ہوئی اور وفات کی تاریخ 767ء ہے۔ اس دور میں حضرت حمادؒ ہی پختہ عمر بزرگ تھے۔ جن سے امام صاحب نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ ان کے علاوہ کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ رہا تھا، جس سے امام صاحب نے احادیث کا ذخیرہ حاصل نہ کیا ہو۔ اس لیے بزرگ حضرت حمادؒ کے بعد کوفہ میں فقہ پر سب سے زیادہ اہمیت امام صاحب کو ہی حاصل ہوئی تھی۔ مگر امام صاحب خود تشنہ تھے اور اس تشنگی کو مٹانے کے لیے حرمین جانا ضروری تھا، کیوں کہ یہی

علوم کی اصل جگہ تو بہر حال حرمین شریفین ہی تھی۔ مکہ معظمہ میں درس و تدریس کا سب سے بڑا مرکز عطاؒ بن ابی رباح کا سمجھا جاتا تھا، لہٰذا امام ابوحنیفہ بھی ان کے حلقے میں داخل ہوئے۔ عطاؒ بن ابی رباح نے امام اعظمؒ کی خواہش سن کر سوال کیا۔

''تمہارا عقیدہ کیا ہے؟''

''امام صاحب نے جواب دیا۔ میں اسلاف کو بُرا نہیں کہتا، گناہگار کو کافر نہیں سمجھتا اور قضا و قدر کا قائل ہوں۔'' اس جواب پر عطاؒ بن ابی رباح مطمئن ہوئے اور انہیں اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیا۔ امام صاحب جب باقاعدہ درس میں شرکت فرمانے لگے تو عطاؒ بن ابی رباح پر ان کی ذہانت، فصاحت و بلاغت عیاں ہوئی تو انہیں اپنے پہلو میں بٹھانے لگے۔ امامؒ صاحب نے مدینہ شریف تشریف لے جا کر سالمؒ بن عبداللہؒ بن عمر بن خطابؓ اور سلیمان سے ملاقات کی اور ان سے احادیث بھی روایت کیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کئی صحابہ کرامؓ سے احادیث سنیں اور روایت کی ہیں۔ اب وہ دور آ چکا تھا کہ امام صاحب کی شہرت کو چار چاند لگ چکے تھے۔ اسی شہرت سے رشک کھائے ہوئے ظاہر بینوں نے آپ کو قیاس مشہور کر دیا۔

''قیاس! مطلب؟ میں اس لفظ کے صحیح معنی سمجھ نہیں سکی۔''

تمہارا کہنا ہے۔ ظاہر بین قسم کے لوگوں نے امام صاحب کو احادیث کے معاملے میں قیاس مشہور کر دیا۔''

''کہہ سکتی ہو۔ اس بات کی تصدیق اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ آپ کے شاگرد عبداللہ بن مبارک فنِ حدیث کی تکمیل کے لیے بیروت امام اوزاعیؒ کے پاس تشریف لے گئے۔ امام اوزاعیؒ نے عبداللہ بن مبارک سے بلا سوال ہی یہی کیا۔ کوفہ میں ابوحنیفہ کون ہے جو دین میں نئی بات نکالتا ہے۔ عبداللہ بن مبارک تو ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے وہ خاموش رہے۔ میں اب سوچتی ہوں اس وقت عبداللہ بن مبارک خود خاموش نہیں رہے بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کچھ اور مقصد تھا۔''

''اور مقصد.....کیا؟''

ہاں تقدیر امام اوزاعیؒ کو اس سوال کا جواب ایک دوسرے طریقے سے دینے کی خواہاں تھی۔ جب امام اوزاعیؒ حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات بھی ہوئی۔ اس وقت امام ابوحنیفہؒ نے تقریر فرمائی۔ تقریر میں عبداللہ بن مبارک بھی تشریف فرما تھے۔ امام صاحب کی تقریر ایسی باکمال اور پُر اثر تھی کہ امام اوزاعی ششدر رہ گئے۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں۔ امام اعظمؒ جب جا چکے تو امام اوزاعیؒ نے مجھے کہا۔ اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے۔ بلاشبہ یہ میری بدگمانی تھی، جس کا مجھے افسوس ہے۔''

''مکھنی۔'' انم میرا نام پکار کر سر کھجانے لگی۔

''بولو انم۔''

''محسود سے مراد......''

''حسد کرنے والا۔ رَشک کرنے والا۔'' میرے جواب پر انم نے زور زور سے سر ہلایا۔ میں نے کہا بعد ازاں امام اعظمؒ نے امام اوزاعیؒ کی شاگردی بھی اختیار کی۔

''اس کا مطلب ہے امام اوزاعیؒ بھی عام شخصیت نہیں تھے۔''

''انم۔ وہ اس وقت کے امام تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کم و بیش چار ہزار اشخاص سے احادیث روایت کی ہیں اور صرف اندلس ایسا اسلامی ملک ہے جہاں آپ جا نہ سکے، باقی کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں بچا جہاں آپ نہ گئے ہوں۔ انم جس طرح امام اوزاعیؒ نے عبداللہ بن مبارک سے بات کہی تھی، اسی طرح کی بات سیدنا امام باقرؒ نے بھی از خود امام ابوحنیفہؒ سے فرمائی تھی۔''

''وہ کیا مکھنی۔''

''امام ابوحنیفہؒ جب دوسری بار مدینہ تشریف لے گئے تو امام باقرؒ کی خدمت میں بھی پیش ہوئے۔ جب سیدنا امام باقرؒ کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ابوحنیفہ ہے۔ تو بولے۔

''تم ہی قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو۔''

امام ابو حنیفہؒ ادب سے بولے۔ ''معاذ اللہ۔ حدیث کی مخالفت بھلا کون کر سکتا ہے۔'' اس وقت امام باقرؒ کھڑے ہوئے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ بولے۔ ''آپ تشریف رکھیے میں آپ کو تسلی سے جواب دے دیتا ہوں۔'' سیدنا امام باقرؒ بیٹھ گئے۔ تب امام اعظمؒ بولے۔ ''مرد ضعیف ہے یا عورت؟''

''امام باقرؒ نے جواب دیا۔ ''عورت زیادہ ضعیف ہے۔'' امام ابو حنیفہؒ نے دوسرا سوال کیا۔

''وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا۔''

''عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں کم ہے۔ مرد کا حصہ زیادہ ہے۔'' امام باقرؒ کا جواب سن کر امام ابو حنیفہؒ بولے۔

''اگر میں قیاس لگاتا تو عورت کو زیادہ حصہ دینے کا فتویٰ دیتا، کیوں کہ قیاس پر تو ضعیف کو ہی زیادہ ملنا چاہیے۔''

پھر ایک اور سوال پوچھا۔

''نماز افضل ہے یا روزہ؟''

امام باقرؒ نے فرمایا۔ ''نماز افضل ہے۔''

پھر امام صاحب نے فرمایا۔ ''اس اعتبار سے حائضہ عورت کی قضا واجب ہونی چاہیے نہ کہ روزہ کی۔ قیاس یہی کہتا ہے، مگر میں قیاس کی نہیں حدیث کی مانتا ہوں۔ اس لیے میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔''

ان سوال و جواب پر سیدنا باقرؒ اس قدر خوش ہوئے کہ بے اختیار اٹھ کر امام ابو حنیفہؒ کی پیشانی چوم لی۔ سیدنا امام باقرؒ بھی وقت کے امام تھے۔ اس لیے ابو حنیفہؒ نے ایک مدت تک آپ کی خدمت میں حاضری دی اور فقہ و احادیث کی بہت سی نادر باتوں سے مستفید ہوئے۔ امام اعظمؒ نے علم کے حصول کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، حتیٰ کہ حج کے موقع پر دنیا کے گوشے گوشے سے اہل علم حضرات جب کے میں آتے تو امام صاحب ان سے ملتے اور ان کے علم سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ ابو مسلم خراسانی نے جب مروانی حکومت کے خلاف تمام ممالک میں سازشوں کا جال پھیلایا تو کوفہ اس کی لپیٹ میں سب سے زیادہ آیا۔ اس وقت عراق کا گورنر یزید بن عمر بن ہبیرہ تھے۔ یزید بن عمر نے امام ابو حنیفہؒ کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کیا، لیکن امام صاحب نے انکار کر دیا۔ امام صاحب کا کہنا تھا۔

''یزید بن عمر کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر لگاؤں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''سبحان اللہ۔'' انعم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں نے اسے ٹھہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی دلچسپی ہنوز قائم تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''پھر کیا ہوا مکھنی؟''

اس انکار پر وقت کا گورنر غصے میں آ گیا اور امام صاحب کو ہر روز دس درّے لگانے کی سزا سنا دی۔

''اوہ...... ایسا ظلم۔''

''ہاں آگے سنو...... یہ سزا ہوتی رہی مگر امام صاحب اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹے۔ جب خلافت بنو امیہ کا خاتمہ ہوا تو آل عباس تخت و تاج کے وارث ہوئے، مگر انہوں نے سادات اور علویوں کے ساتھ ظلم و ستم شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ محمد بن ابراہیم کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا۔''

بلکہ سنی تاریخ نے اگر عدل و انصاف کے پیکر حکمران دیے ہیں تو وہیں جابر اور سفاک حکمرانوں کی بھی کمی نہیں رہی۔''

''ہاں انعم۔ ابراہیمؒ کے بیٹے محمد کو زندہ چنوانے والے حکمران کا نام المنصور تھا۔ چوں کہ محمد نفس زکیہؒ اور ان کے بھائی ابراہیمؒ نے علم بغاوت بلند کیا تھا اور امام اعظمؒ نے ابراہیمؒ کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے المنصور جب بغداد آیا تو اس نے امام اعظم کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار سے بھرے ناقابل فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)